راگ رُت، خواہشِ مرگ اور تنہا پھول

ادیبوں میں خودکشی کے محرکات

اردو ادب کے خصوصی حوالے سے

ڈاکٹر صفیہ عباد

خودکشی اور خواہشِ مرگ کے حوالے سے ادیبوں کے عام آدمی کی نسبت اپنے خواب اور آئیڈیلز ہوتے ہیں ہر دور اور خصوصاً انیسویں اور بیسویں صدی میں بہت سے ادیبوں نے اپنی زندگی کا چراغ گل کیا اور ادبی افق پر سوگواریت کی دبیز کہر پھیلا گئے زیادہ تر ادیبوں نے پچیس سے چالیس سال کے دوران خودکشی کی۔ زندگی در پردہ کیا ہے موت کے بعد کیا ہوگا گویا خود کو حیاتِ دائمی کے بحرِ بیکراں میں گم کر دینے کی خواہش انہیں ایک نئے تجربے سے ہم آہنگ کر رہی تھی اسی جذبے کی سرشاری انہیں ''اِس دُنیا'' سے ''اُس دُنیا'' کی طرف کھینچ لے گئی۔

ثروت حسین کی شاعری میں موت سے بے خوفی نظر آتی ہے۔ آنس معین نے موت کا وہ خوبصورت روپ دیکھا کہ ہر شخص موت کی تمنا کرنے لگے۔ شکیب جلالی کی خودکشی لحہ لحہ موت کی کیفیت اور اس کے تسلسل سے گزرنے کا ایک عمل ہے۔ تمام عظیم ادیبوں کی طرح ہکسلے بھی عمر بھر انسانی نفس کی پیچیدگیوں اور وجود میں موجزن کائناتوں سے مسحور ہوتا رہا۔

سلویا پلاتھ نے اپنے خوابوں بھرے دماغ کو تنور میں ڈال کر خواہشِ مرگ کی تکمیل کی۔ مرشد کی ہدایت کے بغیر خود اترنے کا لازمی نتیجہ انجذاب۔ ٹوٹ پھوٹ۔ حدِ نظر اسرار اور ابدیت کا بحرِ بیکراں۔

راگ رُت، خواہشِ مرگ اور تنہا پھول

ادیبوں میں خودکشی کے محرکات

(اردو ادب کے خصوصی حوالے سے)

ڈاکٹر صفیہ عباد

نیشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد

چرواہوں کے اُداس گیتوں کے نام
جن کا کوئی وطن نہیں

ابتدائیہ

ادیبوں میں خودکشی کے محرکات (اردو ادب کے خصوصی حوالے سے) میرا تحقیقی مقالہ ہے جو ''ڈاکٹر آف فلاسفی''
کی ڈگری کے لیے لکھا گیا۔ کتابی صورت دیتے ہوئے اس کا موضوع خالصتاً ادبی نوعیت کا تجویز کیا گیا ہے یعنی ''راگ،
رات، رُت، خواہشِ مرگ اور تنہا پھول''۔ کیونکہ یہی عناصر ان ادیبوں کے یہاں اداسیوں اور تنہائیوں کے وہ داخلی موسم بنے
جس کے باعث عہد شباب میں وہ حیرانیوں کے سفر پر اُفق کے پار اُتر گئے جبکہ ''ادیبوں میں خودکشی کے محرکات'' کا موضوع
یہاں ذیلی عنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک سوال جو اکثر مجھ سے کیا جاتا رہا ہے کہ میں نے اس موضوع پر کن اسباب و
محرکات کے باعث لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اپنی طبیعت کے حوالے سے مجھے منفرد موضوع پر لکھنا پسند
ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس موضوع کو جس زاویۂ نگاہ سے میں نے دیکھا اور اس پر کام کیا ہے۔ اس نوعیت کا
کام اس سے پہلے موجود نہیں تھا۔ اس ضمن میں ایک اہم محرک یہ بھی ہے کہ جب میں اپنے ایم فل کے مقالے پر کام کر رہی تھی
، تو دورانِ مطالعہ بہت سے ایسے واقعات نظروں سے گزرے، جو عالمی سطح پر ادیبوں کی خودکشی سے متعلق تھے۔ خصوصاً
انیسویں اور بیسویں صدی میں ایسے واقعات زیادہ رونما ہوئے۔ چنانچہ ایک سوال، ایک تجسس ذہن میں جگہ بنانے لگا کہ ایسا
کیوں ہوتا ہے۔ ادیب معاشرے کا باشعور فرد ہے۔ دُوسروں کو روشنی اور زندگی دیتا ہے۔ خود کیوں زندگی سے کٹ جاتا ہے۔
یہاں میرا بنیادی مقصد ادیبوں کی خودکشی کے محرکات تک پہنچنا تھا۔ محض خودکشی کرنے والے ادیبوں کے واقعات جمع کرنا
نہیں تھا۔ ایک اور تجسس بھی اس ضمن میں میرے پیشِ نظر تھا کہ خودکشی کرنے والے زیادہ تر ادیب بائیس سے چالیس سال
کی عمر کے درمیان تھے اور اکثر ادیب اُس وقت اپنے فن اور شہرت کی بلندیوں پر تھے۔ قابلِ ذکر پہلو یہ تھا کہ اس مخصوص
مرحلۂ عمر میں انسانی نفسیات کے تقاضے کیا ہو سکتے ہیں اور اس کے پس پردہ ایک سوال یہ بھی کارفرما تھا کہ کیا عام و عامی
کی نسبت جینئس انسان کا (Mental Setup) فرق ہو جاتا ہے؟

میں یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ ان ادیبوں کی خودکشی کے حوالے سے یہ موضوع نہ تو ان کے
لیے کوئی داد و تحسین ہے اور نہ ان ادیبوں کو کسی اخلاقی یا مذہبی حوالے سے موجب گناہ و سزا قرار دینا اور نہ ہی ان کی
خودکشی اور اداسیوں کے طویل سلسلوں سے معاشرے میں ڈپریشن کو فروغ دینا ہے، بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ ادب کی
عدالت میں پیش ہونے والے وہ (Cases) ہیں، جن کی وجہ معلوم کی جائے کہ ایسی خود طلبی کی حامل اموات کے محرکات

اور پسِ پردہ عوامل کیا ہے۔

اس کتاب کے پانچ ابواب میں پہلے باب کو میں اپنے موضوع کی تھیوری سمجھتی ہوں۔ لفظ خودکُشی کے تمام ممکنہ مفاہیم، مطالب اور اقسام سے یہاں تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔ اس کے لیے ڈکشنریز، انٹرنیٹ اور انسائیکلوپیڈیاز سے بھی مدد لی گئی۔ جسم اور روح کا رشتہ جو اہل فکر و دانش کے نزدیک ایک پسندیدہ موضوع رہا ہے، اسے خواہش مرگ اور مخصوص حالات میں، مَیں نے خودکشی کے ساتھ مطابقت دی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مذاہبِ عالم نے موت اور خودکشی سے متعلق جو مخصوص نظریات دیئے ہیں، وہ یہاں تفصیلاً درج کیے گئے ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں مغرب کی وہ تحریکیں، جن کی فکر نے انسان کی اخلاقی اور روحانی زندگی پر ضرب کاری لگائی اور انسان اندر سے بے یقین اور تنہا ہوگیا۔ اس حوالے سے تمام تفاصیل بابِ اول میں درج کی گئی ہیں۔ دوسرے باب میں عالمی سطح کے اُن مخصوص ادیبوں کے انفرادی حالات درج کیے گئے ہیں جنھوں نے خودکشی کی۔ اس ضمن میں اُن کا فن، خطوط، سوانح اور آپ بیتیاں میرے پیشِ نظر رہیں۔ تیسرے باب میں خودکشی کرنے والے پاکستانی ادیبوں کو انفرادی سطح پر میں نے مطالعہ و تجزیہ کیا ہے۔ چوتھے باب میں مَیں نے اُن پاکستانی ادیبوں کو منتخب کیا جنھوں نے بظاہر خودکشی تو نہیں کی لیکن تمام زندگی اُن کا رویہ ایسا رہا کہ کثرتِ مے نوشی اور مضرِ صحت ادویات کے حددرجہ استعمال نے اُنھیں رفتہ رفتہ زندگی کی بجائے موت کے قریب تر کیا۔ یہاں تک کہ اسی کیفیت میں اُن کی موت واقع ہوگئی جو خودکشی ہی کی ایک صورت تھی جبکہ پانچواں باب ادیبوں کی خودکشی کے محرکات پر مبنی ہے۔

خودکشی کا موضوع ادیبوں کے حوالے سے اس لیے بھی نیا تھا کہ مجھے سب سے پہلے انٹی لیکچول Suicide کا تعین کرنا تھا۔ اس کے لیے میں نے دیگر تمام طرح کے تحریری مواد سے کام لینے کے علاوہ پاکستان بھر کے تقریباً تمام نامور اہلِ قلم سے ملاقاتیں کیں۔ ان تمام ادبی نشستوں سے مجھے بڑے مفید اور کارآمد نکات تک پہنچنے میں مدد ملی۔ میرا یہ سفر پاکستان بھر میں کئی مہینوں کی آبلہ پائی پر مشتمل تھا۔ جن نامور اہلِ قلم سے اس ضمن میں میری ملاقاتیں اور گفتگو ہوئی اُن کے اسمائے گرامی ہیں:

احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر ہلال نقوی، ڈاکٹر نوازش علی، ڈاکٹر انور نسیم، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، ڈاکٹر روبینہ ترین، ڈاکٹر ناہید قاسمی، مشتاق احمد یوسفی، علامہ علی کرار نقوی، کشور ناہید، علامہ نصیر ترابی، مظہر الاسلام، مسعود اشعر، پروفیسر فتح محمد ملک، پروفیسر توصیف تبسم، پروفیسر شکیلہ حمید، پروفیسر سلمیٰ جبین، پروفیسر احمد جاوید، افتخار عارف، پروفیسر جلیل عالی، عذرا عباس اور بانو قدسیہ وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح موضوع سے متعلق خودکشی کرنے والے ادیبوں کے اہل خانہ، عزیز و اقارب اور دوست احباب پاکستان کے جن جن شہروں میں تھے میں وہاں بہ نفسِ نفیس گئی اور اُن سے اُن کے عزیزوں کے بارے میں تفصیلاً باتیں ہوئیں۔ میں سمجھتی ہوں، کہ ان ملاقاتوں میں مجھے بعض ایسی حیرت انگیز معلومات حاصل ہوئیں جو اس سے پہلے منظرِ عام پر نہیں آئی تھیں۔ اس ضمن میں جن شخصیات کے اہل خانہ سے میں ملی، اُن میں صغیر ملال، ثروت حسین، سارا شگفتہ، مصطفےٰ زیدی، منٹو، جمیلہ شاہین، آنس معین، شکیب جلالی اور ناصر کاظمی شامل ہیں۔

اس کتاب کو عملی شکل تک پہنچانے میں مَیں یہ وضاحت بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ اپنے موضوع سے متعلق مجھے

انگریزی کا مواد اور کچھ کتب جو یہاں پاکستان میں دستیاب نہیں تھیں، بیرونی ممالک سے منگوانا پڑیں۔ یہ کتاب موت سے محبت رکھنے والے مخصوص عالمی ادیبوں کے حوالے سے ایک ایسی ادبی، نفسیاتی، تاریخی اور سوانحی دستاویز ہے جس میں فراہم کردہ معلومات مجموعی طور پر اس سے پہلے منظرِ عام پر نہیں آئیں۔ موت ہر طور خوبصورت ہے جو زندگی کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ اس موضوع کی تفہیم کا بنیادی طور پر تعلق ادب اور ادیب کی اپنی قدریں اور ان کے اپنے موسم ہیں جن کے راستے عام و عامی کی زندگی کی جانب نہیں کھلتے۔

چونکہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے چنانچہ میں یہاں خاص طور پر ایک کتاب کا ذکر کروں گی جو پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں تھی کیونکہ مجھے اس وقت اس کتاب تک رسائی نہ ہو سکی تھی۔ کتاب کا نام "Short Lives" ہے جو پہلی مرتبہ Great Britain Picador سے 1980ء میں شائع ہوئی۔ پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد یہ کتاب مجھے انگلینڈ سے دستیاب ہوئی لہٰذا اس دوسرے ایڈیشن میں خصوصیت کے ساتھ اس کتاب کے مخصوص حصے ڈالے گئے ہیں۔ یہ کتاب بالخصوص اُن غیر ملکی ادیبوں اور فنکاروں کی اداس اور ناراض زندگی کا احاطہ کرتی ہے جن کی زندگی کا خاتمہ بالآخر خودکشی پر منتج ہوا یا وہ خودکشی کے راستے پر چلتے رہے اور میرا موضوع بالخصوص ادیبوں کی خودکشی کے محرکات سے متعلق تھا لہٰذا میں نے اس کتاب سے زیادہ تر ادیبوں کا ہی انتخاب کیا کیونکہ ان نئے ادیبوں کے نام اور اُن کا تعارف قارئین تک پہنچانا مقصود تھا ورنہ اُن کی خودکشی کے محرکات تقریباً وہی تھے جو میرے زیرِ مطالعہ آئے تھے اور جو پہلے ایڈیشن میں تحقیق شدہ ہیں۔ کتاب میں غیر ضروری طوالت کے خدشے کے پیشِ نظر اس نئے انتخاب میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ ان نئے ناموں کا اضافہ قارئین کے لیے ضرور دلچسپی کا باعث ہوگا۔

ڈاکٹر صفیہ عباد

اظہارِ تشکر

اظہارِ تشکر کی سب سے پہلی اور بے پناہ حقدار ''الف اللہ'' کی ہستی پاک ہے جو حیات و کائنات کے تمام علمی و فکری سرچشموں کی مالک و مختار ہے۔ اگر اس کی مدد اور رضا میرے شاملِ حال نہ ہوتی تو مقالے کی تکمیل ہرگز ہرگز ممکن نہ ہوتی۔

اپنے والدین کی بے پایاں شفقت و محبت کو کیا نام دوں کہ ان سے صرف میں دعائیں سمیٹتی رہی جو ان تحقیقی مراحل میں میری مشکلات کی راہ میں مینارۂ نور ثابت ہوئیں۔ عباد! آپ کے لیے میں اب پھر کیا لکھوں۔ جب میں نے ایم فل کا مقالہ لکھا تھا تو یہ الفاظ کہے تھے کہ عباد کی شکر گزاری کے لیے مجھے اگر کوئی لفظ مل گیا تو یہ مجھ پر عباد کا قرض رہا مگر افسوس کہ یہ قرض گھٹنے کی بجائے بڑھتے بڑھتے میرے وجود کو کمزور اور میرے قد کو چھوٹا کر گیا۔ عباد نے اپنی دفتری مصروفیات کے باوجود ملتان، لاہور، کراچی، راولپنڈی اور اسلام آباد کی مختلف لائبریریوں تک لے جانے، کتب کی فراہمی، مختلف ادبی شخصیات سے فون پر رابطے اور ان سے ملاقات کے اوقات کا رطے کرنے میں جس ذمہ داری کا ثبوت دیا، ان تمام مراحل پر اگر مجھے عباد کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو تحقیق کے یہ مرحلے میرے لیے دشوار ترین ہو جاتے۔ اللہ آپ کو اس کا اجرِ عظیم دے۔

حرا اور تیمور نے ایم فل کرنے کے زمانے کی طرح اب بھی تعاون کا بے پناہ ثبوت دیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں ان کے علمی مراحل میں کامیابیاں عطا فرمائے (آمین)۔ رضیہ نے پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی میری کامیابی کے لیے نہ صرف دعاؤں کا ورد جاری رکھا بلکہ میرے کچن کی مصروفیات میں بھی اپنا حصہ ڈالا۔ اللہ اس کا صلہ عطا فرمائے۔ ہر ملاقات پر ظفر بھائی کے وہ چند الفاظ بھی میری ہمت بندھاتے رہے ''کہ کام کہاں تک پہنچا''۔ انور بھائی جان اور ثریا باجی نے فوری طور پر میرے موضوع سے متعلق انگریزی کی چند کتب انگلینڈ سے بھجوائیں جو یہاں پاکستان میں دستیاب نہیں تھیں۔ عذرا کی نیک خواہشات کی میں تہِ دل سے قدر دان ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو نیک تمناؤں کا اجر دے۔

یہ کتاب اپنی اشاعت کے لیے ابتدا میں کافی وقت طلب مراحل سے گزری لیکن شاید زندگی اسی کا نام ہے۔ معلوم نہیں ابرِ نیساں کے پہلے قطرے کو گہر بننے اور سیپ کی کوکھ میں اترنے کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہوں گے اور اس اضطراب اور کرب کا عالم کیا ہوتا ہوگا جو عملِ تخلیق کے لیے روح اور جسم کا ایقان بن جائے ...... اک جانِ ناتواں اور حلقۂ صد کامِ نہنگ ...... کتاب کی اشاعت اور اس کی داخلی حسِ لطیف کی تمام تر نزاکتیں نیشنل بک فاؤنڈیشن کے ساتھ وابستہ ہیں۔ میں مظہر الاسلام صاحب کی تہہِ دل سے شکر گزار ہوں، جن سے اُن کے پسندیدہ موضوع خودکشی پر وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ان کے قیمتی وقت کا بے دریغ استعمال کیا۔ اپنے نگرانِ مقالہ ڈاکٹر رشید امجد کی سرپرستی اور علمی معاونت کی میں بطور خاص شکر گزار ہوں۔

میں ان تمام راستوں، موسموں، ہواؤں، فضاؤں اور بے خواب راتوں کی ممنون ہوں جو دورانِ تحقیق اور دورانِ سفر میرے ساتھ ساتھ بھاگتی اور جاگتی رہیں۔ ان ہوائی پروازوں کا شکریہ، جو ایک احساسِ تفاخر کے ساتھ میرے ساتھ ساتھ اُڑیں۔ دورانِ تحقیق یہ سب مجھے سرگرمِ عمل رکھنے کے بہانے بنے۔ ان تمام لائبریریوں کا بھی شکریہ جنھوں نے مجھے کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹایا۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں دائم آباد رکھے۔

فہرست ابواب

باب اول

خودکُشی کے ممکنہ مفاہیم اور وضاحتیں

خودکُشی کے مفہوم کی وضاحت مختلف لُغات اور انسائیکلوپیڈیا میں یوں کی گئی ہے۔

Suicide.. inclined to commit Suicide. 2. Of or concerning suicide. 3. Self destructive fatally or disastrously rash. Suicide... A The intentional killing of oneself... B.A person who commits suicide... self destruction action or course designating a highly dangerous or deliberately suicidal operation etc... suicide pact, an agreement between two or more people to commit suicide together[۱]

خودکُشی کی ایک اور وضاحت اس طرح سے ہوئی ہے۔

Suicide... Sui of oneself... cide the act of killing one self intentionally... Ruin of one 's interests or prospects through one's own actions, policies etc... a person who commits suicide..۔[۲]

گویا خود کو جان بوجھ کر ہلاک کرنا، اپنی دلچسپیوں اور مفادات کے خاتمے کے لیے ذاتی اقدام کرنا۔ اس ذاتی نقصان کے لیے انفرادی سطح پر کوشش کرنا وغیرہ اسی زمرے میں آتا ہے۔" خودکُشی[۳]۔ Khud Kushe... "Suicide... to commit Suicide." اپنی ذات اور ذات سے متعلقہ امور کا خاتمہ کرنا خودکُشی کہلاتا ہے۔ خودکُشی ".Suicide (S (y)00-I-sid) n - Self murder" قتلِ نفس۔ اپنے آپ کو مارنے والا فعل جو (خودکُشی) خودکُشی کے مترادف ہو۔ خودکُشی کے مماثل، خودکُشی کے متعلق Suicidal (adj)۔[۴]

اس کے علاوہ "یہ ایک انسانی فعل ہے۔ اس میں مرنے والے کے ارادے کو مکمل دخل ہوتا ہے۔ خودکُشی۔ اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے"۔[۵] اپنی ذات، وجود اور زندگی کا خاتمہ تو مکمل طور پر خودکُشی کے زمرے میں آتا ہے لیکن اپنی

دلچسپیوں اور مفادات کو نظر انداز کرنا، اُن سے عدم توجہی کا رویہ بھی کسی حد تک اسی ضمن میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ خودکشی کی ایک تعریف یہ بھی ہے۔ ''خودکشی اپنے آپ کو مارنا، مقدور سے بڑھ کر دعوت پر خرچ کرنا''۔۶ اس سے یہ نکتہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ کہ اپنی قدرت اور اختیار سے بڑھ کر کوئی ایسا اقدام کرنا۔ جو ذاتی نقصان پر منتج ہو۔ اور یہ بھی کہ دوسروں کی خاطر، دوسروں کے لئے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کرنا۔ اس سے اپنے لئے تکلیف کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

Suicide (Sew-I-Sid) deliberately killing oneself، خودکشی

Commit Suicide خودکشی کرنا. One who does so خودکشی کرنے والا

Suicidal (Sew-I-Si-Dal) adj. very harmful to One's own interest

۷۔ خودکشی کے مترادف

گویا ایسے عوامل بھی خودکشی کے زمرے میں آئیں گے جو انسان کے اپنے ہاتھوں اپنے ہی مفاد کیلئے مضر اور نقصان دہ ہوں۔ اور بظاہر خودکشی وہ موت ہے۔ جو اپنے ہاتھوں اپنی مرضی، ارادے اور کسی حد تک منصوبہ بندی کے ساتھ کی جائے۔

"Suicide (from Latin Suicaedere, to kill one self) is the act of intentional ending one's own life"۔۸

بانو قدسیہ نے اپنے ایک کردار کے ذریعے خودکشی کی وضاحت یوں کی ہے۔

> دراصل خودکشی ایک symptom ہے۔ کسی معاشرے کے اندر اگر کوئی بیرومیٹر فٹ کیا جائے۔ تو خودکشی اس کا آخری درجہء حرارت ہوگا۔ سوسائٹی کا پریشر پاگل پن کو جنم دیتا ہے۔ اور پاگل پن ہی خودکشی کا باعث ہے۔ ہم ایسی عمر میں جب خودکشی سے ایک روحانی اور رومانی وابستگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی وجوہات کا جائزہ لیا گیا۔ جن کی وجہ سے فرد خودکشی پر مائل ہوتا ہے۔ اقتصادی، معاشرتی، شخصی، ذاتی اور جبلی وجوہات۔۔۔۔۹

یہاں خودکشی کی وجوہات کی ایک تکون نظر آتی ہے۔ سوسائٹی کا پریشر اور عمر کے ایک خاص حصے میں شدت جذبات کے پیش نظر خودکشی کے ساتھ روحانی وابستگی کی کیفیت کا پیدا ہونا۔ ادیبوں میں خودکشی کی یہ تکون اور اس سے وابستہ محرکات زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

یہ صرف ابتدائی زمانے کی بات نہیں۔ ہر دور میں، ہر سوسائٹی میں خودکشی اور اقدام خودکشی پر مبنی اقدامات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ اس کا تناسب گھٹتا بڑھتا رہا ہے۔ خودکشی کے موضوع پر پہلے پہل جس نے لکھا۔ وہ کورون (J. Choron) ہے۔ اس نے اس ضمن میں بہت تحقیق کی۔ اور خودکشی فعل کے لئے قدیم زمانے سے ہی مستعمل ہونے والی اصطلاحات سے بحث کی۔ مثلاً Sua Manu Cadere۔ مراد کوئی شخص اپنے ہاتھوں موت کے منہ میں چلا گیا۔ اس کے علاوہ Sibi Morten conscisere۔ یعنی کسی شخص نے اپنی موت خود پیدا کی۔ اور Sibi inferre vim یعنی کسی نے خود اپنے اوپر تشدد کیا۔ اسی طرح انگریزوں نے اس فعل کے لئے Felo-De-Se کی

[illegible] پسندی۔ جس کا مطلب ہے۔ کہ مرنے والے نے خودکشی کر کے جرم کا ارتکاب بھی کیا۔

انگریزی تاریخ میں خودکشی یعنی Suicide کا لفظ سترھویں صدی عیسوی میں پہلی بار استعمال ہوا۔ اور اس لفظ نے جلد مقبولیت حاصل کی۔ کہ بہت کم مدت میں زبان زدِ عام ہو گیا۔ درکھیم ایک اہم نام ہے۔ جس نے خودکشی کے مفہوم اور اس کی اقسام سے بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے ماہرین عمرانیات و نفسیات نے بھی خودکشی کے مختلف پہلوؤں اور اقسام پر روشنی ڈالی ہے۔ مجموعی طور پر اس ابتدائی نقطہ نظر سے خودکشی کی مندرجہ ذیل اقسام منظر عام پر آئی ہیں۔

۱۔ لمبے عرصے پر محیط خودکشی (Chronic Suicide):

ایسا شخص جس میں مرنے والا خودکشی تو کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس کے لئے [illegible] شراب کا سہارا لیتا ہے۔ ان اشیاء کا استعمال وہ اس لئے کرتا ہے۔ کہ بغیر تکلیف کے آپ خالق حقیقی سے جا ملتے ہیں۔ [illegible] سے الگ سے کوئی تردد نہیں کرنا پڑتا۔ اسی نوعیت کی خودکشی میں وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ جو [illegible] قطرہ قطرہ موت، اس کی لذت اور اذیت [illegible] اس سے ہم آہنگی کی صورت پیدا کر لیتے ہیں۔ [illegible] تیز دھار آلے سے خود کو ہلکی ہلکی ضربیں لگاتے رہتے ہیں۔ "[illegible] کے مطابق یہ لوگ۔۔۔ آپ [illegible] برداشت کا مادہ پیدا کر لیتے ہیں یہ افراد حقیقتاً خودکشی کی جب منصوبہ بندی کریں گے۔ تو اس "منصوبہ بندی" سے زیادہ مقدار و شدت ذہن میں رکھیں گے۔۔۔" ۱۰

۲۔ غیر محتاط خودکشی (Neglect Suicide):

اس سے مراد ایسے لوگ ہیں۔ جو اپنی صحت کے بارے میں غیر محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں۔ جیسے

۔۔۔ شوگر کا مریض اگر اپنی خوراک میں شکر کی مقدار کو کنٹرول نہ کرے۔ یا کوئی آدمی ہائی بلڈ پریشر کا مریض ہو۔ مگر وہ اپنی غذا میں سوڈیم کے اجزا کی موجودگی کو پسند کرتا ہو تو اس کی موت معینہ مدت سے قبل اس کی گردن پر تلوار رکھ دیتی ہے۔ ۱۱

۳۔ خام ارادہ والی خودکشی (Sub Intentional Suicide):

۔۔۔ کسی شخص کو بہت زیادہ غیر محتاط انداز سے ڈرائیونگ کرنے کی عادت ہے اور سرخ اشاروں سے گزرنے کا شوق ہے یا کسی شخص کو کشتی رانی کا جنون اس وقت اٹھے۔ جب سمندر کا موسم خراب ہو۔۔۔ عملی نقطہ نظر سے ہم اسے خودکشی کہیں گے۔۔۔ ۱۲

۴۔ مہلک خودکشی (Surcease Suicide):

ایسے لوگ جو شدید پرانے، لاعلاج امراض سے دوچار ہوتے ہوئے روز روز کی تکلیف سے جان چھڑانے کی خاطر اپنے لئے خودکشی کا راستہ پسند کرتے ہیں۔

۵۔ نفسیاتی خودکشی (Psychotic Suicide):

اس میں شاذوفرینیا کے دورے پڑنے لگتے ہیں اور بعض مخصوص نفسیاتی عوامل کے پیش نظر انسان نہ چاہتے ہوئے بھی ایسی حرکات کر بیٹھتا ہے جس سے وہ موت کے قریب ہونے لگتا ہے۔

۶۔ اپنی موجودگی کے فلسفہ پر مبنی خودکشی (Existential Suicide):

اس طرح کی خودکشی کو پہلے پہل (Camus) نے حقیقی رنگ میں پیش کیا۔ اس کی رو سے جب زندگی میں بوریت زیادہ ہو جائے۔ اس میں ترقی و خوشحالی کے امکانات ختم ہونے لگیں۔ ہر شے بے معنی نظر آئے۔ تو بعض لوگ موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگتے ہیں۔ بعض دانشوروں (انٹیلیکچول) کی خودکشی پر مبنی اموات کو مفکرین اسی زمرے میں لیتے ہیں۔ خودکشی کا ایک حوالہ (Para Suicide) بھی ہے۔ یعنی خودکشی کرنے کی کوشش کرنا۔ خودکشی کرنے والے بہت سے اہم ادیبوں میں ایسے نام بھی ہیں۔ جو خودکشی کرنے سے پہلے ان مراحل سے بھی گزرے۔

> Para suicide is a suicide attempt in which a person does not intend to die. The person is making a plea for help and wants others to know of his/her pain.[۱۳]

خودکشی کے اس طریقہ کار میں دوسروں کو محض دھمکی دینا۔ ان کی توجہ اور ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرنا بھی شامل ہے۔ اس میں دوسروں کے ناروا سلوک کے خلاف احتجاج کی ایک صورت بھی پائی جاتی ہے اور ایک حوالے سے خود اپنی ذات کے لیے اذیت اور انتقام کی کیفیت بھی موجود ہے۔

> One of the most unfortunate myths about suicide is thatpeople who threaten to kill themselves will not carry out the threat that only the "Silent Type" will pull it off. This is quite untrue. In a recent study of seventy one completed suicides, more than half the victims had clearly committed their suicides intent within three monthsbefore the fatal act... in other words, when people threaten suicide, they should be taken seriously. Another myth is that people who attempt suicide and fail are not serious about ending their lives. they are just looking for sympathy.-[۱۴]

اس سے قدرے ملتی جلتی صورت حال یہ بھی ہے۔

Who has clearly expressed his intention of dying, or the action of some one who takes a massive dose of

drugs, then telephones a friend in order to hear an affectionate voice before he dies, or because he no longer wants to die and wishes to be saved .... ۔۱۵

اب تک خودکشی کے مفہوم کی جو وضاحت سامنے آئی ہے۔اس کے مطابق مندرجہ ذیل نکات سامنے آئے ہیں۔

☆ خودکشی سے مراد فرد کا اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ ہے۔

☆ خودکشی اور اقدام خودکشی کا وجود ہر دور، ہر سوسائٹی میں موجود رہا ہے۔اگرچہ حالات و واقعات کی روشنی میں اس کا تناسب گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

☆ زندگی کے خاتمے کے علاوہ اپنی طاقت، اختیار اور ہمت سے بڑھ کر اپنی ذات کی دلچسپیوں، اِنفرادی اُمور اور ذاتی مفاد کو نظر انداز کرنا، اپنے ہاتھوں سے اُنہیں کچلنا بھی خودکشی کے زمرے میں آتا ہے۔اِس میں ایسی خودکشیاں شامل کی جاسکتی ہیں جو حیات کے خاتمے پر منتج ہونے کی بجائے ایک مسلسل کرب، اذیت، خاموش انتقام اور احتجاج کے ساتھ معاشرے سے متصادم رہیں۔ایک Slow Poisoning تھی جو اپنے ہاتھوں انہیں ملتی رہی۔اسی طرح خودکشی کی وضاحت میں ہم مندرجہ ذیل مخصوص طرزِ عمل کے حامل افراد کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔

...... معاشرے کے منفی رویوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے خودفراموشی کا شکار ہوتے لوگ۔

...... صحت اور زندگی کے لئے نقصان دہ عوامل کے ساتھ شعوری طور جینے کی خواہش رکھنا۔

...... اپنے لئے آسودگی اور مادی آسائش کے تمام در بند کر دینا۔

...... نشہ آور اور مضرِ صحت ادویات کا جانتے بوجھتے استعمال جاری رکھنا۔

...... سب میں رہتے ہوئے بھی تنہائی کا زہر پینا یا تنہا ہو کر سماج سے کٹ جانا۔

...... ذاتی فائدے کی جستجو ترک کر دینا۔

...... اُس نکتہ اتصال پر جینا، جہاں موت اور حیات یکساں معنی دیں۔

...... اپنی ذات اور حیات کا یہ وہ شعوری، اِرادی اور ناقابل تلافی نقصان ہے جس سے دوسروں کو فائدہ بھی پہنچتا ہو۔ (یہ فائدہ چند مخصوص افراد، تمام سوسائٹی یا سوسائٹی کے چند مخصوص رویوں کا بھی ہوسکتا ہے۔جس کے ساتھ ایک فرد اپنے آپ کو مطابقت نہیں دے سکا) یعنی یہ صورتحال کچھ اِس طرح سے ہے کہ ایک شخص سوسائٹی کے اُن لوگوں اور اُن کے چند مخصوص منفی اور ناروا رویوں جنہیں وہ نہ تو بدل سکا اور نہ خود اُن سے مطابقت پیدا کر سکا۔خودکشی کی صورت میں اُن کے لئے وہ جگہ خالی کر گیا جو خود سوسائٹی اور اُن کے منفی رویوں کو مزید پنپنے کے لئے درکار تھی۔

...... خودکشی ایسا اقدام ہے جس میں ایک فرد کی جانب سے احتجاج کا خاموش مگر اعلانیہ اظہار بھی شامل ہے۔

...... اقدام خودکشی کے محرکات میں سوسائٹی سے کٹتا ہوا شخص دوسروں کی ہمدردی اور توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

خودکشی کی بین الاقوامی شرح اور خودکشی کے مختلف طریقہ کار:

جہاں تک خودکشی کی شرح کا تعلق ہے، بین الاقوامی سطح پر یہ کسی مقرر شدہ ضابطے اور قاعدے کی حد میں نہیں آتی۔ کیونکہ مختلف ادوار میں مختلف ممالک اور مختلف اقوام میں مخصوص سماجی اور معاشی صورت حال میں اس کا تناسب گھٹتا بڑھتا رہا ہے جس کے باعث اِس ضمن میں ایک واضح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ مردوں میں عمر کے ساتھ خودکشی کی شرح بڑھتی جاتی ہے لیکن عورتوں میں پچیس برس کی عمر کے بعد خودکشی کا رُجحان کم ہوتا جاتا ہے (لیکن یہ کوئی حتمی بات نہیں)۔ لیکن اس میں حقیقت کا پہلو موجود ہے اور یہ بھی کہ عورتوں کے مقابلے میں مرد اور حبشیوں کے مقابلے میں سفید فام لوگ زیادہ تعداد میں اپنے آپ کو ہلاک کرتے ہیں۔

Male Suicide rates are higher than females in all age groups... In other western countries, males are also much more likely to die by Suicide than females.-۱۶

جاپان کے حوالے سے خودکشی کا اپنا ایک مخصوص حوالہ ہے۔

جاپان میں خودکشی کو ایک مقدس اور بہادرانہ فعل سمجھا جاتا تھا اور لوگ ذرا ذرا سی بات (ہتک عزت، کاروبار میں نقصان، عشق میں ناکامی) پر اپنے آپ کو ہلاک کر دیتے تھے۔ لیکن اب یہاں خودکشی کی وارداتیں کم ہوگئی ہیں۔ اور ٹوکیو یونیورسٹی کے پروفیسر کینجی تامورا کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے بموجب اب یہ ملک اِس معاملے میں دسویں نمبر پر ہے۔ اِس کا سبب پروفیسر تامورا کے بقول صنعتی ترقی اور پرانی اقدار کی تبدیلی ہے۔-۱۷

جاپانی زبان میں خودکشی کو ہراکری کہتے ہیں۔ جاپان کے علاوہ قدیم یونان، مصر، روم، ایران اور بھارت وغیرہ جیسے ممالک میں بہت دیر اِس کا رواج رہا ہے۔ لیکن مختلف ادوار میں خودکشی کی بنیاد مختلف مفروضوں پر رکھی جاتی رہی ہے۔ اِن میں مذہبی، طبی، معاشی اور اخلاقی اقدار سے متعلق بہت سے عوامل شامل رہے ہیں۔ ''۱۹۶۷ میں خودکشی کی سب سے زیادہ وارداتیں شمالی یورپ کے ملک آسٹریا میں ہوئیں۔ اس سال یہاں ۱۸۱۸ لوگوں نے خودکشی کی۔ سویڈن کا نمبر دوسرا اور امریکہ کا تیسرا رہا''۔ -۱۸ جبکہ ۱۹۶۰ء تک کے ایک اندازے کے مطابق'' صرف امریکہ میں خودکشی کرنے والوں کی سالانہ تعداد ۶۷۴۰ ہے''۔-۱۹

امریکہ کے حوالے سے جدید ترین اندازہ یہ ہے۔

The suicide rate in the U.S.A is 0.02% per annum for males, and 0.005% per annum for females.-۲۰

جبکہ طالب علموں کے حوالے سے ایک مجموعی اندازہ یہ ہے۔

Each year, almost one-half million students attemptsuicide. The majority who attempt suicide do not receive medical or mental health care.... This places them at risk for making another attempt. Approximately 5,000 students ages fifteen to

twenty four commit suicide each year (National Center for Health Statistics, 1993) The number is probably even higher because many suicides go unreported.۔۲۱

ایک اور اندازے کے مطابق

A recent report by the World Health Organization (WHO) states that nearly a million people take their own lives every year... WHO figures show a suicide takes place some where in the world every 40 seconds. The numbers are highest in Europe, Baltic States where around 40 people per 100.000 die by suicide each year.۔۲۲

آج کل خود کشی کا تناسب غیر واضح ہے۔ اِس کی شماریات کو حتمی شکل نہیں دی جا سکتی۔ لیکن اِس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خود کشی کا تناسب رومن کیتھولک سوسائٹیز میں عموماً کم پایا جاتا ہے۔ یہ پروٹسٹنٹ کے مقابلے میں شاید اِس وجہ سے بھی کم ہو کہ پروٹسٹنٹ کے مقابلے میں کیتھولک خود کشی کے تناسب کو چھپاتے ہیں۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ سرکاری سطح پر پچھلی صدی میں مغربی اقوام میں خود کشی کے رُجحانات کا تناسب اس لیے بھی بڑھا ہے کہ خود کشی کے طریقہ کار کو جاننے کے طریقے بہتر اور مؤثر ہوئے ہیں اور خود کشی کرنے کا جو دھبہ کسی قوم پر آ سکتا ہے، اُسے کم رکھنے کی کوشش ہوئی ہے۔

۱۸۳۸ کے دور میں جینی آسکرال کے تجربات کے مطابق خود کشی کے واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جنہیں بآسانی حادثات کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اِن میں درپیش حالات کے تحت وجہ موت کا تلاش کرنا خاصا دُشوار ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی عورت خواب آور گولیاں کھانے کی عادی ہے تو خود کشی کرنے کے لئے جائز مقدار سے زائد کھائی گولیوں کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا۔ پس اِن حالات میں اعداد و شمار مشکوک ہو سکتے ہیں۔۲۳

چنانچہ اِس ضمن میں یہ بھی پیشِ نظر رکھا جاتا ہے کہ "Certain time trends can be related to the type of death"۔۲۴ جہاں تک خود کشی کرنے کے طریقہ کار کا تعلق ہے تو اِس کے مختلف حوالے اور طریقہ کار ہیں۔ مثلاً مغرب میں زہریلی گیسوں کے ذریعے خود کشی کا عام رُجحان ہے۔ وہاں تو کہیں سزائے موت کے لئے گیس چیمبرز استعمال ہوتے ہیں۔ اور امریکہ میں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۵ء تک سزائے موت کے لئے کاربن مونو آکسائیڈ کا طریقہ کار بھی رائج رہا۔ پھر کوئلے کی گیس سے بھی کام لیا جاتا رہا۔ اِس کے علاوہ ایسے طریقہ کار، با آسانی اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً

The common means of suicide, roughly in order of use (U.S) are by gunshot (The so-called "HemingWay Solution"), asphyxia, hanging, drug overdose, carbonmonoxide, poisoning, jumping from height, stabbing or exsanguination and drowning. ۔۲۵

لیکن اس سلسلے میں سب سے اہم اور مؤثر گیس کاربن مونو آکسائیڈ ہی سمجھی جاتی ہے۔

> کیونکہ یہ زوداثر ہے۔ اور اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ آدمی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اِس کے خون کے خلیات آہستہ آہستہ منجمد ہو رہے ہیں۔ اور گو اِس کی چھٹی حس خبردار کر دیتی ہے کہ کوئی چیز گلے میں اٹک رہی ہے مگر جب تک وہ اِس کا چارہ کرتا ہے، گیس اپنا کام دِکھا چکی ہوتی ہے۔۔۲۶

ایشیائی ممالک میں ٹرین کے نیچے آ کر خودکشی کرنے کا رُجحان پایا جاتا ہے۔ بلکہ یہ رُجحان زیادہ ہے۔ ریل گاڑی کی اِس حوالے سے کئی علامتیں ہیں۔ اِس کا چیخنا، چلانا، اِس کی تیز رفتاری، ویرانوں اور سناٹوں کو چیر کھانے والی اِس کی دہشت زدہ آواز اور اِس کے علاوہ انتظار اور سفر کی علامتیں اِس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جس سے ایک طرح کا رومانوی رنگ بھی پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر حسن رضوی نے ریل گاڑی کے حوالے سے ناصر کاظمی کی شاعری کے ایک مخصوص پہلو کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ریل گاڑی کا وقت پر آنا اور چیختے ہوئے گزر جانا، انتظار کی وہ کیفیت ظاہر کرتا ہے جو آگے چل کر ناصر کاظمی کی شاعری میں رومانوی رنگ میں نمایاں ہوئی۔ ہمارے ہاں بہت سے شاعروں اور افسانہ نگاروں نے ریل گاڑی کو اپنی تخلیقات میں اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔۔۲۷

اِس کے علاوہ شدید بیماری کی نوعیت میں بعض ممالک میں میڈیکل advice کے طور پر فرد کی زندگی ختم کرنے کے لئے ایمرجنسی روم اور ایمرجنسی service کے طریقہ کار بھی اختیار کیے جاتے ہیں۔

خودکشی کے طریقہ کار کا اختلاف بھی دراصل خودکشی کرنے والوں کے مزاج اور رویوں کی اختلافی نوعیت پر مبنی ہے۔ جس کی مندرجہ ذیل ممکنہ صورتیں ہیں۔

۱۔ کیا خودکشی کرنے والی کی نیت واقعی اپنی زندگی کا خاتمہ تھا یا محض ایک اقدام۔ اگر مکمل خودکشی کرنے کا اِرادہ تھا تو فوری موت واقع ہو جانے کا طریقہ کار اختیار کیا گیا۔ مثلاً بندوق یا پستول کی گولی سے یا چلتی ٹرین کے آگے اپنی جان ختم کر دینے کا عمل۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ چلتی ٹرین کے آگے خودکشی کرنے کا رُجحان ایشیا میں زیادہ ہے۔ (اُردو ادب کے حوالے سے ادیبوں کی زیادہ تر خودکشی اِسی طریقہ سے ہوئی)۔

۲۔ محض اقدامِ خودکشی کے پس پردہ خودکشی کرنے والے کی نیت یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ وہ مرنا بھی چاہتا ہے اور اِس کے ساتھ ساتھ زندہ رہنے کی طلب بھی کسی حد تک اس میں موجود ہے۔ مثلاً اتنی مقدار میں فوری طور پر اتنا نشہ یا خواب آور ادویات کا استعمال جس سے اُس کی زندگی بچائے جانے کا امکان بھی موجود ہو۔ یا اس طرح سے خود کو لٹکانا کہ اُس کے بچ جانے کی صورت بھی نکل سکے۔ مشرق و مغرب کے کئی ادیبوں نے اِس حوالے سے محض اقدامِ خودکشی بھی کیا۔ یہ اقدام ایک یا ایک سے زیادہ مرتبہ پر مشتمل ہے۔ اور بعض نے اقدامِ خودکشی کے بعد پھر خودکشی بھی کی۔ پہلے اقدامات کی صورت ظاہر کرتی ہے کہ وہ محض ایک اِرادہ تھا جس میں اپنی زندگی کو مکمل طور پر ختم کرنے کی نیت شامل نہیں تھی یا ایسی نیت پوری ہونے سے پہلے ہی بدل گئی ہو۔

۳۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ شدید غم و غصے، ذہنی اضطراب اور شدت جذبات میں جو طریقہ آسانی سے ہاتھ آ گیا

اُسی سے اپنی زندگی ختم کر دی۔اس میں خودکشی کرنے کے طریقہ کار کے بارے میں کوئی باقاعدہ منصوبہ بندی کا پہلو موجود نہیں۔مثلاً فوری دستیاب ہونے والی کوئی زہریلی چیز یا اگر دریا/سمندر قریب ہے تو پانی میں کود جانا۔

۴۔ خودکشی کے طریقہ کار سے علم ہوتا ہے کہ خودکشی کرنے والے کا اِرادہ خود کو ختم کرنا تھا اور دوسری طرف آخری لمحے پر بھی خود کو اذیت دینے یا نہ دینے کا پہلو موجود ہے۔مثلاً آگ میں کود جانا، چلتی ٹرین کے سامنے کٹ جانا یا تیز دھار آلے سے خود کو کاٹنا وغیرہ۔اِن طریقہ ہائے کار میں شدید اذیت کا پہلو بھی موجود ہے۔یہ طریقہ ہائے کار مشرق میں مقابلتاً زیادہ ہیں (خاص طور پر ٹرین کے حوالہ سے)۔جبکہ مغرب کے ادیبوں نے وہاں کے طریقہ کار کے مطابق خود کو زیادہ تر گیس (کاربن مونو آکسائیڈ) سے ہلاک کیا۔جس کے لئے باقاعدہ ایک حکمت عملی اور منصوبہ بندی اختیار کی گئی۔

گویا خودکشی کرنے کے نمایاں طریقہ کار ایک طرف تو اپنے اپنے علاقوں/ممالک کے دستور اور عمومی رجحان سے وابستہ ہوتے ہیں تو دوسری طرف خودکشی کرنے والے کی فوری ذہنی حالت اور کیفیت کے بھی ترجمان ہوتے ہیں۔

خودکشی، انسانی زندگی اور مذہب کا کردار :

اِنسانی زندگی اپنی نشوونما کے حوالے سے ایک مخصوص سماجی نظام کی متقاضی ہوتی ہے۔اس مخصوص سماجی نظام میں معاشرت، معیشت، سیاست اور ادب کے ساتھ ساتھ مذہب کا بھی ایک انتہائی اہم کردار اور اہمیت ہے۔اِنسان کے ہر فعل کے پیچھے کسی نہ کسی حوالے سے اُس کا سماجی پس منظر موجود رہتا ہے۔خودکشی بھی ایک اِنسانی فعل ہے۔یہاں ضرورت اِس بات کی ہے کہ اُن مخصوص عوامل کو دیکھا جائے جو مذہب کے حوالے سے کسی سماج پر اور سماج کے حوالے سے انسانی سوچ اور افعال پر اثرانداز ہوتے ہیں۔دیکھنا یہ ہے کہ مذہب کی موجودگی میں یقین محکم کی کون سی گرہیں اِنسان کی روحانی دُنیا سے بندھ جاتی ہیں۔اور اِس کی عدم موجودگی میں کون سے رابطے اور سلسلے یہاں ٹوٹتے اور بکھرتے ہیں۔

انگریزی زبان میں مذہب کے لئے Religion کا لفظ استعمال ہوا ہے۔جو لاطینی زبان سے ماخوذ ہے۔جس کا مفہوم عقیدہ اور پوجا پاٹ کا نظام ہے۔اسلام نے مذہب کے لئے دین کا لفظ استعمال کیا ہے اور مذہب کو فطری چیز کہا ہے۔دین یا مذہب انسان کے لئے داخلی اور خارجی دونوں حوالوں سے ایک لائحہ عمل مرتب کرتا ہے۔قرآن پاک میں اِرشاد ہوتا ہے۔"اور اِس شخص سے کس کا دین اچھا ہوسکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا"۔۲۸ "آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں"۔۲۹

اِن ارشادات سے جن نکات کی نشاندہی ہوتی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا تصور، اُسی ایک ہستی کی اطاعت گزاری کرنا اور اِس اطاعت گزاری کا بڑا سبب اُس کی رحمتوں اور نعمتوں کا نزول ہے۔جس میں زندگی اُس کی سب سے بڑی نعمت ہے۔اُس کو ختم کرنا، خراب کرنا، اُسے عدم تحفظ دینا، اُس کی حکم عدولی کے ساتھ ساتھ اُس کی نعمتوں (سب سے بڑی نعمت زندگی) کو جھٹلانا بھی ہے۔دُنیا کی مختصر ترین مادی زندگی میں بھی اگر فردِ واحد کے قانون سے روگردانی کی جائے تو سوائے ہلاکت، بدامنی اور اِنتشار کے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تو خدا تعالیٰ کے ازلی وابدی قوانین کو توڑنے سے اِنسانی زندگی کی تباہی کا نظارہ کیا ہوگا یا ہوسکتا ہے، صرف اہل عقل جانتے ہیں اور اِس ضمن میں قرآن پاک میں بھی اہل عقل کا ہی لفظ استعمال ہوا ہے۔"خدا کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔یہی سیدھا دین ہے"۔۳۰

اسلام میں صرف عقیدہ اور پوجا پاٹ کا نام ہی مذہب نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کے ہر شعبے کو احکام الٰہی کے مطابق بسر کرنے کا نام ہے۔ اِس میں عقیدہ، عبادت، سیاست، معاشرت اور معیشت سبھی کچھ شامل ہے۔ مذہب دراصل فطری چیز ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مذہب ہر قوم اور نسل میں ایک مشترک امر ہے اور یہاں بھی حوالہ ''عقل والوں'' کا ہی بنتا ہے۔ جو سوچتے ہیں کہ انسان کے مذہب کی کیا اہمیت ہے۔'' Plutarch کہتا ہے کہ کسی انسان نے کوئی ایسی بستی نہیں دیکھی جس میں مذہب نہ ہو۔'' ۔۳۱ والیٹر کہتا ہے ۔'' زوراسٹر (Zoraarster) منو (Manu) سولن (Solon). سقراط (Socrates) سب کے سب ایک ہی کی پرستش کرتے تھے اور یہی فطرت ہے ۔'' ۳۲

مذہب کی ایک تعریف یہ ہے۔

> Religion, a concept which has used to. denote. The class of all religions. The common essence of pattern of all supposedly genuine religions phenomena... human religiousness in a form of life which may or may not be expressed in system of belief and practice...۔۳۳

ایک اور تعریف کے مطابق

> Religion ... belief in, recognition of, or a awakened sense of, a higher unseen controlling power or powers, with the emotion and morality connected there with ... rites or worships.... ۔۳۴

جامع نسیم اللغات میں مذہب کی تعریف اسطرح سے ہے۔'' مذہب، ایمان، عقیدہ، مذہب بدلنا، دھرم تبدیل کرنا، دوسرا مذہب اختیار کرنا، مذہب میں لانا، دین میں شامل کرنا، مذہبی، مذہب سے منسوب۔۔۔'' ۔۳۵ مذہب کسی ایک خاص قاعدے اور اصول کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بہت سے عناصر کا مجموعہ ہے۔ جو زندگی اور اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا اور ان کے لئے ایک مخصوص لائحہ عمل بھی اختیار کرتا ہے۔

مذہب اور مذہبی اقدار کی زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ مذہب سماج کے لئے کیوں ضروری ہے۔ انسان کے وجود اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں مذہب کی ضرورت اور افادیت کیونکر ممکن ہے۔ اس کی پیروی کے لئے کیا کیا اقدامات ضروری ہیں۔ آج انسان روحانی اور مادی طور پر ترقی و تنزلی کی کن منزلوں یا مراحل پر ہے۔ مذہب کا اس میں کیا کردار رہا یا ہوسکتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے مزید کئی سوالات ایسے ہیں۔ جنکا کوئی با قاعدہ جواب بنی نوع انسان کے پاس نہیں۔ اور اگر ہے تو بھی ہم اس کو ماننے، دہرانے یا پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ انسانی طرز حیات میں مذہب کا وجود، اس کا کردار بنیادی اور امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ قومی انگریزی لغت میں مذہب کی وضاحت اس طرح سے ہے۔

مذہب طریقہ، دھرم۔۔۔ کسی انسان کا کسی مافوق الفطرت۔۔۔Religion قوت

کی اطاعت، عزت اور عبادت کے لئے با اختیار تسلیم کرنے کا عمل ۔۔۔(کسی بھی چیز سے) وفاداری اور باضمیر ہونے کا عمل ۔۔۔۔۳۶

مذہب کی ایک جامع تعریف اس طرح سے کی گئی ہے۔'' مذہب زیادہ تر انفرادی بقاء پر ایمان لانے ہی کا نام ہے۔ اگر زندگی فرد کی جسمانی موت کے ساتھ ختم ہو جائے۔ تو یہ سمجھنا چاہیے کہ خدا نہیں ہے۔ مادیت کے سمندر میں ایک ناپائیدار حباب کا کیا مذہب ہوسکتا ہے۔''۔۳۷

شوپن ہار لکھتا ہے کہ'' مذہب موت کے تصور سے وابستہ ہے''۔۳۸ یعنی موت اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ مذہب کے اندر (چاہے وہ کوئی بھی مذہب ہو) اِس سے متعلق واضح اِشارے موجود ہوتے ہیں۔ ایسے اِشارے، جن سے باقاعدہ ایک منصوبہ بندی اور حکمت عملی وضع کی جاسکتی ہے۔

زرتشت کی مذہبی کتاب ''اوشا'' میں تفصیل کے ساتھ اِن سزاؤں کا ذکر ہے جو حیات بعد موت اپنے اعمال کے باعث انسان کو درپیش ہوں گی۔ گویا اِنسانی زندگی میں مذہب کا کردار اور اِس کی ضرورت بنیادی اور کلیدی ہے۔

تمام مذاہب عالم میں خدا کی ہستی کا تصور پایا جاتا ہے۔ گویا مذہب کی پہلی غرض اللہ تعالیٰ پر یقین پیدا کرنا ہے۔ فطرت کی دوسری اقتضاء مادی ہے جس میں خاندان، معاشرہ، حکومت اور بین الاقوامی اُمور شامل ہیں۔

اِنسان کی فطرت میں خدا کی ہستی کا تصور مرکوز ہے۔ مگر سزا و جزا اور زندگی بعد موت کا علم سوائے مذہب کے کہیں سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ انسان کی اپنی عقل اِس قدر دور کے نتائج کو بھانپنے سے قاصر ہے۔ اِنسان کا مادی وجود مادے کے حصول اور مادے کی ضرورت تک تو اِسے پہنچا سکتا ہے۔ لیکن داخلی اور روحانی زندگی کی ضرورتیں صرف مذہب کے حوالے سے ہی تکمیل کو پہنچ سکتی ہیں۔

> مذہب کو سمجھنے کے لئے فقط براہِ راست مذہبی شعور ہی کا مطالعہ کام کرسکتا ہے۔ مذہبی وجدانات یا افکار کو جانچنے کا منصفانہ اور صحیح طریقہ یہی ہوگا کہ اِن کے اندر تین باتیں دیکھی جائیں۔ اول یہ کہ براہِ راست اِن میں کہاں تک نورِ صداقت کا احساس ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ فلسفیانہ معقولیت اِن میں کہاں تک پائی جاتی ہے اور تیسرے یہ کہ اخلاقی زندگی میں وہ کہاں تک معاون ہوسکتی ہیں۔۔۔۔۳۹

مذہب زندگی کے کسی ایک حصے کی ضرورت پوری نہیں کرتا۔ اِس کا تعلق کسی ایک عنصر سے نہیں۔ یہ کلیت ہے۔ تمام زندگی کے داخلی و خارجی پہلوؤں سے وابستہ ہے۔ مذہب کی روح اِنسانی عقیدوں کو زندہ رکھتی ہے۔ اِس کے بغیر فرد ہو یا قوم، بے سمت اور بے منزل ہو جاتے ہیں۔ حرکت و عمل اور قوتِ تخلیق کی شناخت باقی نہیں رہتی۔ ایک ایسا جانور جو بے سمجھے چلا جاتا ہے۔ صحیح اور غلط کی تمیز کے بغیر۔ وہ سُدھایا نہیں گیا۔ جس کی لگام کسی مالک و مختار ہستی کے ہاتھ میں نہیں۔ جو کہیں اپنی فطری جبلتوں اور گرم و سردِ زمانہ کے ہاتھوں بے بس و بے اختیار ہو جاتا ہے اور کہیں منہ زور و سرکش۔ گویا مذہب کا وجود فرد کے سدھائے جانے اور تربیت کرنے کا نام بھی ہے۔ چنانچہ مذہبی زندگی صحیح و وسیع معنوں میں یہ ہے کہ'' اِس زندگی کا مدار ایمان بالغیب پر ہے۔۔۔ ہم اِس غیر مرئی عالم کے ساتھ اپنا رابطہ صحیح طور پر اور اُستوار رکھیں۔ اِس ایمان اور اس سے سرزدہ عمل کا نام مذہبی زندگی ہے۔''۔۴۰

گویا مذہب مخصوص مادی، اِخلاقی و روحانی قاعدوں اور ضابطوں کے ساتھ جینے کا مہذب عمل ہے جو موت اور

موت کے بعد کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔

اہم مذاہب عالم کے حوالے سے تصورِ موت اور خودکشی:

دیکھنا یہ ہے کہ موت بذات خود مذاہب عالم کے حوالے سے کیا ہے۔

In Christianity:

Death is a penance to all sins. It gives Salvation...۔[۴۱]

کنزرویٹو کرسچئن کہتے ہیں کہ "...Suicide involves self-murder, any one who commits this sin goes to hell..."۔[۴۲] لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ بہت سی Biblical figures نے خودکشی کو مستحسن اقدام جانتے ہوئے اِس راستے کا انتخاب بھی کیا۔ اِس کا ایک حوالہ اور پس منظر حضرت عیسیٰ کا پھانسی پانا بھی ہے۔ اِس سے ایک طرح یہ خیال اور رائے بھی تقویت پا گئی۔ کہ

> ... Christians who choose suicide are still granted Eternal life... People who choose suicide are severely distressed and that the loving God of Christianity can forgive such an act.۔[۴۳]

اِسی طرح اِس سے یہ مراد لی جانے لگی کہ حضرت عیسیٰؑ کے حوالے سے جو خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف حیاتِ ابدی پاتا ہے بلکہ اللہ کے پسندیدہ بندوں میں بھی شمار ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اِس کا اطلاق ہم مکمل اور مجموعی طور پر تمام Christianity کے حوالے سے نہیں کر سکتے۔

عیسائیت مجموعی طور پر خودکشی کی مخالفت کرتی ہے اور یہ کہ زندگی خدا کی امانت ہے۔ اِس کی حفاظت کرنا مقدم ہے۔ جہاں تک Catholicism کا تعلق ہے۔

> ".....Suicide has been considered a grave and sometimes moral sin."۔[۴۴]

اِن کی بحث یہ ہے کہ اِنسان کی زندگی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اِس کو ختم کرنا حکم الٰہی کی نافرمانی ہے۔ جہاں تک ہندومت کا تعلق ہے۔ اِس میں خودکشی ایک منفی اِقدام تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن چند مخصوص حالات میں یہ قابل قبول بھی ہے۔ مثلاً

☆ اپنے دھرم کے مطابق روزے کی حالت میں مرنا۔ اِس طریقہ کار کو یہاں Prayepavesha کہتے ہیں۔ اِس کے لئے بہت سی ریاضت اور خود اعتمادی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں فرد پہلے اپنی تمام دُنیاوی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ خود کو خدا سے قریب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح

ہندوؤں کے ہاں بعض حالات میں خودکشی کی اجازت تھی۔ بیوہ اپنے شوہر کی وفات پر آگ میں جل مرتی تھی۔ جو لوگ غربت، بیماری، بڑھاپے یا نقص اعضاء کی وجہ سے تنگ آ جائیں تو اِن کو بھی آگ میں جل کر مرجانے کی اجازت تھی۔ اُونچی ذات کے

لوگ آگ سے خودکشی نہیں کرتے تھے۔صرف ویش اور شودر آگ سے مرتے تھے۔
لیکن اگر برہمن اور کھشتری خودکشی کرنا چاہیں۔تو انہیں یہ حکم تھا کہ کسوف یا خسوف
کے وقت کسی طریقہ سے خودکشی کر لیں۔یا کسی شخص سے کہہ کر اپنے آپ کو گنگا میں غرق
کرا لیں۔گنگا اور جمنا کے سنگم پر بڑ کا ایک درخت ہے۔جس کو پریاگ کہتے ہیں۔
برہمن اور کھشتری اِس درخت پر چڑھ جاتے اور وہاں سے گنگا میں کود کر خودکشی کر
لیتے۔۔۴۵

برہموں میں دو اصول بھی دیئے گئے ہیں۔جو مذہبی طور پر خودکشی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ایک تو یہ کہ انسان کی طرف سے حقیقی قربانی اس کی اپنی ہی ہے۔مہابھارت میں البتہ خودکشی کو خالصتاً شیطانی فعل کہا گیا ہے۔مگر اِس کے باوجود ''دریودھنا'' نے مرن بھرت کے ذریعے جان گنوائی۔اس ضمن میں معین اختر کا کہنا ہے۔

In Hinduism:

Death is considered as the annihilation of soul and body, as a phase in the way to metamorphosis for transmigration of soul into anothor body. Death follows the reconstruction of soul and body in another fashion to exert itself after cremation.-۴۶

جبکہ دین اسلام میں موت کا حوالہ بہت منفرد اور جدا ہے۔یہاں موت زندگی کی نمو پذیری ہے۔یہ بالیدگی کا نام ہے۔جی کر دوبارہ زندہ ہونے کا نام ہے۔ایک نئی حیات اور اس سے وابستہ اِسرار و رموز کا عمل ہے۔اِس کے حوالے سے اِنسان کو فنا نہیں بلکہ بقائے دوام حاصل ہے۔اپنے دُنیاوی اعمال کو 'مختارِکل' کے ساتھ پیش کرنے اور جوابدہی کے مرحلے کا نام ہے۔اس طرح موت یہاں اپنی فطری وقوع پذیری میں اپنے اندر بڑی سچائی، رفعت اور معنویت رکھتی ہے جو صرف اور صرف قادرِ مطلق کے حکم کے تابع ہے۔''اور کسی شخص میں طاقت نہیں کہ خدا کے حکم کے بغیر مر جائے (اُس نے موت کا) وقت مقرر کر کے لکھ دیا ہے''۔۴۷ اور مقررہ وقت سے پہلے اِس کے حصول کی کوشش گویا احکام اِلٰہی کے ازلی و ابدی قوانین کو توڑنے کے موافق ہے۔اور اُس کی نافرمانی کے ساتھ ساتھ یہ اِنسانی وجود کے کمزور ایمان یا ایمان کے خاتمے کا اظہار بھی ہے۔''تم کہیں رہو۔موت تو تمہیں آ کر رہے گی۔خواہ بڑے بڑے محلوں میں رہو''۔۴۸ یعنی ہر ایک کے لئے موت لکھ دی گئی ہے لیکن وقت سے پہلے اِس کو پانا یا پانے کے راستے تلاش کرنا کسی بھی طور یہاں جائز نہیں۔''ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر آزماتے ہیں۔اور تم ہماری طرف ہی لوٹ کر آؤ گے''۔۴۹

گویا سختی، آسودگی اور آزمائش کے الفاظ یہاں گہری معنویت کے مظہر ہیں۔اِسی آزمائش سے گزرنا عالی ہمتی اور انسانیت کی معراج ہے۔نہ یہ کہ اِن سے گھبرا کر زندگی کا خاتمہ کیا جائے۔'' اور موت کی بے ہوشی حقیقت کھولنے کو طاری ہوگئی''۔۵۰

اِس آیت کریمہ میں موت کی بے ہوشی وسیع معنی رکھتی ہے۔گویا ظاہری دُنیا سے اِنسان کی صرف آنکھیں موند

گئیں، وہ ختم نہیں ہوا۔اور یہ بے ہوشی ملی ہی اِسی لیے ہے کہ اُس پر نئے اِسرارِ نئی زندگی کے رموز منکشف ہو سکیں۔ مثلاً اِس آیت کریمہ میں مزید وضاحت اس طرح سے ہے۔ ''کہ تمہاری طرح کے اور لوگ تمہاری جگہ لے آئیں۔ اور تم کو ایسے جہان میں، جس کو کہ تم نہیں جانتے، پیدا کر دیں''۔۵۱ کہ اِنسان اِس جہاں سے آگے نئے جہان (جس کا ابھی وہ علم نہیں رکھتا) کی طرف چلتا جاتا ہے۔ایک بہاؤ اور تسلسل ہے۔لیکن پھر یہ بھی کہا کہ اہل علم کے پاس اِس کا علم ہے۔

ترجمہ:

'' جو سمجھتے ہیں۔ کہ آخر کار انہیں اپنے رب سے ملنا اور اِس کی طرف پلٹ کر جانا ہے''۔۵۲ موت سے متعلق رسولؐ نے فرمایا کہ ''وہ فنا اور نیست ہو جانا نہیں ہے۔ بلکہ ایک دوسری زندگی کا آغاز اور ایک دوسرے عالم کی طرف منتقل ہو جانا ہے۔ جو اللہ کے ایمان والے بندوں کے لئے نہایت ہی خوشگوار ہوگا۔ اور اِس لحاظ سے موت مومن کا تحفہ ہے''۔۵۳ موت کے بعد جی کر دوبارہ اُٹھنے کا عمل قرآن پاک میں جگہ جگہ اِرشاد فرمایا گیا ہے۔اس مرحلے پر اِنسان کے لئے خوف و خطر اور خسارہ نہیں۔ بلکہ اس کے لئے تیار رہنے اور اعمالِ صالح جمع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اِس سے ایک تخلیقی عمل اور جوہر وابستہ ہے۔ترجمہ: ''وہی زندے کو مردے سے نکالتا اور وہی مردے کو زندے سے نکالتا ہے۔ اور وہی زمین کو اِس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔اور اِسی طرح تم دوبارہ زمین میں سے نکالے جاؤ گے''۔۵۴

اسلامی شریعت میں خودکشی کا فعل ناجائز ہے۔ حضورؐ کی احادیث کے حوالے سے حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں۔

> رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ جس شخص نے اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا کر مارا، اِس کو دوزخ میں بھی گرایا جاتا رہے گا۔ اور جس شخص نے زہر کھا کر جان دے دی، دوزخ کے اندر بھی زہر کا پیالہ اِس کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور جس شخص نے اپنے آپ کو لوہے کے کسی ہتھیار سے مارا، دوزخ میں وہ ہتھیار اِس کے ہاتھ میں ہوگا۔۔۔۵۵

گویا دینِ محمدیؐ میں خودکشی عمداً اور خطاءً دونوں حرام ہیں اور خودکشی کے فعل کو کسی صورت جائز نہیں سمجھا گیا۔ اور نہ کسی انتہائی مجبوری کی حالت میں بھی اس کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔

اِن تمام اِرشادات میں جن اہم نکات کی نشاندہی ہوئی وہ یہ کہ موت برحق ہے۔ اِس سے کسی کو فرار نہیں۔ موت کا وقت مقرر ہے۔موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ نئی زندگی کی طرف پیش قدمی ہے۔موت دُنیاوی زندگی کے اعمال کی جوابدہی کا نام ہے۔اس طرح موت کا تصور کاروانِ حیات و کائنات میں بہت مثبت، افادی اور تعمیری نقطہ نظر کا حامل ہے۔ اِس کی بدولت اِنسان کے اندر زیادہ سے زیادہ فعال، مستعد اور باعمل رہنے کا تصور اُبھرتا ہے۔ موت کا راستہ متانت اور احتیاط کا حامل ہے۔ جو اِنسانی شعور کو اعتدال و توازن کی راہ پر گامزن رہنے میں معاون و مددگار ہوتا ہے۔ گوتم بدھ کے لئے کہا جاتا ہے کہ ''گوتم اِنسانی زندگی کے تین حسرت ناک پہلوؤں بڑھاپا، بیماری اور موت سے بہت متاثر ہوا۔ اور دِل سے دُنیا کی محبت کی آگ سرد ہوگئی''۔۵۶ مجموعی طور پر مذاہب عالم کسی نہ کسی حوالے سے زندگی اور موت کو داخلی اور روحانی پہلو سے دیکھتے ہیں۔

اور اس ضمن میں یہ بات طے ہے کہ ''اِسلام اور دیگر الہامی مذاہب نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے''۔۵۷ لیکن اِس کے باوجود ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سوائے اسلام کے دیگر مذاہب میں خودکشی کو کسی نہ کسی وقت اور کسی نہ کسی حوالے سے

درست اور مثبت اقدام بھی کہا گیا ہے۔

جہاں تک بدھ مت کا تعلق ہے، اِن کے مطابق ہمارے حال پر ماضی کے گہرے اثرات ہوتے ہیں۔ چنانچہ جو شخص آج جو کچھ کرتا ہے۔ اُس کے اثرات آنے والے کل پر ظاہر ہوتے ہیں۔ گو اِس زندگی میں ہو یا اگلی زندگی میں۔ یہ گوتم بدھ کی تعلیمات میں شامل ہے۔ اِسے Karma کہا جاتا ہے۔ وہ جسم، زبان اور ذہن کا شعوری عمل ہے جس کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ اِس عقیدے کے مطابق ایک شخص کے مسائل اُس کے ماضی کے منفی اعمال سے جنم لیتے ہیں۔ اِسے حوالے سے وہ جسے Samsara کہتے ہیں۔ وہ پیدائش اور موت کا ایک Cycle ہے۔ چنانچہ یعنی زندگی میں حالات سے غیر مطمئن ہونا اور ہر فرد کو لمحہ ُ وجود کی اصل فطرت کا احساس ہونا ضروری ہے۔ اِسے Nirvama کہا جاتا ہے۔ زندگی سے متعلق اِس صورتحال اور نقطہ نظر میں جب اور جہاں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ فرد کا زندگی سے متعلق رویہ بھی اعتدال و توازن کا حامل نہیں رہتا۔ اِس صورت حال میں اگر فرد کی زندگی اور اس کا طرزِ عمل خودکشی کے راستے پر منتج ہو۔ تو اِسے یہاں منفی اور قابلِ مذمت فعل کہا گیا ہے۔

> For Buddhists, since the first precept is to refrain from the destruction of life, including oneself. Suicide is clearly considered a negative form of action.-۵۸

لیکن اِس کے باوجود ایشیا کا ایک قدیم نظریہ Seppuku (Hara-Kiri) نے مایوس بدھ ازم کو خودکشی ایک باعزت موت کے طور پر قبولنے پر آمادہ کیا۔ جبکہ دورِ جدید میں تبت کے رہنے والے Monks نے چین کے مقبوضہ علاقوں میں اِسے اِنسانی حقوق کے خلاف قرار دیا۔

جین مت اور بدھ مت میں خودکشی مذہباً ممنوع قرار دی گئی ہے کیونکہ اِس فعل سے اِن کے پانچ بنیادی عقائد میں سے ایک پر زد پڑتی ہے کہ ''کسی زندہ چیز کو مت مارو''۔۵۹ تورات اور انجیل میں خودکشی کے حوالے سے ایسے واقعات اور حالات کی نشاندہی ملتی ہے جس میں کوئی کردار خودکشی کرتا ہے۔ جن کے بارے میں کبھی کبھار کہیں کہیں پسندیدگی کا پہلو بھی موجود ہے۔ مثلاً توریت کی کتاب سموئیل نمبر 1 کے باب نمبر ۳۱ میں ساؤل اور اِس کا ساتھی عزتِ نفس اور خود کو مزید تکلیف سے بچانے کی خاطر مرے۔ یہاں خودکشی کی موت پر تحسین و آفرین کا پہلو موجود ہے۔ انجیل اور تورات کے اِن واقعات کو اگر صرف تاریخی حوالے سے لیں، تو اِن الہامی کتابوں کو ہم راہِ ہدایت کے ضمن میں ہی لیں گے۔ اور محتاط انداز میں کہا جا سکتا ہے کہ توریت اور انجیل کے ماننے والوں کے لئے خودکشی اگر صریحاً جائز نہیں تو مخصوص حالات میں جائز تصور کی گئی ہے۔

قدیم یونان کے ایک مخصوص نظریہ پر ایمان رکھنے والی قوم سٹائیک (Stoic) یا اِن کے افکار سے مطابقت رکھنے والے لوگوں کے نزدیک خودکشی صریحاً جائز ہے۔ بلکہ پسند کیا جانے والا فعل ہے۔ اِن کے عقیدے کے مطابق عقل مند آدمی کے لئے زندہ رہنا یا مرجانا ایک ہی فعل کے دو نام ہیں۔ اِس میں اچھائی اور برائی کا تصور پیدا کرنا جائز نہیں۔ یہاں یہ فیصلہ کرنا آدمی کے اختیار میں ہے کہ مخصوص حالات میں زندہ رہنا بہتر ہے یا مرجانا۔ جب کسی شخص کی زندگی کے متعینہ مقاصد پورے نہ ہو رہے ہیں تو اِس نقطہ نظر کے حامل لوگوں کے نزدیک '' خودکشی کے ذریعے مرجانے میں کوئی مضائقہ نہیں''۔۶۰ یہاں پھر اِس نقطہ نظر کو تقویت ملتی ہے جس کے تحت فرد اپنے ہر قول و فعل پر قادر ہے۔ نہ صرف زندگی

اور موت کے بارے میں بھی فیصلہ کر سکتا ہے بلکہ وہ اس کا حق اور اختیار رکھتا ہے۔

روح اور جسم کے باہمی تعلق سے متعلق فکرِ انسانی کا تجسس:

خودکشی وہ انسانی فعل ہے۔ جس کے اثرات عملی طور پر انسان کے خارجی، ظاہری اور مادی جسم پر مرتب ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ انسان کے ظاہری جسم کا خاتمہ اور خاتمے کی خواہش ہے۔ یہ خواہش کیوں ہے؟ ۔۔۔ یا کیوں ہو؟ ۔۔۔ کیا یہ اپنے آپ کو پانے کی خواہش ہے؟ خود کو جاننے کی تمنا ہے؟ یا خود کو اس حوالے سے تسخیر کرنے کی آرزو ہے؟ یا یہ ایسا سفر ہے جو اپنی ذات سے شروع ہو کر اپنی ذات پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ان عوامل کی روشنی میں دیکھنا یہ ہے کہ انسانی ذہن اپنے مادی وجود کے حوالے سے کیا سوچتا ہے اور اس سوچ کی سمت کیا رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ضمن میں ابتداء ہی سے انسانی فکر متحرک و فعال رہی ہے اور جب ''مادے'' کے بارے میں سوال اٹھتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ تو یہیں ایک اور سوال بھی ابھرتا ہے کہ روح کیا ہے۔؟

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ روح اور جسم کے باہمی تعلق، ان کی حقیقت اور اہمیت پر غور و فکر کرنا صوفیا اور دیگر صاحب بصیرت ہستیوں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ مذہب، سائنس، تاریخ اور ادب غرض کہ علم کی شاخ اور ہر میدان میں اس موضوع کے بارے میں غور و فکر ہوتا رہا ہے۔

روح کا لفظ ریح سے ہے۔ یعنی ہوا اور ہوا سے زندگی حاصل ہوتی ہے۔ روح بدن میں زندگی کا کرنٹ بن کر دوڑتی ہے اور ایک خاص وقت کے بعد جب زندگی کی معیاد پوری ہو جاتی ہے۔ تو روح اپنے اس محل سرائے کو چھوڑ کر پرواز کر جاتی ہے۔ اور جسم بے معنی بے جان اور بے حیثیت ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہاں انسانی فکر اور متجسس ہو جاتی ہے۔ فنا کیا ہے اور بقاء کیا؟ دائمی کیا ہے اور فانی کیا؟ ۔۔۔ اور پھر مزید کئی سوالات اس موضوع کے آس پاس انسانی فکر کا ایک ہالہ بناتے جاتے ہیں۔

روح کیا ہے۔ اس کا وجود کیا ہے۔ اس کا آغاز اور انجام کیا ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ یہ اور اس جیسے تمام سوالات نے انسان کے اندر تجسس اور بے چینی کو جنم دیا ہے۔ اس سوال پر بہت غور و خوض کرنے کے بعد بھی انسان کو اس سوال سے کبھی چھٹکارا نہیں مل سکا ہے۔ قرآن پاک میں روح کو امرِ ربی کہا گیا ہے۔ ان آیات مقدسہ کے مطابق

> ''روح میرے رب کے حکم سے ہے۔'' ''روح میری مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے۔'' آپؐ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے۔ روح اللہ کی مخلوق ہے اور تمہیں تھوڑا ہی علم دیا گیا ہے۔ ۔۶۱
>
> اللہ تعالیٰ نے روح کے بارے میں ایک اسرار قائم کر رکھا ہے اور انسان اس اسرار کا پردہ چاک کرنے کی طاقت سے قاصر ہے۔ وہ جتنا چاہے سر پٹخ لے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں سر کر ڈالے۔ صحراؤں کی خاک چھان لے۔ علم کے حصول میں ایک حد سے زیادہ کبھی وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ۔۶۲

قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ''اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ میرے پروردگار کی ایک شان ہے اور تم لوگوں کو (بہت ہی) کم علم دیا گیا ہے۔ ۔۶۳

''جب اس کو (صورت انسانیہ میں) درست کرلوں۔ اور اس میں (اپنی بے بہا چیز یعنی) روح پھونک دوں۔ تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا''۔۶۴ مراد یہ ہے کہ روح قدرت کی ایک شان ہے۔ اس کی ایک صفت ہے۔ جس طرح خدا کی ہستی اور اس کی شان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح روح کے بارے میں جتنا بھی غور و فکر کیا جائے۔ اس کا احاطہ ممکن نہیں اور ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ انسان کے پاس اسے جاننے کا بہت ہی کم علم ہے۔ گویا یہ علم اور اس کا حصول اس کی دسترس سے باہر بھی ہے۔ ایک اور وضاحت بھی یہاں موجود ہے کہ روح کے باعث ہی انسان معتبر ہوا۔ گویا روح صورت انسان میں علم و شعور کا بلند مقام اور فکر کی اعلیٰ ترین معراج ہے۔ جو اپنے ازلی و ابدی اسرار کا جہاں رکھتی ہے۔

سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کو رب العالمین کہا گیا ہے۔ رب کا لفظ استعمال کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کسی کی شراکت نہیں ہے۔ وہ مادہ اور روح دونوں کا رب ہے۔ روح کی مادے پر بالادستی مسلم ہے۔ یہ ایک ابدی اور لافانی قوت ہے۔ انبیاء کرام اور بزرگان دین کا اس حوالے سے غور و فکر کی حالت میں رہنا بہت واضح ہے۔

یہ روح اور روحانی زندگی کا حصول جس میں ابدیت ہے۔ وصال ہے، دوام ہے۔ جز و اور کل کے مسائل ہیں۔ قطرہ اور سمندر کی واردات قلبی ہے۔ بزرگان دین کا یہ عمل، یہ سوچ، اس پر چلہ کشی، ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ ایسی ہی چلہ کشی اور غور و فکر کا مادہ صاحب بصیرت اور دانشوروں کے ذہن میں بھی چنگاریاں بن کر بھڑکتا رہا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ صاحب بصیرت کسی دین و مذہب کی کوئی دستار بند شخصیت اور ہستی ہو۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی ودیعت شدہ انسانی ذہن کی بے پناہ تخلیقی قوتوں کا گوہر نایاب بھی ہے۔ جو ہمہ وقت غور و فکر کی حالت میں ریاضت کی بھٹی سے حیات و کائنات کے در کھولتا رہتا ہے اور کبھی شدید ناگزیر حالات میں جسم کے مادی اور فانی خول سے نکل کر روح کے ابدی سفر کی خواہش اور تلاش میں نکل جاتا ہے۔ یہاں پھر کسی مذہب اور دنیاوی قاعدے کی تخصیص نہیں رہتی۔ جو جتنا بڑھا، آگے نکل گیا والی بات بن جاتی ہے۔ اس حوالے سے فلسفہ و ادب کی دنیا میں روح اور جسم کے حوالے سے غور و فکر کی ایک دنیا آباد دکھائی دیتی ہے۔ جس میں روح کو مقدم، بالاتر اور ابدی جانتے ہوئے دوسری دنیا اور موت کی خواہش بھی زور پکڑ جاتی ہے۔

روح اور جسم کی حقیقت اور اہمیت کے بارے میں ہمیں قدیم یونانی فلاسفروں کے ہاں بھی مختلف نظریات ملتے ہیں۔ مثلاً انیکسا غورث نے روح کے بارے میں کہا کہ یہ ایک ایسی قوت ہے جو حیوانات اور نباتات اور ہر وجود کے اندر جاری و ساری ہے۔ فیثا غورث کا کہنا ہے کہ انسان کا جسم تو فانی ہے۔ لیکن روح کو فنا نہیں ہے۔ سقراط نے اس ضمن میں کہا کہ روح ابدی حقیقت کا نام ہے۔ روح کیلئے اس نے متبادل لفظ ''نفس'' استعمال کیا۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ جسم مقررہ مدت پوری کرنے کے بعد ختم ہوجاتا ہے۔ مگر روح کی زندگی دائمی ہے۔ افلاطون کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اعلیٰ اخلاق روح کے باعث ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک روح اور جسم دو الگ الگ عناصر ہیں۔ ارسطو نے نفسیات کو روح کا علم کہا۔ البتہ وہ روح کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک روح حیوانی اور دوسری روحِ انسانی، روحِ حیوانی کو نچلے درجے کی روح کہتا ہے اور اعلیٰ درجے کی روح اس کے خیال میں ذہن ہے۔

ارسطو کے بعد بھی کئی مفکرین نے روح اور جسم کے درمیان ایک خط کھینچا۔ مثلاً آگسٹائن کے نزدیک جسم فرد کا کمتر پہلو ہے۔ جبکہ سینٹ تھامس اکیونس کا نقطہ نظر ان سے قدرے فرق ہے۔ ''اس کا خیال تھا کہ انسان محض ذہن اور جسم کا نام نہیں۔ بلکہ وہ ذہن اور جسم کے مرکب کا نام ہے۔''۔۶۵ گویا روح کے حوالے سے جسم کی اہمیت اور حرکات و سکنات کو بھی قابل توجہ جانا گیا۔ اس سے انسانی شخصیت کی تکمیل اور اکائی کا تصور بھی اہمیت کا حامل بنتا ہے۔

مسلم مفکرین نے بھی اس ضمن میں مختلف خیالات وافکار پیش کئے۔ انہوں نے قرآنی تعلیمات اور احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے انسانی نفس اور روح کا مطالعہ کیا۔ الکندی نے انسانی روح کو ایک سادہ، غیر فانی اور غیر مرکب قرار دیا۔ یہاں روح جسم سے الگ اور جدا ہے۔ جسم کا تعلق خارجی حوالے سے ہے۔ جبکہ ابن سینا کا خیال ہے کہ "روح جسم سے برتر ہے۔ روح غیر فانی ہے۔ دماغ جسم کو کنٹرول کرتا ہے۔۔۔ فارابی کے نزدیک روح ایک آزاد جوہر ہے۔ جس کا انسانی جسم کے ساتھ عارضی تعلق ہے۔" ۔۶۶

امام غزالی نے روح، قلب اور نفس کو قوت کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان تمام مفکرین اور سائنس دانوں نے روح کے علم کو نفسیات کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی اور جہاں تک نفسیات بطور ذہنی علم (Psychology as a Science of mind) کا تعلق ہے۔ ماہرین نفسیات نے نفسیات کو ذہن کی سائنس قرار دیا۔ لیکن یہاں بھی روح ذہن کی طرح غیر مرئی شے ہے۔ جس کا براہ راست مشاہدہ ممکن نہیں۔ ذہن کو ذہنی اعمال سے الگ شے نہیں کہا جا سکتا۔ نفسیات کی زبان میں ان حرکات وسکنات کو کردار کا نام دیا جاتا ہے۔ چنانچہ نفسیات ان کا مشاہدہ کردار ہی کے ذریعے کر سکتی ہے۔

روح درحقیقت انفرادی روح پر موت طاری ہونے کے باوجود خدائی کی حیرت انگیز وحدت اور کُل میں زندہ ہوتی ہے۔ چمکتا سورج جس طرح ہر تاریک چیز کو منور کر دیتا ہے۔ یہی حالت روح کی بھی ہوتی ہے۔ جب وہ خدا سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ صوفی اور صوفی ازم سے متعلق جو واردات قلبی کے انکشافات اور اسرار و رموز ہیں۔ وہ ہر دور، ہر قوم اور انسان میں کسی نہ کسی حوالے سے موجود رہے ہیں۔

> صوفی کی معراج یہ ہے کہ انسان کی انفرادی روح اور ہستی مطلق کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ رہے۔ ایسی حالت میں انسان خدا کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے تمام مذاہب کے صوفی اس بارے میں متفقہ رائے رکھتے ہیں۔ ہندو مت میں، نو فلاطونیت میں، اسلامی تصوف میں، عیسوی سریت میں۔۔ ہمیں اسی یقین و وجدان کی تکرار ملی ہے۔ اسی لئے صوفیانہ لٹریچر ہر زمانے اور ہر قوم میں اساسی طور پر یکساں نظر آتا ہے۔ دین و وطن اور قومیت کا فرق اس پر اثر انداز نہیں ہوتا۔۔۔ ۶۷

مفکرین عالم (کسی مذہب کی تخصیص کے بغیر) زیادہ تر اسی نکتے پر متفق ہیں۔ کہ روح ابدی اور لافانی ہے۔ سقراط کے نزدیک

> The soul is entirely indissoluble or nearly so... the soul is most like the divine and immortal and simple and unchanging. ۶۸

روح سے متعلق متعدد کتابوں کے مصنف دیپک چوپڑہ اپنی کتاب "کامیابی کے سات روحانی قانون" میں لکھتا ہے۔ روح معلومات کا ایک متحرک فیڈل ہے۔ جو مسلسل تبدیل ہوتا رہا ہے۔ چونکہ یہ جسم میں رہتی نہیں۔ لہٰذا جسمانی موت سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جسم کو تو یہ صرف اپنے ہونے کے اظہار کے طور پر استعمال کرتی ہے۔

روح کے ابدی ہونے اور جسم کے فنا کا تصور مختلف ادیبوں کے فن اور ان کے مختلف کرداروں کے حوالے سے بھی

اجاگر ہوتا ہے۔ مثلاً شکسپیئر کا ایک کردار کنگ جون کہتا ہے۔ "Heaven takes my soul, and England-۶۹ keep my bones." اسی بات کو مزید غور و فکر کے ساتھ اور قدرے فرق انداز میں شکسپیئر کا ایک اور کردار Hamlet اس طور سے بیان کرتا ہے "All that lives must die, passing through nature to eternity."-۷۰

گویا جسم کے خارجی وجود سے نکل کر انسان موت کی صورت حیات ابدی کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

> ای بی ٹائلر نے ۱۸۷۱ء میں چھپنے والی کتاب قدیم تہذیب Primtive culture میں لکھا ہے کہ ہر معاشرے کے لوگوں میں یہ تصور یقیناً موجود ہوتا ہے کہ عام انسان کے دکھائی دینے والے چھوئے جانے والے جسم کے اندر ایک ان دیکھی چھوئے نہ جا سکنے والی ہستی رہتی ہے۔ جسے ہم روح کہتے ہیں۔-۷۱

اور جسے ہم موت کا خوف کہتے ہیں۔ وہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ جسم اور روح اکائی کا نام ہے۔ اس اکائی کا ٹوٹنا ہی موت کے تصور کو جنم دیتا ہے۔ "The fear of death is itself evidence of the union of soul and body."-۷۲ گوتم بدھ کی تعلیمات میں بھی روح جسم سے اعلیٰ مقام کی حامل اور لافانی ہے۔ بقول گوتم بدھ:

> جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے جسم کی مثال جو کہ عناصر میں غلط ملط ہو جاتا ہے۔ اس مہمان کی سی ہے۔ جو میزبان سے رخصت ہوتے وقت اس کے گھر کے تعلقات کو زمانہ گذشتہ کی بات سمجھ کر وہیں چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن اس کی آتما (روح) نہیں مرتی بلکہ ایک اعلیٰ زندگی پاتی ہے۔-۷۳

گویا جسم اور روح کی اکائی کی جب بات ہوتی ہے تو محض اکائی سے انسان وجود کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اس وجود میں جذبات کی دنیا الگ سے اپنا ایک وجود انسانی، اہمیت اور کارکردگی رکھتی ہے۔ جذبات کی یہ دنیا مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ کوئی خانہ مذہب، اخلاق اور روحانی سلسلوں سے وابستہ ہے۔ کوئی مادہ اور دنیاوی معاملات سے متعلق، کسی میں اپنی ذات اور اس سے متعلقہ امور کا خیال اور کہیں سماج کے ضابطے اور قاعدے درپیش ہیں۔ ہر خانے کے تقاضے فرق اور اسی لحاظ سے انسانی فکر، فرائض کی انجام دہی اور اس کی ضرورت کا احساس بھی فرق ہوتا جاتا ہے۔ گویا انسانی وجود اور اس کے اندر موجود انسانی شخصیت انتہائی نازک اور حساس جکڑ بندیوں کے تاروں سے بندھی ہوئی ہے۔ یہ کردار، اس کے رویے سب کے سب ایک سسٹم کے تابع ہیں۔

> "Systems of behaviour are likeothers kinds of systems."-۷۴

ان تمام عوامل کے باعث ہی کہا جاتا ہے کہ

> Personality as having at least four elements of domains: motivation, cognition, departments and social context.-۷۵

گویا انسانی شخصیت جب ان تمام داخلی، خارجی، مادی اور روحانی عوامل اور عناصر سے تشکیل و تکمیل پاتی ہے۔ تو پھر غور و فکر، مراقبہ و مکاشفہ کا وہ عمل شروع ہوتا ہے۔ جو جسم اور روح کی الگ الگ اہمیت اور پھر ان کی اکائی پر غور و غوض کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ اسی کے باعث انسانی فکر کا ایک راستہ مادی زندگی کے در سے وابستہ ہوتا ہے اور دوسرا روح کے

اسرار کی کھوج میں نکل جاتا ہے۔اسی کھوج اور تجسس نے رفتہ رفتہ انسان خصوصاً جینئس genius کے اندر خواہش مرگ کو بھی تقویت دی اور جسم و روح کے اس رشتے کے بارے میں انسانی فکر کے تجسس اور مسلسل غور و فکر کرنے کی صلاحیت نے بلا واسطہ نہ سہی، بالواسطہ کئی حوالوں سے اس موت کو وقوع پذیر ہونے کے اسباب مہیا کئے۔اس کے لئے راستے ہموار کئے۔ جسے خود اختیاری موت (خودکشی) کا نام دیا جاتا ہے۔

خودکشی اور انسانی نفسیات کا تجزیہ:

بنیادی طور پر نفسیات ایک جدید علم ہے۔۔۔نفسیات کو انگریزی زبان میں سائیکلوجی (Psychology) کہا جاتا ہے۔یہ لفظ دو یونانی الفاظ سائیکی (Psyche) اور لوگوس (Logos) سے مل کر بنا ہے۔سائیکی سے مراد ''روح'' ہے اور لوگوس کے معنی ''علم'' کے ہیں۔یعنی روح کا علم چنانچہ نفسیات کو ابتداء میں روح کا علم کہا گیا۔
(Psychology as a Science of soul)۔۷۶

نفسیات کا علم کئی حوالوں سے ہر انسان کی انفرادیت کو سامنے لاتا ہے۔یہ علم انسان کی داخلی، خارجی، ذہنی اور فکری جہتوں کا عکاس ہے یہ اختلافی پہلو ہر انسان میں فطری طور پر موجود ہوتے ہیں۔

> Man is no exception to the rule that diversity is the most uniform phenomenon in nature. No two leaves on a maple tree are even exactly alike when accurately measured. No two people on the globe are precisely similar in Physical or mental make up. The universality of human differences is the first of many awakward facts with which scientific psychology must grapple.-۷۷

جدید نفسیات سے بہت پہلے نفسیاتی مباحث کولرج کے ہاں بھی ملتے ہیں۔بعض آراء کے مطابق وہ پہلا نفسیاتی نقاد بھی ہے۔ادبی تنقید میں لفظ سائیکلوجی اس نے استعمال کیا۔وہ جب تخیل کو اہمیت دیتا ہے تو اس کے نزدیک تخیل کا سرچشمہ لاشعور سے پھوٹتا ہے۔اس کے علاوہ گوئٹے ،شلر اور شوپن ہار کے ہاں بھی لاشعور کی بحث موجود ہے۔شوپن ہار نے پاگل پن سے متعلق جو نظریات دیئے۔وہ تحلیل نفسی میں Neorosis نیوروسس کے مترادف ہیں۔ان کے علاوہ ہربرٹ نے بھی لاشعور کی بحث چھیڑی۔کرک گارڈ جو وجودی فلاسفر تھا۔اس نے لاشعور کو اہمیت دی۔وونٹ نے لاشعور کی تخلیقی قوت پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔''گو ہمیں اس کا کوئی شعور نہیں ہوتا۔لیکن یہ لاشعوری ذہن ہمارے لئے بنانے اور تخلیق کرنے والی ایک ہستی کی مانند ہے۔جو آخر میں پکا پھل ہماری جھولی میں ڈال دیتی ہے۔'' ۔۷۸

مجموعی طور پر یہ تمام نظریات ایسے ہیں۔جنہوں نے جدید نفسیات کو بنیاد فراہم کی۔

لاشعور کو ۱۶۳۰ء میں Inwardly Sensible کے طور پر لیا گیا۔۱۶۷۸ء میں Consciousness کہا گیا۔۱۶۹۰ء میں Self Consciousness کا نام دیا گیا۔انیسویں صدی میں لاشعور کا لفظ بحیثیت اصطلاح پختہ تر ہوتا

گیا۔ لاشعور پر جرمن فلاسفر ہارٹ مان کی کتاب Philosophy of the Unconsciousness ۱۸۶۸ میں شائع ہوئی۔ فرائڈ کا کمال یہ ہے کہ اُس نے لاشعور کو باقاعدہ ایک علم سائنس اور زندگی کی تکمیلی صورت میں لیا۔ شارکو اور برائر کے ساتھ مل کر اُس نے تحلیل نفسی پر کام کیا۔ اِنسانی شخصیت کے کئی داخلی گوشے اور جہتیں پردۂ ظہور میں آئیں۔ اِس حوالے سے فن اور فنکار کا ایک مخصوص رشتہ اور تعلق قائم ہوا۔ خوابوں اور اِنسانی زندگی میں اِس کے وجود اور اہمیت پر اُس کی کتاب Interpretation of Dreams جو ۱۸۹۹ء میں لکھی گئی کو بہت شہرت ملی۔

فرائڈ نے انا کو شعور کی نمائندہ کہا۔ اور اِڈ کو لاشعور کی۔ وہ کہتا ہے کہ انا کو جب خارجی مشکلات کا سامنا ہو اور اُن سے متصادم ہو تو اِنسان کا خارج سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اور اُس سے ذہنی نفسیاتی اور داخلی بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اُس نے بحیثیت ایک معالج اِنسانی ذہن اور شخصیت کی اُن کارکردگیوں کو دیکھا جن کے پس پردہ لاشعوری محرکات موجود ہوتے ہیں۔ اِنسانی خواہشات اُن کا عمل ردِعمل بالواسطہ یا بلاواسطہ اُنہی سے وابستہ ہوتا ہے۔ اِس ضمن میں فرائڈ جو اُصول وضع کرتا ہے وہ اِن اصولوں کی مدد سے فن اور فنکار تک پہنچنے کا راستہ دِکھاتا ہے۔

بقول ڈاکٹر سلیم اختر ''فرائڈ نے ادب ونقد کی تعریف میں پہلی مرتبہ تخلیقات کو لاشعوری محرکات کا ثمر قرار دیتے ہوئے اِن کے حوالے سے تخلیق کار کی شخصیت کرداری میلانات اور بالخصوص تخلیقی محرکات پر روشنی ڈالی''۔۷۹ وہ جب تحلیل نفسی یعنی شخصیت اور ذہن کی لاشعوری کارکردگی جو ایک سائنس ہے کا ذکر کرتا ہے تو اس میں جنس اور اس کے متنوع مظاہر اہم ترین کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ فرائڈ نے تحلیل نفسی سے جس طریقہ علاج کو دریافت کیا۔ وہ اعصابی مریضوں کے لاشعور کی دُنیا سے متعلق تھا۔ اِس کی بنیاد پر'' مذہب، ادب، کلچر، تہذیب وتمدن، فنون لطیفہ اور لاشعور کا تحلیل نفسی کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ مقبول ہوا''۔۸۰

اُس کے نزدیک ہم خارجی حقائق سے دو صورتوں میں نبٹ سکتے ہیں۔ ایک صورت جسے عملی اور مثبت کہا جا سکتا ہے۔ یہ نفس شعوری یا دوسرے الفاظ میں اَنا کا طریقہ کار ہے۔ اور اس کے برعکس جو عمل پیدا ہوتا ہے وہ خارجی حقیقت کی بجائے محض اپنی جذباتی واردات سے وابستہ رہنا اور اُسی سے اُلجھنا ہے۔ اس کی ایک واضح صورت بیداری کے خواب ہیں جیسے خیال ہی خیال میں اپنے مسائل کا حل اور خواہشات کی تسکین تلاش کرنا۔ دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ نیند کی حالت کے خواب زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں۔ جبکہ نیوراسس یا اعصابی خلل اِن سے بھی کہیں زیادہ پیچیدہ اور ناخوشگوار ہوتا ہے۔ نیند کی حالت کے خواب افسانوی اور خیالی سرگرمیوں سے بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اِنسانی ذہن خارجی حقائق کو تکلیف دہ نیوراسس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ فرائڈ نے دراصل حقیقت اور فریب دونوں کو سامنے رکھا۔ حقیقت موجود کی مظہر ہے جبکہ فریب نظر کو استحقاقی ترکیب کہہ سکتے ہیں جو ناموجود کا اظہار ہے۔ چنانچہ بنیادی اور اصل اہمیت اول الذکر کی ہے۔ اِسی سے مؤخر الذکر کی نوعیت کا تعین ہوتا ہے۔ یہی حقیقت ہے کیونکہ ہر شخص فلسفے اور علم الانسان کا مطالعہ نہیں رکھتا۔ چنانچہ خارجی حقائق اِن کا ردوبدل اِن کے اثرات بہرطور اِنسان کی شخصیت اور اِس کی داخلی دُنیا میں شدت کے ساتھ دخیل ہوتے ہیں۔

اِس لحاظ سے فرائڈ کا تصورِ موت قابل غور ہے جس پر وہ زور دیتا ہے۔ اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان لاشعوری طور پر موت کی طرف کھنچتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ شاید کوئی اس قسم کی انسانی تحریک بھی موجود ہے جو موت کو انسان کے سامنے آخری اور مطلوبہ مقصد کے طور پر پیش کر دیتی ہے۔ گو بہت سے ناقدین نے اُس کے مرگ پسند

جبلت کے عنصر کو رَدّ بھی کیا ہے لیکن اِس کے باوجود اس نظریئے کی اپنی جگہ اہمیت ضرور ہے۔ بقول لائنل ٹرلنگ "۔۔۔ مرگ پسند جبلت کے نظریات فرائڈ کے وسیع تر تصورات میں اہم ترین حیثیت کے مالک ہیں۔۔۔"۔ ۸۱

جب وہ جبلت کی بات کرتا ہے تو اُس کے نزدیک

> Each person has a group of life instincts or Eros and group of aggressive, destructive or "death instincts" called "Thanatos" from the greek word for death.-۸۲

موت اور حیات کی یہ کش مکش انسان کے اندران دونوں جبلتوں کا تصادم اِنسانی زندگی کی بقاء اور ارتقاء کو جاری وساری رکھتا ہے۔ موت کی جبلت اِس بقاء وارتقاء اور جسم وروح کی اکائی کو منتشر کرنے پر آمادہ۔ جبکہ زندگی کی جبلت اِس انتشار کو اکائی میں پرونے پر مصر۔

> Thanatos (death) struggles with Eros (the drive to life): Thanatos strives to return all organic life to its inorganic condition, but Eros continues to essemble and integrate the constituents parts into their organic unity.-۸۳

فرائڈ نے جب اِن جبلتوں کی بات کی تو اُس ضمن میں ایک واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اور وہ یہ کہ تمام والدین کی طرح ایک مرتبہ وہ اپنے اٹھارہ ماہ کے پوتے کو کھلونوں سے کھیلتے دیکھتے ہوئے محظوظ ہو رہا تھا۔ بچے کی ہر حرکت اُس کے مشاہدے میں تھی۔ وہ اپنے کھلونوں کے اِس کھیل کو بار بار دہرا رہا تھا۔

> ...he kept throwing or pushing everything he could grasp into a corner or underneath a bed, long-drawn-out 'o-o-o-o', accompanied by an expression of interest and satisfaction. Freud and child's mother believed that the sound was an attempt at the German word fort-'gone. -۸۴

فرائڈ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ بچے کا عمل اگرچہ ایک کھیل تھا۔ لیکن اس کھیل کی اہم ترین بات gone یعنی چلا گیا۔ گویا زندگی اور موت کا کھیل اِنسان کے اندر اِس کی جبلت اِسی طرح دہرائے جانے والے کھیل کی مانند ہے۔

فرائڈ کہتا ہے کہ ذہن اپنی حقیقت انتخاب اور قدر کے حوالے سے تخلیق کرتا ہے۔ گویا یہاں حقیقت تغیر پذیر ہے۔ ایک تسلسل ہے۔ ہر مقام پر اِس کی ضرورت مختلف ہے۔ لیکن یہ صورت حال بحیثیت معالج جب اُس کے عملی مفروضے کی زد میں آتی ہے تو ذہن کو دوچار حقیقت جامد اور متعین ملتی ہے۔ اِسی حقیقت کے تحت وہ اِس سے اپنے نیوراتی مریضوں کی مفاہمت پیدا کرتا ہے۔ وہ فنکار کو اِس لحاظ سے مختلف سمجھتا ہے کہ وہ نہ صرف تخیل کی دُنیا سے واپسی اختیار کر سکتا ہے بلکہ حقیقت میں بھی واپس لوٹ آتا ہے۔

فرائڈ نے یہ وضاحت بھی کی کہ ذہن کا ایک حصہ منطق کے بغیر بھی کام کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی کسی نہ کسی حوالے سے کچھ نہ کچھ حصہ منطق ضرور موجود ہوتی ہے۔ اِسی طرح وہ خوابوں کا مقصد یہ بھی بتاتا ہے کہ خواب تکلیف دہ صورت حال

کی نئے سرے سے تعمیر کرتا ہے۔ گویا خوابوں میں گریز کا پہلو مکمل طور پر موجود نہیں۔ بلکہ اِن میں حالات سے مقابلے کی خواہش موجود ہوتی ہے۔

ڈیپریشن اور تنہائی کی مختلف صورتیں:

یہ بات تو طے ہے کہ خودکشی کا بڑا بنیادی اور نمایاں ترین محرک وحوالہ depression (اضمحلال) ہے۔

> Any consideration of the mood disorders must include some discussion of suicide. People take their lives for many reasons, but a very common reason is depression. The life time risk of suicide among people with mood disorder is estimated at 19 percent... In a sample of adolescent who had committed suicide, It is found that almost half had been depressed before the fatal attempt.-۸۵

عمومی طور پر ڈیپریشن کی وجوہات میں مندرجہ ذیل اہم عوامل کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔

۱۔ (Inherit) کرنا۔ بچپن کے کوئی اندر رہ جانے والے عوامل، جو بعد میں depression کا مؤجب بنیں۔ ایسے عوامل ہمارے لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔

۲۔ (Feeling of helplessness)۔ ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا۔ ایسے حالات وواقعات سے گزرنا کہ انسان نہ تو انہیں تبدیل کر سکے اور نہ اِن کا حصہ بن سکے۔ اور کچھ نہ کر سکنے کی کیفیت سے دوچار ہو جائے۔

۳۔ (Stressful Life Events)۔ زندگی کے پریشان کن حالات وواقعات اور اُن کا لاشعور کا حصہ بن جانا نہ صرف اِنسان کو depression (اضمحلال) سے دوچار کرتا ہے۔ بلکہ اُسے اِس کیفیت میں مزید شدت سے بھی مسلسل ہمکنار کرتا رہتا ہے۔

۴۔ (Parents-child relationship in childhood)۔ اس میں والدین کے آپس کے تعلقات۔ بچوں کے ساتھ اُن کے رویے۔ اُن کا عمل اور ردِ عمل بھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ اِس دور کے حالات۔ واقعات اور گھر کی مجموعی صورتِ حال کے اثرات اِنسان کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

۵۔ (Parents attitude towards everything)۔ بچہ ابتدا ہی سے اپنے گھر کی فضا اور والدین کے زندگی اور زندگی کے دیگر اُمور سے متعلق اُن کے طرزِ عمل کو دیکھتا اور سیکھتا ہے۔ زندگی اور اِس کے معاملات کو برتنے کا ایک تجزیہ اور تجزیاتی نگاہ اُس کے اندر پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اُس کے اندر ایک طریقہ کار ایک طرزِ عمل جگہ بنانے لگتا ہے۔ کہ کس قسم کے حالات میں اُسے کس طرح سے جینا اور کس طرح کا طرزِ عمل اپنانا ہے۔

.. how they interpret themselves in their own worlds..." -۸۶

انسان کے نفسیاتی تجزیے میں (Cychodinamic Theory) قابلِ ذکر ہے۔ اس کے دو Phases

ہیں۔اوران دونوں کو ہی نارمل نہیں کہا جا سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ Mania کیا ہے۔

1۔ (Mania)۔(Over Excited)

اس میں انسان سمجھتا ہے کہ وہ جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے اُسے حاصل کرلے گا۔

"People experiencing mania feel intense happiness power, invulnerability and energy."۔۸۷ یہ ہر لحہ کی منصوبہ بندی ہے۔ اِنسان باتوں اور خیالات کے سیلاب میں گویا بہتا جاتا ہے۔ بظاہر خوش دِکھائی دیتا ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ عملی طور پر کچھ نہیں کر پاتا۔ خود کو خیالوں میں باتوں سے کسی بڑے سے بڑے مرتبے پر فائز کامران وشادماں دیکھتا ہے۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اِس حالت میں کبھی کبھار بڑی کامیابیاں بھی حاصل کرلیتا ہے۔ یہ اِنسانی موڈ کی ایک extreme اور انتہائی صورت ہے۔ جو بہر طور نارمل نہیں کہی جا سکتی۔ اِس میں انسان سب کے درمیان رہتا ہنستا کھیلتا اور خوش باش نظر آتا ہے۔ جبکہ اس کی دوسری متضاد انتہائی صورت ڈیپریشن ہے۔ ڈیپریشن اور mania کو bipolar disorder بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف دو انتہاؤں کی کیفیات ہیں۔ اِن دونوں کے درمیان اِنسانی ذہن کی کیفیت ایک لہر کی مانند نشیب و فراز کی حامل رہتی ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ یہ دونوں Phases ایک دوسرے کے متضاد ہیں اور حدود سے متجاوز ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں جو نارمل نہیں کہلاتے۔ اِن دونوں کے درمیان ایک انتہا سے دوسری انتہا تک اِنسانی ذہن کی کیفیت اکثر دِنوں یا ہفتوں اور بعض اوقات سالوں پر بھی محیط ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات اِنسان جب mania سے depression کی طرف آتا ہے تو پھر کبھی اپنے وقت کے زیاں پر پچھتاتا ہے اور کبھی خود کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے۔ اُس کی یہ حالت مایوسی تنہائی زندگی سے نا اُمیدی اور بے عملی سے دوچار ہوتی جاتی ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اِنسان mania کی کیفیت میں حدود سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ اُس صورت میں اُس کی hyperactiveness سے ایسے اعمال بھی سرزد ہو جاتے ہیں جو تکلیف دہ اور نقصان زدہ عوامل پر مشتمل ہوتے ہیں۔

> ... who experience this disorder often show a recklessness that produces self-injury, both emotionally and sometimes physically...۔۸۸

گویا mania اور depression دونوں صورتیں جو ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ الگ الگ انتہاؤں پر لیکن ایک دوسرے سے متعلق بھی ہوتی ہیں۔ ہر انسان میں یہ دونوں کیفیات متناسب اور متوازن صورت میں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا disorder اِن کا نارمل حالت میں نہ رہنا اِنسان کو اپنے رویے میں غیر متوازن بنا دیتا ہے۔ اِسی سے وہ اپنے رویے طبیعت اور قول و فعل میں نارمل نہیں رہتا۔ اور اِسی کی شدت پسندی میں وہ بعض اوقات خودکشی کے عمل سے بھی گزرتا ہے۔

Latest Theory کہتی ہے کہ اِنسان کی depression کی وجوہات اُس کی اپنی اپنی زندگی سے متعلق اُس کی approach ہے۔ اِس ضمن میں Aaron Beck کی تھیوری جسے Cognitive Theory کہا جاتا ہے قابلِ ذکر ہے۔ اس کا تعلق بیسویں صدی سے ہے۔ Beck کہتا ہے۔

...that most depression is as much a disorder of

> thinking as of mood, and he hypothesized that some people may be susceptible to depression because of their cognitive triad, or characteristic negative ways of thinking about the self, the world, and the future.-۸۹

بیک کے نزدیک اِس طرح اپنے ذہن سے انسان کا سوچنا کوئی نہ کوئی نتیجہ نکالنا اور اُسی کے مطابق اپنی سوچوں کو ڈھال کر کسی مخصوص سمت پر ڈالنا اہمیت کا حامل ہے۔ اُس کے مطابق اِنسان میں ڈیپریشن کا عنصر اُس وقت جنم لیتا ہے جب وہ ذاتی طور پر تجربوں کی منفی صورت حال کا سامنا کرتا ہے۔ بیک کے نقطہ نظر کو Cognitive Vulnerability کا نام دیا جاتا ہے۔

> So that they select interpretations that fit their beliefs while ignoring or reinterpreting information that does not fit. This leads to a self-prepetuating system of beliefs... People are more likely to experience depression when negative events be fall them in the specific areas. They have identified as important to their self-worth...-۹۰

بیک کی رائے میں ایسی شہادتیں موجود ہیں جس سے اِس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ جو لوگ ''لمحہ حال'' میں ڈیپریشن کا شکار ہوتے ہیں وہ مایوسی اور نا اُمیدی کی حالت میں اپنا تجزیہ کرتے ہیں۔ اور جب تک وہ بذاتِ خود اِس حالت اور کیفیت سے نہیں گزرے ہوتے۔ اُن کا نقطہ نظر اُن کی توقعات ذہنی کیفیت اور اندر کا یقین اُنہی لوگوں کی طرح ہوتا ہے جو depress نہیں ہوتے۔

> ...when no longer depressed, their interpretation, expectations, memories and beliefs resemble those of people who are not depressed...-۹۱

کچھ ماہرین نفسیات کے مطابق Psychotic depression اور شے ہے۔ اور Non-Psychotic depression اور شے۔

ایک تھیوری کے مطابق روزمرہ معاملاتِ زندگی میں جب اُداسی اور مایوسی کا عنصر بڑھتا جائے تو اِس disorder سے ڈیپریشن کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ گویا اُداسی کا تناسب یہاں کیفیت میں نہیں۔ مقدار میں مضمر ہے۔ اِس تھیوری کو Continuity hypothesis کا نام دیا جاتا ہے۔

یہاں دیکھا یہ جاتا ہے کہ کیا انسان/مریض کی کیفیت Psychotic ہے یا Neurotic ہے لیکن درست بات یہ ہے کہ "... all mood disorder, whether neurotic or psychotic, are grouped together".-۹۲

Continuity hypothesis کے نقطہ نظر سے تمام طرح کے mood disorders کو وسیع پیمانے پر Psychogenic کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک نقطہ نظر کے مطابق موڈ disorder کی ایک reactive

dimension بھی ہے۔ اِس میں دیکھا جاتا ہے کہ کیا depression کے حوالے سے کوئی خاص واقعہ مرکز بنا ہے۔ مثلاً خاندان میں کسی کی موت یا ملازمت اور کاروبار کا نقصان وغیرہ۔ Neurotic depression کے ساتھ عموماً reactive dimension کا سلسلہ جوڑا جاتا ہے۔ جبکہ Psychotic depression کو عام طور پر Endogenous (biogenic) کے طور پر لیا جاتا ہے۔

Psychotic depression کی نسبت Neurotic depression میں اگر چہ فرد کی شخصیت کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔ اُس کے رویے اکثر غیر متوازن بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود ایسے لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اُن کی آس پاس کی روزمرہ زندگی میں کیا ہو رہا ہے۔ ایسے لوگ بظاہر نارمل نظر آتے ہیں۔

> Neurotics ... do not lose their ability to interact with their environment in a reasonably efficient manner. Psychotics do, partly because their thinking processes are often disturbed by hallucinations, or false sensory perceptions, and delusion, or false beliefs. This same neurotic - psychotic distinction is often applied to depression. In psychotic depression hallucination, delusions, or extreme withdrawal effectively cut the tie between the person and the environment. Manic episodes can also have psychotic features.-۹۳

اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اکثر ڈیپریشن کے حوالے سے کسی ایک عنصر یا نکتے کو نتیجہ خیز بنانا اور سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ وضاحتاً کسی ایک مرکز تک نہیں لائے جا سکتے۔ "It is often difficult to determine whether a depression has been triggered by a specific event."-۹۴ اور جہاں تک Endogenous اور Reactive کی اصطلاحات کا تعلق ہے۔ یہ اپنے مطالب و مفاہیم میں بہت واضح سہی، لیکن ڈیپریشن کی تمام تر وجوہات اور اِن کی تہہ تک پہنچنے میں اِنہیں حتمی نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ ڈیپریشن کی علامات اور اُن کی نشاندہی میں معاون ہو سکتی ہیں۔

جب ڈیپریشن کی وجوہات میں کوئی ایک واقعہ خصوصیت سے شامل ہوتا ہے تو پھر ڈیپریشن کا سلسلہ یہ کیفیت تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی جاتی ہے۔ مثلاً

> Being laid off from work, losing one's home and particularly interpersonal loss... "death" separation, divorce, a child's leaving home...-۹۵

اِن حالات میں ایسا ضرور ہے کہ اگر سماجی حالات و عوامل depressed اِنسان کے لئے مددگار اور مثبت ہوں۔ اُن سے اُس کا اعتماد بحال ہو تو ڈیپریشن میں ملوث اِنسان اِن تمام کیفیات اور منفی صورتحال سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور اعتماد پا سکتا ہے۔

ڈیپریشن کے حوالے سے جو نئے نقطہ ہائے نظر اور آراء سامنے آئی ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ

ڈیپریشن کی ایک mixed anxiety depression Category'' بھی ہے۔ یہ W.H.O کی تحقیق کے مطابق اپنا ایک وجود رکھتی ہے۔ ایسے انسانوں میں ڈیپریشن کی کئی ملی جلی کیفیات اور علامات یکجا ہو جاتی ہیں۔ اُن کی ڈیپریشن کا احاطہ کسی ایک اور مخصوص محرک کے حوالے سے نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہو جاتی ہے کہ ڈیپریشن ذہنی گھٹن اور ذہنی دباؤ ایک ایسی مضرِ صحت کیفیت ہے جو اِنسان کو فعال اور مثبت نقطہ نظر کی حامل نہیں رہنے دیتی۔ ایسی صورت حال میں جو اُداسی اور تنہائی ہے۔ وہ انسان کو سماج سے الگ تھلگ ایک ایسی ذہنی سوچ کے کونے میں دھکیلتی چلی جاتی ہے۔ جہاں مثبت، پُر اُمید اور ایک صحت مند زندگی گزارنے کا رویہ اور طریقہ اُس سے چھن جاتا ہے۔ یہ ایک مریضانہ طریقہ کار ہے جو علاج اصلاح اور تربیت کا محتاج ہے۔ اِس میں انسانی سوچ اُس کا رویہ مشکوک، متزلزل، بے یقین بے عمل اور غیر مستقل مزاجی کا حامل ہو جاتا ہے۔ اُس کی تخلیقی صلاحیت اور صحت مند سوچوں کو زنگ لگنے لگتا ہے۔ ایسی صورت حال کا حامل اِنسان جس تنہائی کا شکار ہوتا ہے یا وہ جس تنہائی کی طلب رکھتا ہے۔ وہ اُسے منفی سوچ کا حامل بنا کر سماج سے کاٹتے ہوئے جس راستے پر ڈال دیتی ہے۔ وہ راستہ تاریکی بلکہ زندگی کے تاریک تر انجام پر بھی منتج ہوتا اور ہو سکتا ہے۔ ایسا اِنسان عارضی سکون کے لئے خود کو نشے میں بھی گم کرنے کی بعض اوقات راہ تلاش کرتا ہے۔

دوسری طرف وہ تنہائی اور اُداسی ہے۔ جو زندگی کو بامعنی اور باعمل جانتے ہوئے متجسس ہے۔ متلاشی ہے۔ اُس سوچ کی، اُن افکار کی، اُن حقائق کی، اُن سچائیوں کی جو زندگی کے ہنگاموں میں پوشیدہ و خوابیدہ ہیں۔ جن تک انسان کو پہنچنا تھا۔ اور وہ بھی اُن تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ ایسی اُداسی اور تنہائی ریاضت ہے۔ تخلیقی صلاحیتوں کو گویا یہاں پر لگ جاتے ہیں۔ ہر ہر لحہ کی جستجو، مطالعہ، فکر، غور و غوض، تلاشِ حق، روحانی سفر، کشف و کرامات، موج در موج پار اُترتے جانا۔ اِسی کی انتہائی سطح اور اعلیٰ فکر و نظر انبیاء کرام اور بزرگانِ دین کے حصے میں آئی۔ اِن کے علاوہ بلند فکر رکھنے والے باصلاحیت لوگوں نے بھی اِسی راستے کی خوشہ چینی میں زندگیاں بتا دیں۔ جنہوں نے موت کو روحانی اور ابدی سفر کے لحاظ سے لیا۔ وہ اِسی زمرے میں آتے ہیں اور جہاں تک ادب / ادیب اور مجموعی طور پر تخلیق کاروں کے لحاظ سے تنہائی کا تعلق ہے۔ تو اُسے بہت حد تک اِسی صحت مند اور مثبت اندازِ فکر رکھنے والوں میں لیا جا سکتا ہے۔

بقول غالب احمد

> تنہائی ایک بنیادی تخلیقی قوت ہے۔ تخلیق کا محرک ہے۔ باعث تخلیق کائنات ہے۔
> تنہائی اول۔ تنہائی آخر اِس کے بغیر فرد اور معاشرے کے باہمی روابط عمل اور ردِ عمل
> سے متعلق مسائل کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں رہتا۔۔۔۔ ۹۶

مظہر الاسلام کا اس ضمن میں کہنا ہے کہ ''کبھی کبھی مجھے انسانوں سے خوف آنے لگتا ہے۔ میں فاصلہ اوڑھ لیتا ہوں۔ تنہائی میں بیٹھ کر سچ کے دھاگے سے زندگی کا پھٹا ہوا لباس سیتا ہوں''۔ ۹۷ اس نقطہ نظر کی وضاحت ایک اور مقام پر وہ اس طرح سے کرتے ہیں ''کیا تم نے سوچا ہے کہ سب سے بڑی حقیقت تنہائی اور اداسی ہے اور اپنی پہچان کے لیے بہت ضروری ہے''۔ ۹۸ یعنی احساس ذات اور ادراک کائنات کے لیے تنہائی بہت بڑا سچ اور زندگی کی انتہائی اہم ضرورت ہے۔ انسانوں کے درمیان فاصلے اسوقت اوڑھنے کی نوبت آتی ہے۔ جب ایک دوسرے کے چہروں کو پڑھنا مشکل ہو جائے۔ تو گویا ایسے میں صرف تنہائی ہے۔ جو اس ضمن میں انسانوں کو تفکر کی دولت سے مالا مال کرتی ہے۔

اِس طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تنہائی کی کئی صورتیں ہیں۔ اِس کا ایک سیاسی رنگ بھی ہوتا ہے۔ ابلاغ کی کمی یا

ابلاغ نہ ہونے کی صورت میں بھی تنہائی وجود پاتی ہے۔ سماج سے کٹنے کی صورت میں بھی۔ سماج اور فرد کے درمیان اختلاف کی صورت میں بھی یہ منظر پر آنے لگتی ہے۔ اور کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ خود پر اِسے یوں ہی یوں طاری کرلیا جائے۔ جو شاید دیرپا اور اہم نہیں ہوتی۔ یہاں یہ صورت حال بھی قابل ذکر ہے کہ اِن تمام صورتوں میں فرد کے دیگر داخلی اور انفرادی رویوں پر بھی مبنی ہوتی ہے کہ اُس کا اِن مخصوص حالات میں ردعمل کیا ہے۔ کیونکہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی طرح کی صورت حال میں مختلف افراد کا ردعمل ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

ادیبوں اور تخلیق کاروں کے ہاں جب ہم تنہائی کا ذکر کرتے ہیں تو یہ تنہائی تخلیقی سطح کی حامل بن کر انتظار کی کیفیت کو جنم دیتی ہے۔ یہ انتظار وہی ہے۔ ''من وتو'' کے درمیان کا ''جزو وکل'' کے مابین کا قطرہ سے سمندر ہونے کا ہجر سے وصال تک کا اور زندگی سے موت تک کے عرصے پر محیط ہوتا ہے۔ اِس طرح تنہائی کی دو بڑی واضح صورتیں سامنے آتی ہیں۔ جن کا نام ایک لیکن راستے اور کیفیات جدا جدا ہیں۔ بقول سجاد باقر رضوی

> تنہائی کا ایک مثبت پہلو ہے۔ جس سے تخلیقی عمل وجود میں آتا ہے۔۔۔ اِن لوگوں کی تنہائی کا جن کا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا۔ یقین نہیں ہوتا۔ کوئی ایمان نہیں ہوتا۔۔۔ یہ تنہائی بے یقینی کی تنہائی ہے جو بڑی کربناک ہوتی ہے۔ ۔۹۹

ادب/ادیب کے حوالے سے تنہائی کی چند مخصوص صورتیں ہیں۔ مثلاً

۱۔ اپنے اندر اور باہر جھانکنا۔ ایک تضاد۔ ایک خلا کا اِحساس دامن گیر ہوجاتا ہے۔

۲۔ ایک وہ کیفیت جب ایک انسان شاعر یا ادیب کی صورت میں اپنے آپ کو اور اپنے ماحول کو شناخت کرتا اور دیکھتا ہے۔ اور مکالمے کے لئے کوئی دوسرا اِسے دِکھائی نہیں دیتا۔

۳۔ ایک یہ صورت بھی ہے کہ جس معاشرے میں وہ رہ رہا ہے۔ اِس کی عملی صورتِ حال کو Reject کردینا۔ اور ایک نئی دُنیا اپنے اندر باہر اور اپنے آس پاس بسالینا۔ اور اُسے اپنی مرضی ومنشا کے مطابق بسر کرنا۔

اِس میں بھی دو حالتیں دِکھائی دے سکتی ہیں کہ آدمی نارمل دِکھائی دے یا نارمل نہ رہے۔

تنہائی کے حوالے جو مجموعی صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ تنہائی کی ایک قسم فعال مثبت بامعنی اور تخلیقی سطح کی حامل ہے۔ جس میں ہر لحہ تجربہ، مشاہدہ، مطالعہ اور متجسس نگاہ اِنسان/فنکار کے اندر بیدار اور متحرک رہتی ہے۔ زندگی کا ورق ورق اُلٹتے پلٹتے، موت کا تصور، اِس کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش اور بعض اوقات موت کی طلب، لذت اِس حد تک بڑھ جانا کہ سرشاری اور کیفیت قلبی کی شدت میں موت کی وادی میں اُتر جانا۔ بظاہر خودکشی لیکن قطرہ سے سمندر، جزو سے کل اور اِنتشار سے اِکائی بننے کی تڑپ یہاں موجود ہے۔ (حالات کا جبر اور نامساعد حالات سے شکوہ یہاں شامل حال نہیں)۔

تنہائی کے ضمن میں تخلیق کار کے حوالے سے دو مزید صورت حال اِس طرح سے ہیں۔ ایک وہ صورت جب ناخوشگوار حالات کا شکار ہوکر فرد سماج حتیٰ کہ اپنی ذات، مفاد اغراض سے بھی بے نیاز اور بے تعلق ہوجائے۔ اپنی ذہنی دُنیا الگ بسالے۔ سماج کے ساتھ ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہوجائے۔ حالات کے جبر پر نہ صرف کڑھتا اور جلتا رہے بلکہ بہت ممکن ہے کہ وہ کچھ نہ کرسکنے کے باعث کسی ذہنی دباؤ گھٹن کسی جسمانی عارضے یا دماغی امراض کا بھی شکار ہوجائے۔ اور اپنے لیے ایک اذیت اور تکلیف دہ راستے کا انتخاب۔ موت نشے کی صورت قطرہ قطرہ اُس کے حلق سے اُتر کر اُسے زندگی سے دور کرتی چلی جائے۔ اور انجام کار ہمیشہ کا ابدی سکون راحت اور تلخ زندگی کے طوق سے آزاد ہوجانا۔ سماج سے نامطابقت

یہاں بھی موجود ہے۔

تنہائی کی ایک اور صورت جو اِسی سلسلہ ہی کی کڑی ہے۔ کہ فنکار نامساعد حالات سماج کے جبر کے باعث نہ صرف ذہنی اور عملی طور پر معاشرے سے کٹ جائے۔ بلکہ اُس کے اندر سماج کے لئے نفرت غصہ احتجاج اور بغاوت کے عناصر بھی جڑ پکڑ جائیں۔ وہ اِس کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ حالات کی تلخیوں سے فرار کے لئے نشہ آور چیزوں کا استعمال کر کے وقتی سکون کا متلاشی ہو۔ اور رفتہ رفتہ کچھ نہ کر سکنے کی صورت میں صرف موت ہی اس کے سامنے وہ راستہ رہ جائے۔ جس کے انتخاب پر وہ خود کو قادر سمجھتا ہے۔ اس حوالے سے وہ سوسائٹی کو ٹھکرا رہا ہوتا ہے اور اکثر کئی مرتبہ اقدام خود کشی سے گزر کر وہ انہی محسوسات کو سماج تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے کہ اگر تمہیں میری پرواہ نہیں تو مجھے بھی تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اذیت پسند بھی ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ یا تو دوسروں کی ہمدردی سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے یا اس توجہ کا طالب ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے مل نہیں پاتی۔ یا پھر موت کی ایک لذت ناتمام یا اِس کے نشہ سرشاری سے گزرنے کی خواہش اسے درپیش ہوتی ہے۔ اور بالآخر اکثر اوقات وہ اسے پانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔

خودکشی کے حیاتیاتی اور موروثی محرکات:

انسانی جسم اپنی داخلی ہیئت کارکردگی اور تشکیلی نوعیت کے اعتبار سے قدرت کا انمول، عجیب و غریب اور حیران کن تخلیقی شاہکار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی کے آثار پیدا ہونے سے بہت پہلے تقریباً ایک بلین سال پر مشتمل زمانہ بھی ہے۔ جب یک سالمی نامیاتی حیات (Bio Menomers) سے کثیر سالمی نامیاتی حیات (Bio Polymers) ہے اور پھر ان میں جو خود سمٹتی ہے یعنی (Self Assembly) اس کا ظہور بھی ہوا۔ جس کا اختتام پھر پر فعال (Living Cell) پر ہوا۔ اس طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پہلا خلیہ 3.5 بلین سال پرانا ہے۔ خلیہ درحقیقت زندگی کی اکائی ہے۔ جس میں زندگی کے تمام راز اور مظاہر پوشیدہ ہیں۔

انسان مجموعی طور پر تقریباً تین کھرب مختلف اقسام زندہ خلیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر خلیہ اپنی زندگی کیلئے غذا استعمال کرتا ہے۔ سانس لیتا اور گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خلیہ جینز کے حوالے سے اور جینز D.N.A کے حوالے سے کیا ہے۔ اور D.N.A کی وضاحت کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح کسی عمارت کا کسی مشین کا پورا ایک نقشہ ہوتا ہے۔ جس میں اس کے تمام پرزوں کی تفصیل اور کارکردگی کی نوعیت درج ہوتی ہے۔ اسی طرح

> ۔۔۔ جسم کا پورا تعمیراتی نقش موجود ہوتا ہے۔ اتنا مکمل نقش کہ اگر کوئی خلیہ اپنے قبیلے (جسم) سے بچھڑ جائے۔ تو ڈی۔ این۔ اے کے مطالعے اور تقابل سے بلا کسی شبے کے پہچان کی جا سکے۔ کہ یہ کس جسم سے نکلا ہے۔ [۱۰۰]

اور D.N.A کیا ہے۔ یہ Deoxy Ribonucleic Acid کا مخفف ہے۔ یہ بلوریں کرسٹل کے ذرات پر مبنی ایک تیزابی فارمولے کا نام ہے۔ جو کئی اجزاء سے مل کر وجود میں آتا ہے۔ اس میں ہائیڈروجنی نسل کے چار اجزاء ایڈے نائن (Adenine) گوانائن (Guanine) سائسٹو سائن (Cystosine) اور تھایامائن (Thyamine) پائے جاتے ہیں۔ اس کی دریافت کا سہرا دو نوجوان سائنس دانوں فرانس کرک جو امریکی تھا اور جیمز

راگ رُت، خواہشِ مرگ اور تنہا پھول

واٹسن جس کا تعلق برطانیہ سے تھا کے سر ہے۔ یہ دریافت ۱۹۵۴ء میں منظر عام پر آئی۔ اور اس پر ان دونوں کو ۱۹۶۲ء میں نوبل پرائز بھی دیا گیا۔

D.N.A کی دریافت محض جسمانی حوالے سے کسی نئے عضو کی دریافت ہی نہ تھی۔ بلکہ اس حوالے سے جو بات منظر عام پر آئی۔ وہ یہ کہ قدرت نے انسانی شخصیت اور اس کے اسرار و رموز کا نسلاً اور وراثتاً ایک نقشہ انسان کے اندر پوشیدہ کر رکھا ہے۔ جو کئی حوالوں سے انسانی شخصیت، مزاج اور اس کے رویوں پر اثر انداز ہوتا اور اس کی ایک مخصوص پہچان اور حیاتیاتی و موروثی تاریخ کا حامل ہوتا ہے۔ ابھی یہ اس حوالے سے تحقیق کی ابتدا ہی کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اس نظام کی پیچیدگی، اس کا تمام علم برس ہا برس کی دریافت و تحقیق کا متقاضی ہے۔

سائنس دانوں کے ایک محتاط اندازے کے مطابق ڈی۔ این۔ اے کے تقریباً ستانوے فی صد حصے میں کوئی خفیہ اشارے نہیں۔۔۔ صرف تین فی صد ایسے ہیں جن میں جین کے اشارے پنہاں ہوں گے۔ ۱۰۱

یہ بھی محض ایک اندازہ ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ قدم قدم پر اسرار کے نئے جہاں جب منظر عام پر آئیں تو انسان کی عقل و فہم پر دستکیں دے دے کر اسے اپنی طرف متوجہ کریں۔ اس تمام پس منظر میں جب ہم انسانی خلیے کو دیکھتے ہیں تو اس کے ساتھ نئے اسرار کی دنیا توجہ طلب ہو جاتی ہے۔ انسانی خلیے کا مرکز ایک بند تجوری کی مانند ہے۔ جس کے اندر ۲۳ جوڑوں کی شکل میں ۴۶ عدد کروموسوم پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جن پر دھاگے جیسی شے لپٹی ہوتی ہے۔ اسے کیمیا کی زبان میں ڈی۔ این۔ اے کہتے ہیں۔ یہ دو مضبوط دھاگوں کی متوازی شکل سے بنا ہوا فیتہ ہوتا ہے اور ان دو رویہ مسلسل دھاگوں کو متوازی اور آپس میں مربوط رکھنے کیلئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے پھول نما دھاگے بندھے ہوتے ہیں۔ اسے اگر بل دیا جائے تو اندر سے کھوکھلی رسی کی شکل بنے گی۔ واپس کھولا جائے تو چکر دار سیڑھی کی طرح کھلے گی۔ اس کے اندر جسم کے سارے نقشے کی تفصیل اور خفیہ راز قدرت نے پوشیدہ کر رکھے ہیں۔ سائنس دان اسے (Genom) کہتے ہیں۔ لیکن یہ تمام راز، تمام معلومات، تمام خفیہ اشارے نہ تو انسان پر ابھی تک کھل سکے۔ اور نہ اس سے کوئی حتمی نتیجہ برآمد ہوا۔ یعنی ایک چیز موجود ہے۔ اس کے مکمل اور درست علم تک ابھی انسان کی رسائی نہیں ہو پائی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ D.N.A اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ آنکھ یا طاقتور ترین خورد بین بھی اس کی اہل نہیں۔ بلکہ اس کے مالیکیول کو سائنسی تجربات اور ان کے نتیجے میں بننے والے (Formation) کے مطالعہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے اور جب ہم جینوم کی بات کرتے ہیں تو ''جینوم (Genom) کسی جاندار کے بارے میں مکمل جنیاتی تفصیلات یعنی D.N.A کے تین کھرب زینوں (Base Pairs) پر مشتمل ہے''۔ ۱۰۲

اس رائے کو اگر ہم مکمل جنیاتی تفصیلات کے حوالے سے نہ بھی لیں۔ تو ہم اسے اسی حوالے سے زیادہ سے زیادہ تفصیلات اور امکانات ضرور کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ پہلو بہت حد تک حقیقت پر مبنی ہے کہ انسانی جسم کا ہر خلیہ کوئی نہ کوئی مخصوص حکم بجالاتا ہے۔ جو ایک یا ایک سے زیادہ پروٹین بناتا ہے۔ ہماری صحت، بیماری اور موت کے حوالے سے پیغامات بھی انہی حوالوں پر مبنی ہیں۔ جب انسانی زندگی کے اتنے اہم ردوبدل اس نظام کے تابع ہیں۔ تو پھر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ خودکشی کا عمل، اس کا ارادہ یا اس کے لئے اقدام کرنا اس نظام سے جدا یا الگ کوئی چیز ہے۔ کیونکہ بہر حال زندگی انسان کی قیمتی متاع ہے۔ اس کا نقصان اور اس کا خاتمہ کیونکر کسی سطحی جذبے، یا سطحی سوچ کے ہاتھوں انجام پا سکتا

ہے۔ یا یہ امکان خارج از بحث کر دینا۔ کہ خودکشی کے عمل اور اس اقدام میں کوئی موروثی و حیاتیاتی حوالے موجود نہیں ہوتے۔ جبکہ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ

> انسانی خلیے کے مرکز (Nucleus) میں کل ۴۶ کروموسوم ہوتے ہیں۔ جو جوڑوں کی صورت میں گلے ملتے ہوئے گھاس کاٹنے والی قینچی کی طرح ہوتے ہیں۔ ہر جوڑے کا ایک کروموسوم باپ اور دوسرا ماں کی جانب سے آتا ہے۔۔۔انسانی جینوم میں اشاروں کی صورت (Genetic Codes) میں وہ احکامات یا پیغامات چھپے ہوتے ہیں۔ جن سے جاندار جسم کے تخلیق زندگی، صحت اور موت کے سارے مراحل طے ہوتے ہیں۔ ۔۱۰۳

یہاں تحقیق والدین کی وراثت کے شواہد بھی دے رہی ہے اور اس میں پیغامات و احکامات کی جس پوشیدگی کا ذکر ہے۔ اس میں زندگی، صحت اور موت کے وہ حوالہ جات بھی موجود ہیں۔ جو انسانی زندگی میں نمایاں اور اہم ترین تبدیلیوں اور رد و بدل کے حامل ہوتے ہیں۔ گویا ایسے نشانات اور راستوں کی نشاندہی ہو رہی ہے۔ کہ (Genetic Codes) میں اہم ترین معلومات کا وہ خزانہ ہے۔ جو نہ صرف انسانی شخصیت اور حیات کے نئے نئے اسرار کھولتا اور کھولے گا۔ بلکہ زندگی اور موت کے حوالے سے انسان کے اہم ترین رویوں کا بھی بہت ممکن ہے۔ پتہ دینے کے قابل ہو جائے یا اس حوالے سے خودکشی کرنے والے ذہن کے مخصوص مزاج اور اس کے رویے کے مخصوص عوامل کی نشاندہی بھی کر سکے۔ کیونکہ خودکشی کرنے کا رویہ، انسانی زندگی کا اہم ترین اور فیصلہ کن رویہ اور عمل ہے۔ لیکن بات ابھی تحقیق پر انحصار کر رہی ہے۔ وہ تحقیق جس نے اس حوالے سے راستوں اور مخصوص نقطہ نظر کی بہت حد تک نشاندہی کر دی ہے۔

> انسانی خلیے میں موجود جینز (Genes) کی تعداد ایک اندازے کے مطابق ۳۸ ہزار سے ایک لاکھ بیس ہزار کے درمیان ہے۔ جب تمام جینز دریافت ہو جائیں گے۔ تب مشاہد حیات انسانی کا بلیو پرنٹ ایک مربوط اور مکمل نقشے کی شکل میں سامنے آ سکے گا۔ اس وقت شاید ہم بہتر طور پر انسانی فلاح اور حیات کی حرمت کا مفہوم سمجھ سکیں گے۔ ۔۱۰۴

یہ تمام بحث اور تحقیقی امور اس نقطہ نظر کو تقویت دے رہے ہیں۔ کہ جینز کے حوالے سے خودکشی کرنے کا عمل اور خودکشی کرنے والے شخص کے حیاتیاتی اور موروثی عوامل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جینز کی انسانی شخصیت اور زندگی میں بہت اہمیت ہے۔ انسان کو فنا ہے۔ جبکہ جینز نسل در نسل اپنا سفر جاری و ساری رکھتے ہیں۔ یہ immortal ہیں۔

> When the male and female germ cells come together at conception, the new organism acquires a unique combination of genetic material from its parents and ultimately from its distant ancestors. The mechanisms by which parents transmit their biological

characteristics to the next generation...۔۱۰۵

اس حقیقت کی سائنسی توجیہہ GregorMendel (۱۸۲۲ء۔۱۸۸۴ء) نے باقاعدہ طور پر کی۔
انسان کی شخصیت اور کردار کی تعمیر میں genetic inheritance کا بہت ہاتھ ہے۔اس میں ماحول کا بھی بہت عمل دخل ہے۔جس میں حالات وواقعات، ان کا ردوبدل اور نشیب وفراز سبھی کچھ شامل ہے۔۱۰۶۔ Genes do not exist in isolation. جینز کو کیمیکل کوڈ کہا جاتا ہے۔یہ cell کی کارکردگی، حالت اور نوعیت کو درست اور بہتر بنانے میں معاون ہیں۔جبکہ cell فوری طور پر ماحولیاتی عناصر کو جینز سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔گویا دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔Cells کا مکمل مربوط نظام ماحول سے مطابقت قائم رکھتا ہے۔دونوں کی ہم آہنگی سے فرد کے داخلی اور خارجی نظام کی اکائی میں توازن واعتدال قائم رہتا ہے۔

> When gene-environment interactions are investigated, the environment must be specified with as much care as the relevant genes.۔۱۰۷

جینز اور ماحول کے باہمی روابط پر مبنی نظام زندگی کے تسلسل پر اثرانداز رہتا ہے۔جو تمام ممکنہ نتائج پر مشتمل ہوتا ہے۔

> We are not determined by our genes, although surely we are influenced by them. Development depends not only on the materials that we have been inherited from parents... but also on the perticular temperature, humidity, nutrition, smells, sights and sounds (including what we call education.۔۱۰۸

گویا خارجی ماحول، تربیت، تعلیم اور دیگر سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ جینز کا کردار بھی انسان کی شخصیت، مزاج اور رویوں کو تشکیل دیتا ہے۔اس طرح جینز کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ماہرین کی رائے میں جینز اور ماحول کا باہمی رابطہ/ رشتہ نباتات، حیوانات اور انسان سب پر یکساں اثرات کا حامل ہوتا ہے۔اس کی Range of Reaction کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔خصوصاً انسانوں کے حوالے سے۔کیونکہ

> The major problem restricting the study of human genetic expression is that to obtain a range of reaction, researchers must expose organisms with the some genotype to a wide variety of environments, in principle the widest range in which the organism can survive. ۔۱۰۹

اور اب تک جینز اور وراثت کے حوالے سے جو تحقیق سامنے آئی ہے۔اس سے شواہد واضح طور پر پتہ دیتے ہیں کہ جینز کا انسانی شخصیت، مزاج اور رویوں پر اثر ہوتا ہے۔

خلیے کے اندر کے مرکزے میں کروموسوم کے ۲۳ جوڑے میں سے ایک ماں سے اور

دوسرا باپ سے ورثہ میں ملتا ہے۔۔۔۲۳ جوڑے بنانے والے ۴۶ کروموسوم میں
سے ہر ایک میں D.N.A ہوتا ہے۔ جو اندازاً 6 ارب جین کا مجموعہ ہوتا ہے۔۔۔
چھ ارب ٹکڑوں سے بننے والے انسانی ڈی۔این۔اے (D.N.A) میں پوشیدہ
جین کے حکم پر ہی زندگی اور موت کے سارے مراحل طے ہوتے ہیں۔۔۱۱۰

اس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے۔ کہ جب جینز کے حوالے سے تحقیق کسی حتمی نقطہ نظر کی حامل ہو جائے گی۔ تو بہت ممکن ہے کہ خودکشی پر مبنی انسانی فعل جینز کا ہی حوالہ بن جائے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کے اندر تجرباتی سطح پر زندگی کے چیلینجز کو سامنا کرنے کی جو صلاحیت اور اہلیت ہوتی ہے۔ "Such experiments would require is incompatible with moral precepts and standards of ethical research."۔۱۱۱ گویا انسانوں میں جینز اور ماحول کے باہمی تعلق پر مبنی organisims کا عمل اور ردعمل اپنے تشکیلی عناصر میں زندگی کے حوالے سے اخلاقی پہلوؤں کا تابع بھی ہے جو مذہب اور داخلی عقیدے سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس حوالے سے انسانی کردار کے مخصوص خدوخال بھی ایک دوسرے سے جدا نظر آتے ہیں۔ کوئی بھی دو اشخاص جو ایک ہی ماحول میں رہتے ہوں۔ ان پر اس ماحول کے یکساں اثرات تو ہو سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کا انفرادی تجربہ مکمل طور پر ایک دوسرے سے مماثل نہیں ہوتا۔ اس میں ان کے مختلف انفرادی ماحول کا اختلافی پہلو بھی ساتھ ہی ساتھ موجود ہوتا ہے۔ اس میں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے۔ کہ بچہ ابتدائی گھریلو ماحول سے جو اثرات لیتا ہے۔ ان کا اس کی شخصیت کی تشکیل میں نمایاں ہاتھ ہوتا ہے۔ یہاں لاشعور کی دنیا ہے۔ جس میں اس وقت کے بہت سے حالات و واقعات محفوظ ہو جاتے ہیں۔ جو بچے پر اس کے مستقبل میں شدت سے اثرات مرتب کرتے ہیں۔

جینز کے حوالے سے ایک اور اہم بات یہ ہے کہ یہ انسان کی شخصیت میں اس کی اہلیت اور کارکردگی کے معیار کی شناخت بھی بنتے ہیں۔ "Another commonly encountered idea is that genes determine capacity."۔۱۱۲ اسی بنا پر کسی مقابلے میں شریک دو لوگوں کی کارکردگی فرق ہوتی یا ہو سکتی ہے۔ ایک وہ جو مقابلے کے آخری مرحلے تک مقابلہ کرنے کی سکت رکھتا اور سب پر سبقت لے جاتا ہے اور دوسرا وہ جو ہر طرح کی آسائش و سہولت رکھنے کے باوجود مقابلے سے باہر ہو جاتا ہے۔ یہاں ہم مقابلے سے مراد زندگی کی دوڑ بھی لے سکتے ہیں۔

انسان میں جینز کا جو مخصوص set ہوتا ہے۔ وہ والدین سے بچے میں منتقل ہوتا ہے۔ گویا genetic material انسان میں پیدائش سے ہی ایک عطا شدہ سرمایہ ہوتا ہے۔ فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں نفسیات کے ماہرین نے ایسے دو جینز کی نشاندہی کی ہے۔ جس سے انسان میں اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی tendency پیدا ہوتی ہے۔ اس تحقیق سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ خودکشی کی genetic وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔

اس ضمن میں ایک مضمون کا نام ہے۔ "Suicide attempts and the tryptophan hydroxylase gene."۔۱۱۳ اس تحقیق کے مطابق جو صورت حال سامنے آئی ہے۔ اس کے مطابق۔

A specific genetic vulnerability for suicidal behavior is
strongly suggested by the results of epidemiological

genetic studies.. evidence suggest that regulation of serotonin neurotransmission is a key factor for this vulnerability.-۱۱۴

دوسرے مضمون کے مطابق جس کا نام ہے۔ " Association between violent suicide behaviour and the low activity allele of the serotonin transporter gene." اس ضمن میں جو نکات سامنے آتے ہیں۔

There is compelling evidence that serotonin system dysfunction is associated with suicidal behaviour. Some data suggest that this association is stronger with violent sucidal behaviour.

جدید تحقیق نے اس حوالے سے ان امور پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ

...The involvement of the gene coding for the tryptophan hydroxylase (TPH), the rate limiting enzyme in serotonin biosynthesis, in the genetic sysceptibility to suicidal behaviour. -۱۱۵

(Serotonin) سیروٹونن ایک کیمیکل ہے۔ اسے نیوروٹرانسمیٹر کہا جاتا ہے۔ اس کا لیول level، اس کی مقدار suicide کے ضمن میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ (TPH) انزائم enzyme ہے۔ انزائم بہت سے ہوتے ہیں۔ جو جسم کے تمام functions میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جسم کی تمام کارکردگی، ہماری سوچ اور عمل وغیرہ میں انزائم کا کنٹرول ہوتا ہے۔ خون میں سیروٹونن کا جو level ہوتا ہے۔ اسے بھی انزائم کنٹرول کرتے ہیں۔ (TPH) genes جینز سے بنتا ہے۔ جو (TPH) کا لیول کنٹرول کرتا ہے۔ اگر یہ لیول level نارمل ہے تو behaviour بھی نارمل ہوگا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے۔ تو behaviour بھی نارمل نہیں رہے گا۔ Dr. Redford Williams کی تحقیق کے مطابق۔

... Central Nervous System (CNS) sorotonin function is involved in the regulation of potentially health damaging behavioural characteristic such an anxiety, depression, hostility and social isolation. -۱۱۶

اس ضمن میں جن نکات اور امور کی طرف نشاندہی کی گئی ہے۔ انہیں اگر چہ ابھی حتمی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ غور و فکر کا ایسا راستہ ہے کہ جن سطور پر مزید تحقیق بہت سے اہم اور حتمی نتائج و انکشافات کی حامل ہو سکتی ہے۔ انیسویں صدی کو ہم علم کیمیا کی صدی کہتے ہیں۔ جبکہ بیسویں صدی ایٹم کی صدی کہلائی۔ لہٰذا امکان ہے کہ ''اکیسویں صدی (Genetics) کی صدی ہوگی۔'' -۱۱۷ ڈاکٹر ولیم نے اس فیچر میں اس بات کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔ کہ کیا انسان میں غم و غصہ اور ناراضگی کا عنصر اپنے اندر کوئی وراثت کے آثار بھی رکھتا ہے؟ ۔۔۔ کیا اس کا اس سے کوئی تعلق بنتا ہے۔؟ بالکل اسی طرح، جیسے انسان میں بلڈ پریشر کا حوالہ موروثی بھی ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں ان کا مزید کہنا ہے کہ

...He evaluted the relationship between psychosocial / behavioural risk factors and two indices of serotonin function. CNS serotonin function can be indexed by levels of 5-hydroxyindoleacetic acid (SHIAA) in the cerebrospinal fluid (CSF) and previous research has shown that low CNS serotonin function is associated with impulsive and aggressive behaviors...-۱۱۸

جہاں تک اس ضمن میں موروثی ہونے کا تعلق ہے۔ تو انسان بہت سی عادات، خصائص اور کردار کے نمایاں نقوش وراثت سے بھی لیتا ہے۔ لیکن اس حوالے سے suicidal tendency کے بارے میں تحقیق ابھی حتمی اور نتیجہ خیز مرحلے تک نہیں پہنچی۔ ابھی ہر طرح کے غور و فکر کے بعد پھر ایک سوالیہ نشان سامنے آتا ہے۔ البتہ ایسے سلسلہ وار امور اور علامات ضرور موجود ہیں۔ جو اس بات کو تقویت دیتے ہیں کہ انسان میں محبت، غصہ، احتجاج، نفرت، خفگی، ڈپریشن، حالات سے سمجھوتہ کرنے یا نہ کرنے کی صلاحیت کا ہونا اور اس طرح کے دوسرے بہت سے رویے اور عادات موروثی بھی ہوتی ہیں۔ اور ان میں سے اگر کوئی ایک بھی عادت اور رویہ مخالف صورت حال میں طاقت پکڑ لے تو ردعمل کے طور پر انسان نارمل نہیں رہتا۔

جنوری ۲۰۰۰ء کے آخری ہفتے کی ایک بڑی خبر، جو ایک تحقیقی رپورٹ کی صورت میں سامنے آئی یہ تھی کہ خودکشی کا رجحان وراثت سے بھی ودیعت ہوتا ہے۔ رائل اوٹاوا ہسپتال کے ڈاکٹرز ڈیوڈ باکش اور پاول ہرڈینا نے یہ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ لیکن اسے ایک محتاط اندازہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے مطابق۔

...The percentage of a group of suicidal depression patient with a specific gene mutation was higher than the same percentage in a group of people with no mental illness.-۱۱۹

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ انسانی جسم میں بہت سی بیماریاں اور ان کی وجوہات میں موروثی حوالے موجود ہوتے ہیں اور ان بیماریوں/ امراض کی تشخیص اور علاج کے دوران مریض کی یہ فیملی ہسٹری بھی مدِنظر رکھی جاتی ہے۔ ڈیپریشن (اضمحلال) کا عنصر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

... Biological signs, family history, and response to various treatments... and have family histories of both anxiety and depressive disorders...-۱۲۰

یہ تمام پس منظر ایک واضح اور نمایاں ترین حوالہ بنتا ہے۔ کہ انسان کی شخصیت، اس کے قول و فعل اور اس کے مخصوص رویوں کے پس پردہ اس کے حیاتیاتی اور موروثی حوالے موجود ہوتے ہیں۔ جو مخصوص خارجی عوامل سے مل کر اس کے مخصوص افعال کا محرک بننے کا امکان رکھتے ہیں اور ان افعال میں خودکشی کے فعل کو بھی خارج از بحث نہیں کیا جا سکتا۔

علم نفسیات نے جہاں انسان کی داخلی شخصیت کا پتہ دیا ہے۔ وہاں سائنسی ترقی ایسے شواہد کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے جن سے علم ہوتا ہے۔ کہ خودکشی کے جرثومے انسان کے اندر موروثی بھی ہوتے ہیں۔ اور اس حوالے سے جینز کی

انسانی زندگی میں بہت اہمیت ہے۔ اس دعویٰ کی رو سے انسان تو فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن جینز کا سفر نسل در نسل جاری رہتا ہے۔ خودکشی کے حوالے سے جینز کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر ظفر اقبال راجہ کا کہنا ہے۔

> The research studies in the field of "psychiatry & psychology" have revealed that there is a definite rise of certain Biochemical agent inthe Blood samples of "Depressive patients who are in the state of anxiety, e.g. there is sharp rise of 'a' Biochemical agent serotonin in the blood of 'schizophrenic patients. It is also true that these tendencies may be running in families but yet to be confirmed by further studies.-[۱۲۱]

گویا خودکشی کی وجوہات Genetic بھی ہیں۔ اگرچہ خودکشی کے محرکات کے حوالے سے جینز کے حتمی کردار کے بارے میں کوئی تحقیقی شواہد اس طرح سے سامنے نہیں آئے۔ جنہیں اس ضمن میں حرفِ آخر کہا جا سکے۔ لیکن سائنس اور تحقیق اس راستے پر گامزن ہیں۔ چنانچہ انسانی کاوش جہاں کئی اور امورِ حیات و کائنات میں ابھی تک بے بس و نا کافی ہے۔ اسی طرح خودکشی کے حوالے سے جینز کے حتمی کردار کے بارے میں تحقیق اور فکرِ انسانی کو اپنا سفر طے کرنا باقی ہے۔ ڈاکٹر انور نسیم اس ضمن میں کہتے ہیں۔

> Genetic control of human behavior is extremely complicated and warrants much more detailed studies. The work published up to this stage is the involvement of genes, in such characteristics as depression, agression and tendencies towards committing crimes. some of these traits especially depression often leads to Suicide. The few examples documented so far could infect be released to a specific set of circumstances which may be shared by memebers of a family (Heming way). This however, warrants much more detailed study of the specific circumstances in each generation of the family concerned. Therefore in my opinion it is appropriate to state that there is no convincing evidence that suggest a specific role of genes in Suicide attempts. Social trauma and financial pressure are more likely to be responsible for Suicides. As a Geneticist it is my opinion that there is no data available which show the role of genes in Suicide.-[۱۲۲]

ڈاکٹر انور نسیم کی اس رائے میں خودکشی کے حوالے سے جینز کے کردار کی نفی نہیں ملتی۔ بلکہ انہوں نے بحیثیت

Geneticist اس ضمن میں مزید تحقیق اور مطالعہ کی ضرورت محسوس کی ہے۔ خودکشی کے محرکات کے ضمن میں معاشی وسماجی عوامل کی بات اسلیے وثوق کے ساتھ کی جاتی ہے۔ کہ وہ محرکات بظاہر خارجی طور پر موجود اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ جبکہ جینز کے داخلی اور غیر محسوساتی کردار کو اس حوالے سے حتمی طور پر گرفت میں لانے کے لئے انسانی عقل کو فہم وفراست اور تحقیق کا ابھی طویل سفر طے کرنا ہے۔

جبکہ خودکشی اور جینز کے باہمی تعلق کے حوالے سے ڈاکٹر محمد جلیل انور نے جدید تحقیق کی روشنی میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے۔

Evidence that suicide can run in families has been found in both case reports and epidemiological studies. A well known case is the novelist Ernest HemingWay's family, in which five members over four generations died from completed suicides, Epidemiological studies, based on clinical patients or community samples have consistently demonstrated a significantly higher risk for suidcidal behaviour among family members of suicide victims and attempters (Gould et al., 1996; Kendler et al., 1997). Studies of twins have shown monozygotic twin pairs have significantly greater concordance for both completed suicide than dizygotic twin pairs (Glowinski et al., 2001; Roy et al.,1991) while one adoption study indicated that suicide is more common among biological relatives of adopted suicides than among biological relatives of adopted controls(Wender et al., 1986). Recent research findings support a role for genetic risk factors for suicide(Roy et al., 1999). A large community twin study has shown that genetic risk factors accounted for approximately 45% of the variance in suicidal thoughts and behaviour(Statham et al., 1998). This evidence suggest an important role for genetic factors in suicidal behaviour.-[۱۲۳]

ڈاکٹر جلیل انور کی اس رائے میں بہت حد تک خودکشی کے ضمن میں جینز کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

خودکشی کے حوالے سے سماجی و سیاسی عوامل:

مختلف دانشوروں اور سائنس دانوں کے نزدیک خودکشی ایک پیچیدہ تر انسانی رویہ ہے۔اس کے محرکات میں بہت سے حیاتیاتی، نفسیاتی اور سماجی پہلو شامل ہوتے ہیں۔ ماہر نفسیات اس ضمن میں اضمحلال کا پہلو نکالتے ہیں اور depression کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔

ماہر نفسیات اور ماہر سماجیات نے انسانی شخصیت میں مختلف صورتحال کے شخصی عوامل کو بھی سامنے رکھا ہے۔جن میں تکلیف دہ ماحول کے حوالے بھی شامل ہیں۔ جو دوسروں سے انتقام لینے کی ایک صورت بھی بن جاتے ہیں۔ یہ خودکشی کا ایک بہت بڑا محرک ہے۔خودکشی کے پسِ پردہ ایک عمومی رویہ یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ انسان تکلیف دہ صورت سے نکلنے کے لئے موت کو ہی جائے سکون و عافیت سمجھتا ہے۔اس میں انسان خود کو تنہا جانتے ہوئے مشکل سے نکلنے کی کوئی اور صورت نہیں پاتا۔اور نہ ہی اُسے آئندہ اُمید کی کوئی کرن نظر آتی ہے۔اور صرف موت ہی اُس کے سامنے واحد علاج اور راستہ رہ جاتا ہے۔

جہاں تک خودکشی کے سیاسی و سماجی عوامل اور اس سے متعلقہ معاشرتی رویوں کا تعلق ہے۔ یہ خودکشی کے تناسب کو گھٹانے اور بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جنگ عظیم اول کے بعد خاص طور پر جرمنی اور امریکہ کے نوجوانوں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں خودکشیاں کیں۔خاص طور پر اس کی شرح میں ۱۹۳۳ء کے لگ بھگ اضافہ ہوا۔سیاسی حوالے سے کہیں کہیں کسی ناپسندیدہ شخصیت اور حکمران کے خلاف بھی بطور احتجاج خودکشیاں ہوئیں۔ان میں جو خودکشی ناکام ہو جاتی ہے۔وہ بھی دراصل احتجاج ہی کی ایک صورت ہے۔ جسے مدد کی پکار کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

مغرب میں بڑھتی ہوئی عمر اِس کے مسائل اور بیماریوں کی وجہ سے بھی خودکشی کا مسئلہ بڑھا ہے۔شدید اور مسلسل بیماری کے باعث طبی مشورے کے ساتھ مریض کو مارنے کا عمل بھی ہے۔جس میں اُسے رضا کارانہ طور پر اس کیلئے تیار کیا جاتا ہے۔اور بغیر تکلیف کے اس کی زندگی کو ختم کرنے کے طریقے اور ادویات آزمائی جاتی ہیں۔مثلاً نیدرلینڈ میں یہ طریقہ غیر قانونی نہیں ہے۔اور بغیر کسی سرکاری یا قانونی اجازت نامے کے ڈاکٹر کا مشورہ اور راہنمائی کافی ہوتی ہے۔اگرچہ آسٹریلیا، کینیڈا اور امریکہ میں یہ طریقہ کار ابھی التوا میں ہے۔

کچھ ماہرین نفسیات کے نزدیک تنہائی، اپنی ذات سے کٹنے اور خود کو بُرا سمجھنے کا انسانی رویہ بھی خودکشی کے رجحان کا باعث بنتا ہے۔ایسا زیادہ تر صنعتی میدان میں کامیاب اقوام کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔مثلاً خاص طور پر امریکہ میں خودکشی کا تناسب ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان پندرہ سے چوبیس سال کی عمر کے حامل افراد میں زیادہ ہوا ہے۔اور آج بھی خودکشی کو اگر احتجاجی سطح پر دیکھا جائے۔تو اس عمر کے درمیان مرنے والوں کے ہاں یہ تیسری بڑی وجہ بنتی ہے۔ایسی تنظیمیں بھی اب موجود ہیں۔ جو لوگوں کو اس صورت حال سے محفوظ رکھنے میں نہ صرف کوشاں ہیں۔ بلکہ اُنہیں اعتماد، ہمدردی اور جذباتی سہارا دیتی ہیں۔مثلاً Samaritans وغیرہ۔

سماجی حوالوں سے جو اس طرح خودکشیاں ہوئیں۔اُن میں زیادہ تر ریٹائرڈ، بے روزگار اور طلاق یافتہ لوگوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔اس کے علاوہ ان میں بے اولاد اور تنہائی کے مارے لوگ بھی شامل تھے۔اور یہ بھی درست ہے۔کہ خودکشی معاشی بدحالی میں بھی جڑ پکڑتی رہی۔

Certain demographic variables are strongly correlated with suicide. Twice as many single people as married people kill them selves, and childless women are more likely to commit suicide than those with children.. In general the likelihood of a person's committing suicide increases as a function of age, especially for men. -۱۲۴

اگرچہ خودکشی کے سماجی وسیاسی محرکات ہیں۔ لیکن کسی حدتک اس کی عمومی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱) طرزِ زندگی کے معیار اور لطف کا ختم ہو جانا۔ (اس میں مادی اور روحانی دونوں طرح کے حوالے شامل ہیں)۔

۲) نفسیاتی صورتحال۔ (اس میں ذہنی وجسمانی عوارض بھی شامل ہیں)

۳) کسی ناپسندیدہ صورتحال اور کیفیت سے دلبرداشتہ ہو کر اُسے نظر انداز کرنا، جبکہ اسی ضمن میں اپنی بے اختیاری کا بھی احساس ہو۔

عمر کے حوالے سے ان مخصوص حالات میں وقت کے ساتھ ساتھ خودکشی کا نظریہ بھی بدلتا جاتا ہے۔ تمام demographic آبادی میں خودکشی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے۔ نئی تحقیق کے مطابق یہ تناسب اگر مردوں میں زیادہ ہے۔ تو عورتوں میں ۳۵ سال کی عمر تک یہ تناسب انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔

بعض نظریات کے مطابق خودکشی کا تناسب سماجی صورتحال کے مطابق گھٹتا بڑھتا ہے۔

خودکشی نشہ کرنے والوں میں بھی بہت عام ہے۔ جبکہ نشہ خود ایک ذہنی عارضہ اور ایک بیماری ہے۔ جس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ مثلاً بُری صحبت کا شکار ہونا، کسی ذہنی و جذباتی صدمے کا شکار ہو کر نشہ میں وقتی سکون تلاش کرنا، کسی بیماری کے دوران نشہ آور ادویات کے استعمال کے بعد پھر مسلسل انکا غیر ضروری طور پر عادی ہو جانا وغیرہ۔

اُنیسویں اور بیسویں صدی کی اہم تحریکات اور ان کے تشکیلی عناصر کے زندگی کے مثبت فلسفہ پر اثرات:

انیسویں اور بیسویں صدی میں مغرب میں کئی تحریکوں نے جنم لیا۔ سیاست، مذہب، فلسفہ، معاشرت، معیشت، ادب غرض زندگی کا ہر میدان متضاد ومتصادم نظریات کی زد میں تھا۔ نہ صرف زندگی کا ہر شعبہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ بلکہ ہر ملک وقوم کے ادب پر ان تحریکات کے اثرات بین الاقوامی سطح پر مرتب ہو رہے تھے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ تین اہم نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ژاں پال سارتر، فرائڈ اور کارل مارکس۔ ژاں پال سارتر کے وجودی فلسفہ کے حوالے سے، فرائڈ نے نفسیات کے میدان میں اور کارل مارکس نے سماجی اور معاشی نظام کے حوالے سے اپنا فلسفیانہ نقطہء نظر پیش کیا۔ مجموعی طور پر زندگی اور ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے۔ جن پر ان کے فلسفیانہ افکار نے اپنے اثرات نہ ڈالے ہوں۔ اور ان کے فلسفے کے جو پہلو تنقید کی زد میں آئے۔ اُن کا ردِعمل بھی درحقیقت انہی کے فلسفے کی اہمیت کا ہی مرہونِ منت ہے۔ کیونکہ کسی بھی نظریے اور فلسفے کے مثبت اور منفی پہلو ساتھ ساتھ نمودار ہوتے ہیں اس نمو پذیری

کا تناسب سماج کی ضرورت اور رویے کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔

ماڈرن سوسائٹی میں ہم مذہب کو اس کے تسلسل کو اور اس کی اہمیت کو کیسے اور کیونکر قابل قبول بنائیں؟ یہ وہ سوال تھا جو مسلسل مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اہل دانش کے پیش نظر رہا۔ کہ اس حوالے سے سوسائٹی کو توازن کیسے دیا جائے۔

مذہب کا وجود انسان کی زندگی کو ایک داخلی مرکزیت سے وابستہ کرتا ہے۔ تمام دنیاوی کاموں اور انسانی رویوں کے سامنے مخصوص حدود، قاعدے اور ضابطے وضع کرتا ہے۔ جو انسانی زندگی کو ایک حد تک با مقصد اور اس کے انتشار کو اکائی میں پروتے ہیں۔ اسی لئے مذہب کی افادیت کا سوال اپنی جگہ ایک اہم سوال رہا ہے۔

یہاں اس ضمن میں Daniel L. Pals کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ جس نے Seven theories of Religions کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ اور اس حوالے سے بات کی ہے۔ کہ مذہب کی ضرورت انسان اور سماج کے حوالے سے کیا ہے۔ اس میں اس نے ان تین ناموں کے علاوہ دیگر فلاسفر کے نام اور ان کے مذہبی نظریات درج کئے گئے ہیں۔

اُس نے ابتداء میں E. B. Tylor اور جیمز فریزر کے نظریات سے بحث کی ہے۔ جنھوں نے مذہب کو روحانی سطح پر اہم جانا اور یہ بھی کہ مذہب ایک باقاعدہ نظام کی صورت انسان کا معاون و مددگار ہے۔ اور ہر واقعہ اور ہر بات کے پیچھے دکھائی نہ دینے والی طاقت ہے۔ انہوں نے مذہب کے اندر عقلی بصیرت بھی تلاش کی۔ گویا مذہب سماج کے اندر ہر زاویے اور ہر سطح پر اپنا وجود، اہمیت اور ضرورت رکھتا ہے۔

اس نے Emile Durkheim کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ کہ اس نے سماج / سوسائٹی، سوسائٹی سٹرکچر اور سماجی روابط کے باہمی حوالے سے بات کی ہے۔ وہ انسانی رشتوں اور ان کی اہمیت کا شعور رکھتا ہے۔ اُس نے مذہب کو عقیدوں کا ایک مربوط سسٹم کہا۔ جس کا اطلاق اچھی متعلقہ چیزوں پر ہوتا ہے۔ اور جس میں بعض باتوں کی ممانعت ہے۔ اچھی باتوں سے مراد اُس کے نزدیک تمام سوسائٹی کا مفاد ہے۔ مذہب سے مراد ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ وہ سماجی حقائق میں علامتی محسوسات ہیں۔ جن کے بغیر سماجی حقائق میں جو بنیادی مذہبی عقائد ہیں۔ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ Durkheim نے مذہب کو سماج کی تمام کارکردگی میں رواں دواں دکھایا۔

اس حوالے سے ایک اور اہم نام Mircea Eliade کا ہے۔ جو بیسویں صدی کے نصف آخر کے مشہور مذہبی محققین میں شامل ہوتا ہے۔ اُس کے مذہب سے متعلق دو اہم بنیادی نظریات ہیں۔ ناپاکی اور پاکیزگی۔ اسے ہم نیکی اور بدی کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ مذہب ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ اگرچہ Eliade نے Durkheim کی طرح پاکیزگی اور نیکی کو سماجی حقائق کے اندر کوئی محسوساتی سطح پر نام نہیں دیا۔ بلکہ اس کی بجائے وہ Frazer اور Tylor کی طرح مذہب کو مافوق الفطرت سطح پر عقیدوں کی اعلیٰ صورت کہتا ہے۔ اور اُسے نیکی و پاکیزگی کا نام دیتا ہے۔ اُس کے اس تجزیے میں جو خاص پہلو موجود ہے۔ وہ فرائڈ، مارکس اور Durkheim سے ہٹ کر ہے۔ وہ مذہب کو محدود کر کے اُسے کوئی چیز بنا کر پیش نہیں کرتا۔ جیسا کہ مارکس نے اسے معیشت اور فرائڈ نے اسے نیوروسس کے حوالے سے دیکھا۔ اگرچہ Eliade کی تھیوری کو بھی ہم مکمل یا تمام کمزوریوں سے پاک نہیں کہہ سکتے۔ یہ ایسے ہی خیالات ہیں۔ جو ذہن میں آتے جاتے رہتے ہوں۔ جن کی کوئی مخصوص شکل یا تاریخی پس منظر نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود یہ آسانی

سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگر با قاعدہ کوشش کی جائے۔ تو اس کی تھیوری کو مخصوص پیرائے میں فٹ کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی کہ اُس نے مذہب کو ایک جامع پیرائے میں بیان کر کے اُسے دیگر سماجی سسٹم پر خود مختاری بھی دی۔

فلسفے کی دنیا نے اگر چہ انسانی افکار کے نئے نئے افق دریافت کیئے۔ لیکن مذہبی حوالے سے کئی سوالیہ نشانات کا در کھلتا چلا گیا۔ مذہب کی دائمی حیثیت عارضی اور جز وقتی طور پر بھی لی جانے لگی۔ یہاں اس حوالے سے فرائڈ، کارل مارکس اور سارتر کے فلسفیانہ افکار کا مختصراً تجزیہ ضروری ہے۔

سگمنڈ فرائڈ Sigmund Freud کا تعلق ویانہ (آسٹریا) سے تھا۔ وہ مذہباً یہودی تھے۔ ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں ویانہ یونیورسٹی سے میڈیکل ریسرچ کی تعلیم پائی نفسیات کا مطالعہ اُسکا خاص میدان تھا۔ وہ مذہب، سماج اور انسان کے بچپن کے حالات کو ایک دوسرے سے وابستہ کر کے نفسیاتی تجزیے کی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے۔ انسانی شخصیت کے داخلی پہلوؤں کو خاص اہمیت دیتے ہوئے ان کے مطالعہ کی ضرورت کو اولیت دیتا ہے۔ نفسیات کے علاوہ اُسے علم الحیات، علم الانسان، تہذیب قدیم، ادبیات عالم اور جمالیات سے بھی دلچسپی تھی۔ مذہب کے معاملے میں وہ ملحد تھا۔ اُس کے نزدیک خدا انسان کا خالق نہیں۔ بلکہ خود انسان کے ذہن کی مخلوق ہے۔ اور انسان دینی و نفسیاتی لحاظ سے بالغ ہونے کے بعد خدا کے سہارے کی ضرورت نہیں سمجھے گا۔

> Freud thought that religious doctrines are all illusions and that religion is the universal obsessional neurosis of humanity. He viewed religion as the source of mental problems and thus formed all of his notions from a godless position. Nevertheless, Freud's views influenced our culture to the degree that many christians began to doubt the effectineness of the Bible and the Church in dealing with life's problems. All the while, freud argued that belief in God was delusionary and therefore evil.-۱۲۵

درحقیقت مذہب سے متعلق فرائڈ کا نقطہ نظر اُس کے شعور لاشعور اور تحت الشعور کے ساتھ ایگو اور سپرا یگو پر مبنی نظریات کے درمیان ہی موجود ہے۔ یعنی ہم اپنی ناآسودہ خواہشات کے لئے اگر مذہب کے حوالے سے خدا سے مانگنا یا دُعا کرنا کہہ سکتے ہیں تو وہ بار بار دہرایا جانے والا عمل ہے۔ جو لاشعوری طور پر ہم اپنے اندر اپنی شخصیت کی بہتری اور اصلاح کے لئے کر رہے ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ مذہب کو "Group of Thonghts اور Neurosis بھی کہتا ہے۔ وہ اگر مذہب کو نہیں مانتا تو مذہب کو لاشعور کے قریب لا کر اپنا نقطہ نظر بیان کرتا ہے۔

اُس نے مذہب کو نفسیات کے حوالے سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ اور جب وہ نفسیاتی حوالہ، ذہنی گھٹن، اُسکا دباؤ ختم ہو جاتا ہے۔ تو انسان مذہب کی اُس کیفیت اور اُس کے سحر سے (فرائڈ کے مطابق) نکل جاتا ہے۔ اس حوالے سے اُس کے مذہبی نظریات بے یقینی اور غیر واضح صورت حال کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں عقلی توجیہہ اور سائنٹیفک نقطہ نظر کی کمی ہے۔ البتہ وہ یہ باور کروانے میں کسی حد تک کامیاب ہوا۔ کہ مذہب اور مذہبی عقائد کے پس پردہ، پوشیدہ نفسیاتی

عوامل بھی ہوتے ہیں۔
سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا یہاں مذہبی اقدار کی ضرورت جز وقتی محسوس کی گئی ہے۔ کیا مذہبی ضرورت اپنا فوری اثر دکھا کر پھر انسان کے لئے غیر ضروری ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا پھر انسانی زندگی میں مادہ اور مادی تقاضے ہر شے پر غالب اور اہم نہیں ہو جاتے؟
اُس نے اس بات کو ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ کہ انسانی ذہن اور شخصیت کی تعمیر میں مذہب، سماج، ماضی، حال اور مستقل کے جتنے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ نفسیات کا مطالعہ ان سب کا احاطہ کرتا ہے۔ اور اگر ہم ادب اور ادیب کے حوالے سے بات کریں۔ تو فرائڈ نے اپنے مخصوص نقطہ نظر کے تحت فنکار کی شخصیت اور اُسکی تخلیق میں لاشعور کی متنوع دنیا کو دیکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس سے انسانی ذہن کی گھتیاں سلجھانے اور لاشعوری عوامل کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ اسکا اعتراف کم و بیش تمام نقادوں نے ہی کیا ہے۔ لیکن اپنے اپنے نقطہ نظر سے۔ یہاں ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے قابل ذکر ہے۔ لکھتے ہیں کہ اِس (فرائڈ) نے

> نظریہ ادب میں تخلیق کاروں اور ان کی تخلیقات کی تفہیم و تحسین کیلئے ایک نیا اور منفرد معیار مہیا کیا۔ لیکن تحلیل نفسی سے وابستہ تصورات کے تناظر میں یہ نظریہ ادب کوئی بہت انقلابی نظریہ نہیں ثابت ہوتا۔ ۔۱۲۶

اسی پیراگراف میں آگے چل کر ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں۔ "۔۔۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ دنیائے ادب میں اس جز و نے ہی ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اور یہ تنقیدی معائیر کے ٹھہرے پانیوں کے لئے بھاری پتھر ثابت ہوا۔" ۔۱۲۷ یہاں صرف اس بات اور اس پہلو کو تقویت دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کہ جب فن اور فنکار کے درمیان لاشعور کی دنیا کا مطالعہ ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ اُس کے ذہن کے دکھائی نہ دینے والے لاشعوری محرکات پر تکیہ کیا جاتا ہے۔ تخلیق کے تمام پہلوؤں کی تفہیم کے لئے ان محرکات سے مدد لی جاتی ہے اور اسے دنیائے ادب میں انقلاب تصور کیا جاتا ہے۔ تو یقیناً یہ نظریہ ادب تنقیدی و ادبی دنیا میں منفرد، نیا اور تخلیق کے بہت سے پیچیدہ عوامل کے حل کا ذریعہ بنتا ہے۔ لائنل ٹرلنگ کا کہنا ہے۔

> یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ فرائڈ نے ادب پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اکثر حالتوں میں یہ اثر اتنا ہمہ گیر ہے۔ کہ اس کی حدود کا تعین بھی ممکن نہیں تنقید نے فرائڈ کے نظام فکر سے جو کچھ اخذ کیا۔ اس کی اہمیت کچھ کم نہیں۔ اس میں سب سے اہم وہ اصول ہیں۔ جنہوں نے ہمیں ادبی کارناموں کے پوشیدہ اور مبہم معانی کا زندہ شعور عطا کیا ہے۔ گویا ادب بھی بعینہ اپنے خالق کی طرح ایک زندہ اور تضاد کی حامل مخلوق ہے۔ ۔۱۲۸

فرائڈ ایک معالج تھا۔ اس نے انسان کے وجود، شخصیت اور کردار کے تمام خارجی اور داخلی عوامل کی ظاہری اور پوشیدہ دنیاؤں کو احاطہ تحقیق و تشخیص میں لانے کی سائنٹفک بنیادیں فراہم کیں۔ بالواسطہ ادب پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ادب اور ادیب کے حوالے سے تحقیق و تنقید کی نئی نئی سمتوں کا سراغ ہاتھ آیا۔ فن اور فنکار کے پس پردہ شعوری اور غیر شعوری عوامل جو تخلیقی سطح پر متحرک ہوتے ہیں۔ اُن کی اہمیت منظر عام پر آئی۔ اس طرح فرائڈ کے نفسیاتی نقطہ نظر نے سماج اور سماج نے ادب پر گہرا اثر ڈالا۔

فرائڈ نے اس بات کی بخوبی وضاحت کی کہ ادب میں حقیقی مسرت وہی ہے۔ جو ہمارے اذہان کی پیچیدگی کو دور کرے۔ تناؤ، گھٹن اور نا آسودگی کو ختم کرے۔ اور ہمیں آسودگی عطا کرتے ہوئے عالم بیداری میں لطف اندوزی سے ہمکنار کر سکے۔ گویا فرائڈ نے پہلی مرتبہ واضح اور مربوط انداز میں اس بات کی طرف توجہ دلوائی کہ تخلیق لاشعوری محرکات کا ثمر بھی ہے۔ ان کے حوالے سے تخلیق کار کی شخصیت، میلانات اور تخلیقی محرکات کو پیش نظر رکھا جائے۔ گویا وہ تخلیق کار کی زندگی کے معمولی سے معمولی حالات اور چھوٹی سی بات کو بھی غیر اہم نہ سمجھتا تھا۔ وہ ادبی تخلیق اور اس کے کرداروں کے نفسیاتی مطالعے کی ضرورت پر زور دیتا تھا۔ اور ان کی ذہنی اُلجھنوں کے پیچھے کسی نہ کسی غیر متوازن انسانی رویے اور احساس جرم و گناہ کو بھی مضمر سمجھتا تھا۔ وہ تخلیق میں پوشیدہ تخلیقی محرک قوتوں کا سراغ لگاتا ہے۔

نفسیات اور نفسیاتی مطالعے سے انسان کی شخصیت اور فن و فنکار کے ظاہری عوامل میں پوشیدہ اُن پیچیدگیوں کی تلاش کی جاتی ہے جو شخصیت کی تعمیر اور فن و فنکار کے مخصوص مزاج کا محرک بنیں۔ یہاں علاج اور تحلیل نفسی سے بات بن نہیں پاتی۔ اور اگر بات براہِ راست اس موضوع پر آئے۔ کہ فنکار نے خودکشی کیوں کی؟ یا فنکار سوسائٹی سے الگ ہو کر تنہائی کا کرب کیوں جھیلتا رہا۔ یا اُس نے نشے اور شدت احساس کی اذیّت پسندی میں قطرہ قطرہ موت کا انتخاب کیوں کیا؟ تو سوائے نفسیاتی بنیاد پر فن اور فنکار کے تجزیے اور اُس سے متعلقہ نتائج، کوئی اور صورت حال سامنے نہیں آ سکتی۔ کیونکہ جو ادیب اور فنکار خودکشی کر گیا۔ وہ لوٹ کر کیونکر آئے گا۔ کہ وجہ موت بتا سکے۔ یا سماج سے الگ تنہا موت کی سولی پر لٹکنے والا تخلیق کار، جو دوسروں سے اپنا کوئی ذہنی، روحانی رابطہ تک نہیں رکھتا۔ کیونکر اپنے داخل کا پتہ دے گا۔ لہذا نفسیاتی نقاد کو بیک وقت معالج اور مریض بننا پڑتا ہے۔ اور اُس کے فن سے ایسے اشارے، استعارے، تلازمات اور امیجز تلاش کرتے ہیں۔ جو با قاعدہ اور ممکنہ نتیجہ خیزی پر مبنی ہوں۔

جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے۔ نفسیاتی تنقید کے حوالے سے بقول ڈاکٹر سلیم اختر

> نفسیاتی تنقید میں ہمارے ہاں سب سے پہلے فرائڈ کے تصورات کی بازگشت سنی گئی۔ اس ضمن میں مرزا محمد سعید، محمد حسین ادیب اور سید شاہ محمد کی تنقیدی کاوشیں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ وہ ناقدین ہیں جنہوں نے اس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں اردو میں نفسیاتی تنقید کا چراغ روشن کیا۔ ۔۱۲۹

گویا نفسیاتی تنقید فن اور فنکار کے بہت سے پوشیدہ و پیچیدہ پہلوؤں کو منظر عام پر لانے میں معاون ثابت ہوئی۔ جہاں تک کارل مارکس کا تعلق ہے۔ اُس نے انسانی زندگی میں معیشت کو مرکزیت دیتے ہوئے اپنا فلسفیانہ نقطہ نظر پیش کیا۔ کارل مارکس ۵ مئی، ۱۸۱۸ء کو جرمنی کے شہر ترائر Trier میں پیدا ہوا۔ اُسکا تعلق یہودی خاندان سے تھا۔ لیکن بعد میں وہ ".....Converted to protestantism is 1824 in order to avoid anti semitic laws and persecution...." ۔۱۳۰ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مارکس نے ابتدا ہی میں مذہب کو رد کر دیا۔ تاکہ مکمل طور پر وہ اظہار کر سکے۔ کہ وہ دہریا ہے۔

اس نے پہلے بون اور پھر برلن میں فلسفہ پڑھا۔ وہ اس ضمن میں ہیگل سے متاثر تھا۔ ہیگل کی بنیادی پہچان یہ ہے کہ ذہن سے متعلق امور مثلاً ہمارے تصورات، محسوسات اس دنیا کے لئے بنیادی چیزیں ہیں، جبکہ مادی چیزیں ہمارے تصورات سے متعلق تاثرات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مارکس ہیگل کی فلاسفی اور ہیگل سے متاثر ہونے والوں کو بھی پسندیدگی کی

نظر سے دیکھتا ہے۔

مارکس کے فلسفے کا خاص میدان سماج اور معیشت ہے۔ شاید اسی سبب سے بھی اُس نے مذہب کے بارے میں براہ راست کم کہا۔ اپنی تمام تحریروں میں اُس نے شاید بمشکل ہی کہیں مذہب کو براہ راست مخاطب کیا ہو۔ ابتدا میں اُس کی تحریریں اور پمفلٹ جو شائع ہوتے رہے۔ اُن میں اُس کا نقطۂ نظر مذہبی حدود کے آس پاس کبھی کبھار دکھائی دے جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو۔ کہ سوسائٹی سے متعلق اُس کے مجموعی نقطۂ نظر میں مذہب صرف ایک پہلو کے طور پر موجود ہے۔ جو کسی بھی سوسائٹی میں مادی اور معاشی قوانین اور ضابطوں پر انحصار کرتا ہے۔ وہ ذاتی طور پر خودمختار نہیں ہے۔ بلکہ پیداواری قوتوں کی تخلیق ہے۔

...According to him, religion is one of those social institutions which are dependent upon the material and economic realities in a given society. It has no independent history -۱۳۱

کارل مارکس کہتا ہے کہ مادی روابط اور قوتوں سے تمام معاملات میں اہم اوارے اور دیگر امور مثلاً شادی، چرچ، گورنمنٹ اور آرٹس وغیرہ کی حقیقت اور اہمیت تاریخی معنوں میں کھو بیٹھی ہے۔ تو صرف اسی صورت میں کہ جب ان کا معاشی قوتوں کے ساتھ ایک تعلق اور رشتہ قائم ہو جائے۔ وہ مذہب کو تین اہم پہلوؤں کے باعث پسند نہیں کرتا۔

۱) مذہب کو وہ غیر منطقی کہتا ہے۔ اُسے فریب کا نام دیتا ہے۔ مذہب کی طرف کھلنے والے تمام راستے اُس کے یہاں سوسائٹی اور معیشت کے حوالے سے ہیں۔

۲) مارکس کے نزدیک انسان کے اندر جو ہمدردی، غم اور کیفیات ہیں۔ مذہب ایک طرح سے انہیں رد کرتے ہوئے انسان کو مکمل طور پر اطاعت گزار بنا دیتا ہے۔ یہ اطاعت گزاری ایک افیون اور نشے کی طرح اُس کے حواس پر چھاتی چلی جاتی ہے۔ گویا وہ ایک فریب اور مکر میں مبتلا ہوتا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "Religion is the opium of the masses" -۱۳۲ یعنی جب انسان معاشی طور پر خوشحال نہیں ہوتا۔ تو اس دنیا کے مسائل میں صرف مذہب ہی ہے۔ جو انہیں تسلی دیتا ہے۔ کہ تمہیں اگلی دنیا میں بہت کچھ ملے گا۔

۳) وہ سمجھتا ہے۔ کہ مذہب میں اگرچہ کچھ اہم اصول اور ضوابط بھی ہیں۔ لیکن وہ صرف ظالم اور بااختیار انسان کیلئے ہیں۔ Jesus کے حوالے سے کہتا ہے۔ کہ انہوں نے غریب کی مدد ضروری کہی ہے۔ یعنی کرسچین چرچ جب رومن کے ظلم میں ضم ہوا۔ تو صدیوں تک انسانوں کو غلام بنایا گیا۔ اسی طرح Middle ages میں کیتھولک چرچ نے ایک طرف جنت کی حقیقت بتائی اور تبلیغ کی۔ لیکن دوسری طرف اختیارات کے بے جا استعمال سے اپنے لئے طاقت اور سرمایہ اکٹھا کیا گیا۔ انہی خیالات کے پیش نظر وہ کہتا ہے۔ کہ مذہب۔

It is used by oppressors to make people feel better about the distress they experience due to being poor and exploited...-۱۳۳

دراصل اُس نے مذہب کی ضرورت صرف معاشی اور مادی آسودگی کے لئے محسوس کی۔ اسی لئے وہ مذہبی دنیا کو حقیقی دنیا کا عکس کہتا ہے۔ مذہبی خیالات کو نہ تو اُس نے حتمی کہا۔ اور نہ ہی دوسروں نے حتمی جانا۔ بلکہ وقتاً فوقتاً ان پر تنقید ہوتی رہی ہے۔ سوسائٹی اور سماج کے نقطۂ نظر سے وہ معیشت کو ہی حرف آخر کہتا ہے۔ نہ کہ مذہب اور مذہبی اقدار کو۔ اور

اگر معاشیات کو ہم وسیع تر مفہوم میں لیں تو معاشیات۔'' منزل کے انتظام کا ہی مطالعہ ہے۔خواہ منزل سے ایک گھرانا مراد لیں۔یا ایک شہر مزارعین کا ایک گروہ مراد ہو یا ایک کارپوریشن۔ایک قوم مراد ہو۔یا پوری دنیا۔''۱۳۴

مذہب کے اندر جو ایک طرح کی اطاعت گزاری۔احکام الٰہی کے سامنے خود سپردگی کی کیفیت اس ہتی کل کے سامنے اپنی رضا، انا، ہتی، وجود سب کچھ مٹا کر اس کی خوشنودی میں ہی زندہ رہنا۔انسان کی ان صفات عالیہ کو ان فلسفیانہ افکار نے شدید گزند پہنچایا بظاہر حقیقت کل کے سامنے انسان کی یہ عاجزی اور اپنے وجود کو مٹا دینے کا عمل انہیں ان کے وجود کی نفی اور اُس کا خسارہ دکھائی دیا اور اس طاقت واختیار اور قوت تسخیر وتخلیق تک ان کی نگاہ نہ پہنچ سکی۔

جو انسان کو اپنے وجود کی اس نفی کے بعد حاصل ہوتی ہے احتیاط و اعتدال کی تمام حدود کو پھلانگ کر ان نظریات کی اشاعت نے انسان کو اپنے وجود، نظریات، عقائد حتیٰ کہ زندگی اور موت پر بھی پوری قدرت اور اختیار دیدیا۔یعنی انسان کا وجود ہے تو ہے۔اس سے متعلقہ تمام معاملات و امور بھی ہیں۔اور اگر یہ وجود نہیں رہا۔تو پھر کچھ بھی نہیں۔نہ گزرے کل کا احتساب نہ آنے والے کل کا حساب۔یہیں سے مذہب واخلاق کا خانہ انسانی زندگی سے نکل گیا۔اور اگر رہا بھی۔تو بچی کھچی صورت اور مسخ شدہ حالت میں۔اس ضمن میں سارتر کے نقطہ نظر کا جائزہ ضروری ہے۔ژاں پال سارتر کو وجودی فلسفے کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس کے فلسفیانہ افکار کا جائزہ لینے سے پہلے دیکھنا یہ ہے۔ کہ وجودیت Existentialism کیا ہے۔

> Existentialism, Philosophical movement or tendency, emphasizing individual existence, freedom and choice, that influenced many diverse writers in the 19th and 20th centuries... The term ifself suggest one major theme:
> The stress on concrete individual existence and, consequently on subjectivity, individual freedom, and choice.-۱۳۵

یہ ضرور ہے۔کہ وجودیت کی اصطلاح انیسویں اور بیسویں صدی میں متعارف ہوئی۔لیکن وجودی فکر کے عناصر بہت ابتدا میں بھی ہمیں مختلف فلسفیوں کے ہاں دکھائی دیتے ہیں۔جو باقاعدہ ایک تحریک اور اصطلاح کا روپ تو نہیں کہا جاسکتا۔لیکن ان کی نشاندہی ضرور ہوتی ہے۔

> But elements of existentialism can be found in the thought (and life) of socrates, in the Bible and in the work of many pre-modern philosophers and writers.-۱۳۶

اسے باقاعدہ ایک فلسفیانہ نقطۂ نظر کا حامل بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔جس میں خدا، انسان، کائنات اور دیگر متعلقہ عوامل سے متعلق سوالات اُٹھائے جاتے ہیں۔

> ... A systematic philosophy that persumes to explain God and humanity is a form of pride. Like later existentialist writers, he

saw human life in term of paradoxes: the human self, which combines mind and body is itself a paradox and contradiction.-۱۳۷

وجودی نظریات بحیثیت ایک فلسفہ با قاعدہ طور پر فرانسیسی فلسفی ژاں پال سارتر سے وابستہ کئے جاتے ہیں۔ سارتر کی اپنی زندگی اور اس کا پس منظر کیا تھا؟ کیا محرومیاں اور نا اُسودگیاں تھیں؟ جنہوں نے اُس کے مخصوص نظریات کو با قاعدہ ایک فلسفہ اور تحریک کی شکل دی۔ یہ ایک سوال ہے۔ سارتر کے دادا کے اپنی بیوی کے ساتھ تمام زندگی تعلقات کشیدہ رہے۔ ایک بیزاری کی کیفیت، ذہنی گھٹن اور داخلی نا آسودگی گھریلو فضا پر غالب رہی۔ ان حالات میں جو بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سارتر کا والد بھی شامل تھا۔ جس نے ابتدا سے جوانی تک اس افسردہ اور گھٹے ہوئے ماحول میں پرورش پائی۔ اس کی شخصیت جس ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو کر پروان چڑھی۔ اسی کا نتیجہ تھا۔ کہ وہ غیر مطمئن اور ٹوٹی پھوٹی شخصیت کا مالک ہوا۔ شاید اسی کا سبب تھا۔ کہ وہ ہکلانے لگا۔ جو کچھ کہنا چاہتا۔ اُسے مناسب الفاظ نہ ملتے ممکن ہے۔ کہ انہی الفاظ کی تلاش پھر سارتر کے پیشِ نظر ہوئی۔

سارتر کے والد بحریہ میں ملازم تھے۔ غیر مطمئن ماحول میں گرتی ہوئی صحت کا حامل یہ شخص ۳۰ سال کی عمر میں ہی چل بسا۔ جبکہ سارتر اس دنیا میں آنے والا تھا۔ سارتر کی ۲۰ سالہ والدہ نے اس کم عمری میں ایک طرف مریض شوہر کے ساتھ زندگی کے چند سال گزارے۔ اور دوسری طرف اُس بچے کو جنم دیا۔ جس نے مسلسل اُس کے پیٹ میں زندگی کے ان گنت صدمے اور کرب سمیٹے۔

گویا یہ اُس آزادی کا آغاز اور تصور تھا۔ جس نے بعد میں سارتر کے فکری سر چشمے کے تمام بند توڑ ڈالے۔ سارتر کے مخصوص نظریات کی تشکیل میں کئی عوامل دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً اپنی نانی کے حوالے سے اُس کا کہنا کہ اُن کے خیال میں میرے والد نے اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کی۔ اور موت کے منہ میں چلا گیا۔ اس طرح کے خیالات اور عوامل جو اس کی زندگی میں دخیل رہے۔ انہوں نے بلواسطہ یا بلاواسطہ اس کے تصورِ حیات و ممات کو بھی ایک منفرد راستہ دکھایا۔

سارتر کی زندگی کی نا آسودگیاں یہیں پر بس نہ ہوئیں۔ بلکہ انکا سلسلہ طول پکڑتا چلا گیا۔ والدہ کی دوسری شادی اس کے اندر تنہائیوں کا مزید زہر اتار گئی۔ جہاں تک اس کی اپنی ذات اور شخصیت کا تعلق ہے۔ وہ ایک لاغر، نحیف، بیمار اور کوتاہ قد تھا۔ وہ ان بچوں کو حسرت کے ساتھ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ جو اس کے ساتھ کھیلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ تن تنہا طویل دوپہروں میں درختوں کے آس پاس دور دور تک مارا مارا پھرتا اور پھر تھک ہار کر اپنے خوابوں اور تصورات کی دنیا میں کھو جاتا۔ وہ خواب جو بار بار ٹوٹتے اور یکجا ہوتے رہے۔ لیکن یہ حقیقت مسلم ہے کہ زندگی کے اس ابتدائی دور کے اثرات شدت کے ساتھ اس کے نظریات اور شخصیت پر مرتسم ہوئے۔ ذاتی زندگی کی محرومیاں اور پھر معاشرے میں اس کا وہ مقام جو عام بچوں جیسا نہ تھا۔ وہ اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا۔ اس کی شخصیت کی ظاہری ناپسندیدہ حالت اور آئے روز کی بیماری نے اسے تقریباً ہر ایک کیلئے غیر متاثر اور غیر دلچسپ بنا دیا تھا۔ ایک طفل نا مطلوبہ (Unwanted Child) کا ہالہ ابتداء ہی سے اسے اپنے حصار میں لے گیا تھا۔ انہی حالات میں وہ قنوطی بنا۔ قنوطی انسانی زندگی سے بیزار، ناامید اور مایوس ہو کر اکثر غیر فعال ہو جاتا ہے یا نطشے کی طرح باغی ہو کر خدا کا بھی منکر ہو جاتا ہے۔ سارتر اور نطشے کی زندگیوں میں کچھ حد تک یکسانیت بھی تھی۔ دونوں نے خدا کے متعلق یکساں بغاوت کا رویہ اختیار کیا۔ یہ ضرور ہے کہ نطشے کی بغاوت میں

سارتر سے زیادہ تندی دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ سارتر کے جن مخصوص نظریات نے بعد میں جن وجودی تصورات کو باقاعدہ ایک فلسفے کی شکل دی اور اس کے اثرات بہت ہمہ گیر ہوئے۔ وہ مجموعی طور پر مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ ہستی being اور عدم ہستی Nothingness دراصل سارتر کے فلسفہ وجودیت کی دو اہم ترین بنیادیں ہیں۔ اس کی قنوطیت خود اپنے وجود پر زیادہ زور دیتی ہے۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ عدم Nothingness کے اندر وجود being تو نہیں ہوتا۔ لیکن وجود اسے سہارا ضرور دیتا ہے۔

بقول جین پال سارتر:

> میں موت سے بالکل لاتعلق ہو چکا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب موت آئے گی۔ تو میں اپنے آخری مضمون کی آخری سطر کا آخری لفظ لکھ رہا ہوں گا۔ اس صورت میں وہ میرا کوئی نقصان کرنے سے قاصر ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ موت فقط اس فرد کو مار سکتی ہے جس کا نام سارتر ہے۔ لیکن میں تو پوری نسل انسانی کے اندر موجود ہوں۔ جب تک موت نسل انسانی کو تباہ نہیں کر سکتی۔ وہ مجھے بھی تباہ نہیں کر سکتی۔ روئے زمین پر ایک بھی انسان کا موجود ہونا جین پال سارتر کا موجود ہونا ہے۔ -۱۳۸

۲۔ سارتر کی ناامیدی اور یاسیت خدا کے انکار کی شکل میں نمودار ہوئی۔ وہ خدا کا منکر اس لئے ہوا کہ وہ انسان کی عظمت کا قائل تھا۔ وہ انسانیت کے دکھوں پر نہ صرف کڑھتا ہے۔ بلکہ متفکر بھی دکھائی دیتا ہے۔

۳۔ اس کے نزدیک مادہ اپنے غیر شعوری طریقہ عمل میں توانائی Energy ہے۔ جبکہ ذہن کو وہ شعوری طریقہ عمل سے توانائی کہتا ہے۔ اس طرح شعور مادے اور ذہن دونوں میں موجود رہتے ہوئے ہستی کو ''کل'' بناتا ہے۔ یہاں شاید اس طرح کی ایک غلط فہمی بھی جنم لیتی ہے۔ کہ وہ وحدت الوجودی تھا۔ کیونکہ وجود کے ''کل'' کا قائل تھا۔ لیکن اس خیال میں کوئی حقیقت نہیں۔ کیونکہ وہ سرے سے ہی خدا کے وجود سے منکر تھا۔ وہ انسان سے بالاتر ہستی کے وجود کا قائل ہی نہیں۔

۴۔ سارتر کے نزدیک انسان اپنی کائنات خود تخلیق کرتا ہے۔ وہ اپنی صفات سے پہلے ہی وجود میں آتا ہے۔ وہ اس خیال سے متفق نہ تھا۔ کہ انسان میں اس کی تخلیق سے پہلے ہی اسکا جوہر موجود ہوتا ہے یا یہ کہ انسان اس ''جوہر'' کے ہاتھوں مجبور محض ہے۔ اس کے خیال میں انسان اپنا جوہر خود بناتا ہے اور اس جوہر کی تشکیل وہ اپنی موت کے وقت تک کر چکا ہوتا ہے۔ وہ جوہر سے مراد انسانی جبلت لیتا ہے اور وجود کو زندگی گزارنے کے طریقہ کا نام دیتا ہے۔ اس طرح ''وجود'' کو ''جوہر'' پر فوقیت دے کر سارتر نے داخلی انسانی بصیرت کے نظریے یا تصورِ وجدان کو مسترد کر دیا

۵۔ سارتر نے آزادی کے تصور کو حد سے زیادہ اہمیت دی۔ مذہبی اور اخلاقی اقدار اور انسانی زندگی سے مذہب کا خانہ خالی ہو گیا۔ یہیں سے اس کے فکری بے راہ روی کی حد شروع ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ سارتر کی تخلیقات اور نظریات کی یلغار سے یورپ کا نوجوان زندگی سے ہی بیزار ہو گیا۔ جس نے آہستہ آہستہ پھر یورپ سے باہر بھی ایک دنیا کو اپنے زیرنگیں کیا۔ خدا کے وجود کو انسان کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جانے لگا۔

۶۔ سارتر نے اپنے سیاسی نظام میں انفرادی آزادی کو بنیادی حیثیت دی اور معاشی نظام کے معاملے میں وہ کارل

مارکس کا حامی تھا۔ یہاں اس کے نظریات میں تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ایک طرف تو انفرادی آزادی کا حامی اور دوسری طرف فرد پر سخت ترین پابندیوں کی حامل اجتماعی معیشت کا قائل۔

مجموعی طور پر جب ہم سارتر کے نظریات اور فلسفے کا احاطہ کرتے ہیں۔تو عموماً اسے وجودی نظریات کا بانی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس اصطلاح کو باقاعدہ طورر پر اسی نے متعارف کروایا۔

> Sartre first gave the term "Existatialism" general currency by using it for his own philosophy and by becoming the leading figure of a distinct movement in France that became internationally influential after world war II.-۱۳۹

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے۔ کہ جب سوسائٹی میں کوئی تحریک، فلسفہ یا مخصوص افکار ونظریات پھیلتے ہیں۔تو عموماً سوسائٹی میں قبول اور رد کرنے کے دونوں رجحانات ساتھ ساتھ چل پڑتے ہیں۔قبول کرنے کی صورت میں ان افکار کی مکمل پیروی کی جاتی ہے۔جبکہ رد کرنے کے رجحان میں بھی کچھ نہ کچھ تناسب ''اپنانے'' یا پیروی کرنے کا موجود رہتا ہے۔ کیونکہ سوسائٹی کسی جمود اور سکوت پر مبنی انسانی گروہ کا نام نہیں۔ایک سیال اور متحرک مادے کی طرح انسانوں کا باہمی میل جول، ان کے رویے، رہن سہن کے طریقہ کار ایک دوسرے سے متصادم رہتے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہم بہت سی باتوں اور طریقہ کار کو اپناتے چلے جاتے ہیں۔یہی حوالہ سماج کے ضمن میں ان اہم فلسفیوں کے اثرات کا بھی ہے۔

یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ جسے Existentialism Psychology کہا جاتا ہے۔نفسیات کے اس مکتبہ فکر نے فرانسیسی ژاں پال سارتر Jean Paul Sartre اور دوسرے وجودیت پسند فلسفیوں سے استفادہ کیا اور اس نظریے کے تحت آج کا انسان بے مقصدیت اور بیگانگت کا شکار ہے۔اسی وجہ سے وہ نشے کی عادت، دوسرے مسائل اور ذہنی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔وجودیت پسند نفسیاتی فکر فرد کو اپنی حقیقت کی شناخت کراتی ہے۔تاکہ وہ خود کو زندگی میں کسی مقصد سے منسلک کر سکے۔اس طرح وہ دوسروں سے مثبت تعلقات قائم کرنے کے ساتھ ساتھ خود اپنے وجود کا جواز بھی پا لیتا ہے۔ یہاں فرد کے ذاتی تجربے سے حاصل شدہ سچائی پر انحصار کیا جاتا ہے۔دوسروں سے مدد لینے کی بجائے خود انحصاری کا رویہ ملتا ہے۔

ذاتی تجربے سے حاصل شدہ سچائی، آزادی اور خود مختاری کی ایک مثال، اسکا ایک حوالہ ٹیلی ویژن پر نیشنل جغرافی National Geography کے ایک پروگرام کے حوالے سے اس طرح سامنے آتا ہے۔مثلاً ایک کردار کہتا ہے۔ " We are the one who control our body." -۱۴۰ یعنی انسان ہی ہے۔جو اپنے ذہن اور سوچ پر قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے جسم، اپنے عمل پر بھی قادر ہے۔یہاں کردار کا لہجہ، مکالمے کی ساخت اور لفظوں کا چناؤ ظاہر کرتا ہے کہ یہاں جسم پر انسان کو وہ اختیار بھی حاصل ہے۔جو موت کو انسانی جسم پر سکوت و جمود کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔

اس خود انحصاری سے پھر رفتہ رفتہ فرد کو ہر طرح کی آزادی کا پروانہ تھما دیا جاتا ہے۔اس کے اندر اس آزادی کی ایک خود ساختہ روح پھونک دی جاتی ہے۔وہ اپنے تمام تر اعمال وافعال پر قادر ہوتے ہوئے زندگی اور موت سے متعلق اپنے فیصلے صادر کرنے پر بھی قدرت رکھتا دکھائی دیتا ہے۔

That a person's life belongs only to him or her, and no body should enforce on someone their own view that life must be lived.-۱۴۱

گویا صرف فرد ہی وہ اختیار رکھتا ہے اور فیصلے پر قادر ہے اور اسے باعزت طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے۔فرد کے اس تصورِ آزادی کو اگر سامنے رکھا جائے۔تو وجودی نظریات کوئی اس سے بہت فرق دکھائی نہیں دیتے۔

Existentialist thinking essentially begnis with the premise that life is objectively meaningless, and then poses the question. Why not just kill oneself. It then proceeds to answer this by suggesting the individual has the power to give personal meanings....-۱۴۲

اپنے وجود کا اثبات، اپنی صلاحیتوں کو آزمانہ، خودانحصاری، یہاں تک تو ان نظریات کے اثرات فرد اور اس کی زندگی کے حوالے سے درست ہیں۔لیکن ہر طرح کی آزادی لامحالہ اپنے ساتھ کئی غیر اخلاقی اور بے راہ روی پر مبنی عوامل کا بھی باعث بنی۔

ان مخصوص فلسفیانہ افکار کے پس پردہ ایک تو ان فلسفیوں کے ذاتی حالات وواقعات اور تجربات تھے۔دوسرے سماج اور اس کے بدلتے ہوئے رجحانات، اور تیسرے خود ان فلسفیوں کی نظریاتی شدت پسندی بھی قابل ذکر ہے۔ان تمام عوامل نے مل کر ایک مخصوص فضا قائم کی۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کم وبیش ایک ہی وقت میں مختلف فلسفیوں کے افکار کی انفرادی سطح پر نمو پذیری اور پھر اُن کا ایک دوسرے کے افکار میں انجذاب وتصادم بھی جہاں کئی پیچیدگیوں کو ختم کرتا ہے۔وہاں کئی پیچیدگیوں کو جنم بھی دیتا ہے۔

اُنیسویں صدی میں ڈینش فلاسفر کیرک گارڈ Kierkgard نے خود کو وجودی کہا۔اِنفرادی حوالے، اِخلاق اور سچائی کے ضمن میں تمام وجودیوں نے اِس کی پیروی کی۔

کیرک گارڈ اپنے ایک جریدے میں لکھتا ہے۔ "I must find a truth that is true for me... the idea for which I can live or die."-۱۴۳ اور تقریباً تمام وجودیوں نے کیرک گارڈ کے اس عقیدے کی پیروی کی۔کہ "... That one must choose one's own way without the aid of universal, objective standards."-۱۴۴ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں ان نمایاں تحریکات نے نہ صرف کسی ایک ملک اور سماج پر اپنے اثرات ڈالے۔بلکہ بین الاقوامی سطح پر تقریباً ہر سوسائٹی نے کسی نہ کسی حوالے سے ان اثرات کو قبول کیا۔اور سماج کے حوالے سے ادب/ادیب بھی ان افکار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

مختلف مفکرین اور اہلِ قلم کے نزدیک تصورِ موت / خودکشی:

موت بظاہر کیا ہے؟ سائنس اور عقل کی دُنیا کیا کہتی ہے؟ موت کا اِنسانی جسم پر بظاہر ردعمل کیا ہوتا ہے؟ اِس سوال کی بہت سی جہتیں ہیں۔

...death is an irreversible state, which can be diagnosed

in terms of the cessation of crucial cardio-respiratory and neural functions. Normally it is assumed that death takes place at a specific moment, although from a biological standpoint death can be considered as a more gradual process.-۱۴۵

سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا موت ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ اِس کے اثرات رفتہ رفتہ اِنسانی جسم، اُس کی ذہنی صلاحیتوں اور اُس کی توانائی پر مرتسم ہوتے ہیں۔ یا اچانک، فوری طور پر اِن تمام عوامل کا خاتمہ اِس سے وابستہ ہے۔ تو کسی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ موت کا حوالہ اس کے اثرات اِنسانی جسم اور اِس کی توانائی پر دونوں حوالوں سے اپنا اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ فوری خاتمہ یا رفتہ رفتہ اِنسانی وجود، جسم اور اس کی توانائی کی شکست و ریخت جس سے انسان کے مادی وجود کا مکمل طور پر نا قابل تبدیل اور نا قابل واپسی صورت حال میں ڈھلنا ہے۔

The concept of death is necessarily linked to an irreversible physical change in the state of the organism as a whole.-۱۴۶

دیکھنا یہ ہے کہ کیا جسم اِنسانی کے مندرجہ بالا حوالہ جات سے نا قابل واپسی اور نا قابل تبدیل صورتِ حال مذہب کے حوالے سے بھی کافی سمجھی جا سکتی ہے۔ کیا مذہبی اور روحانی دنیا بھی موت کو اسی یا صرف اسی حوالے سے دیکھتی ہے۔ کیا ایک چیز ''بس'' ہے۔ اور پھر ''بس'' نہیں ہوگی؟ کیا ایک کلچر، جس کی تعمیر و تشکیل میں مذہب و اخلاق ایک امتیازی و انفرادی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس میں موت کا صرف اس قدر حوالہ ہی کافی ہے؟ کیا انسانی شعور، اس کے عقل و فہم کی دنیا موت کو صرف وجود انسانی کی شکست و ریخت تک ہی محدود تصور کرتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ذہن انسانی کی لامحدود تخلیقی صلاحیتیں، اس کی نا قابل تسخیر بلند پروازی کے کیا معنی ہوئے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر موت کا مفہوم ''دانائے کل'' کے حوالے سے کیا ہے؟ انسانی فہم و ادراک اس کا احاطہ کیونکر کر سکتا ہے۔ کیا موت کے یہ محدود معنی خود کائنات اور فطرت کے خود کار نظام میں موجود زندگی کے وجود کو محدود نہیں کرتے؟ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی اور روحانی دنیا کے حقائق و دلائل اس کے اسرار ثابت کرتے ہیں کہ موت محض کسی وجود اور انسانی پیکر کی ظاہری شکست و ریخت اور ایک organism کی ٹوٹ پھوٹ کا نام نہیں۔

"Religious concepts of the transcendence of death only appear contradict known medical concepts of death." -۱۴۷

اور اس ضمن میں یہ بات قابل غور ہے کہ موت کے ساتھ سفر کا تصور ایک تسلسل کو ظاہر کرتا ہے۔ جو حیات سے اختتام تک جاری و ساری ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے اس سفر کی رسائی ہے۔ یہ سفر ایک طرف انسان کی بے اختیاری اور دوسری طرف ''دانائے کل'' کے اختیار کی علامت بھی ہے۔ اکثر ادیبوں نے اپنے کرداروں کے حوالے سے بھی اس نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔ مثلاً شکسپیئر کا ایک کردار کنگ لیئر کہتا ہے۔ "I have a journey, sir, shortly to go, My master calls me, I must not say no." -۱۴۸ سقراط نے بہ رضا و رغبت زہر کا پیالہ پیتے وقت اپنے شاگردوں سے کہا۔ "To live means to be sick for a long time." -۱۴۹ یعنی پوری زندگی جب ایک طویل بیماری کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تو موت کو خوشی سے گلے لگانے میں کیا حرج ہے۔ جس طرح خدا کا تصور اور اس کا وجود موت کی گرفت سے آزاد اور اس کے تصور سے بے خوف و بالاتر ہوتا ہے۔ اسی طرح اہل علم کی فکری پرواز بھی

عموماً اس حوالے سے ایسی ہی دکھائی دیتی ہے۔ بے خوف، بے خطر اور احساس لذت سے بھرپور Phaedo اور جو دوسرے لوگ سقراط کی موت کے وقت اس کے آس پاس موجود تھے۔ ان کے مطابق سقراط

> ...really, totally free of the fear of death. Socrates's laughter on the day of his death, and is making jokes about death seen in a way, God like. He comes close to showing contempt for death.-۱۵۰

موت کے لمحہ میں ہنسی یا مسکراہٹ سے مراد وہ شعور اور آگہی ہے جو صاحب بصیرت مرنے سے پہلے موت سے متعلق پا چکا ہوتا ہے۔ اس کے لئے نہ تو کوئی لمحہ آخر ہوتا ہے اور نہ کیفیت حیرت و استعجاب۔ جس طرح زندگی کو عملی طور پر برتنے میں صاحب بصیرت، علم تجربہ اور مشاہدہ حاصل کرتا جاتا ہے۔ اس طرح داخلی، فکری و روحانی روشنی اسے موت سے متعلق بھی علم اور واردات قلبی عطا کرتی جاتی ہے۔ یہ سفر بظاہر نامحسوس سطح پر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر سچائی، تلاش حق اور موت کی حقیقت کو پانے کا تجسس انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔

اقبال کے یہاں تصورِ موت دیگر بہت سے فلاسفہ عالم کی طرح متحرک، فعال اور ایک نئی زندگی کی نمو پذیری سے عبارت ہے۔ بلکہ کئی حوالوں سے اس میں زیادہ بصیرت اور فکر و دانائی کے رموز پائے جاتے ہیں ان کی تجزیاتی نگاہ، روح کی سرشاری موت کی حقیقت، اہمیت، اس کے وجود کو ہر ہر قدم، پر ہر پہلو سے پرت در پرت مشاہدے اور تجربے کی بھٹی سے گزارتی ہے۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
مجھ کو جو موج نفس دیتی ہے پیغام اجل
لب اسی موج نفس سے ہے نوا پیرا تیرا
میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات
پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو، یہ وہ گوہر نہیں
زندگی محبوب ایسی دیدہ قدرت میں ہے
ذوق حفظ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظام کائنات
آہ ! غافل موت کا راز نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے

گویا اقبال نے موت کو زندگی اور کارزار حیات کیلئے لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ اس کے وجود سے زندگی کی

اہمیت ثابت کی ہے۔ اسی کے دم سے سفر زندگانی میں چہل پہل ہے۔ موت یہاں نئی زندگی اور نئی حرکت وحرارت کا پیغام ہے۔ قدرت خود زندگی، کائنات اور ہر لمحہ تخلیق کی محافظ ہے۔ ایک شے ایک نقش کو مٹانے سے مراد نئے تخلیقی لمحوں کو وجود عطا کرنا اور سفر زندگانی کو فعال اور متحرک رکھنا ہے۔ ورنہ کائنات میں قدم قدم پر موت کا قدم کب کا زندگانی اور رنگ وبو کے سیلاب کو ختم کر چکا ہوتا۔

شکسپیئر نے جہاں دنیا کو سٹیج کہا۔ اور انسان کو اس کے مختلف کرداروں سے تعبیر کیا۔ وہاں موت کو بھی دنیا کی گھما گھمی کی طرح ایک ایسی جگہ سمجھتا ہے۔ جہاں سب لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ملاقات کرتے ہیں۔ گویا اس میں بھی ایک نئی زندگی کا تصور موجود ہے۔ جس کا مخصوص مزاج ہے۔ " And death, the market place, where each one meets." -۱۵۱

غالب کا تصورغم اپنے اندر بڑی توانائی اور تازگی رکھتا ہے۔ غالب کا فلسفیانہ نقطہ نظر غم سے فرار اور مایوسی کی بجائے اسے انسانی زندگی کے لئے لازم وملزوم اور قابل قبول بناتا ہے۔ اس کے ہاں غم انسانی زندگی میں جو حوصلہ اور تاب و طاقت پیدا کرتا ہے۔ ''غم سے خوگر'' ہونا درحقیقت غالب کو زندگی بسر کرنے کا قرینہ سکھاتا ہے۔

ع۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ع۔ غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

اہل قلم اور صاحب بصیرت ہستیوں کے یہاں موت کا تصور اور اس سے لذت شناسی کے عوامل ایک عام انسان سے مختلف ہوتے ہیں۔ زندگی کی خارجی جہت مادی زندگی کے حقائق، حالات و واقعات کے درو بدل کے ساتھ عموماً اس داخلی کیفیت وآگہی کا تعلق نہیں ہوتا۔ یہ ایک فکری پروسس ہے۔ جو اندر ہی اندر چلتا رہتا ہے۔ اور انسانی ذہن کے بارے میں جو کہا جاتا ہے۔ کہ یہ بے پناہ تخلیقی وفکری وقوتوں اور صلاحیتوں کا منبع ہے۔ وہ فکری سرچشمے، جن کے در ابھی شاید وا ہی نہیں ہوئے۔ جن کے طلسماتی افق اور معجزیاتی سرحدیں بظاہر بے دستک ہی دکھائی دیتی ہیں۔ انہیں بھی کبھی کبھار یہ مخصوص داخلی کیفیت اور تجسس چھوتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ جس سے مزید سوالات اور فکر کی لہریں متحرک ہو جاتی ہیں۔ امید، نا امیدی، سوال، جواب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ این ہارٹل اپنی کتاب سے متعلق اس ضمن میں لکھتی ہیں۔

My book began a study of philosophical disappointment and became a questioning of philosophy's claim to console in the face of death.-۱۵۲

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ موت سے متعلق مخصوص نظریات اور مخصوص نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص تصورِ زندگی کو بھی تقویت ملتی ہے۔ موت کیا ہے؟ یا موت کیا ہوسکتی ہے؟ یا موت کیا ہوگی۔ شوکت علی فانی کے یہاں غم کی شدت اور اس کا تاثر بہت گہرا ہے۔ یہاں غم زندگی کی بڑی اور اہم شکل میں موجود ہے۔ کہ اکثر زندگی کے ساتھ اس کا توازن بگڑ جاتا ہے اور غم زندگی کو اس طرح زیر بار کر لیتا ہے۔ کہ گویا غم کے بوجھ تلے زندگی قطرہ قطرہ آنسو بن کر ٹپکتی، سسکتی اور تڑپتی ہے اور دنیا ایک ماتم کدہ میں بدلتی محسوس ہوتی ہے۔

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے، مر مر کے جیئے جانے کا

فانی کے ہاں غم اور موت اکثر ایک دوسرے کے متبادل بن جاتے ہیں۔غم کا روپ فانی کے یہاں زندگی کا لازم وملزوم حصہ نہیں۔ بلکہ زندگی پر مسلط کی گئی کوئی آہ یا چیخ ہے۔فریاد وآہ زادی ہے۔ مایوسی، قنوطیت اور ناامیدی کے عناصر فانی کے یہاں انہی عوامل کے باعث پیدا ہوئے ہیں۔ بقول جوش ملیح آبادی۔ ''یہ پورا کرہ ارض ایک امام باڑہ ہے۔اور اس امام باڑے میں فانی ایک بہت بڑا تعزیہ ہے۔جو مدتوں سے رکھا ہوا ہے۔'' ۱۵۳

جب انسانی فکر اس تجسس وتلاش میں سرگرداں ہوتی ہے۔تو زندگی کے وجود، اس کی اہمیت وحقیقت کا احساس بھی ایک منفرد زاویہ نگاہ کا حامل ہونے لگتا ہے۔ "When the philosophy consoles in the face of death, she is defending the philosophical life." ۱۵۴ مشہور فلاسفر شوپن ہار کا نقطہ نظر نہ صرف اپنے اندر زندگی، موت اور خودکشی سے متعلق ایک خاص انفرادیت اور اہمیت رکھتا ہے۔ بلکہ اس کے نظریات نے دُنیائے ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔

شوپن ہار (۱۷۸۸-۱۸۶۰) جرمنی کا فلاسفر تھا۔ اِس کے نظریات نے مغربی ادبی دُنیا پر گہرے اثرات مرتب کیے۔جن اہم شخصیات نے خاص طور پر شوپن ہار کے فلسفے کے گہرے اثرات قبول کیے۔اُن میں فرائڈ کا نام بھی قابل ذکر ہے۔شوپن ہار کے خودکشی کے حوالے سے جو منفرد نظریات تھے۔ادب کی دُنیا اُن سے محفوظ نہ رہ سکی۔شوپن ہار کے نزدیک "All life is suffering" ۔۱۵۵

شوپن ہار تمام زندگی کو مشکلات اور مسائل کا دوسرا نام دیتا ہے۔زندگی اُس کے نزدیک ایک جبر مسلسل کا نام ہے۔وہ اِنسانی زندگی کو بے پناہ مسائل میں گھرا پا کر اِسے بالکل اسی صورت میں اپنانے کے لئے تیار نہیں۔اور نہ اِنسان کو مجبورِ محض سمجھ کر اُسے ایسے حالات میں زندگی بسر کرتے رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔اور اِس ضمن میں مذہب واخلاق کی تمام عائد کردہ پابندیوں سے بھی بغاوت کرتا ہے۔خودکشی کے نظریے کے حوالے سے شوپن ہار تمام مذہبی ٹھیکیداروں پر طنز وتنقید کرتا ہے۔ "Religious teachers are forced to base their condemnation of suicide on philosophical grounds of their own invention." ۱۵۶

مذہب کے حوالے سے خودکشی کے ضمن میں جو نظریات دیئے جاتے ہیں۔وہ شوپن ہار کو اِس لیے قابل قبول نہیں تھے کہ اُن کو مذہبی ٹھیکیداروں نے خود اپنے فلسفیانہ نقطہ نظر کے مطابق تراشا ہے۔اور وہ فلسفیانہ نظریات محض فلسفے کی حد تک ضرور اہم ہو سکتے ہیں۔لیکن عملی زندگی میں اُن نظریات کی اہمیت اور افادیت کچھ نہیں۔مثلاً خودکشی کو ایک بزدلانہ فعل کہنا شوپن ہار کے نزدیک درست نہیں۔اور نہ ہی خودکشی کرنا کسی پاگل پن کی علامت ہے۔

"They tell us that suicide is the greatest piece of cowardice; that only a madman could be guilty of it." ۱۵۷ شوپن ہار کہتا ہے کہ خودکشی کا عمل اور اِس کا حق رکھنا ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ اِنسان کے پاس اُس کی وراثت یا جائیداد کا حق محفوظ ہوتا ہے۔خودکشی کے فعل کے ضمن میں شوپن ہار چند سوالات اُٹھاتا ہے۔اور اِن سوالات پر غور وغوص کی دعوت دیتے ہوئے اُس کا کہنا ہے۔کہ اگر خودکشی جرم ہے تو پھر ایسا کیوں نہیں ہے۔کہ ایک انسان جو قتل کرتا ہے۔چوری کرتا ہے۔اور یا اِس طرح کے اور جرائم میں ملوث ہوتا ہے۔تو اُس کے لئے ہمارے جو محسوسات ہوتے ہیں۔وہ خودکشی کرنے والے شخص کے لئے ہمارے اندر پیدا نہیں ہوتے۔قاتل چور اور دیگر جرائم کے حامل لوگوں کے لئے فوراً کہتے ہیں کہ اِنہیں سزا ملنی چاہیے۔اِن سے بدلہ لینا چاہیے جبکہ خودکشی کرنے والے شخص

کے لئے ہمارے اندر رحم اور دُکھ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

...In the other hand you will be moved to grief and sympathy, and mingled with your thoughts will be admiration for his courage, rather than the moral disapproval which follows upon a wicked action.-۱۵۸

شوپن ہار خودکشی کرنے والے کیلئے اپنے دلائل اور منفرد نقطہ نظر دیتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ ایک شخص جو زندگی میں بے پناہ مسائل کا شکار ہو کر تنہا رہ جائے۔ دوست، احباب سب اُسکا ساتھ چھوڑ جائیں۔ تو ایسے میں اُس شخص کے پاس مکمل آزادی اور اختیار ہونا چاہیے۔ کہ وہ اپنی زندگی ختم کرے۔ اور ایسا کرنے پر اُسے مجرم کہنا درست بات نہیں۔

...Who has not had acquaintances, friends, relations, who of their own free will have left this world; and are there to be thought of with horror as criminal?-۱۵۹

شوپن ہار کے نزدیک وہ شخص جو زندگی میں بے پناہ مسائل میں گھرا ہوا ہو۔ اُس کی خودکشی کی صورت میں کسی شخص اور مذہب و اخلاق کے ٹھیکیداروں کو بھی یہ حق حاصل نہیں۔ کہ وہ اُسے مجرم قرار دیتے ہوئے اُس کے اس فعل پر تنقید کریں۔ اور اُس کی خودکشی کے عمل کو رد کرتے ہوئے اپنے نقطہ نظر کو تقویت دیں۔

"They have no Biblical authority to boast of, as justifying the condemnation of suicide"-۱۶۰ مزید برآں خودکشی کے مرتکب شخص کے لئے کوئی سزا تجویز کرنا یا جرمانہ وغیرہ ۔ان تمام باتوں کا کوئی جواز دکھائی نہیں دیتا۔ اور اگر سماج اُس کے ساتھ ایسا کرتا ہے۔ تو وہ شخص ان تمام عوامل، جرمانہ اور سزا وغیرہ سے بھلا کیونکر خوفزدہ ہوگا۔ یا خوفزدہ ہو سکتا ہے۔ جو موت سے کسی قسم کا خوف نہیں رکھتا۔ "What penalty can frighten a man who is not afraid of death itself?"-۱۶۱

شوپن ہار اپنے نقطہ نظر کو تقویت دینے کے لئے اپنے سے پہلے زمانوں کے اُن فلاسفر کا تذکرہ کرتا ہے۔ جنہوں نے خودکشی کے فعل کو نہ صرف پسندیدہ کہا۔ بلکہ اُسے دلائل کے ساتھ سراہا۔ مثلاً وہ ایک فلاسفر Pliny کا حوالہ دیتا ہے۔ جس نے خودکشی کے عمل کو زندگی میں ایک مستحسن اقدام کہا ہے۔

Life is not so desirable a thing as to be protected at any cost. Whoever you are, you are sure to die, even though your life has been full of abomination and crime.-۱۶۲

شوپن ہار نے خودکشی کے فعل کو ایک نئے اور منفرد زاویہ نگاہ سے دیکھا اور اس کا اظہار کیا۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی میں ایک پریشانیوں میں گھرے ہوئے شخص کیلئے جہاں قدرت کی بے پناہ نعمتیں موجود ہیں۔ وہاں ایک یہ نعمت بھی موجود ہے۔ کہ خود کو موت کے حوالے کر دینے کا اختیار اور موقع بھی انسان کے پاس موجود ہے۔ اور انسان کے لئے زندگی کی پریشانیوں سے بچنے اور ان کے ازالے کی ایک صورت یہ بھی ہے۔ کہ انسان حصول موت کیلئے اپنے اس اختیار کو استعمال کرے۔ شوپن ہار تاریخ کے ان بڑے ناموں اور ہیروز کا ذکر کرتا ہے۔ جنہوں نے خودکشیاں کیں۔ ... in ancient times how

many heroes and wise men died a voluntary death."-۱۶۳

چنانچہ تاریخی ادوار میں اگر کچھ فلاسفر نے خودکشی کے فعل کو درست نہیں کہا۔ تو ان کے ساتھ ساتھ کچھ فلاسفر کے نام خودکشی کے فعل کو سراہنے میں اہم ہیں۔ مثلاً ارسطو اگر خودکشی کو ملک کے لئے کوئی بہتر عمل نہیں سمجھتا۔ تو بقول شوپن ہار Stobacus خودکشی کو ان الفاظ میں سراہتا ہے۔

> The good man should flee life when his misfortune become too great; the bad man, also, when he is too prosperous.-۱۶۴

گویا ان فلاسفر نے انسانی زندگی میں خودکشی کی اہمیت اور ضرورت کو اسی طرح سے اجاگر کیا جیسے انسان دیگر ضروریات زندگی کیلئے متفکر ہوتا ہے۔ شوپن ہار نے خودکشی سے متعلق اپنے مخصوص نقطۂ نظر اور سیر حاصل بحث کو مزید تقویت اس طرح سے دی۔ کہ اپنے ہم خیال فلاسفر کا نقطہ نظر بھی اس ضمن میں پیش نظر رکھا۔

> We find that the stoics actually praised Suicide as a noble and heroic action... Seneca, who expresses the strongest approval of it.-۱۶۵

ان فلاسفر نے خودکشی کے عمل کو ایک بہادری عزت آور ہیروازم کے روپ میں پیش کیا۔ جسکا بزدلی اور کسی جرم کے ساتھ دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔ Suicide thwarts the attainment of the highest moral aim by the fact that, for a real release from this world of misery...-۱۶۶

مجموعی طور پر شوپن ہار کے نظریات، جو اُس نے خودکشی سے متعلق پیش کئے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شوپن ہار خودکشی کے عمل کو انسانی زندگی میں اس لئے اہم سمجھتا ہے۔ کہ انسان دُکھوں سے بھرپور زندگی سے چھٹکارا پانے کیلئے خودکشی سے بہتر کوئی اور راستہ نہیں پاتا۔ جب انسان تکلیف اور آزاری کی حالت میں ہوتا ہے۔ تو مذہب، اخلاق، سماج اور احباب کوئی بھی اُس کی تکلیف رفع نہیں کرتے۔ اور اگر انسان اس حالت میں خودکشی کر کے اس آزار سے نجات پالے۔ تو سماج اور مذہب کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ کہ خودکشی کرنے والے شخص کو مجرم یا بزدل کہیں۔ کیونکہ شوپن ہار کے نزدیک خودکشی کا فعل بہادری، خودانحصاری اور ایک باعزت مقام کا حامل ہے۔ مزید برآں یہ کہ خودکشی کرنے والے شخص کیلئے ہمارے دل میں جو دُکھ، رحم اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ قتل، ڈاکہ، چوری اور اس نوع کے دیگر جرائم کے حوالے سے ہمارے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے بھی کی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ خودکشی کرنا کوئی جرم یا بزدلی نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ اس ضمن میں شوپن ہار کا نقطۂ نظر یہ ہے۔ کہ مذاہب نے از خود خودکشی کے فعل کے لئے کوئی زیادہ بات یا وضاحت نہیں کی ہے۔

شوپن ہار کے اس فلسفہ نے خودکشی کے حوالے سے جس نقطہ نظر کو آگے بڑھایا۔ عالمی ادب پر بالواسطہ اور بلا واسطہ اُس کے ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے۔ اکثر ادباء اور فلاسفر نے موت کی اہمیت کو زندگی کے حوالے سے دیکھا اور تجزیہ کیا ہے۔ زندگی کے متوازی موت کا سفر اور زندگی کے بعد موت کا ایک نیا پس منظر اس فکری جہت کو جدت اور تازگی عطا کرتا ہے۔

> Death is a gateway to the other world in more than the

literal sense. According to the most theories of early religions, a great deal, if not all, of religious inspiration has been derived from it, and in this, orthodox views are on the whole correct... death and its denial. Immortality have always formed, as they form today, the most poignant theme of man's forebodings.-۱۶۷

موت کو ادیبوں اور فلاسفر نے کہیں تو اس دنیاوی زندگی کا اختتام کہا ہے۔ جس سے کسی کو فرار نہیں۔ کہیں اسے سفر کا نام یا کیفیت سفر کیا گیا ہے۔ کہیں اسے لامحدود اور ابدی زندگی کے حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ کہیں اسے پُرسکون نیند کا نام دیا گیا ہے۔ اور جب نیند کہا تو نیند سے مراد بھی مکمل مدہوشی اور سرمستی میں گم ہونے کی کیفیت ہے۔ "We are such stuff, as dreams are made on, and our little life, it rounded with a sleep." -۱۶۸ موت یہاں کئی حوالوں سے اِنسان کے لئے بے نیازی، بے خوفی اور ایک مخصوص سرمستی و مدہوشی کا عنوان بھی بن جاتی ہے۔
اس کے ساتھ ساتھ ایک اور سوچ بھی متحرک ہوتی ہے کہ قدرت اپنی تخلیق کو، انسان کو مکمل طور پر بناتی، سنوارتی اور پھر توڑ کر ایک نئے تخلیق عمل میں سرگرداں ہو جاتی ہے۔ اور اس تخلیقی عمل کو کہیں پر بھی بس نہیں ہے۔ شیکسپیر کا ایک کردار اس سوچ پر مبنی گفتگو کرتا ہے۔ "Let me shape, and there an end"-۱۶۹ کہیں اِسے پھول، کبھی شبنم اور کسی نے اِسے نور کہا ہے۔

مثلاً شیکسپیر کا ایک کردار دوسرے کردار کیلئے کہتا ہے۔ رومیو اینڈ جیولیٹ Death lies on her like an Untimely frost, upon the sweatest flower of all the field.-۱۷۰

اس ضمن میں ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے۔

A man that apprehends death no more dreadful but as a drunkea sleep, careless, reckless, and fearless of what's past, present, or to come, insensible of morality and desperately mortal.-۱۷۱

موت کا وجود، کائنات میں اِس کی ضرورت، اِس کی اہمیت، فطرت کے اٹل اور مضبوط ترین قوانین اور حکمت عملی کے ساتھ بھی وابستہ ہے۔ یہ ایک سائنسی اور عقلی توجیہہ سے عبارت ہے۔ موت تند و تیز جھکڑ کی مانند ہر شے کو بے برگ و بار کر جاتی ہے۔ پھر ایک نئی زندگی، نیا وجود، نئی فکر، نئی نسل صفحہ ہستی پر حیاتِ نو کا عنوان بن جاتی ہے۔

...Mutation to be of any use, requires a succession of generation... Death is necessary, so that one generation can make space for the next, in which such changes, as have occured can be tested.-۱۷۲

گویا عقلی دلائل سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ موت کا وجود جس طرح سے ایک عام و عامی کے سامنے مایوسی، نا اُمیدی، خوفزدگی یا اُداسی کا موجب ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پس پردہ قدرت کے بے پناہ اسرار پوشیدہ ہیں۔ یہ سارے عوامل اور محسوسات انفرادی حد تک اپنے منفی اور تاریکی پر مبنی اثرات کے موجب تو ہو سکتے ہیں۔ لیکن جزو

کل بننے، قطرہ کو سمندر ہونے کے حوالے سے انسان کا شعور پختہ ہوتا ہے۔ گردوپیش کے حالات وواقعات، مثبت اور منفی قوتوں کے درمیان اہل فکر کی سوچ اور رویوں میں ایک خفی انقلاب جڑ پکڑ لیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں وہ خود کو داخلی اور خارجی قوتوں سے متصادم پاتا ہے۔ اُس کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ اُس کو فنا بھی آ سکتی ہے۔ وہ ختم بھی ہو سکتا ہے۔ موت اُس کے اندر ہے یا باہر۔ وہ خود کو کیسے بچائے؟ یہ سوال اُسے درپیش ہے۔ اور کبھی کبھار یہ سوال اُس کے اندر خوفزدگی کی صورت بھی پیدا کر دیتا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خودکشی کی صورت میں جدید ریسرچ کے مطابق دس میں سے آٹھ افراد اپنے ارادوں کے بارے میں گردوپیش کو ضرور باخبر کر دیتے ہیں۔ مثلاً بقول انعام الرحمٰن سحری

۔۔۔میں نے زندگی میں بہت کچھ دیکھ لیا۔ دوسری دُنیا اِس دُنیا سے زیادہ خوبصورت ہے۔۔۔زندگی نے مجھے دیا ہی کیا ہے۔ محرومیاں اور مسائل۔۔۔ مجھے ابدی سکون کی ضرورت ہے۔۔۔ پائیدار سکون کی تلاش۔۔۔۔۱۷۳

اِس حوالے سے اِس طرح کے محسوسات، خیالات، حیاتِ ابدی اور سکون کی تلاش کی جستجو اَدیبوں/دانشوروں میں نسبتاً زیادہ ہے۔

... man first regards himself as immortal, death being an avoidable accident: then in a second stage, he regards himself as mortal because of evil spirits out himself. Death wants him', as he says paranoiacally. Man then believes that he bears death within himself... death being a disease that the witch-doctor must cure...۔۱۷۴

اور کبھی کبھار اِس خوفزدگی (جس کا اوپر ذکر ہوا ہے) کے ساتھ بیرونی مخالف ومتصادم قوتوں کا ایک ایسا امتزاج بنتا ہے کہ اُس کے رویے زندگی سے متعلق بدلنے لگتے ہیں۔ اور اکثر اِن رویوں میں سے ایک امتیازی رویہ خودکشی سے بھی منسلک ہو جاتا ہے۔ اُس صورت میں "... he cannot reconcile himself to the idea of a natural death!"۔۱۷۵ اِنسان کے اندر یہ رویہ عمومی اور خصوصی، عام وخاص دونوں حوالوں سے ہے۔ یہ ضرور کہ خصوصی حوالوں سے اِس کا پروسس شدید تر ہو جاتا ہے۔

مثلاً علامہ اقبال لاہور سے ۱۹ اپریل ۱۹۰۹ء کو اپنے گھریلو مسائل کے بارے میں عطیہ فیضی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "۔۔۔واحد علاج یہ ہے کہ میں اِس بدبخت ملک کو چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں۔ یا پھر شراب نوشی میں پناہ لوں۔ جو خودکشی کو آسان بنا دیتی ہے۔"۔۱۷۶

یہاں شراب نوشی میں پناہ لینے کا اِشارہ بھی اِس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ پھر اِس اقدام کی انتہائی صورت خودکشی پر ہی اختتام پذیر ہوتی ہے۔ جس سے اِس بات کو تقویت ملتی ہے کہ نشے کا استعمال اور اِسکی زیادتی بلاواسطہ نہ سہی، بالواسطہ طور پر حصول مرگ کی خواہش سے ہی سرشار ہوتی ہے جو خودکشی ہی کی ایک صورت ہے۔ اور بعض ادیبوں نے اِس خواہش کی سرشاری کو خلوص نیت کے ساتھ سینچا۔ اِس سرشاری میں بدمست بھی رہے اور اِسے اندر ہی اندر کسی خاص جذبے

اور اہم موضوع کے طور پر نہ صرف محسوس کیا بلکہ مسلسل اِس کی آبیاری کرتے رہے۔ مثلاً ابن انشاء کے لئے ممتاز مفتی لکھتے ہیں۔

> اِن دِنوں ابن انشاء میں خودکشی کا رُجحان بڑی شدت پر تھا۔ یہ رُجحان موروثی تھا۔ درحقیقت اِسے زندگی سے محبت تھی۔ موت کا ڈر اِتنی شدت سے غالب تھا کہ کبھی کبھی اِس کے اعصاب پر سوار ہو جاتا۔ جس سے گلوخلاصی کے لئے وہ جذبہ خودکشی کا سہارا لیتا تھا۔ ہر چھ ماہ یا سال کے بعد اِسے شدت کا دورہ پڑتا تھا۔ ۱۷۷

یہ صورتِ حال کچھ اسی قسم کی ہے۔ جس کے لئے Andre Haim لکھتا ہے۔

> "He tries to situate death outside himself, to believe that it is coming to kill him."۔ ۱۷۸

دورے کی یہ کیفیت ایک جنون کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک ایسا جنون، ایک ایسی کیفیت، جس کے اندر اِنسان خود کو ''بننے'' لگتا ہے۔ اُسی میں ہی اِنسان پھر زندہ رہتا اور زندہ رہنا چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال ہے جو اِنسان کو رفتہ رفتہ ایک مخصوص طرزِ حیات کا عادی بنا دیتی ہے۔ اور بالخصوص ادیبوں کے ہاں یہ عادت ایک فکر آمیز صورت میں پنپنے لگتی ہے اور پھر وہ نہ اِس سے باہر آسکتے ہیں اور نہ اِس کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ اسی ضمن میں ممتاز مفتی احمد بشیر کے حوالے سے ابن انشاء کی خودکشی کے ساتھ دلچسپی کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔

> چند ہی روز میں احمد بشیر کو اِس بھید کا پتہ چل گیا کہ ابن انشاء کو خودکشی کے شدید دورے پڑتے ہیں۔ ایک روز احمد بشیر نے بر سبیل تذکرہ سرسری انداز میں بات چھیڑی۔ کہنے لگا، 'یار مجھے خودکشی کے دورے پڑتے رہتے ہیں'۔ 'اچھا، تمہیں بھی'۔ اِنشاء نے حیرانی سے پوچھا، 'تمہیں بھی پڑتے ہوں گے۔ سبھی آدمیوں کو پڑتے ہیں۔ یار، یہ ایک فطری اور صحت مند جذبہ ہے۔ ہمیں پورا حق حاصل ہے کہ جب چاہیں اپنی زندگی کو ختم کرلیں۔
> ۱۷۹

اِس سے اِس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اِنسان موت کی اَن دیکھی حقیقت اور اِس کے نئے تجربے کی صورت حال سے دوچار ہونے سے قبل ہی ایک سحر اور حیرت زدگی کی کیفیت میں اُس کے آنے سے پہلے ہی اُس کی گھات میں لگ جائے۔ جیسے حملہ آور کے آنے سے پہلے ہی اُس پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی تیار کر لی جائے۔ اِس کے پیچھے فتح و کامرانی کا نشہ بھی ہے۔ اور احساسِ شکست سے بچنے کی حکمت عملی بھی۔ تفکر کی یہ گہرائی اور اِس کی منفرد صورتِ حال بھی عام و عامی کی نسبت خصوصی طور پر ادیبوں کے ساتھ ہی وابستہ ہوتی یا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہاں خودکشی صرف وجود کا خاتمہ نہیں رہتا۔ مثلاً اس ضمن میں مظہر الاسلام کا ایک کردار کہتا ہے۔ ''سوچ سوچ کر میں اِس نتیجے پر پہنچا تھا کہ خودکشی کرنا بھی زندہ رہنے کے لئے بہت ضروری ہے۔''۔ ۱۸۰

گویا اِنسان زندہ رہنے کے لئے جو تدابیر کرتا ہے۔ وہ تدابیر اُسے بعض اوقات خودکشی کے حوالے سے بھی اختیار کرنا پڑتی ہیں۔ اور یہ بھی ایک ادیب ہی کی سوچ ہے۔ یہی سوچ اُسے رفتہ رفتہ موت کے قریب کرتی جاتی ہے۔ وہ پھر نہ صرف اِس کی تمنا کرنے لگتا ہے بلکہ اپنی سوچ میں، اپنے فن میں اِس کے ذکر سے ایک طرح کی تقویت بھی حاصل کرتا

ہے۔ مثلاً مظہر الاسلام کا ایک کردار خود مصنف کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ ''تمھیں موت سے بہت پیار ہے۔ تم اپنی خودکشی کے لئے راہ ہموار کرتے رہتے ہو''۔۱۸۱ ''اگر اُس کی مرضی کی موت ہوتی۔ تو اُس نے اُس وقت خوبصورت لباس پہنا ہوتا۔ خوشبو لگائی ہوتی''۔۱۸۲

سوچ کا یہ انداز بھی ایک مثالی اور آئیڈیل طرزِ حیات کا غماز ہے۔ جہاں موت زندگی بھی ہے۔ اور اِسے پانے کی خواہش اور طریقہ کار بھی منفرد اور اختیاری سطح پر نظر آتا ہے۔ یہاں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ اور وہ ہے۔ کہ اِنسان کا زندگی اور موت سے متعلق رویہ، اُس کی فطرت، اُس کا مزاج۔ کیونکہ اِسی کے تانے بانے سے اُس کا ہر قول وفعل متاثر ہوتا ہے۔ اور ادیبوں میں اِس کا تناسب نسبتاً زیادہ ہے۔ مثلاً مظہر الاسلام کی رائے میں ''میں بڑا جذباتی اور جلد باز اِنسان ہوں۔ موت سے محبت کی وجہ بھی جلد بازی کا اور زندگی کا اِختصار ہے''۔۱۸۳

شواہد بتاتے ہیں کہ جذباتی ہونا اور جلد بازی کی کیفیت سے خودکشی کے عمل کو تقویت ملتی اور ملی ہے۔ اِسی سے یہ احساس بھی شدید تر ہوتا جاتا ہے کہ زندگی مختصر ہے۔ کچھ ہونے والا ہے۔ لہٰذا کچھ ہونے سے پہلے ہی اُس ہونے والے تجربے سے گزر لیا جائے۔ یہاں ایک نہایت اہم نوعیت کی صورتِ حال موجود ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح ایک ادب دوسرے ادب سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک ادیب دوسرے ادیب کے اثرات قبول کرتا ہے۔ اِسی طرح کسی ادیب کو زیادہ پڑھنے والا قاری بھی اُس ادیب کے نظریات وافکار سے شدت کے ساتھ متاثر ہوتا ہے۔ اِسے وہ نہ صرف ذہنی وفکری طور پر بلکہ عملی طور پر بھی اُس کا اثر لیتا ہے۔ یہاں بھی جذبات اور جلد بازی کی کیفیت اُس پر طاری ہوجاتی ہے۔ وہ پھر اُس کے ہر قول وفعل کو حرفِ آخر مانتا ہے۔ اِس حوالے سے مظہر الاسلام کے ایک قاری نے عین اُس روز خودکشی کی جو مظہر الاسلام کا جنم دن تھا۔ یہ صورتحال اِس طرح سے کسی اقدام کو گلیمرائزڈ بھی کر دیتی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ خودکشی کا اقدام بھی ادب میں بعض حوالوں سے گلیمرائزڈ ہوا ہے۔ چاہے وہ کسی ادب کے حوالے سے ہو۔ ایک ادیب کا دوسرے ادیب کے حوالے سے ہو۔ یا قاری کا کسی مخصوص ادیب اور اُس کے مخصوص نظریات کی بناء پر ہو۔ اور گلیمر یہ بھی ہے کہ کمسنی کی عمر میں کسی موت (خصوصاً جو خودکشی کے حوالے سے کی گئی ہو) پر لوگوں کا فوری اور شدید ردِعمل دیکھ کر اُس کا اثر لیا جائے۔ وہ اثر جو غیر اِرادی طور پر ہمیں اُس کی طرف نہ صرف مائل وراغب کرے۔ بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی سمت کھنچتا شروع کر دے۔ اور پھر وہ فطرت کا ایک حصہ اور اُس کا مخصوص زاویہ نگاہ بن جائے۔ یہاں ان مفاہیم میں کئی نئے عوامل کی شمولیت بھی ہوتی جاتی ہے۔ مثلاً دوسروں کی پیروی میں کوئی کام کرنا یا بظاہر کسی پُرکشش عمل کو دیکھ کر کسی نئے تجربے سے گزرنے کا خیال آنا۔ ایسے میں بظاہر اِس عمل کے ساتھ کوئی خارجی وجہ وابستہ نہیں ہوتی۔ مثلاً بقول مظہر الاسلام

> اچھا ہوا، کہ تم نے کسی مجبوری کے تحت یا حالات کے ہاتھوں تنگ آ کر خودکشی نہیں کی۔
> بلکہ خودکشی کرنے کی غرض سے خودکشی کی ہے۔ ورنہ تمہاری خودکشی بھی بہت سی
> خودکشیوں میں شمار ہوتی۔ جو دُکھوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کی جاتی ہیں۔
> ایسی خودکشی بے معنی ہے۔۱۸۴

یہاں خودکشی کے عمل میں ایک ادیب کی سوچ کا پرتو ملتا ہے۔ وہ سوچ جو عام وعامی سے بالکل مختلف ہے۔ جس میں زندگی سے فرار کا کوئی پہلو موجود نہیں۔ جس کو ادیبانہ سوچ کوئی معنی دینا چاہتی ہے۔ وہ معنی جو بظاہر اِسرار کے حامل ہیں لیکن اِس کی داخلی جہت میں کوئی دانشوری موجود ہے۔ جو حساس مزاج کی عکاس ہے۔ ''چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہمیشہ ناراض ہو جاتا

ہے۔ حد سے زیادہ جذباتی ہے۔۔۔ وہ بہت زیادہ اَنا پرست ہے۔ اپنے آپ کو سزا دیتا ہے۔'' ۔۱۸۵
خودکشی کے حوالے سے یہ سطور صرف کسی ایک فرد کے جذبات ہی کی عکاس نہیں ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ادیب غیر محسوساتی سطح پر اپنے آپ سے، سماج کے غیر متوازن رویوں سے جنگ کرتا رہتا ہے۔ یہی ایک سزا ہے جو اُسے داخلی کرب سے دوچار کرتی ہے۔ کیونکہ ''وہ بے حد حساس ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔'' ۔۱۸۶

وہ غیر متوازن رویے جو دوسرے کے لئے تو شاید قابل قبول ہوں۔ لیکن ادیب کی حساس طبیعت کے لئے وہ کسی طور گوارا نہیں۔ اِسی کے باعث اُس کا داخلی کرب، اُس کی خارجی زندگی کا بھی بعض اوقات مزاج اور کیفیت بگاڑ دیتا ہے۔ مظہر الاسلام کا اسی ضمن میں کہنا ہے۔

کبھی کبھی اُس کی کیفیت ایسے شخص جیسی ہو جاتی ہے۔ جسے تھوڑی دیر بعد مر جانا ہوتا ہے۔ اور وہ غیر اِرادی طور پر اپنے رشتوں کی ڈوریاں یوں کاٹنے لگتا ہے۔ جیسے دیہات سے لائی گئی مرغی کو ذبح کرنے سے پہلے اُس کی ٹانگوں سے بندھی رسی یا لیر کاٹی جاتی ہے۔ ۔۱۸۷

یہ ایک اضطراری کیفیت ہے۔ حالات سے سمجھوتہ نہ کرسکنے کی ایک المناک صورتِ حال۔ جو اکثر خودکشی اور اقدامِ خودکشی کرنے والوں کو درپیش رہی ہے۔ اور بعض اوقات ایک نفسیاتی جنگ کی صورت بھی اختیار کرلیتی ہے۔ مثلاً ن م راشد کی ایک نظم ہے۔ ''خودکشی''۔ اس میں کچھ اِس طرح کی ذہنی کش مکش دِکھائی دیتی ہے۔

''گھر پہنچتا تھا میں اِنسانوں سے اُکتایا ہوا۔
میرا عزم آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج''۔۱۸۸

ادیبوں کی خودکشی کے حوالے سے یہ پہلو قابل ذکر ہے کہ انہوں نے موت کو اس لیے بھی اپنے لیے منتخب کیا۔ کہ موت ہی ان کے نزدیک ایک خالص ترین شئے ہے۔ ایک خالص ترین کیفیت کا نام۔ جس میں آلودگی کا کوئی ذرہ تک نہیں۔ یہاں اس حوالے سے ایک انتہائی جذباتی شدت احساس موجود ہے۔ جو خصوصیت کے ساتھ عالم شباب سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کہ اسی عالم شباب میں، اسی شدت نظری کے ساتھ زیادہ تر ادیب خودکشی اور اقدام خودکشی کے مرتکب ہوئے۔ ذاتی زندگی میں ناآسودگی، خارجی زندگی کے نامساعد حالات سے بد دل ادیبوں کو خواہش مرگ ایسے ہی مخصوص حالات میں خودکشی کی طرف لے گئی۔ اور اپنی ذات کی سولی پر لٹکا ہوا ادیب مخصوص قسم کی تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ''خودکشی کی وجہ کسی سے کوئی جھگڑا یا محبوبہ کی بے وفائی بھی نہیں تھی۔ بس ایک خاص طرح کی تنہائی تھی۔ جو محفل میں بیٹھے ہوئے بھی اس کے گرد لپٹی رہتی تھی۔'' ۔۱۸۹

یہاں اِس صورتِ حال کی عکاسی ہوتی ہے کہ اِس طرح کے مخصوص حالات میں ادیب تنہا پسند بھی ہوئے۔ وہ تنہائی جو بظاہر خاموشی کی زبان تھی۔ لیکن سمندر کی اُس پرسکون سطح کی مانند جس کے اندر مضطرب اور سرکش موجیں ٹھاٹھیں مار رہی ہوں۔

موت اور خودکشی سے متعلق اہلِ فکر کا مخصوص اور مختلف نقطہ نظر اپنے بے پایاں اظہار کے باوجود بھی اپنے اندر

حوالہ جات

۱۔ The Concise Oxford Dictionary of current English, 190,000 definitions, 120,000 entries. The New Edition for the 1990S, Eighth Edition, Edited by R.E Allen clarendon press, oxford,1990, P, 1220.

۲۔ Webster's New world, college Dictionary Fourth Edition, Definition that set the Standard for Darity more than 12,000 Americanisms updated every year, the official Dictionary of the associated press 2001, P,1432.

۳۔ Urdu English Dictionary, Feroz Sons, Urdu English Dictionary, A comprehensive Dictionary of current vocabulary, revised edition,P,337.

۴۔ English to English and Urdu Dictionary, Ferozsons (Pvt) Limited, New Edition, P, 933.

۵۔ فیروز اللغات اردو، جامع، نیا ایڈیشن، (جدید ترتیب اور اضافوں کے ساتھ)، (مرتب) الحاج مولوی فیروز الدین، لاہور، س ن

۶۔ فیروز اللغات فارسی، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۵۲، ص، ۴۲۳۔

۷۔ Practical Dictionary, English into English and Urdu, Kitabistan Publishing Co. Urdu Bazar, Lahore, P, 653.

۸۔ Suicide, From wikipedia, the free Encyclopaedia.

۹۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۲واں ایڈیشن، ۲۰۰۵، ص، ۱۲،

۱۰۔ انعام الرحمٰن سحری، خودکشی (ایک مکمل مطالعہ) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸، ص، ۴۱،

۱۱۔ ایضاً، ص، ۴۷

۱۲۔ ایضاً، ص، ۴۸

۱۳۔ Linda Meeks, Philip Hert, the Ohio State University, Everyday Learning Corporation, U.S.A, 1996, P, 06.
۱۴۔ Lauren B. Alloy, Joan Accocella, Abnormal Psychology, Seventh Edition, Last Printed in U.S.A, 1972, P, 243.
۱۵۔ Andre Haim, Adolescent Suicide, Translated by A.M. Sheridan Smith, Tavistock Publication, P, 06.
۱۶۔ Suicide, From Wikipedia, the free Encyclopaedia.
۱۷۔ اردو انسائیکلوپیڈیا، تیسرا ایڈیشن، فیروز سنز، لاہور، جنوری ۱۹۸۴، ص، ۴۵۷
۱۸۔ ایضاً ص، ۷۵۷
۱۹۔ اردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز، لاہور، باراول ۱۹۶۲ء، ص، ۶۸۷
۲۰۔ Suicide, From Wikipedia, the free Encyclopaedia.
۲۱۔ Linda Meeks, Philip Hert, the Ohio State University, U.S.A. 1996, P, 06.
۲۲۔ Suicide, From Wikipedia, the free Encyclopaedia.
۲۳۔ انعام الرحمٰن سحری، خودکشی (ایک مکمل مطالعہ)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸، ص، ۲۴
۲۴۔ Suicide, From Wikipedia, the free Encyclopaedia.
۲۵۔ Ibid.
۲۶۔ انعام الرحمٰن سحری، خودکشی (ایک مکمل مطالعہ) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸، ص، ۲۶۵
۲۷۔ حسن رضوی، ڈاکٹر وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر، ناصر کاظمی، شخصیت اور فن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶، ص، ۴۸
۲۸۔ سورۃ النساء، القرآن، آیت نمبر، ۱۲۵
۲۹۔ سورۃ المائدہ، القرآن، آیت نمبر، ۳
۳۰۔ چوہدری غلام رسول، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، ہندومت، جین مت، بدھ مت، علمی کتاب خانہ، اردو بازار، لاہور، س ن، ص، ۲
۳۱۔ ایضاً
۳۲۔ ایضاً
۳۳۔ Chambers Twentieth Century Dictionary, Edited by AM Macdonald B.A (oxon) 1975, P, 1141.
۳۴۔ The Cambridge Encyclopaedia, Cambridge University Press, Sydney, 1991, P, 1015.
۳۵۔ جامع نسیم اللغات، اردو، مرتبین سید قائم رضا امروہوی، سید مرتضیٰ حسین فاضل، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، نمبر ۲، س ن، ISBN-969-31-0727، ص، ۱۰۶۶
۳۶۔ قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، (مرتب) ڈاکٹر جمیل جالبی، سروسز بک کلب، اسلام آباد، ۱۹۹۴، ص، ۱۶۶۶
۳۷۔ ولیم جیمز، نفسیات وارداتِ روحانی، (مترجم) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم، نومبر ۱۹۶۵ء، ص، ۷۴۵
۳۸۔ چوہدری غلام رسول، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ۔ ہندومت، جین مت، بدھ مت، علمی کتاب خانہ، اردو بازار، لاہور، س ن، ص، ۸

۳۹۔ ولیم جیمز، نفسیات وارداتِ روحانی، مترجمہ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم، نومبر ۱۹۶۵ء، ص ۱۸، ۲۶

۴۰۔ ایضاً، ص، ۷۸

۴۱۔ Moeen Akhtar, What is death, Dar-ul-Tazkeer, Lahore, 1998, P, 09

۴۲۔ Suicide, from Wikipedia, the free Encyclopaedia

۴۳۔ Ibid

۴۴۔ Ibid

۴۵۔ چوہدری غلام رسول، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، ہندومت، جین مت، بدھ مت، علمی کتاب خانہ، اردو بازار لاہور، س ن، ص ۲۱۶

۴۶۔ Moeen Akhtar, what is death, Dar-ul-Tazkeen, Lahore, 1998, P, 09.

۴۷۔ سورۃ آل عمران، القرآن، آیت، ۱۴۵

۴۸۔ سورۃ النساء، القرآن، آیت ۷۸

۴۹۔ سورۃ الانبیاء، القرآن، آیت نمبر ۳۴، ۳۵

۵۰۔ سورۃ مکی، القرآن، آیت نمبر ۱۹

۵۱۔ سورۃ الواقعہ، القرآن، آیت نمبر ۶۷، ۶۸

۵۲۔ سورہ البقر، القرآن، پارہ ۱، آیت نمبر ۴۶

۵۳۔ بحوالہ محمد منظور عثمانی، مولانا مصارف الحدیث، جلد سوم، ادارہ اشاعت حدیث، لاہور، س ن، ص، ۴۴۱

۵۴۔ القرآن، پارہ ۲۱، آیت نمبر ۱۹

۵۵۔ بحوالہ انعام الرحمٰن سحری، خودکشی ایک مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص، ۱۶۲

۵۶۔ چوہدری غلام رسول، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، ہندومت، جین مت، بدھ مت، علمی کتاب خانہ، اردو بازار، لاہور، س ن، ص، ۲

۵۷۔ اردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز، لاہور، تیسرا ایڈیشن، جنوری ۱۹۸۴ء، ص، ۷۵۷

۵۸۔ Suicide, From Wikipadia, the free Encyclopaedia

۵۹۔ انعام الرحمٰن سحری، خودکشی (ایک مکمل مطالعہ) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص، ۱۳۹

۶۰۔ ایضاً، ص، ۱۵۵

۶۱۔ جنگ روزنامہ سنڈے میگزین ۲۶ مارچ، ۲۰۰۶، ص، ۱۳

۶۲۔ ایضاً

۶۳۔ سورہ بنی اسرائیل، القرآن، آیت ۸۵

۶۴۔ سورۃ الحجر، القرآن، آیت، ۳۸، ۳۹

۶۵۔ نفسیات، پنجاب ایجوکیشنل پریس، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور، اشاعت، جون، ۱۹۹۱، ص، ۴

۶۶۔ نفسیات، اعتصام پبلشرز، چوک اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۷، ص، ۱۴، ۱۵

۶۷۔ ولیم جیمز، نفسیات وارداتِ روحانی، (مترجم) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم، نومبر، ۱۹۶۵، ص، ۲۰۶

۶۸۔ Anne Hartle, Death and the Disinterested Spectator, State University of New York Press, 1986, P, 20

۶۹۔ The Arden Shakespear, Death, book of Quotations, compiled by Jane Armstrong, Printed in Singapore, Seng Lee Press, 2001, P, 26

۷۰۔ Ibid, P, 48

۷۱۔ بحوالہ جنگ سنڈے میگزین، ۲۶ مارچ، ۲۰۰۶، ص، ۱۳

۷۲۔ Anne Hartle, Death and Disinterested Spectator, State University of New York Press, 1986, P, 51.

۷۳۔ بحوالہ چوہدری غلام رسول، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، ہندومت، جین مت، بدھ مت، علمی کتاب خانہ، اردو بازار ، لاہور، س ن، ص، ۲۴۴

۷۴۔ Margaret S. Stroebe, Wolfging stroebe, Robert O. Hanson, Hand Book of Bereavement, Cambridge university Press, 1993, P, 79

۷۵۔ David G. Winter Personality, Analysis and Interpretation of lives, University of Michigon, The Megraw, Hill companies, 1996, P, 06

۷۶۔ نفسیات، پنجاب ایجوکیشنل پریس، برائے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور، اشاعت اول، ۱۹۹۱، ص، ۱۰

۷۷۔ Leonard Carmichael, Basic Psychology, Random House, New York, 1957, P, 03.

۷۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر نفسیاتی تنقید، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور طبع اول، جون، ۱۹۸۶، ص، ۴۷

۷۹۔ ایضاً، ص، ۶۳

۸۰۔ ایضاً، ص، ۵۴

۸۱۔ لائنل ٹرلنگ ، (مترجم) سید امجد الطاف، رسالہ، نئی تحریریں، مطبع استقلال لاہور، ۱۹۵۶، ص، ۲۲

۸۲۔ David G. Winter, Personality, P, 64

۸۳۔ John Bowker, The meanings of death, Cambridge University Press, 1991, P, 14.

۸۴۔ Ibid, P, 13.

۸۵۔ Lauren B. Alloy, Joan Accocella, Abnormal Psychology, Seventh Edition, U.S.A, 1972, P, 241, 242

۸۶۔ Philip C. Kendall/Constance Hammen, Abnormal Psychology, California, 1995, P, 242.

۸۷۔ Robert S. Feldman, Understanding Psychology, Fourth Edition, U.S.A, 1996, P, 553.

۸۸۔ Ibid, P, 975

۸۹۔ Philip C. Kendall / Constance Hammen, University of California, Los Angelos, 1995, P, 238.

۹۰۔ Ibid.

۹۱۔ Ibid.

۹۲۔ Lauren B. Alloy , Joan Accocella , Abnoramal Psychology, U.S.A, 1972, P ,239.

۹۳۔ Ibid, P, 238.

۹۴۔ Ibid, P, 240.

۹۵۔ Ibid

۹۶۔ غالب احمد، اردو ادب میں تنہائی، ادبی مذاکرے، (مرتب) شیما مجید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۹۹

۹۷۔ مظہر الاسلام، دیباچہ، خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر

۹۸۔ مظہر الاسلام، آندھی اور کھلی کھڑکیاں، خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر، ص، ۱۴۷

۹۹۔ سجاد باقر رضوی، اردو ادب میں تنہائی، ادبی مذاکرے، (مرتب) شیما مجید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص، ۱۵۴

۱۰۰۔ باقر نقوی، ''خلیے کی دنیا جنیات، کلوننگ اور انسانی جینوم، اردو، سائنس بورڈ، کوہستان انٹر پرائزز، ۲۹۹، اپریل، لاہور طبع سوم، ۲۰۰۲ء، ص ۲۷

۱۰۱۔ ایضاً، ص، ۴۷

۱۰۲۔ ایضاً

۱۰۳۔ ایضاً، ص، ۳۲

۱۰۴۔ ایضاً، ص، ۸

۱۰۵۔ Michael Cole, Sheilar Cole, The Development of Children Second Edition, University of California, San Diego, 1938, P, 55

۱۰۶۔ Ibid, P, 58.

۱۰۷۔ Ibid.

۱۰۸۔ R.C. Lewontin, The Doctrine of D.N.A, Biology as Ideology, Penguin Books, England,1992, P, 26.

۱۰۹۔ Ibid, P, 59.

۱۱۰۔ باقر نقوی، خلیے کی دنیا، جنیات، کلوننگ اور انسانی جینوم، اردو، سائنس بورڈ، کوہستان انٹر پرائزز، ۲۹۹، اپریل، لاہور، طبع سوم، ۲۰۰۲ء، ص، ۳۳

۱۱۱۔ Michael Cole, Cheilar Cole, the Development of Children, Second Edition, University of California, San Diego, 1938, P, 59.

۱۱۲۔ Ibid, P, 63

۱۱۳۔ Department of Psychiatry, Caremean Hospital, Nimes France Department of Psychological Medicine and Psychiatry, Lapeyronie Hospital and University Department of psychiatry La Colonbiere Hospital Montpellier, France Henri Mondor and Albert Chenevier Hospital, and the Department of Psychiatry, Geneva, Switzerland.

۱۱۴۔ Tendency to kill one self have a genetic basis, Daily University Science New, Search.

۱۱۵۔ Ibid.

۱۱۶۔ Dr. Redford Williams "The discovery of the "Anger Gene, Could Anger be a Hereditary Trait? a web page, "Good Morning America", April, 2002.

۱۱۷۔ باقر نقوی، خلیے کی دنیا، جنیات، کلوننگ اور انسانی جینوم، اردو سائنس بورڈ، کوہستان انٹر پرائزز، پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۹۹، اپر مال، لاہور، طبع سوم، ۲۰۰۲، کراچی، ص،۵۴

۱۱۸۔ Dr. Redford Williams, the Discovery of the "Anger Gene", web page, Good Morning America, April, 2002.

۱۱۹۔ Research Studies, Is Suicide Hereditary?January 2000.

۱۲۰۔ Lauren B. Alloy, Joan Accocella, Abnormal Psychology, Seventh Edition, U.S.A, 1972, 239, 241.

۱۲۱۔ Ibid, P, 242

۱۲۲۔ Internet

۱۲۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر نفسیاتی تنقید، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، طبع اول، جون ۱۹۸۶، ص، ۵۶، ۵۷

۱۲۴۔ ایضاً

۱۲۵۔ لائنل ٹرلنگ، (مترجم) سید امجد الطاف، فرائڈ اور ادب، رسالہ، نئی تحریریں، مطبع استقلال پریس، لاہور، ۱۹۵۶، ص، ۱۱

۱۲۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر نفسیاتی تنقید، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، طبع اول، جون، ۱۹۸۶، ص، ۸۵

۱۲۷۔ Internet

۱۲۸۔ Ibid

۱۲۹۔ Ibid

۱۳۰۔ Ibid

۱۳۱۔ جارج سول، عظماء کے معاشی نظریات، (مترجم)، ڈاکٹر ایس ایم اختر، مولانا غلام رسول مہر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰، ص، ۲۰

۱۳۲۔ Existentialism, Introduction, Microsoft Corporation,1993-2003

۱۳۳۔ Ibid.

۱۳۴۔ Ibid

۱۳۵۔ بحوالہ صغیر ملال، بیسویں صدی کے شاہکار افسانے، (ترجمہ و تبصرہ) ویلکم بک پورٹ، (پرائیویٹ) لمیٹڈ، فضل سنز، کراچی، ۱۹۹۱، ص، ۲۱

۱۳۶۔ Extentialism, Microsoft Corporation, 1993-2003.

۱۳۷۔ Programme, National Geography, 28.4.2005.

۱۳۸۔ Suicide, From Wikipedia, the free Encyclopaedia.

۱۳۹۔ Ibid.

۱۴۰۔ Existentialism, Introduction, Microsoft Corporation, 1993-2003.

۱۴۱۔ Ibid.

۱۴۲۔ David Lamb, Death, Brain, Death and Ethics, State University of New York Press, 1985, P, 02.

۱۴۳۔ Ibid, P, 19.

۱۴۴۔ Ibid, P, 03.

۱۴۵۔ The Arden Shakespear, Death, Book of Quotations, Compiled by Jane Armstrong, Printed in singapore, Seng Lee Press, 2001, P,16

۱۴۶۔ بحوالہ صغیر ملال، بیسویں صدی کے شاہکار افسانے (ترجمہ وتبصرہ) ویلکم بک پورٹ، (پرائیویٹ) لمیٹڈ فضل سنز، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص، ۲۲۱

۱۴۷۔ Anne Hartle, Death and the Distinterested spectator, State University of New York press, 1986, P, 17.

۱۴۸۔ The Arden Shakespear, Death, Book of Quotations, Complied by Jane Armstrong, printed in Singapore, Seng Lee Press,2001, P, 07.

۱۴۹۔ Anne Hartle, Death and the Disinterested Spectator. An Inquiry into the Nature of Philosophy, State University of New York Press, 1986, P, 05

۱۵۰۔ بحوالہ نقوش، شخصیات نمبر، جلد اول ودوم، (مرتب) محمد طفیل، ادارہ فروغ ادب، اردو بازار، لاہور، س ن، ص، ۱۲۱

۱۵۱۔ Anne Hartle, Death and the Disinterested Spectator, P, 06.

۱۵۲۔ Schopenhauer, on Suicide,

Notes:

i) Hist Nat. Lib. XXVIII ch. 1

ii) Loc.cit.Lib.ch.7.

iii) Valerius maximum; hist. Lib. 11.ch.6,seos. 7et.8. Heraclides pointicus, fragmenta de rebus publicis, ix. Aellami variae historia, 111, 37. starabo; Lib; x, ch. 5,6.

iv) Eth. Nichom; V,15.

v) Stobaeus, Ecl. Eth. 11, Ch. 7, PP. 286, 312.

vi) Tradhuit par st. Julien, 1834.

vii) See my treatise on the foundation of Morals, Sec. 5.

viii) Essay on suicide and the immorality of the soul, by the late David Hume, Basle, 1799, Sold by James Decker. Return to Suicide & Philosophy # 5, 484.

۱۵۳۔ Ibid.

۱۵۴۔ Ibid.

۱۵۵۔ Ibid.

۱۵۶۔ Ibid.

۱۵۷۔ Ibid.

۱۵۸۔ Ibid.

۱۵۹۔ Ibid.

۱۶۰۔ Ibid.

۱۶۱۔ Ibid.

۱۶۲۔ Ibid.

۱۶۳۔ Ibid.

۱۶۴۔ John Bowker, the Meanings of Death Cambridge University Press, 1991, P, 07.

۱۶۵۔ The Arden Shakespear, Death, book of Quotation, Complied by Jane Armstrong, Printed in Singapore, Seng Lee Press, 2001, P, 48.

۱۶۶۔ Ibid.

۱۶۷۔ Ibid, P, 11.

۱۶۸۔ Ibid, P, 20.

۱۶۹۔ John Bowker, The Meanings of Death, Cambridge University Press, 1991, P, 215.

۱۷۰۔ انعام الرحمٰن سحری، خودکشی،(ایک مکمل مطالعہ) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۱۹۹۸ء،ص،۳۹

۱۷۱۔ Andre Haim, Adolescent Suicide, Translated by A.M. Sheridan Smith, Tavistock Publication, P,131.

۱۷۲۔ Ibid.

۱۷۳۔ بحوالہ ضیاء الدین احمد برنی، اقبال از عطیہ بیگم، اقبال اکادمی پاکستان، میکلوڈ روڈ لاہور، بار سوم، ۱۹۸۱ء،ص،۵۲

۱۷۴۔ ممتاز مفتی، اوراو کھے لوگ، ابن انشاء جلتا بجھتا دیا، مکان نمبر۲۲، گلی نمبر۳۲، سیکٹر ایف، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء،ص،۱۳۹

۱۷۵۔ Andre Haim, Adolescent Suicide, Translated by A.M.Sheridan Smith, Tavistock Publication, P, 131.

۱۷۶۔ بحوالہ ممتاز مفتی، احمد بشیر، غنڈہ، اوراو کھے لوگ، مکان نمبر۲۲، گلی نمبر۳۲، سیکٹر ایف، اسلام آباد، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۹۰ء،ص،۵۷

۱۷۷۔ مظہر الاسلام، پت جھڑ، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۲ء،ص،۱۷۶

۱۷۸۔ مظہر الاسلام، دیباچہ، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی

۱۷۹۔ مظہر الاسلام، پنجرہ، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی،ص،۴۹

۱۸۰۔ مظہر اسلام، انٹرویو، روزنامہ جنگ، جمعہ میگزین،۱۹۸۴ء،ص،۱۵

۱۸۱۔ مظہر الاسلام، پت جھڑ، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص ۱۷۶

۱۸۲۔ مظہر الاسلام، بن بیاہی بات، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص ۱۱۱، ۱۱۳

۱۸۳۔ مظہر الاسلام، پاگل، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص ۹۵

۱۸۴۔ مظہر الاسلام، پنجرہ، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص ۴۱

۱۸۵۔ کلیات راشد، ماوراء پبلشرز، بہاولپور روڈ، لاہور، بار دوم، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱۱

۱۸۶۔ مظہر الاسلام، گڑیا مرنے نہیں دیتی، خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۵۱

۱۸۷۔ Al Alverez, The Savage God, the study of Suicide,printed in Great Britain by Clays Ltd, St Ives Ple, ISBNO 7475 59058, Copyrights, Alvarez, 1971, P,95.
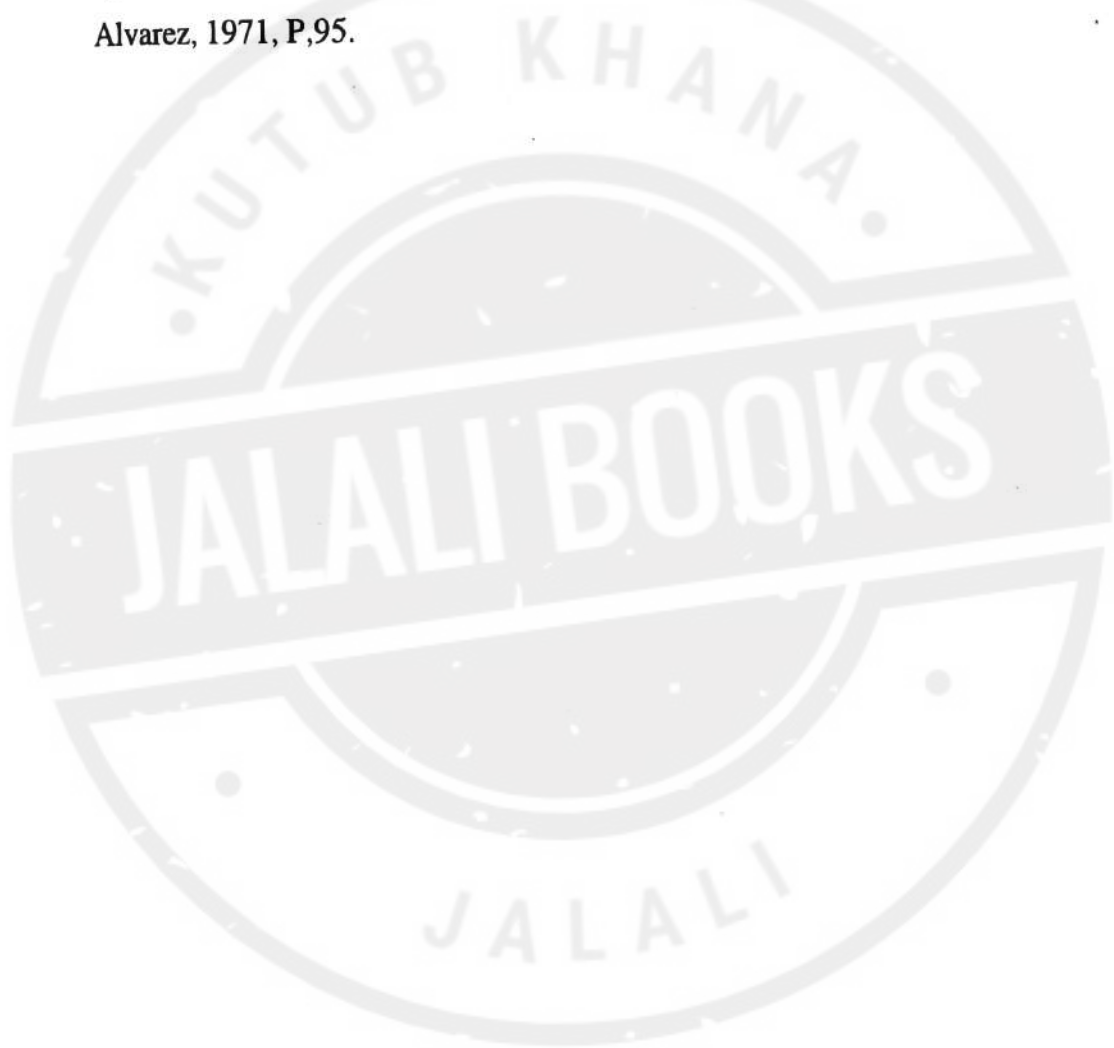
باب دوم

خودکشی کرنے والے عالمی ادیب

سیفو Sappho: (610BC-570BC)

سیفو یونانی شاعرہ تھیں آپکا تعلق انتہائی دولت منداور اعلیٰ خاندان سے تھا۔ وہ جزیرہ لیس بوس کی رہنے والی تھیں۔ سورج کی شعاعوں اور روشنی میں نہایا سمندر Aegeaw، جوسرزمین یونان کے قریب تھا۔ سیفو وہاں رہتی تھیں۔ گویا فطرت کا خارجی حسن سیفو کی ذہنی وداخلی شیفت کے خدوخال پر بہت حدتک اثر انداز ہوا۔ سیفو کی موت خودکشی سے واقع ہوئی۔

> Aristocratic class named Sappho... She was beautiful and blessed by the gods and goddesses with the gifts of poetry, music and teaching. Her poems were heraled, quite Literally, near and for. -۱

سیفو کی شاعرانہ ذہانت اور حسن کا کرشمہ تھا کہ بڑے بڑے شاعر، تاریخ دان، اور امور سلطنت کے صاحب اختیار ان کے نام اور شاعری کے قدر دان تھے، وہ قدیم یونانی ادب میں ایک بڑی شاعرہ اور اہم نام کے حوالے سے جانی جاتی تھیں۔ سیفو کے سیرت وکردار اور ان کے فن کے بارے میں بہت سے شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً انہیں "Lesbian" کہا جاتا ہے۔ یہ رائے اور رویہ اس حوالے سے بھی ہے کہ وہ مرد کے معاشرے کی ایک ذہین شاعرہ اور فطری تخلیق کار تھیں۔ جہاں ان کی ذہانت کو پس پشت ڈالنے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ اسی وجہ سے ۲۶ سو سال سے زائد عرصہ گزرا، حادثات زمانہ کے ہاتھوں اور کچھ ان کے مخالفین کے باعث انکا کلام جانتے بوجھتے ضائع کیا جاتا رہا۔ اس ضمن میں ایک بات یہ بھی ہے کہ ان کے کلام کا کچھ حصہ ان کے بعد آنے والے شعراء کے نام منسوب ہوگیا۔ یہ سیفو کی بدقسمتی تھی کہ شعروادب کی دنیا میں ان کا نام اور کام صحیح معنوں اور اصل حوالے سے مکمل طور پر محفوظ نہ رہ سکا۔ لیکن اس کے باوجود بحیثیت شاعرہ اور نابغہ (Genius) انکا اہم مقام ہے۔ ان میں شاعری کی خداداد صلاحیت تھی۔ سیفو شادی شدہ تھیں۔ اور ایک روایت کے مطابق ان کی ایک بیٹی تھیں۔ جسکا نام Cleis تھا۔ اس وقت کی سوسائٹی اور رسم ورواج کے مطابق سیفو اپنی شاعری محفلوں میں پڑھتیں اور پرجوش مجمع میں گا کر سناتی تھیں۔ ان کی مقبولیت ادب میں ان کی شاعرانہ صلاحیت ہی ہے۔

"Sappho was a poetic genius, legend and even fromtheshredsofpoetryleftbehind..."-۲ کہا جاتا ہے۔ کہ سیفو کو عورتوں سے بہت محبت تھی۔ اس محبت کو مختلف معنوں میں دیکھا اور لیا گیا ہے۔ عورت جو فطرت کے حسن کا شاہکار ہے۔ ان کے ظاہری حسن، خداداد صلاحیتوں، احساسات وجذبات کی نزاکت کے حوالے سے وہ عورت کو پسند کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ چونکہ یہ صلاحیت اور خوبیاں خود

قدرت نے انہیں بھی عطا کر رکھی تھیں۔ یا جنس کے حوالے سے جسے ناقدین نے انکا 'Lesbian' ہونا، ظاہر کیا ہے۔ شاعری میں انکار، جحان، ان کے مزاج کا زیادہ تر حصہ چونکہ فطرت کے حسن کی پرستش بھی ہے۔ لہذا اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ عورت کو فطرت کے حسن کا شاہکار سمجھتی تھیں۔ ان کی شاعری میں بھی عورت کے حسن و نزاکت کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ محبت کی دیوی Aphrodite کی پوجا کرتی تھیں۔ لہذا یہاں بھی اس بات کو تقویت ملی، کہ چونکہ وہ محبت کی دیوی کی پرستار تھیں۔ اس لئے عورت سے ان کے تعلقات قدرے مشکوک ہو جاتے ہیں۔ "It is this aspect of her poetry that would later get her in trouble" ۔۳ اگر اس بات پر جزوقتی یقین کر لیا جائے کہ وہ Lesbian تھیں۔ تو اس سے سیفو کے کردار کی گراوٹ اور اخلاقی کمزوری کا پہلو سامنے آتا ہے۔ اور یہ ممکن ہے کہ کردار کی بدنمائی نے رفتہ رفتہ گہرا رنگ اختیار کرتے ہوئے انہیں کسی نفسیاتی ذہنی اور اندرونی گھٹن اور کمزوری کا شکار بناتے ہوئے بالآخر انہیں نفسیاتی دباؤ کے تحت خودکشی کے ارادے پر مجبور و آمادہ کر دیا ہو۔ اس پہلو کو ان کی خودکشی کرنے کے محرکات سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

سیفو کی خودکشی کے محرکات کا جہاں تک تعلق ہے۔ ان میں سے ایک محرک جو خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ سیفو کی فطرت میں موجود عشق، رومانس اور حسن پرستی کا عنصر ہے۔ عورتوں کے ساتھ سیفو کی جذباتی وابستگی کا تذکرہ تو ہوتا ہے۔ لیکن مردوں کے ساتھ بھی سیفو کے معاشقے اپنی جگہ اہم ہیں۔ گو اس ضمن میں اردو کے شاعر، ادیب اور نقاد میراجی لکھتے ہیں۔

> روایتی نقطہ نظر سے سیفو کسی طرح اخلاقی اصولوں کے پابند نہ تھیں۔ لیکن اس بات سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ کہ دل کی صفائی اور پاکیزگی اسکا مطمح نظر تھا۔ کسی مرد کے ہاتھوں اپنے روح و جسم کو سونپ دینا اس کے لیے کوئی خوشگوار عمل نہ تھا۔ مثلاً وہ ایک جگہ اپنے کو ''ابدی دوشیزہ'' لکھتی ہے۔ اس کے کلام کے جو ٹکڑے زمانے کی دستبرد سے بچ رہے ہیں۔ ان میں کئی مقاموں پر وہ ان لڑکیوں کے لیے تعریفی کلمے کہتی ہے۔ جو ابھی دوشیزہ تھیں۔ اور ان سے صاف ظاہر ہے کہ اچھوتی روحیں اور اچھوتے جسم اس کے لیے کس قدر دلکش اور دل پسند تھے۔ ۔۴

میراجی نے سیفو کی فطرت کا یہاں جو پہلو بیان کیا ہے۔ اس کی رو سے سیفو ایک فطری شاعرہ، عاشق مزاج اور حسن پرست نگاہ کے حامل ہونے کے علاوہ محبت کے شفاف جذبوں پر یقین رکھتی تھیں۔ اس لیے میراجی کی تحقیق کے مطابق جب سیفو نے ایک ہی بار ایک نوجوان سے بھرپور اور شدید محبت کی۔ تو اس ناکامی کے ہاتھوں سیفو نے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کر لی۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے میراجی نے لکھا ہے کہ اگرچہ مٹی لین کا رہنے والا ایک نوجوان شاعر الکیاس اور لیسبوس کا رہنے والا خوبصورت شاعر الکمن سیفو کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ لیکن سیفو نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ لیکن مٹی لین کا ہی رہنے والا ایک نوجوان ملاح جسکا نام فاؤن تھا۔ سیفو کے لیے دیوانہ ہوا۔ تو سیفو کو بھی گویا بے خودی کا نشہ طاری ہو گیا۔ بقول میراجی

> مٹی لین کی پچھلی طرف کے ایک پہاڑی غار میں راتوں کے اندھیرے میں لپٹی ہوئی سیفو چھپ کر اپنے نوجوان ملاح سے ملنے جایا کرتی تھیں۔ شاعرہ کو ملاح دلپسند تھا۔ اور ملاح کو شاعرہ کے نغمے۔ اور سیفو کی زبان سے اس والہانہ محبت میں جو بھی لفظ نکلتا تھا۔ ایک نغمہ ہی تو تھا کیونکہ ایک بار پھر وہی محبت جو ایک ''راحت جانسوز'' ہوتی ہے۔

اس کے روح و جسم پر غلبہ پا چکی تھیں۔ ۔۵

لیکن بد قسمتی سے فاؤن نے سیفو کے ساتھ بے وفائی کی۔ اور چپکے سے مٹی لین سے نکل کر سسلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور جب سیفو کو اسکا علم ہوا۔ تو

> وہ جہاں تھیں۔ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ رنگ زرد ہو گیا۔ اور زبان گنگ ہو گئی۔ اسے یقین نہ آتا تھا۔ کہ اسکا خواب یوں پریشان ہو گیا ہے۔۔۔ وہ ضبط سے بے اختیار ہو کر زار و قطار رونے لگی اس نے اپنے بال نوچ لیے۔ اور سینہ پیٹ لیا۔۔۔ ۔۶

سیفو جو انتہائی نازک مزاج اور حساس تھیں۔ ان کا دل محبت کی اس شدید چوٹ کا وار نہ سہہ سکا۔ وہ ہر دم دکھ سے آہیں بھرتیں، کبھی شہر چھوڑنے کا سوچتیں، بلکہ سسلی تک انہوں نے فاؤن کا تعاقب بھی کیا۔ لیکن بے سود۔ زندگی کی رونقوں سے انکا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ بلکہ اب انہیں اپنی زندگی اور اپنا وجود دونوں بے معنی لگتے تھے۔

> اب اس کے لیے مسرت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس نے نا امیدی اور یاس کی تاریکی میں ایکدم مرنے کی ٹھان لی۔ ایک چٹان پر سیر کرتے ہوئے انہوں نے دوڑ کر چھلانگ لگا دی۔ اور نیچے گہرائی میں موجزن سمندر کی موجوں نے اس کے جسم کو اپنی آغوش میں لے لیا۔۔ ۷

سیفو کی موت کو اگر محبت کے اس ناکام تجربے کے حوالے سے دیکھا جائے تو سیفو کی خواہش مرگ کا محرک محبت میں ناکامی دکھائی دیتی ہے۔ سیفو کی خودکشی کے اس محرک میں اس لیے تقویت موجود ہے کہ سیفو نازک نسوانی جذبوں کی مالک ایک خوبصورت اور حساس شاعرہ تھیں۔ محبت کی ناکامی میں جہاں اور شاعروں اور ادیبوں نے خودکشی کی۔ وہاں سیفو کی خودکشی کا یہ محرک قابل یقین ہو سکتا ہے۔

سیفو سفر کرنے کی بھی بہت شوقین تھیں۔ سفر کرنا از خود زندگی، فطرت سے ہم آہنگی اور ذہن کی بالیدگی کا نام ہے۔ اس سے ان کی فطرت اور سیرت و کردار کے اس پہلو کی نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ مظاہر فطرت اور مناظر قدرت کی پرستار تھیں۔ فطرت کے حسن میں کھو جانا، اس کی بوقلمونیوں پر تفکر کرنا بھی شواہد میں شامل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس حسن ازل کی وسعتوں میں جذب ہو جانے کی متلاطم سوچ انہیں بے چین رکھتی ہو۔ کیونکہ وہ صرف شوقیہ شاعرہ نہ تھیں۔ شاعری اس کی نزاکت، اس جذبے کے سرتال سمجھنے کے ساتھ ساتھ وہ شعر و شاعری کے خارجی / فنی قانون اور قاعدوں سے پوری طرح ہم آہنگ تھیں۔

> Sappho was lyrical poet, well known for the tone, meter and grace of her poetry. This was music to the ears of listeners. Literally...her work so groundbreaking and marvelous that the Greek meter she often used was named after her and continues to bear that name to this day. –۸

پرکشش لباس اور قیمتی زیورات پہننا اور اعلیٰ سوسائٹی میں شامل ہونا سیفو کو مرغوب تھا۔ ان کے نو شعری مجموعے ہیں جن کا نمایاں موضوع عورت کا وجود، حسن اور اسکی داخلی نزاکتیں ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے عہد کے

بعض خوبرو مردوں اور ان کی ذہانت پر بھی لکھا۔ گویا مجموعی طور پر حسن ان کا موضوع تھا۔ چاہے عورت میں ہو یا تمام انسانوں کے حوالے سے، کائنات میں ہو یا نظامِ فطرت میں یہ سب ان کا بنیادی موضوع ہیں اور خاص طور پر اپنی شاعری کو شاعرانہ محفلوں میں جس طرح سناتی اور گاتی تھیں۔ یہ حسن اور نزاکت کا وہ انداز تھا جو صدیوں تک یورپ کی سوسائٹی میں مقبول رہا ہے یہ سیفو کی ذہانت ہی تھی کہ افلاطون، ارسطو، سکندرِ اعظم اور دیگر تمام یونانی فلسفیوں نے اپنے اپنے انداز سے ان کے کلام کو سراہا ہے لیکن سیفو کی بدقسمتی کہ کہ مذہبی حوالے سے ابتدا میں کرسچین چرچ نے ان کی شاعری کو عورتوں سے متاثر ہونے اور ان سے محبت کے حوالے سے قابلِ تنقید گردانا۔ اسی دوران ان کے کلام کا بہت سا حصہ ضائع بھی کر دیا گیا لیکن آج سے تقریباً ہزار سال پہلے جب بہت سے قدیم شعراء اور ادیبوں کے کام اور نام کو تحقیق منظرِ عام پر لانے لگی۔ تو سیفو کی اہمیت بھی ابھر کر سامنے آ گئی۔ انکا اب تک جو کلام بچا کچھا تھا انہیں زندہ رکھنے کے لیے اب بھی کافی تھا۔ اسی حوالے سے تحقیق سے یہ انکشافات اور حقائق بھی سامنے آئے کہ سیفو Lesbian نہیں تھیں۔

> Sappho was not lesbian in her sexual orientation-or if she was, her love of women was never actually consummated. This went So for as a legend being promulgated that she swore off women and fell in love with a ferry man named Phaeon, and when he Spurned her, She Jumped of a cliff to her death.-۹

گویا سیفو نے عورت کی حیثیت اس کے جذبات کی شدت اور صلاحیتوں کو آزماتے ہوئے اسے اپنے وجود کے حوالے سے پیش کیا۔ شاید اس طرح سے انہوں نے مرد کی برتری والے (male dominating) سماج میں عورت اور کے وجود کی اہمیت کا احساس دلایا۔ "The truth Sappho loved women all ways ... "-۱۰ in سیفو نے تقریباً ۵۲ سال کی عمر میں سمندر میں کود کر خودکشی کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ روزانہ اپنی عالیشان رہائش گاہ کے آس پاس پھیلے سمندر کے نیلے پانیوں کو دیر تک دیکھتی رہتی تھیں۔ اور ایک روز دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس میں کود گئیں۔

سوال یہ ہے کہ سیفو نے خودکشی کیوں کی؟

کیا انہیں کوئی جسمانی یا ذہنی عارضہ تھا یا کوئی نفسیاتی دباؤ، گھٹن یا الجھن؟ جس کی پیچیدگی انہیں درپیش تھیں۔ بظاہر اس کے شواہد نہیں ملتے۔ درحقیقت وہ حسن اور محبت کے لطیف جذبوں کی عکاسی کرتے کرتے تفکر کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن ہوگئی تھیں۔ دنیاوی سطح پر ہر آسائش اور آسودگی ملنے کے باوجود انہیں اب احساسِ مرگ درپیش تھا اور وہ اسکا تجربہ کرنا چاہتی تھیں۔ اس کے علاوہ محبت کا ناکام تجربہ بھی ان کی خودکشی کا سبب بنا۔ اس کے ساتھ یہ درست ہے کہ زندگی اور اسکی رنگارنگی تو ان کے سامنے تھی لیکن موت کے چھپے ہوئے حقائق کو دیکھنے کی کشش انہیں خودکشی کی طرف لے گئی۔

اس کے علاوہ خوبصورت جزیرے میں رہتے رہتے لمحہ لمحہ فطرت کے حسن میں جذب ہونے کی خواہش زور پکڑ گئی۔ اور یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ فطرت کے حسن میں انسان کے لئے کوئی بلاوہ موجود ہوتا ہے۔ کیونکہ حسن اور سچائی ایک دوسرے کا نعم البدل بھی ہیں۔ اس لئے ادیب، فنکار، لکھاری اور نابغے عموماً انہی محرکات و اسباب کی وجہ سے خودکشی کرتے ہیں اور سیفو کی خودکشی میں یہی حوالہ نمایاں نظر آتا ہے۔
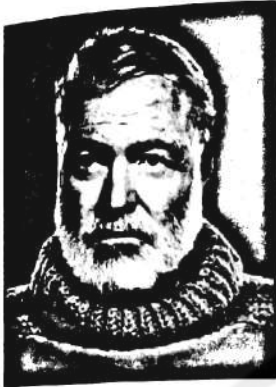
ارنیسٹ ہمینگ وے Ernest Hemingway

(1960-1899)

ارنیسٹ ہیمنگ وے امریکی ادب کا ایک اہم نام ہے۔ وہ زندگی بھر پر خطر مہمات کے شائق رہے۔ ہیمنگ وے بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ ان کی زندگی رنگا رنگ مشاغل سے عبارت تھی۔ اور جہاں تک ان کے خاندانی پس منظر کا تعلق ہے۔

> He was one of the Six children... His father Dr. Clarence Edmond Hemingway was a fervent member of the first congregational church. His mother Grace Hall sang in the Church choir.-[11]

ہیمنگ وے کی فطرت کا یہ پہلو ان کی شخصیت کو بہت منفرد بناتا ہے کہ وہ بیک وقت کئی صفات کے حامل، شکاری، لکھاری، پرکشش شخصیت کے مالک، مطالعہ کے شوقین، محفل پسند اور زندگی سے متعلق پر امید نقطہ نظر رکھنے والے تھے۔

> He was a man of heroic adventures and dashing news correspondent,and amateur boxer, drinker, fond of watching the bull fighting, big game hunter and deep-sea fisherman, front-line correspondent in two world wars. The victim of three automobile accident and two plane crashes from which he miraculously recovered. He married four times and made many loves, but above all he was a writer of stories and novels that made him a leading spokesman of the mood of America between world wars.-[12]

ہیمنگ وے کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ وہ ۱۸۹۹ میں شکاگو کے Oakpark میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد فزیشن تھے۔ جو شکاری کے حوالے سے بھی جانے جاتے تھے۔ ہیمنگ وے جب طالب علم تھے۔ تو سکول میگزین میں لکھنے کے ساتھ ساتھ فٹ بال بھی کھیلتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو کے مطابق انہوں نے لکھنے کا آغاز سکول کے زمانے سے کیا۔ ہائی

سکول کی تعلیم کے بعد وہ Komsas city گئے۔اور Star میں کام شروع کیا۔یہ ایک باقاعدہ اخباری مصروفیت تھی۔وہ لکھتے ہیں:
"Who shot whom? who broke into what? Where? When? How! but never why-not really why." -[۱۳] ہائی سکول تعلیم کے بعد کالج کی بجائے جنگ میں شرکت کے لئے چلے گئے۔جنگ سے واپسی پر کالج جانے میں بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ہیمنگ وے کی زندگی بیک وقت کئی تجربوں سے نبرد آزما ہونے اور مختلف طرح کے مشاغل سے ہم آہنگ ہونے کی فطرت ظاہر کرتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر رخ ہر ذائقے اور ہر زاویے کو برتنا چاہتے تھے۔اور اس سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی ہے۔کہ انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی ناکام شادیاں کیں یہ تمام شواہد بتاتے ہیں کہ ان کی بے قرار اور متجسس فطرت انہیں کسی ایک مقام پر ٹھہرنے اور رکنے نہیں دیتی تھی۔چنانچہ خواہش مرگ میں شدت اور بالآخر خودکشی کر لینا ایسی فطرت کے حامل شخص کے لیے کوئی اچھنبے کی بات دکھائی نہیں دیتی۔اور شخصیت بھی ایسی کہ جو اپنے وقت کے نامور ادبی ناموں میں شمار ہوتی تھی۔

> "... a writer whom many critics call the greatest writer of the century, a man who had a zest for life and adventure as being as his genius, a winner of the noble prize and the pulitzer prize..." -[۱۴]

ان کی کتابوں کی تعداد تیرہ (13) ہے۔جو بقول ان کے زیادہ نہیں ہیں۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ صرف لکھنے کے لیے نہیں لکھتے تھے۔اور دوسرا یہ کہ جنگوں میں ان کی شرکت کی وجہ سے لکھنے کا کام معطل ہو جاتا تھا۔مثلاً انہوں نے اسی طرح کی مصروفیت کے باعث اپنی کتاب "A Farewell to Arms" کئی مرحلوں میں لکھی۔آغاز پیرس سے ہوا پھر کیوبا، فلوریڈا اور دیگر کئی مقامات سے ہوتے ہوئے اختتام پذیر ہوئی۔اس ناول کا پس منظر بھی جنگ اور محبت ہے۔اس کے مختلف کرداروں میں اپنے اپنے حوالے سے مخصوص قسم کی فرض شناسی پائی جاتی ہے۔ایک ایسی فرض شناسی جس میں بلند حوصلگی نمایاں ہے۔ان کرداروں میں درحقیقت ہیمنگ وے کی اپنی شخصیت کا عکس نمایاں ہے۔

سفر کو ہیمنگ وے کی زندگی میں بہت عمل دخل ہے چنانچہ سفر کا حوالہ ان کے یہاں ایک استعارہ بن جاتا ہے۔زندگی کا حرکت و عمل کا، زندگی کی گہما گہمی اور رنگا رنگی کا، زندگی کے ہر مرحلے چاہے وہ خوشگوار ہو یا ناخوشگوار اس سے پوری طرح لطف اندوز اور نبرد آزما ہونے کا حامل نظر آتا ہے۔اور یہ مخصوص ہنگامہ خیز شخصیت اور فطرت کا عکاس ہے ایسی شخصیت، ایسا مزاج جس میں ٹھہراؤ نہیں۔جو مہم جو ہے اور تجربات میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔اس پس منظر میں دیکھا جائے تو موت بھی ایک تجربہ ہے۔اور سفر کی علامت ہے ایسا سفر جو زندگی کے خاتمے پر آغاز پاتا ہے۔لہذا ہیمنگ وے کی زندگی میں سفر کی کیفیت اور مختلف تجربات سے گزرنے کی لذت ان کی خواہش مرگ کے ساتھ ساتھ خودکشی کے محرکات کو تقویت دیتی محسوس ہوتی ہے۔

ان کی چند مخصوص عادات کا بھی اپنا ایک حوالہ اور پس منظر ہے۔جو بہت حد تک ان کی شخصیت کی داخلی پرتوں کا عکاس اور ساتھ ہی ساتھ ان کی خودکشی پر منتج موت کے محرکات کو بھی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ہیمنگ وے ادیب تو تھے ہی لیکن جنگوں میں شرکت کے باعث وہ فوجی زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ایک وقت وہ ریڈ کراس کے لئے ایمبولینس کا ڈرائیور بھی

بنے۔ اٹلی میں وہ شدید زخمی ہوئے لیکن وہ بخوبی جانتے تھے کہ زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ جس میں صرف وہی زندہ رہتے ہیں جو اس سے نبرد آزما ہو سکیں وہ خود جدوجہد اور آزادی کے قائل تھے۔ ذہنی آزادی، جسم کی آزادی، نقطۂ نظر کی آزادی، خیالات وافکار کی آزادی، حتیٰ کہ زندگی یا موت دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کی آزادی انکی یہ حددرجہ خطر پسندی انہیں پے در پے حادثات سے دوچار کرتی چلی گئی۔

During World War II Hemingway continued to live the dangerous life, he flew mission over France with the R.A.F. fought in Normandy and France and helped to liberate Paris with a one-man "army". After the war he was partially paralyzed in a plane accident...-۱۵

روز مرہ معاملات زندگی میں بندوق کو ساتھ رکھنا اور اسکا مخصوص طریقے کا استعمال بھی ان کے مخصوص مزاج کا آئینہ دار ہے۔

Ernest had a few strict rules; gun in the car must never be loaded, guns being carried through or over fences must be broken, a bird when spotted, must never be pointed at or the bird will be spooked and never bagged.-۱۶

ہیمنگ وے زندہ دل اور ہنسنے ہنسانے والے شخص تھے۔ ان کے سوچنے کا انداز دوٹوک تھا۔ ادھر یا ادھر، ''ایسا'' نہیں تو پھر ''ویسا''۔ کوئی چیز، کوئی بات، کوئی لمحہ'' ہے''۔ نہیں، تو پھر ''نہیں''۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان لچکدار سوچ کا عمل موجود نہیں ہے اگر ایک بات نہیں ہو سکتی۔ ایک مخصوص صورت حال پیدا نہیں ہو سکتی۔ تو اس کی کیا وجوہات ہو سکتی ہیں۔ اس سے بہتر کا راستہ کیسے اور کیونکر نکلے گا۔ اس راستے پر انتظار اور مزاج کا ٹھہراؤ ہیمنگ وے کے یہاں نہیں ملتا بڑھی ہوئی خود اعتمادی، حددرجہ ذہنی آزادی اور خود انحصاری ہیمنگ وے کی فطرت کے اس مخصوص پہلو کو تقویت دیتی ہے۔ وہ زندگی کو کسی خاص حوالے سے ہار جیت کے طور پر نہیں پرکھتے۔ بلکہ جدوجہد اور مسلسل سرگرمی پر یقین رکھتے ہیں۔

...The "meaning" of life is not to be found in 'success' or 'failure' but rather in the struggle itself, the form which the individual-alone in his own pride, weakness, strength and adurance is able to impose upon indifferent fate.-۱۷

ہیمنگ وے کے یہاں زندگی ہنگامہ خیزی اور نت نئے تجربات کا نام ہے جس میں حرکت ہے۔ ناکامی اور کامیابی بے معنی ہیں بنیادی بات انسانی ہمت اور قوتوں کو زیادہ سے زیادہ اور نت نئے انداز میں آزمانا ہے ایسا شخص نہ تو مایوس ہوتا ہے اور نہ ناامید۔ وہ اپنا تجربہ، تجربے کے نتائج دوسروں کے سامنے مثال بنا کر پیش نہیں کرتا تجربے کی سچائی کو بیان کرتا ہے تاکہ دوسرا خود اپنی راہ تلاش کر سکے۔

He said that for him there was only one way to account

> for things-to tell the whole truth about them... tell the reader the way it truely happend... reader will find his way to the heart of the things itself.-[۱۸]

ایسا شخص ایک وسیع اور لامحدود کارزارِ حیات کا باسی ہے۔ زندگی کو مخصوص سانچوں، ضابطوں اور حدود میں قید نہیں رکھتا۔ چنانچہ وہ کچھ بھی کرتا ہے اسے اچھا سمجھتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ زندگی انسان سے جو کچھ کروانا چاہتی ہے انسان کو اسے کرنا پڑتا ہے۔ گویا یہ ایک جبر ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ "I just go where my life takes me. There are things you do, because you like to do them"-[۱۹] لیکن ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ بھی یقین ہے کہ بے خوف و خطر شخص کو کوئی خارجی قوت اور طاقت دبا نہیں سکتی۔ "... if you don't take command of your fears, no attack will ever do."-[۲۰] انکا یہی نقطہ نظر بالآخر انہیں خودکشی کے راستے پر لے جانے میں معاون ثابت ہوا۔

جہاں تک ان کی کہانیوں کے کرداروں کا تعلق ہے وہ زندگی سے بھرپور ہیں اور زندگی کی گہما گہمی میں مکمل طور پر سرگرمِ عمل بھی۔ ان کے ناول "A Farewell to Arms" میں فریڈرک ہنری جو ایمبولینس ڈرائیور ہے۔ جنگ میں زخمی ہونے کے باوجود ہسپتال میں زیادہ عرصہ علاج کے لیے ٹھہرنا نہیں چاہتا۔ ایک اور ناول "The old Man and the sea" کے موضوع اور بنیادی کردار کے بارے میں ان کا کہنا ہے۔

> I knew about a man in that situation with a fish. I knew what happened in a boat, in a sea, fighting a fish. So I took a man, I knew for twenty years and imagined him under those circumstances.".-[۲۱]

اس ناول میں اسّی سال سے اوپر کا ایک بوڑھا آدمی تن تنہا سمندر کی خوفناک مچھلیوں سے برسرِ پیکار ہے۔ وہ آخر دم تک ان کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا۔ نہ ہمت ہارتا ہے۔ ہیمنگ کے کردار ہیرو کی خصوصیات رکھتے ہیں وہ آئیڈیلزم کا شکار ہیں۔ زندگی کی بے پناہ قوت، طاقت اور تخلیقی جوہر سے سرشار اور زندگی کی متصادم قوتوں سے نبرد آزما۔ جن میں فتح و کامرانی کا نشہ ہے۔ اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ ہے۔ وہ جھکنا اور مرنا نہیں جانتے۔ انہیں صرف اپنی جنگ درپیش ہے۔

ان حالات و واقعات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ہیمنگ وے ایک آئیڈیل زندگی گزارنے کا رویہ رکھتے تھے۔ ہونی، انہونی، حالات و واقعات، انکا عمل، ردِ عمل جیسی حدود ان کے آئیڈیلزم کے آس پاس کم کم نظر آتی ہیں۔ زندگی اور موت دونوں انتہاؤں کے درمیان انسان صرف کسی حد تک کچھ کر سکنے کا مجاز ہے۔ لیکن اس کارکردگی کے بعد نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ یا نکل سکتا ہے؟ محنت، کوشش، مسلسل جدوجہد، عزمِ مصمم سے کیا واقعی ہمیشہ کامیابی، صحت اور اپنے حسبِ منشا نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔ مذہب، اسکا وجود، ہمارے روحانی تقاضے، مقدر، ان سب کے حوالے سے اہم ترین سوال یہ کہ حقیقتِ کُل کا وجود، اسکی ضرورت اور اہمیت کیا ہے۔ اسکا کیا کردار ہے؟ اور اگر سب کچھ اپنی محنت اور کوشش سے انسان کو وہ سب ملتا رہے۔ جسکا وہ خواہشمند ہے تو پھر ''قادرِ مطلق'' کا وجود انسان اور کائنات کے حوالے سے کیا رہ جاتا ہے؟ یہ سوال ہمیشہ غور طلب رہا ہے اور جب انسان بے یقینی کی کیفیت میں ان سوالات کا جواب تلاش نہیں کر پاتا۔ تو شخصیت میں ٹوٹ پھوٹ کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ایسا شخص اپنی ناکامی، بیماری، معذوری اور

بڑھاپے وغیرہ کو فطری عمل سے نہیں جوڑ پاتا چنانچہ وہ کبھی اپنی ''میں'' کو بچانے کے لیے اور کبھی مایوسی کی شدت سے مجبور ہو کر خودکشی کو بہتر راہ قرار دیتا ہے۔ ہیمنگ وے کے سوانحی حالات وواقعات اور خیالات ونظریات کا مجموعی جائزہ بہت حد تک اسی صورت حال پر منتج ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ ساری زندگی شراب اور نشے کا سہارا لیتے رہے۔ جنگوں میں شرکت کے زخم، بیماری، نقاہت، مایوسی کی کیفیات انہیں اندر ہی اندر توڑتی رہیں۔ بظاہران کی عملی زندگی کسی اور سطح پر تھی لیکن ذہنی اعتبار سے وہ کہیں اور زندہ تھے۔ اس کے نظریات وخیالات میں ایک تصادم تھا جو بظاہر نظروں سے اوجھل رہا۔

جب وہ ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ اور انہیں بجلی کے شاک لگ رہے تھے تو انہیں مسلسل شکایت تھی۔ کہ ان کی یاداشت کھو رہی ہے۔ ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق یہ درست تھا۔ یہ ان کے علاج کے منفی اثرات بھی تھے۔ انہیں بغرض علاج ایک ہسپتال سے دوسرے ہسپتال منتقل کیا گیا۔ تو انہوں نے جہاز کے دروازے سے چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن فوری طور پر بچا لئے گئے۔ اور انجکشن دیکر سلایا گیا۔ لیکن جوں جوں بیماری بڑھتی گئی۔ علاج میں بجلی کے شاکوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

ہیمنگ وے کے بارے میں ان کی اکثر سوانح اور دیگر احوال سے واضح ہوتا ہے۔ کہ ان کے اندر ایک پرتشدد جنگ جاری تھی۔ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے۔ کہتے بھی تھے۔ لیکن اکثر خاموش ہو جاتے تھے۔ صحت ومعذوری کے ان معاملات کے ساتھ ساتھ ان کے ذاتی حالات بھی خاصے خراب تھے۔ ٹیکسز کی ادائیگی کے مقدمے چل رہے تھے معاشی صورت حال بھی موافق نہیں تھی وہ اپنی یاداشت میں گزرے واقعات کو یاد کرنا چاہتے تھے۔ اپنے ایک قریبی دوست کے ساتھ سفر پر جاتے ہوئے ان کی حالت کچھ اسی طرح تھی۔ "...as I watched him... his eyes on the ground, his face contorted by the miseries, he was recounting..."۔[۲۲] جب وہ اپنے اندر کی گھٹن کو قابو نہیں کر سکے تو دوست کو مخاطب کر کے بے تابی سے کہنے لگے۔

> Hotch, if I can't exist on my own terms, the existence is impossible, Do you understand? That is how I have lived, and that is how I must lived-or not lived...۔[۲۳]

ان کے یہ الفاظ ان کی ذہنی کیفیت کے ساتھ ساتھ اس منصوبہ بندی کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ جو وہ خودکشی کے حوالے سے اپنے اندر ترتیب دے رہے تھے۔ اس سفر میں وہ موسم بہار سے بھی بے نیاز تھے۔ یہ سوچتے اور کہتے ہوئے کہ نجانے اگلی بہار تک وہ ہوں نہ ہوں اسی دوران وہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے دیوار کا سہارا لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس ساٹھ سالہ شخص (ہیمنگ وے) کو دیکھو۔ جو آئندہ کتابیں لکھنے کے قابل نہیں رہا۔ اچھے دنوں کو لوٹا نہیں سکتا۔ پھر شدت جذبات میں کہتے چلے جاتے ہیں۔ "He says, he can't write any more... says there's nothing to live for ..."۔[۲۴] دوست کے سمجھانے کے باوجود بھی کہ انہوں نے جتنا لکھا ہے۔ وہ ان کے لیے کافی ہے وہ جواباً کچھ نہیں کہتے۔ ہواؤں اور پرندوں کو دیکھتے ہیں۔ اور پھر انہی دنوں انہی ذہنی کیفیات کے ساتھ خودکشی کر لیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟۔ یا ایسا کیوں ہو جاتا ہے؟ قریبی دوست، احباب، برس ہا برس کی رفاقت بھی ان ذہنی کیفیات اور اندر کے متلاطم جذبات کو پڑھ نہیں سکتی۔ اور اگر پڑھ بھی لیتی ہے تو اس المیے کو روک نہیں سکتی۔

> ... On that July day, that man, that every of other man, put a Shotgun to his head and killed himself. How did

this come to pass? Why? I was the closest friend for fourteen years.-۲۵

یہاں ایک اور پہلو کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات ادیبوں/دانشوروں کے حوالے سے ہونے والی خودکشیوں کو خودکشی کی بجائے حادثاتی موت کا نام دے دیا جاتا ہے۔ کبھی خود ادیب بھی اسے خود ہی پراسرار بنا دیتے ہیں اور کبھی خودکشی کرنے والے کے قریبی احباب اسے حادثاتی موت کہہ دیتے ہیں۔ اس میں بھی دو طرح کی صورت حال موجود ہے۔ ایک یہ کہ اس طرح کی موت کو خودکشی کا نام دینے کی ان میں ہمت نہیں ہوتی۔ دوسرا یہ کہ یہ ان کے سامنے بھی یہ سوال ،سوال ہی رہ جاتا ہے۔ کہ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ ایک باشعور ذہن اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ کیا وہ ایسا کر سکتا ہے؟ یا وہ ایسا نہیں کر سکتا ہیمنگ وے کی ایک نزدیکی دوست میری (Mary) جو خودکشی کے وقت وہاں موجود تھیں کہتی ہیں:

...A shotgun exploded in the house. Mary ran down stairs, Ernest had been cleaning on of the guns, she said, and it had accidently discharged, killing him.-۲۶

میری ذہنی طور پر اس موت کو خودکشی کہنے پر تیار نہ تھی۔ یہ بھی ایک جواز ہے کہ ادیبوں کی اس قسم کی اموات یا تو پر اسرار موت کا نام پاتی ہیں۔ یا انہیں حادثاتی موت کا نام دے دیا جاتا ہے۔

ہیمنگ وے کی زندگی اور فن کا مجموعی جائزہ بتاتا ہے۔ کہ وہ زندگی سے بھرپور انسان تھے۔ زندگی کی گھما گھمی میں اترے اس کے ہر رخ کا ذائقہ چکھتے ہوئے ایک ہی طرح، ایک ہی سطح، ایک ہی توانائی اور شدت جذبات کے ساتھ زندگی کے معاملات کو جس طرح وہ برت رہے تھے۔ اس کی شدت کے بہاؤ میں کوئی تلاطم اور طغیانی دیکھنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھے۔ گزرتی ہوئی عمر، انسانی جسم اور توانائی میں ٹوٹ پھوٹ، شکست وغیرہ اور جسے ہم گردش دوراں کا نام دیتے ہیں ۔ان کے ساتھ ان کے ذہنی آئیڈیلز ٹکرا کر پاش پاش ہوئے۔ اسے کم ہمتی کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا۔ ناامیدی اور مایوسی کا بھی اپنا ایک دورانیہ اور عمل ہوتا ہے۔ جس کی زد میں آ کر انسانی قوتیں اور صلاحتیں مفلوج ہونے لگتی ہیں۔ اور انسان خود کو اس مخصوص دورانیے میں موت کے لیے تیار کرتا چلا جاتا ہے۔ جبکہ یہاں ایک فوری ردعمل کی صورت بھی موجود ہے۔ اپنی انا، اپنی قوت، اپنے وجود کو شکست سے بچانے کا خیال بھی پیش نظر ہے۔ مثلاً ان سطور کو دیکھئے۔ جب ہیمنگ وے نے خودکشی کر لی تو ان کے قریبی دوست نے اپنے غم کا اظہار یوں کیا۔

... I went to Santa Maria Sopra Minerva-his Church... becasue I wanted to say good bye to him in his own place. I found a deserted side ...Sat there for a long while... Good luck Papa... I lit a candle and put some money in the poor box and spent the rest of the night alone, wondering through Rome's old streets. Ernest had had its right: "Man is not made for defeat: Man can be destroyed but not defeated.-۲۷

عام طور پر خودکشی کو شکست کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں خودکشی کرنے والے کے نقطہ نظر سے خودکشی، موت اور شکست تینوں کے حوالے بدل رہے ہیں۔ یہاں انسانی قوتوں اور نظریات کے ساتھ فطرت کے قوانین کی عدم مطابقت بھی نظر آتی ہے۔ دونوں کے درمیان توازن کا فقدان ہے انسانی خیالات اور اس کے ان آئیڈیلز کی ٹوٹ پھوٹ کا حوالہ ہے۔ جن کے اندر اور جن کے ساتھ انسان زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اس کے بغیر اسے ہر طرف موت کا سناٹا دکھائی دیتا ہے۔ گویا خودکشی کا اقدام زندگی کا خاتمہ نہیں۔ بلکہ اپنی زندگی اور آئیڈیلز کو بچانا ہے۔

سلویا پلاتھ Sylvia Plath: (1962-1932)

سلویا پلاتھ امریکی شاعرہ تھیں۔ ان کا لندن میں ہی مستقل قیام رہا۔ خودکشی کے وقت ان کی عمر ۳۰ سال تھی۔ وہ ذہین، خوبصورت اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی حامل تھیں۔ خودکشی کرنے والی شاعرات میں وہ اپنے ان اوصاف اور دیگر کئی خصائص کے باعث خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

> Her suicide gave rise to a vast populr mythology In many ways the extreme contradictions in Sylvia Plath, character were the tensions that gave rise to her genius Before everthing she was possessed a driven artist -[۲۸]

سلویا ۲۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئیں۔ انہیں اپنی ماں سے بہت لگاؤ تھا۔ اور والد سے بھی شدید جذباتی وابستگی تھی۔ بچپن کے ابتدائی حالات میں کچھ واقعات کا ان کی شخصیت اور زندگی پر گہرا اثر رہا۔ مثلاً چھوٹے بھائی کی پیدائش پر والدین کی زیادہ توجہ اس پر ہونا۔ دوسرا ابھی وہ نو عمر تھیں کہ سلویا کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی زندگی کی یہ ٹوٹ پھوٹ ان پر کافی اثر انداز ہوئی۔ لیکن زندگی کی گہما گہمی میں وہ ہمہ وقت شریک رہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں بہترین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کھیلوں کی بے پناہ شوقین تھیں۔ "She plays a lot of basketball and tennis... The piano, strictly for her own enjoyment"۔[۲۹] سلویا کچھ عرصہ اپنے دادا دادی کے پاس رہیں۔ والد کے انتقال کے بعد معاشی حالات میں کوئی ایسی نمایاں تبدیلی تو نہیں آئی لیکن صورت حال پہلے سے مختلف ضرور ہو گئی تھی سلویا اس ضمن میں ضرورت سے زیادہ حساس تھیں کہ ان کی والدہ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے کتنی تگ و دو کر رہی ہیں۔

جنگ عظیم دوم کے حالات، معاشرتی ابتری، انتشار، بلیک آؤٹ، قتل و غارت اور عدم تحفظ کا شکار تھے۔ یہ تمام عوامل بھی ان کی شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ میں شریک رہے۔ دوسری طرف اپنے باپ کے ساتھ شدید محبت جو انکی موت کے بعد شدید تر ہو گئی۔ اکثر ان کی نظموں میں دل گرفتگی اور اپنے باپ سے شکوہ شکایت کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔

Daddy, I have had to kill you
You died before I had time ...
I was ten when they buried you

At twenty I tried to die
And get back, back, back to you...-۳۰

یہ طرزِ تخاطب بیٹی کا محض باپ کی موت پر ایک جذباتی ردِعمل نہیں بلکہ موت کی طاقت کے سامنے انسان کی بے بسی اور بے اختیاری کی بھی ایک صورت ہے۔ موت کی یہ طاقت اور اسکا اصل روپ کیا ہے۔ کہ جانے والا انسان پھر لوٹ کر نہیں آتا۔ سلویا پلاتھ کا ذہن اور انکی زندگی ابھی سوالات کی انہی پیچیدگیوں سے نبرد آزما تھی۔

سلویا باپ کے ساتھ انتہائی محبت کرتی تھیں۔ آٹھ سال کی عمر میں باپ کے انتقال نے انہیں بے وفائی کے ایک عجب احساس سے روشناس کرایا۔ اگرچہ ان کی ماں انہیں بتاتی تھیں کہ یہ بے وفائی نہیں بلکہ ان کا باپ کسی اچھی بات کے لیے ان سے الگ ہوا ہے ماں کا وجود جس نے بے غرض ہو کر سلویا کی نگہداشت کی اور قربانیاں دیں ان کے لیے ایک سہارا تھا۔ وہ ماں کے اس شکوہ سے آگاہ تھیں کہ انہیں اپنے شوہر کے جلد چلے جانے کا غم تھا۔ سلویا اپنی ماں کو بدقسمت تصور کرتی تھیں جو شوہر کی وفات کے بعد ان کے حصے کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھا رہی تھیں۔

> Despite her loyalty, goodness, Love and self-sacrifice, things had gone wrong. Her husband died, her mother died of cancer, her daughter tried to commit suicide, why had life been so unjust?-۳۱

یہ وجودی نقطہ نظر ہے کہ انسان ہر معاملے میں خود انحصار اور خود مختار ہے حتیٰ کہ موت بھی اس کے اختیار میں ہے اور گر نہیں ہے تو ایسا ہونا چاہیے۔ سلویا کے بچپن کی محرومیاں اور ان سے وابستہ سلویا کی انتہائی سوچ بچار انہیں رفتہ رفتہ نفسیاتی الجھنوں سے دوچار کر رہی تھی۔ سلویا ایک نفسیاتی کردار بنتی جا رہی تھیں۔ وہ سب میں رہتے ہوئے بھی اکیلی تھیں۔ زندگی کی خوشی، سکون اور اطمینان قلب کی متمنی تھیں۔ جو انہیں حاصل نہ تھا خودی، خودداری، خود انحصاری کے عوامل پر مبنی شخصیت بھی سوچتی کہ وہ تمام خاندان پر بوجھ ہیں کبھی سوچتیں، کہ Nuns اور Saints اندر کی دنیا کا سکون کہاں سے تلاش کرتے ہیں لہذا سلویا اکثر انسان، اس کی زندگی کے معاملات، پیدائش، شادی، موت اور اس طرح کے دیگر موضوعات کے بارے میں متفکر رہتیں۔ کئی معاملات میں وہ ماہر نفسیات Dr. Beuscher کے ساتھ نشست بھی کرتیں۔ یہ نشست بعد میں ہفتے میں دو مرتبہ ہونے لگی تھی۔

اس ضمن میں ان کے اندر اور باہر خیالات کی جنگ جاری رہتی تھی۔ اسکا مطلب یہ نہیں کہ وہ زندگی سے بیزار تھیں۔ دوست، احباب، اہل خانہ کی محبت، فطرت کے رنگوں سے قریب تر رہنا ان کی شخصیت کے اہم پہلو تھے۔ وہ خود شہر سے دور دیہات اور فطرت کی خالص فضا میں گھر بنانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اس غرض کے لیے یکے بعد دیگرے کئی گھر تبدیل کیے۔ اپنے خاندانی دوست مرفی اور شوہر کے ساتھ جب وہ Yeast's Tower جاتیں تو سیب کے درختوں سے سیب توڑتے ہوئے سوچتیں کہ کبھی یہ سیب Yeast نے بھی توڑے اور کھائے ہوں گے۔ سلویا کی فطرت کا یہ پہلو ظاہر کرتا ہے۔ کہ ان کے خیالات کی دنیا نامور ادبی شخصیات کے تصور سے آباد اور ادب کے ایک عجیب ذائقے سے سرشار تھی۔ اسی حوالے سے سلویا مسلسل سوچ بچار کرتیں اور اکثر ایسی کیفیات کا والدہ سے بھی ذکر کرتیں۔ جو انہیں بہت حد تک مطمئن کرنے کی کوشش بھی کرتیں۔ بعض اوقات انکا رویہ دوسرے لوگوں سے بڑا جارحانہ اور تکلیف دہ ہو جاتا۔ گو اپنے شوہر کے ساتھ ان کا وقت اچھی طرح گزر رہا تھا۔ لیکن دونوں کے تعلقات زیادہ بہتر نہ تھے۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھیں کہ علیحدگی کی کیا

صورت ہو سکتی ہے۔ ان کے شوہر نے انہیں یہ بتایا تھا کہ علیحدگی کی صورتِ حال تکلیف دہ ہے۔ کیونکہ ان کی پہلی بیوی نے خودکشی کی کوشش علیحدگی کے بعد ہی کی تھی۔ لیکن سلویا غیر مطمئن تھیں۔ اور اس غیر مطمئن فطرت کے پیچھے درحقیقت سلویا کے کئی پیچیدہ ذہنی سوالات اور سب سے بڑھ کر ایک آئیڈیل زندگی کا خواب تھا۔ ایک ایسی زندگی جوان کے حسین اور مکمل خوابوں جیسی ہو اور جس میں ناآسوگی نہ ہو۔ وہ مثالی زندگی کی خواہش مند تھیں یہ بھی ان کی شخصیت کا خاص پہلو اور بہت حد تک ان کی خود کشی کے حوالے کا ایک محرک بنتا ہے۔ کہ وہ ہر رشتہ، ہر معاملہ، ہر کیفیت اور ہر جذبہ کو خالص بنیادوں پر دیکھنے اور بسر کرنے کی آرزو رکھتی تھیں۔ شخصیت کا یہ پہلو بھی آئیڈیل تراشتا ہے۔ حتیٰ کہ شادی شدہ زندگی کو بھی وہ انہی سطور پر دیکھتیں اور پرکھتیں تھیں۔

> Her concept of marriage was absolute and all demanding. It was perfect or it was nothing. As a mother, a good wife, She owed total allegiance. And her marriage had to be unlike anyother...۔۳۲

سلویا نے اپنی شادی، ذہنی الجھنوں حتیٰ کہ موت کی طلب اور پسندیدگی کو اپنی شاعری میں وضاحت سے بیان کیا ہے سلویا کی دوستی کا دائرہ کار وسیع تھا۔ قلمی دوست بھی تھے۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ وہ خود اپنی ذات کی پرستار تھیں اور جانتی تھیں۔ کہ وہ ذہین ہیں اور خوبصورت بھی ایک حوالے سے وہ خود اپنی ذات کی بھی آئیڈیل تھیں۔ ایسی فطرت حالات ماحول اور اپنے گردوپیش سے زیادہ تر ذہنی ہم آہنگی کی متحمل نہیں ہوتی۔ وہ خود کو کسی حوالے سے غیر اہم نہیں سمجھتیں۔ ان کی سوچ کا ایک اپنا معیار ہے اپنی ذہنی سطح ہے اپنے وجود کی اہمیت ہے۔

> I love my flesh, my face, my links, with overwhelming devotion. I know that i am "too tall" ... and yet I pose and prink before the mirror, seeing more and more how lovely I am...۔۳۳

خودکشی کرنے والے دیگر ادیبوں کی طرف سلویا کی زندگی کا یہ پہلو نہایت اہم ہے کہ وہ زندگی کو نت نئے تجربات اور رنگارنگ مشاغل ہیں بسر کرنا چاہتی تھیں۔ اس حوالے سے ان کے اندر فطری جوہر بھی موجود تھے۔ وہ پیرا کی سائیکل سواری اور ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ شاعری ڈانس، مصوری اور کھیلوں میں پیش پیش رہتی تھیں۔ نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں نمایاں تھیں۔ سلویا ایک ذہین طالبہ تھیں۔ سمتھ سکول سے گریجویشن کے بعد انہیں وظائف بھی ملے۔ کئی ادبی انعامات اور ایوارڈز سے بھی نوازی جاتی رہیں۔ ایک مرتبہ حسب منشا انہیں ایوارڈ نہ ملا۔ تو ان کی والدہ نے ان کی کیفیت کو محسوس کیا۔

> ...face pale in the rearview mirror now all her prizes, her superb grades, her confidence as a winner dissolved in minutes.۔۳۴

اس ذہانت کا حوالہ ایک اور جگہ اس طرح سے ہے۔ "Shool record indicates that she maintained a straight "A" profile from the very beginning."۔۳۵ ایک وقت ایسا بھی آیا

کہ وہ پڑھائی سے زیادہ لکھنے لکھانے پر توجہ دینا چاہتی تھیں۔ شاعرہ تھیں اور نثر نگار بھی۔ ڈائریاں، یاداشتیں، مضامین، اخباری مصروفیت، ریڈیو، ٹی وی، گویا وہ مصروف ترین زندگی بسر کر رہی تھیں۔ وہ اسوقت کیمرج کی شہرت یافتہ لکھاری کے طور پر جانی جاتی تھیں۔

وہ ایک بہترین، ذہین اور قابل استاد تھیں۔ نفسیات کے مضمون میں Ph.D کرنے کی خواہشمند تھیں۔ ۱۹۵۸ء میں بوسٹن میں شاعری اور شاعروں کی بھرمار تھی۔ تھیمز بھی عروج پر تھا۔ "Boston in 1958 was packed full of poets, they may have threatened Sylvia as much as it excited her"۔[۳۶] سلویا ایک طرف خداداد فطری ذہانت کی حامل تھیں۔ تو دوسری طرف وہ ایک خاص علمی وادبی ماحول میں رہ رہی تھیں۔ جس سے ان کی فکری اور ادبی شناخت کو مزید نکھار مل رہا تھا۔ اسوقت کے مشہور شاعر اور ادیب بوسٹن اور اسکے گرد و نواح میں رہ رہے تھے۔ ان مشہور ناموں میں Anne Sexton, Archibald Maclerih, Robert Frost, Richard Wilbur, Philip Booth اہمیت کے حامل ہیں اور جہاں تک سلویا کے مطالعہ کا تعلق ہے۔ اہم یونانی شعراء کے علاوہ اپنے دور کے اہم ادیب شاعران کے زیر مطالعہ تھے۔ مثلاً ٹی۔ ایس ایلیٹ، فراسٹ، سٹیفن ٹوین اور ہیمنگ وے وغیرہ۔

این سیکسٹن سے انکی گہری شناسائی تھی۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ این سیکسٹن نے بھی بعد میں خودکشی کی۔ سلویا اور این سیکسٹن بوسٹن یونیورسٹی میں ایک ساتھ لیکچررز تھیں۔ اور سیمینارز میں شریک ہوتی تھیں۔ فارغ وقت میں دونوں کے درمیان تبادلہ خیالات ہوتا۔ کئی مرتبہ دونوں گاڑی میں ایک ساتھ سفر کرتیں۔ این سیکسٹن کہتی ہیں۔

> Often very often, sylvia and I would talk about our first Suicide at length, in detail and in depth between the free potato chips. Suicide is after all, the opposite of the poem. ...we talk about death with burn-up intensity...۔[۳۷]

این سیکسٹن کے کہنے کے مطابق موت ان کے لئے روشنی کا بلب تھی۔ جس کے بارے میں وہ سوچا کرتی تھیں۔ اس کے لئے کشش محسوس کرتیں۔ این سیکسٹن نے یہاں خودکشی سے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ سلویا اور این سیکسٹن دونوں کی خودکشی کے حوالے سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اور خودکشی سے متعلق ان کے مخصوص مزاج اور نقطہ نظر کو منظر عام پر لاتا ہے ۔ این سیکسٹن کہتی ہیں:

> ....She (Sylvia) told the story of her first suicide in sweet and loving detail... we talked death and this was life for us...۔[۳۸]

این سیکسٹن سلویا کی ذہانت اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی تہہ دل سے معترف تھیں۔ سلویا کی یہی ذہانت ان کے حساس مزاج کی بنیاد بنتی چلی گئی۔ بظاہر وہ تمام رشتوں کے درمیان زندہ تھیں۔ لیکن انکا ذہن، دل، خیالات ونظریات طغیانی کی زد میں تھے۔ اس کے باعث دوست احباب اور افرادِ خانہ کے ساتھ اُنکا رویہ اکثر ترش ہوجاتا تھا۔ وہ خود بھی اپنی اس کیفیت سے آگاہ تھیں۔ اور کبھی کبھار لاشعوری طور پر ان سے ایسا سرزد ہوجاتا تھا۔ وہ فرائڈ کی قاری بھی تھیں۔ یعنی بلاواسطہ طور پر فرائڈ

کے نظریات بھی ان پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ "She was more and more drawn to Psychology and to Freudian explanations of her behavior"۔[۳۹] خودکشی کرنے سے پہلے انہوں نے ایک دو مرتبہ اقدام خودکشی بھی کیا۔ لیکن گھر والوں کی کوشش سے بچا لی گئیں۔ انہوں نے زہریلی ادویات کھا لی تھیں۔ ان کی نظم ''Cut'' میں ایک حقیقی واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جب سلویا نے اپنے انگوٹھے کا گوشت چھری سے کاٹ لیا تھا۔ ایک مرتبہ تیز رفتاری کے ساتھ مورس ویگن کو ویران اور کھلے علاقے میں چلاتے دوڑاتے ہوئے خیالات کی ہم ہمی میں محو وہ کہتی ہیں۔ "She later said was an aborted Suicide attempt."۔[۴۰] خودکشی کے حوالے سے ان کے ہاں پھر سے جنم لینے کی خواہش موجود ہے۔ یہ خواہش انہیں ''وجود'' جو موجود ہے، کی توڑ پھوڑ پر بھی اکساتی ہے۔

> ...She also broke her leg to get back through the tunnel
> of her birth and past to the sweet pure baby in her
> mothers womb.۔[۴۱]

انکے شوہر Ted اس حوالے سے لکھتے ہیں۔ "She would describe her suicide attempt as a bid to get back to her father."۔[۴۲] سلویا کی زندگی میں موت کا اپنا ایک حوالہ اور کشش ہے۔ ''Percy'' وہ شخص ہیں۔ جنہوں نے سلویا کو پہلی خودکشی کی کوشش سے بچایا تھا۔ ان کی وفات جون ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ سلویا سے پہلے انہوں نے بھی خودکشی کی لہذا موت کے لئے کشش اور خودکشی کے واضح اشارے ان کی شاعری اور تحریروں میں ملتے ہیں۔ یہ واقعہ سلویا کی خودکشی سے چند ماہ پہلے کا ہے۔ خودکشی کا حوالہ انکی شاعری میں نمایاں ہے۔

"Dying
is an art, like every thing else
I do it exceptionally well"۔[۴۳]

یہ تمام شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ سلویا بے خطر ہو کر اپنی زندگی سے کھیل رہی تھیں۔ سلویا کی آس پاس کی زندگی میں موت اور خودکشی کا کھیل بھی کسی نہ کسی صورت جاری وساری تھا۔ سلویا کی خودکشی کے محرکات سے ہم ان عوامل کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ وہ موت کے لیے سوچتی اور عملی طور پر اس کی طرف بڑھتی ہیں۔

I do it so it feels like hell
I do it so it feels real
I guess you could say I have a call.۔[۴۴]

ان کی نظم ''Mystic'' میں بچپن اور موت کے امیجز ہیں۔

I remember
The dead smell of Sun on wood cabins,
Once one has seen God, What is the remedy?
Once one has been Seized up...۔[۴۵]

اور ''Dead Dears'' میں "She identifies with the dead women in the museum"۔[۴۶] سلویا روزمرہ زندگی میں اپنے اندر اور باہر کی جنگ لڑ رہی تھیں۔ جنوری کے مہینے میں انہوں نے اپنے معالج ڈاکٹر ہورڈر کو بتایا کہ

She was severely depressed and feared she was heading for a break down. for the first time he heard something of the history of her attempted Suicide.-۴۷

سلویا کو فوری طور پر اینٹی ڈیپریشن دواؤں پر ڈالا گیا۔ اور صورت حال زیادہ بگڑنے پر ہسپتال داخل کرنے کی منصوبہ بندی بھی کر لی گئی۔ لیکن اس سے پہلے ہی انہوں نے خودکشی کر لی۔ اس کے لئے انہوں نے مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ دونوں بچوں کو اوپر کے کمرے میں بند کیا۔ تا کہ گیس، جس سے انہوں نے خود کو ختم کرنا تھا۔ ان تک نہ پہنچ سکے۔ کمرے میں دودھ اور ڈبل روٹی بھی رکھ دی گئی۔ بچے سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ لیکن محفوظ تھے۔ ۳۰:۱۰ پر ان کی موت کی تصدیق ہو گئی۔ ان کا شوہر گھر پر نہ تھا کچن کی طرف کھلے دروازے کے فرش پر سلویا کی لاش پڑی تھی۔ انکا سر ایک چھوٹے سے کپڑے میں لپٹا ہوا oven کے اندر تھا۔ گیس کے تمام points کھلے ہوئے تھے جنہوں نے سلویا اور ان کے حواس کو پوری طرح مفلوج کر دیا تھا۔

بقول Dr. Horder

...That she had been rescued while her body was alive, it is likely that her mind would have been destroyed.-۴۹

سلویا کے مندرجہ ذیل جملے قابل غور ہیں۔ "I missed brains, hate this cow life, am dying to Surround mysef with intelligent, good people"-۵۰ امیجز، آئیڈیلز یہاں ٹوٹ رہے ہیں۔ زندگی کے بھرپور رنگوں کے راستے سے گزرتے ہوئے موت بھی ان کی ہم سفر ہے۔ وہ ان کے لئے اتنی ہی اہم اور پرکشش ہے جتنی زندگی، ان کی زندگی سے مایوسی، ناامیدی اور زندگی سے فرار پانے پر مبنی کوئی تحریریں / خطوط بھی ایسے شواہد فراہم نہیں کرتے۔ جو زندگی کو بے معنی اور موت کو با معنی بنا رہے ہوں۔ وہ زندگی کو مثالی انداز میں اپنے آئیڈیل ذہن کے مطابق گزارنا چاہتی تھیں۔ لیکن جب ایسا ان کے سامنے ممکن نہ تھا۔ تو وہ مایوس اور ناامید ہو کر سماج سے کٹ گئی نہیں۔ یہ الگ بات کہ تنہائی جو ان کے اندر تھی، اس میں کوئی انکا شریک نہ تھا یہ ذہانت پر مبنی تنہائی ہے۔ جو مثبت بھی ہے۔ اور متحرک بھی۔ شاید اس لئے بھی کہ وہ موت کا انتخاب کرتے ہوئے اپنے اندر کے ذہن کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتیں۔ اور جس طرح عام معمولات میں انسان کوئی کام کر گزرتا ہے۔ وہ خودکشی کرتی ہیں، یہاں اس نقطۂ نظر کو تقویت ملتی ہے۔ کہ بقول ان کے معالج ڈاکٹر (Horder) ہورڈر، وہ ایک مثالی مریضہ تھیں۔ علاج میں ڈاکٹر سے مکمل تعاون کرتیں۔ نہ صرف تعاون بلکہ ہر دوا کے اپنے اوپر ہونے والے اثرات اور کیفیت سے بھی ڈاکٹر کو مکمل آگاہ رکھتی تھیں اور دوا باقاعدگی کے ساتھ لیتی تھیں۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ سلویا کی خودکشی کے محرکات میں انکا تخلیقی ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ وہ موت کو ہر زاویے اور ہر پہلو سے محسوس اور بسر کر رہی تھیں۔ ان کی شہرت اور مقبولیت میں خودکشی کا پہلو بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔

این سیکسٹن Anne Sexton: (1973-1928)

این سیکسٹن امریکی شاعرہ تھیں۔ ۱۹۲۸ء میں بوسٹن میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹ سال کی عمر میں الفریڈ طر سیکسٹن سے شادی ہوئی وہ ماڈلنگ کے شعبے سے بھی وابستہ تھیں۔ انکا زیادہ وقت بالٹی مور اور سان فرانسیسکو میں گزرا۔ ۱۹۵۳ء میں ان کے ہاں بچی کی پیدائش ہوئی۔ اسی دوران ڈیپریشن کی تشخیص میں وہ ہسپتال داخل ہوئیں۔ کچھ عرصہ اینٹی ڈیپریشن ادویات استعمال کرتی رہیں۔ جب دوسری بچی کی پیدائش ہوئی تو این سیکسٹن کی بیماری اور ڈیپریشن کی کیفیت زور پکڑ گئی اس دوران بچیاں اپنے دادا دادی کے پاس بھیج دی گئیں۔ اس طرح گھریلو زندگی میں انتشار اور بے چینی کے عوامل داخل ہو گئے۔ ہسپتال میں زیر علاج رہنے کے باجود ان کی ذہنی اور اضطرابی کیفیت میں تبدیلی نہ ہوئی۔ اور اسی دوران انہوں نے خودکشی کی۔

> She was diagnosed with postpartum depression.
> suffered her first mental breakdown, and was admitted
> ... a neuropsychiatric hospital...۔[۵۱]

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ این نے اپنی سالگرہ کے دن خودکشی کی۔ سالگرہ منانے کا دن تقریباً ہر ایک کے لئے باعث مسرت ہوتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مغرب میں سالگرہ کو زیادہ اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ این نے اسی روز اپنی موت کا انتخاب کیا۔

این کا رجحان شعر و شاعری کی طرف تھا۔ عمدہ شعر کہتی تھیں۔ انکا اہم شعری مجموعہ ''Live or die'' ہے۔ شاعری میں انہیں Pulitzer Prize ملا۔ ان کے اہم موضوعات عورت اور اس کے مسائل ہیں۔ عورت کے محسوسات کی انہوں نے بخوبی عکاسی کی ہے۔ بنیادی طور پر این ذہین تھیں۔ ان کے کہنے کے مطابق ۱۹۵۸ء میں وہ ٹی وی پر Sonnet کا کوئی پروگرام دیکھ رہی تھیں۔ پروگرام دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ کہ ایسی شاعری میں بھی کر سکتی ہوں۔ پھر انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ شاعری کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ شاعری کے سیمیناروں میں جانے کی ابتداء کی۔ سلویا سے ملاقاتوں کا یہی زمانہ ہے۔ اس طرح وہ ادبی جرائد میں بھی متعارف ہوئیں۔ وہ شاعری کی استاد تھیں۔ اور بحیثیت انگریزی استاد بوسٹن یونیورسٹی میں پڑھاتی تھیں۔

این حد درجہ حساس تھیں۔ لیکن ماں بننے کے زمانے، ذمہ داریاں اور پھر بحیثیت بیوی کے فرائض کی انجام دہی میں وہ ایک توازن برقرار نہ رکھ سکیں لیکن کئی مرتبہ شوہر کو طلاق کے لئے کہا۔ ذہانت کے علاوہ شوبز کا گلیمر اور اپنے وجود میں قدرتی حسن اور کشش کا بھی انہیں احساس تھا۔ "At ninteen, dark haired, tall and thin model, she

"appeared sophisticated." فطری ذہانت، اعلیٰ تخلیقی سطح اور انتہائی حساس طبیعت نے انہیں مکمل طور پر ایک الگ ذہنی اور فکری دنیا میں منتقل کر دیا تھا۔ وہ حالات کا خود ہی اثر لیتیں۔ اور اسکا ردعمل بھی فوری اور شدید ہوتا تھا۔ ان کے مزاج میں آزادی اور باغیانہ عناصر موجود تھے۔ ان عوامل کا ایک ہالہ ان کی فطرت کے آس پاس بن چکا تھا۔ جس کی ٹوٹ پھوٹ انہیں کسی طور پر قبول نہ تھی۔ ۵۲-"Sexton was strong and temperamental, impatient, rebellious..." یہ بغاوت پھر سماج سے ہٹ کر زندگی کے حوالے سے ابھری۔

On 4 October, 1974, Anne Sexton was found dead, sitting in a idling car outside her garage. The medical examiner ruled her death a suicide by carbon-monoxide poisoning...-۵۳

اسوقت ان کی عمر ۴۵ سال تھی۔ ایک نقاد نے ان کے لئے اس حوالے سے لکھا ہے۔ "...had finality achieved her desire to lie down with, Mr. Death."-۵۴ این اپنی ذات میں ہی زندہ رہیں۔ اس کو تسخیر کیا۔ اور تسخیر کرنے میں بھی انہوں نے کسی خارجی دباؤ کا انتظار نہ کیا۔ وہ گھریلو زندگی کا توازن برقرار نہ رکھ سکیں کثرت سے شراب پیتیں جس میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا وہ سوسائٹی میں جس مقام پر تھیں اس سے کہیں زیادہ، کہیں اوپر اور بہت فرق انداز سے خود کو دیکھتی تھیں۔

شاعری میں این سیکسٹن نے سلویا پلاتھ کے اثرات بھی قبول کیے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کی سلویا کے ساتھ دوستی تھی۔ اور جہاں دیگر معاملات اور موضوعات پر باتیں ہوتیں۔ خودکشی اور موت کا موضوع دونوں کے لئے باعثِ کشش، حیرت افزا اور نئے تجربوں پر مبنی تھا۔ اسے دو ذہنوں کی ہم آہنگی کہیں، دوستی کے اثرات کہیں یا دونوں کی نجی زندگی کے معاملات کی یکسانیت کا نام دیں۔ کہ دونوں نے ہی بعد میں خودکشی کی۔ اور دونوں کے دو دو کمسن بچے بھی تھے۔

۱۹۵۹ء کا سال این کی زندگی میں اموات سے بھرپور تھا۔ انہوں نے اپنی ماں کو کینسر کے موذی مرض سے مرتے دیکھا۔ اس کے چند ماہ بعد ان کے والد کا ہارٹ اٹیک سے انتقال ہو گیا۔ وہ ذہنی طور پر پوری طرح بکھر چکی تھیں۔ موت نہ صرف ان کی زندگی کا مرکز و محور بن گئی۔ بلکہ ہر لحہ وہ اسی حوالے سے سوچتیں اس کی تمنا کرتیں۔ موت کو دیکھنا چاہتیں۔ ان کی اس بے پناہ حساس طبیعت کا پس منظر کچھ اس طرح سے ہے۔

Anne Sexton sometimes seemed like a women without skin, she felt everything so intensely, had so little capacity to filterout pain...-۵۵

وہ اکثر خود کو اذیت دینے کے لئے ہلکی ہلکی ضربیں لگاتی رہتیں۔ اور ان سے لطف اندوز ہوتیں۔ این اس حوالے سے صرف موت کے لئے کشش ہی محسوس نہیں کرتی تھیں بلکہ موت ان پر مکمل طور پر حاوی ہو چکی تھی۔ موت کی یہی دسترس پھر انہیں خودکشی کے راستے پر لے گئی۔

Her poems are haunted by love and fear of death, her love above all, it was her subject, her obsession, She considered it, tasted it, embraced it.-۵۶

این سیکسٹن نے خودکشی کر کے بالآخر خواہش مرگ کا وہ مرحلہ طے کر لیا جس کی شدت کے ساتھ وہ متمنی تھیں۔

ایلس واکر Alice Walker :

سیاہ فام امریکی شاعرہ اور ناول نگار ایلس واکر نے سماجی اور معاشرتی موضوعات پر لکھنے کے ساتھ ساتھ خاص طور سیاہ فام عورت اور اس کے مسائل کو موضوع بنایا۔ اپنی نظم "On Stripping Bark from myself" میں لکھتی ہیں۔

I find my own
small person
A standing self
against the world
an equality of wills
I finally understand.

ایلس سمجھتی تھیں کہ کوئی بھی سماجی تبدیلی انسان کے ذاتی خیالات میں تبدیلی لائے بغیر ممکن نہیں۔ ایلس سوسائٹی میں بلیک عورت کے اصل مقام کی خواہشمند اور اس کی جنگ لڑنا چاہتی تھیں۔ وہ اس عورت کو صرف اس مقام پر نہیں دیکھنا چاہتیں، کہ وہ گھریلو کاموں اور بچوں کی پیدائش و نگہداشت کے لئے بنی ہیں۔ وہ انسانی رشتوں سے محبت اور شفقت کی متمنی تھیں۔ اس کے پس پردہ در حقیقت وہ مسائل بھی ہیں جو کالی عورت کو سفید فام معاشرے میں اٹھانے اور سہنے پڑتے ہیں۔ قدم قدم پر وہ اپنے اندر ہی اندر ٹوٹتی اور بکھرتی ہیں۔ جو احساس کمتری ان کے اندر موجود ہے۔ اس تک کسی کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ the roles ... of black and white are so set and so it is difficult for them to mix...۔۵۷ ایلس سماج میں عورت کے اصل مقام کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ اور اسی حوالے سے سیاہ فام لوگوں کو موضوع بنایا ہے۔ اسی حوالے سے انکا ناول "The colour purple" اہمیت رکھتا ہے۔ جسکا موضوع ایک غریب چودہ سالہ سیاہ فام لڑکی Georgia جو دیہات میں رہتی ہے۔ اسکا نام Celie ہے وہ خدا کو خط لکھتی ہے۔ کہ اسکا سوتیلا باپ Alphonso اسے مارتا اور اس پر جنسی تشدد کرتا ہے۔ اسی دوران وہ ایک بچی کو بھی جنم دیتی ہے۔ جسے اسکا باپ اغواء کر کے جنگل میں قتل کر دیتا ہے۔ دوسری مرتبہ وہ ایک لڑکے کو جنم دیتی ہے۔ اسے بھی اسکا باپ اغواء کر لیتا ہے۔ سلی کی ماں بیمار ہو کر مر جاتی ہے۔ اسکا باپ گھر میں نئی بیوی لاتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ سلی پر تشدد بھی جاری رہتا ہے۔ گویا تمام کہانی میں یہ کردار بہت سے نشیب و فراز سے گزرتا ہے لیکن ۔ "... end of the novel, Celie is a happy, independent, and self

"confident women. اسی طرح سلی کی چھوٹی بہن Nettie بھی بہت سی مشکلات سے گزرتی ہے اور آخرکار

> ... she meets a husband-and-wife pair of missionaries, samuel and corrine, with them, She moves to Africa to preach...

اس طرح وہ ایک طرف ان کرداروں کے حالات و واقعات کے حوالے سے سماجی و معاشرتی مسائل اور سوسائٹی کے مخصوص طرزِ عمل کا ذکر کرتی ہے۔ تو دوسری طرف اس کے کردار زندگی اور سماج کی مخالف قوتوں کے خلاف پوری بہادری اور عزم و حوصلے کے ساتھ نبرد آزما ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایلس واکر نے خودکشی کیوں کی مندرجہ بالا عوامل کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ذہن میں ایک کش مکش اور تصادم ہے معاشرہ، معاشرتی رویے وہ نہیں جو انسانی اقدار کو احترام بخش سکیں۔ نسلی تعصب کے خلاف آواز بلند کرنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہاں خودکشی کرنے کا ایک حوالہ یہ بنتا ہے کہ جب ادیب سماج میں وہ سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ جس کی اصلاح کرنے کے باوجود صورتِ حال موافق نہیں ہوتی۔ تو اس کی حساس فطرت اس منظرنامے سے خود کو منفی کر دیتی ہے۔ ایلس واکر چونکہ ادیبہ تھیں انہوں نے اپنے اور اپنے مخصوص طبقے کو درپیش مسائل کے بارے میں لکھا ضرور، لیکن اس احساسِ کمتری اور ذلت کے کرب سے نہ نکل سکیں۔ جس کے سامنے وہ بے بس تھیں۔ ایلس واکر کی خودکشی کا یہ ایک بنیادی محرک نظر آتا ہے۔

جان بیری مین John Berryman:

خودکشی کرنے والے عالمی ادیبوں میں ایک نام جان بیری مین کا ہے۔ جہاں تک ان کے خاندانی پس منظر کا تعلق ہے جان کے والد جان ایلین سمتھ بینکر تھے۔ اور والدہ سکول ٹیچر تھیں۔ یہ خاندان اپنے معاملات زندگی میں کئی مقامات پر رہا۔ اور آخر کار فلوریڈا میں منتقل ہو گیا۔ وہاں ان کے والد نے کچھ زمین کے حصول کی کوشش کی۔ اور ناکامی کی صورت میں ۱۹۲۶ میں خودکشی کر لی۔ ان کی ماں نے دوسری شادی کی۔ اس شخص کا نام John Mcalpin Berryman تھا۔ اسی کے نام پر ان کا نام بیری مین رکھا گیا۔

جان بیری مین کے پیش نظر بھی زندگی کے کئی مسائل تھے۔ ۱۹۳۱ء میں انہوں نے پہلی مرتبہ خودکشی کی کوشش کی۔ بعدازاں کولمبیا یونیورسٹی میں لکھنے لکھانے کا آغاز کیا۔ وہیں ان کی ملاقاتیں مشہور شعراء مثلyeats اور ایلیٹ کے علاوہ دیگر نامور شعراء سے ہوئیں۔ انہیں شاعری پر متعدد ایوارڈز بھی ملے۔ بعد میں انہوں نے اس میدان میں خاصا کام کرنے کے ساتھ ساتھ اکیڈمی بھی بنائی۔ جہاں مختلف نامور ادبی شخصیات کے کاموں پر ریویو لکھے جاتے تھے۔ ان کو ملنے والے اہم ترین ایوارڈز میں "American's Shelley Memorial Award" "American Academy Award for Poetry" اور اس کے علاوہ "National Institute of Arts and Letters Award" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے واشنگٹن یونیورسٹی میں کئی لیکچرز دیئے۔ علمی و ادبی حوالے سے جان بیری مین کا ریکارڈ شاندار رہا۔

جہاں تک ان کی ذاتی زندگی کا تعلق ہے۔ اس میں ناآسودہ حالی تھی۔ بیوی سے علیحدگی اسوقت ہوئی۔ جب یہ ایک بچے کے باپ تھے۔ منتشر الخیالی، بے چینی اور زندگی کے نشیب و فراز نے انہیں نہ صرف ذہنی بلکہ جسمانی طور پر بھی تھکا دیا۔

> ... in 1958 Berryman was hospitalized for exhaustion... was again in the hospital for alcoholism and nerves
> ۵۸۔

انہوں نے تخلیقی سطح پر سماج اور ادب میں اپنے لئے اہم مقام تو حاصل کر لیا لیکن ذاتی زندگی کی محرومیاں ان کے ساتھ رہیں۔ جنہیں نہ تو وہ بدل سکتے تھے۔ نہ ان سے فرار پا سکتے تھے۔ بیوی سے علیحدگی، گھریلو زندگی میں بے سکونی اور

سب سے بڑھ کر یہ المیہ کہ وہ سماج میں اصل باپ کی بجائے سوتیلے باپ کے نام اور حوالے سے متعارف ہوئے۔ ان کی شناخت کچلنے کے مترادف تھا۔ اس دوران داخلی بے یقینی سے بچنے کے لئے کئی مذاہب کی طرف رجوع کرتے رہے۔ اور نشہ کا سہارا بھی لیا۔ مذہب انسان کی داخلی زندگی میں اسے جس مرکزیت سے وابستہ کرتا ہے وہ مرکزیت ان کے یہاں متزلزل تھی۔

> After checking into alcohol rehabilitation once in 1969 and three times in 1970, Berryman experienced "a sort of religious conversion" in 1970. He considered Judaism, professed catholicism, and wrote Recovery (1971) a vague autobiography about alcoholic rehabilitation.-۵۹

وہ شدید عدم تحفظ اور ذہنی انتشار کا شکار تھے۔ عدم تحفظ اسوقت بڑھ گیا۔ جب سوتیلے باپ کے نام سے زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن جب موت کا انتخاب کیا۔ تو خودکشی کی۔ یہ وہ اقدام تھا جوان کے سگے باپ نے کیا تھا۔ گویا انہوں نے اپنی شناخت اور وراثت کو قائم رکھا۔

> ...haunted by his father's suicide ... Berryman jumped to his death off the Washington A venue Bridge in Minneapolis.-۶۰

یہاں بھی خودکشی ایک مصنف کی معاشرتی عدم تحفظ، ذاتی زندگی کی ناآسودگی، انا و خودداری، مذہبی بے یقینی اور داخلی سطح کی تنہائی جو اسے سماج سے متنفر کر کے کاٹ رہی ہے۔ کا شاخسانہ بنی ہے۔ جان بیری مین کی خودکشی کے محرکات میں ایک طرف انکی اپنی زندگی کی ناآسودہ حالی، منتشر الخیالی اور پے در پے مشکلات کا سامنا اور دوسرے خودکشی کا ایک محرک جینز کا حوالہ بھی ہے۔ کیونکہ جان بیری مین کے حقیقی والد نے خودکشی کی تھی۔

ورجینیا وولف Virginia Woolf:

خودکشی کرنے والی عالمی ادبیات میں ورجینیا وولف کا نام سرفہرست ہے۔ ورجینیا ولف بیسویں صدی کے عالمی ادب میں ایک اہم نام ہے۔ وہ مضمون نگار اور ناول نگار تھیں۔ ماں اور باپ دونوں کی طرف ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ جن میں علمی و ادبی روایات موجود تھیں۔ اس کے علاوہ ان روایات میں فنون لطیفہ سے شغف بھی موجود ہے۔ ان کے شوہر Leonard سیاسی سطح پر ایک جرنلسٹ کے حوالے سے شہرت رکھتے تھے۔ ان دونوں نے Hogarth press سے منسلک ہوکر ایلیٹ اور خاص طور پر فرائڈ کے کام کے انگریزی ترجمے کیے۔

ورجینیا کے اہم تخلیقی کاموں میں ان کے خطوط اور ڈائریوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جسے وہ باقاعدگی اور شوق کے ساتھ تحریر کرتی تھیں۔ ان کا بہت سا حصہ بعد میں ان کے شوہر نے مرتب کر کے شائع کیا۔ "... in her letter and diary she often uses the word writing matter-of-factly, "When I was mad." "-۶۱ جنگ عظیم اول کے مسائل، مشکلات، انسانی دکھ ورجینیا کے پیش نظر تھے۔ وہ حساس اور جذباتی تھیں۔ اسکے ساتھ نفسیاتی طور پر وہ ذہنی دباؤ اور گھٹن کا شکار تھیں۔ مسلسل بیماری کی وجہ سے ان کے اندر چڑچڑا پن پیدا ہو گیا تھا۔ انہیں معمول کے مطابق جتنے دورے پڑتے تھے انکا شوہر باقاعدگی سے انکا ریکارڈ مرتب کرتا۔۶۲ "She suffered from manic-depressive Psychosis" ایک روایت کے مطابق وہ اپنی زندگی سے ناخوش اور بیزار تھیں۔ ان کی زندگی کے روزمرہ معاملات بھی مصروفیت کے ساتھ چل رہے تھے۔ لکھنے لکھانے کا کام جاری و ساری تھا۔ اس دوران کہیں بھی ان کے رویے سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ خودکشی کا ارادہ کر سکتی ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ سکون آور ادویات بھی استعمال کرتی تھیں۔ لیکن خودکشی کے لئے انہوں نے ان کا سہارا نہیں لیا۔ وہ مسلسل ذہنی دباؤ، نزلہ، کمزوری اور دیگر مفلوج کر دینے والے معاملات و کیفیات کا شکار ہو رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں رعشہ آنے لگا تھا۔ لیکن پھر بھی ادبی سرگرمیوں میں خود کو مصروف رکھے ہوئے تھیں۔ وہ پورے انگریزی ادب پر کام کرنا چاہتی تھیں۔ یہ تمام شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ ورجینیا اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ ورجینیا کی زندگی کا اور خاص طور پر ان کی فطرت کا یہ پہلو قابل ذکر ہے۔ کہ وہ موت اور موت کے حوالے سے خودکشی سے شدید طور پر متاثر تھیں خاندان اور احباب میں جو اموات ان کے سامنے ہوئیں ان پر دکھ کی کیفیت ضروری تھی لیکن وہ مرنے والوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتیں جو ان سے پہلے اَن دیکھے راستے پر جا رہے تھے وہ خودکشی کے موضوع پر لکھنا، بولنا اور تبادلۂ خیالات پسند کرتی تھیں۔ خودکشی کرنے والوں کو داد بھری

نظروں سے دیکھتیں۔ اپنی ایک دوست کو لکھتی ہیں۔

...I wanted to tell you, but was too shy, how much I was pleased by your views upon the possible justification of suicide having made the attempt myself, from the best of motives as I thought-not to be a burdon on my husband. The conventional accusation of cowardice and sin has always rather rankled.-۶۳

گویا خودکشی سے سماجی رویہ کیا ہوسکتا ہے۔ انہیں بخوبی علم ہے۔ اس ضمن میں مذہب کیا کہتا ہے۔ وہ اس سے بھی واقف ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ خودکشی کا موضوع محض انہیں اپنی بیماری یا کسی نفسیاتی دباؤ کے پیش نظر ہی مرغوب نہ تھا۔

Suicide was an ever-interesting topic, and she could regard it with cool detachment, when she was well, although she allows herself here to believe that her past attempt was reasonable.-۶۴

ورجینیا وولف نے پہلی بار جب خودکشی کی کوشش کی تو اپنے عزیزوں کو اس بارے میں کہا کہ پانی میں گرنے سے ان کے کپڑے گیلے ہوگئے ہیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی اس حوالے سے انہیں بزدل کہے۔ یا اس فعل کو گناہ کا نام دے۔ وہ ٹھنڈے مزاج کے ساتھ اس موضوع پر سوچتی اور تفکر کرتی تھیں البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے خودکشی کے وقت جو تحریر چھوڑی اس میں انہوں نے اپنے شوہر کے لئے اچھے الفاظ استعمال کرتے ہوئے ان کی ہمدردانہ کوشش کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی بیماری اور ڈیپریشن کا اظہار بھی کیا کہ انہیں اپنے چاروں طرف عجیب وغریب آوازیں آتی ہیں۔ ان کی توجہ کسی ایک نکتے پر مرکوز نہیں رہ سکتی۔ وہ بے سکون ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

So I am doing what seems the best thing to do. You have given me the greatest possible happiness... I can't fight any longer... What I want to say is I owe all the happiness of my life to you...-۶۵

یہ تحریر لکھنے کے بعد انہوں نے گھر چھوڑ دیا۔ صبح کے ۱۱:۳۰ کا وقت تھا۔ ہاتھ میں واکنگ سٹک لیکر انہوں نے آہستہ آہستہ دریا عبور کرنا شروع کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ بھاری پتھروں سے اپنے کوٹ کی جیبیں بھر لیں اور سپردِ دریا ہوگئیں۔ یہ ۲۸ مارچ ۱۹۴۱ء کا دن تھا اور ان کی لاش ۱۸ اپریل کو برآمد ہوئی۔ جس کی موجودگی کی اطلاع آس پاس کھیلتے بچوں نے دی۔ مرنے سے پہلے کی تحریر اور الفاظ ایسے ہیں جو کوئی بھی اس موقع پر لکھتا یا کہہ سکتا ہے۔ اور جہاں تک ان کی صحت کا تعلق تھا وہ مسلسل بیمار تھیں اور مرتے وقت انہوں نے کسی کو کسی قسم کا الزام نہیں دیا۔ اپنی ہی کیفیت بیان کی کہ کہیں وہ پاگل نہ ہوجائیں۔ انہیں کوئی خطرناک مرض لاحق نہ ہوجائے۔ اور ایسی کیفیت میں جب شدت آتی ہے۔ اسکا اظہار بھی ختم ہوجاتا ہے ممکنہ صورتِ حال یہ ہے کہ ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کے تحت اس اقدام سے گزرنا یا موت کی کیفیت اور اس کی سرشاری میں رہتے ہوئے خود کو ختم کردینا لیکن خودکشی اور اس کے بارے میں غور وفکر، پسندیدگی اور عملی اقدام، بہرحال ایسے معاملات ہیں جنہیں فوری طور پر رد یا فراموش نہیں کیا جاسکتا اور وہ ان کے لئے ایک ذاتی اور پرکشش تجربہ ہے۔

رینڈال جیرل Randall Jarrell :

خودکشی کرنے والے عالمی ادیبوں میں ایک اہم نام رینڈال جیرل کا ہے۔ رینڈال جیرل ناش ویلی میں پیدا ہوئے۔ والدین کے ساتھ لاس اینجلس میں رہے لیکن بدقسمتی سے والدین میں علیحدگی ہوگئی اور وہ واپس ناش ویلی آ گئے۔ اور والدہ کے ساتھ رہنے لگے انہوں نے ناش ویلی سے ہی گریجویشن کی۔

رینڈال جیرل کسی قسم کی سیاسی گروہ بندی کے پابند نہیں تھے۔ ان کی شاعری ابتداء سے ہی سنجیدہ رہی۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ استاد تھے۔ اپنے وقت کے ذہین اور سنجیدہ لکھاریوں کے ساتھ ان کے ادبی مراسم تھے۔ ۱۹۴۰ء میں ان کی شادی ہوئی۔ اور ۱۹۴۲ء میں ان کی شاعری کی پہلی کتاب "Blood for a stranger" شائع ہوگئی اسی دوران انہوں نے ایئر فورس میں شمولیت اختیار کرنی چاہی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے اور Tucson میں تقریباً چار سال تربیتی navigator کے طور پر کام کرتے رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے فوج اور جنگ سے متعلق کئی نظمیں لکھیں۔ اخبارات کے ساتھ بھی کام کیا۔ دیگر شعراء اور ان کی شاعری پر تنقیدی مضامین لکھے بحیثیت استاد وہ مختلف یونیورسٹیوں میں کام کرتے رہے، بچوں کے لئے کہانیاں بھی لکھیں۔

پہلی شادی کے تجربے سے غیر مطمئن ہو کر انہوں نے ۱۹۵۲ء میں دوسری شادی کی۔ یہ حالات ان کی گھریلو اور ذاتی زندگی میں تغیر و تبدل اور بے چینی کے غماز بھی ہیں۔ داخلی سکون عنقا ہے۔ چنانچہ خارجی زندگی کا ردوبدل داخلی سطح پر بھی تبدیلی لانے کا موجب بنا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ وہ نفسیاتی دباؤ اور ذہنی گھٹن کا شکار ہوتے چلے گئے۔ ہسپتال اور ادویات کا سہارا ضرورت بن گیا۔ انہوں نے اس تمام صورتِ حال سے دلبرداشتہ ہو کر ۱۹۶۵ء میں خودکشی کی کوشش کی۔

> ...he became mentally ill, first elated and later1965 depressed, and eventually attempted suicide by slashing his wrist...۔ ۶۲

لیکن بچ گئے کچھ عرصہ بعد دوبارہ ملازمت میں آ گئے لیکن اس دوران ہسپتال آنے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ ''اکیڈمی آف امریکن شعراء'' نے انہیں خودکشی کرنے والے شعراء میں شامل کیا ہے۔ اور ان کی موت کی وجہ اور وضاحت یوں کی گئی ہے۔

> ...while walking at dusk on a nearby highway, he was

struck by a car and killed immediately. The coroner's verdict was accidental death, although the cirumstances will never be entirely clear.-۶۷

خودکشی کا یہ انداز خودکو اس طرح ہلاک کرنا ہے کہ جب انسان منتشر الخیالی اور نا آسودہ حالات وواقعات کے پیشِ نظر اپنی زندگی کی حفاظت میں غیر محتاط رویہ اختیار کرے اور اس ضمن میں اسے کسی نقصان اور خطرے کی پرواہ بھی نہ رہے۔ گویا اس غیر ذمہ دارانہ رویے کے پسِ پردہ حصول مرگ کی جبلت کام کرتی ہے۔ اس نقطہ نظر کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے۔ کہ وہ ڈیپریشن کے حوالے سے ہسپتال زیر علاج رہتے تھے اور ایک آدھ مرتبہ خودکشی کی کوشش بھی کر چکے تھے۔

ان تمام حالات وواقعات کی روشنی میں دو امور کی وضاحت ضروری ہے۔ یہ کہ ان کی ذاتی زندگی میں انتشار اور بے چینی کی کیفیت تھی۔ والدین میں علیحدگی ایک سے زیادہ شادیاں کرنا، ایک تجربے کی نا آسودہ حالی کے بعد دوسرے نئے تجربے کی طرف پیش قدمی کرنا، دوسرا یہ کہ ان کی فطرت میں غیر اطمینان بخش عناصر موجود تھے۔ بیک وقت کئی ملازمتیں اختیار کرنا، لکھنے لکھانے کے کئی شعبوں سے وابستگی بھی ظاہر کرتی ہے۔ کہ ان کی فطرت میں ٹھہراؤ نہیں تھا اگرچہ ایک حوالے سے یہ ایک فعال اور مثبت پہلو بھی ہے کہ تخلیقی سطح پر انسان زندگی میں زیادہ سے زیادہ تجربے اور مشاہدے سمیٹتا چلا جائے۔ لیکن اس سطح پر پھر وہ موڑ بھی آ جاتا ہے۔ کہ زندگی کی ہر شے بے مزہ اور روزمرہ معمولات میں شمار ہونے لگتی ہے۔ اور پھر قدم ایک نئے تجربے کی جانب اٹھنے لگتے ہیں کہ موت کیا ہے۔؟ اور اسے جاننے کے لئے ذہنی، فکری اور عملی طور پر پیش قدمی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

سارہ ٹیسڈیل Sara Teasdale: (1933-1884)

سارہ ٹیسڈیل میں پیدا ہوئیں۔ شعری مجموعہ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا اور ۱۹۱۱ء میں "Helean of Troy" کی اشاعت ہوئی۔

سارہ کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ذاتی زندگی کی الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار تھیں۔ اس میں ان کی ازدواجی زندگی کے مسائل تھے۔ انہوں نے عورت کے حوالے سے عورت کے مسائل و معاملات پر بہت کچھ لکھا۔ later - ۶۸"Teasdale's poetry resonated with suffering and strength"

سارہ سوسائٹی میں عورت کے وجود، اس کی اہمیت اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کی قدر دان تھیں۔ اور اس حوالے سے ان کی شاعری میں مثبت اور توانا عناصر پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک طرف عورت کے حوالے سے لکھا، اور دوسری طرف سماج اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھا۔ محبت کے فطری جوہر کی انہوں نے خاص طور پر زندگی اور انسان کے حوالے سے وضاحت کی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ موت بھی انکا پسندیدہ موضوع رہا۔ ۶۹ - number of Teasdale's "A large poems deal with love and death" عدم تحفظ کی فضا اور محبت کی کمی کا احساس انہیں موت سے متعلق کشش عطا کرتا ہے۔ غیر محسوساتی طور پر وہ اس ان دیکھی زندگی کی طلب اپنے اندر محسوس کرتی ہیں۔ چونکہ فطرتاً ذہین تھیں۔ اس لئے زندگی سے کٹی نہیں۔ اور نہ ہی تنہائی کے کرب نے انہیں سماج سے الگ کیا۔ ان کی شاعری کی عورت جب موت کا سامنا کرتی ہے تو اسے بھی محبت کا ایک روپ سمجھتی ہے۔ اس میں سرد مہری اور بے نیازی کی کیفیت موجود نہیں۔ وہ جب انسانی فطرت کے عمدہ خدوخال تراشتی ہیں۔ تو ان میں اخلاقی اور روحانی عناصر نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

خود شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے "The Answering Voice" کے نام سے ایسی شاعری مرتب کی۔ جو عورت کی محبت پر مبنی جذبات و محسوسات کا اظہار کرتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے "Rainbow Gold" کے نام سے نوجوان کے لئے شاعری کا انتخاب کیا ان کی پہلی کتاب "Sonnets to Dues and other poems" تھی۔ جو ۱۹۰۷ء میں چھپی، اس کے علاوہ دیگر مجموعے "Flame and Shadow1920", "Dark of the Moon1926", "Love Song 1917"، جبکہ "Strange Victory" ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئے۔

سارا کے مجموعوں کے ناموں سے احساس ہوتا ہے کہ وہ رومانی مزاج رکھتی تھیں۔ فطرت، حسن، محبت اور موت ان کے

پسندیدہ موضوعات تھے۔ انہیں شاعری کے حوالے سے کئی ایوارڈز ملے۔ جو مختلف قومی اور ادبی تنظیموں کی طرف سے تھے۔ چونکہ وہ اپنی نجی زندگی میں ازدواجی مسائل کا شکار تھیں۔ اسی کے باعث انہوں نے ۱۹۲۹ء میں اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی ان حالات میں ڈپریشن رفتہ رفتہ بڑھنے لگا اور وہ سکون آور ادویات کا استعمال کرنے لگیں۔ اسی دوران اچانک جنوری ۱۹۳۳ء میں انہوں نے خودکشی کر لی۔ "Sara Teasdale died of an overdose of sleeping pills."-۷۰ گویا اپنی غیر مطمئن زندگی اور اس کے کئی ناکام تجربوں کے بعد سارہ نے جو آخری تجربہ کیا۔ وہ خواہش مرگ کی وہ شدت تھی۔ جو خودکشی پر منتج ہوئی۔

پال سیلان Paul Celan : (1970-1920)

پال سیلان رومانیہ میں پیدا ہوئے۔ والدین جرمن بولنے والے یہودی تھے اور پال نے رومانیہ کے علاوہ کئی زبانیں بھی سیکھیں۔ ۱۹۳۸ء میں میڈیسن کی تعلیم پیرس میں مکمل کی۔ لیکن دوسری جنگ عظیم سے ذرا پہلے رومانیہ واپس آ گئے۔ ان کے والدین کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ جن کی آخر کار نازی لیبر کیمپ میں وفات ہوئی۔ جنگ اور قتل و غارت کے ان حالات و واقعات سے پال خود بھی بہت متاثر ہوئے۔ زندگی کا جبر دونوں حوالوں سے تھا یعنی ذاتی اور کائناتی۔ ادیب حساس ہوتا ہے۔ ظلم و جبر کہیں بھی ہو۔ کسی کے ساتھ بھی ہو۔ وہ نہ صرف محسوس کرتا ہے۔ بلکہ کچھ نہ کر سکنے کی صورت میں اپنی ہی توڑ پھوڑ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ گویا اس طرح وہ سماج سے انتقام لے رہا ہوتا ہے۔

۱۹۴۵ء میں وہ اسوقت کے نامور رومانین لکھاریوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے ایک پبلشنگ ہاؤس میں بحیثیت ریڈر اور مترجم کام کیا جہاں سے اپنی نظمیں اور تراجم شائع کیے وہ کثیر المطالعہ لکھاری اور ذہین شخص تھے۔ جرمن فلولوجی اور ادب کو پڑھنے کے لئے پیرس میں قیام پذیر ہونے سے پہلے ۱۹۴۸ء میں وہ کچھ عرصہ ویانا میں بھی مقیم رہے۔ ۱۹۵۲ء میں ان کی شادی ہوئی اور جبکہ بیٹے کی پیدائش ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔

ان کی پہلی کتاب ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔ جسے ادبی اور تنقیدی حلقوں میں زیادہ پذیرائی نہ ملی لیکن اس کے بعد ان کے مجموعوں کو نہ صرف پذیرائی ملنے لگی۔ بلکہ انہیں ایک نمایاں ادبی مقام بھی حاصل ہو گیا۔ انہیں کئی ادبی ایوارڈز ملے۔ تراجم کا کام بھی انہوں نے جاری و ساری رکھا۔ ۱۹۷۰ میں جرمن زبان و ادب میں انہیں یونیورسٹی آف پیرس سے پوزیشن بھی ملی۔ ساٹھ کی دہائی میں ان کی شاعری کی چھ سے زائد کتابوں کی اشاعت ہوئی۔ وہ عالمی شہرت یافتہ تھے۔ ۱۹۷۰ء میں ہی انہوں نے خودکشی کی۔

پال سیلان کے حالاتِ زندگی کے مطالعہ سے یہ علم ہوتا ہے۔ کہ انکا عہد اپنے اندر عالمی جنگ کی اجتماعی اور ہمہ گیر بے چینی اور افراتفری لئے ہوئے تھا۔ قتل و غارت اور انسانیت کی تباہی کا نوحہ ان کے لئے بھی انتہائی پریشان کن تھا۔ ان حالات کی ستم ظریفی نے بحیثیت ادیب ان کے حساس دل و دماغ کو ضرورت سے زیادہ ضرب لگائی۔ زندگی اور موت کے فاصلوں کو انہوں نے انتہائی قریب سے باہم سمٹتے ہوئے دیکھا۔ پال سیلان کی خودکشی کے محرکات میں ان حالات کا خاص عمل دخل نظر آتا ہے۔ جب موت ایک یقین بنکر ان کی زندگی میں داخل ہوئی۔ اس کے علاوہ بحیثیت ادیب وہ جن تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف کار تھا۔ ان میں کامیابیاں اور تجربے انہیں اس موڑ پر لے آئے۔ جہاں موت کا تجربہ کرنا اور

اس کی لذت سے آشنا ہونا ان کے لئے ناگزیر ہو گیا تھا۔اور اپنی ایک نظم "Fugue of Death" میں پال لکھتے ہیں۔

Black milk of day break we drink it at evening... we drink it at mid day and morning... we drink it at night...-۱۷

موت کا موضوع پال سیلان کے لیے واقعی بہت پرکشش تھا۔

ہارٹ کرین Hart Crane: (1932-1899)

ہرولڈ ہارٹ کرین کی پیدائش (Ohio) میں ہوئی ۔ جہاں تک ہارٹ کرین کی ذاتی زندگی کا تعلق ہے حصول تعلیم کا زمانہ تسلسل اور باقاعدگی کا حامل نہیں ۔ ہائی سکول کی تعلیم میں بھی انتشار رہا۔لیکن سترہ سال کی عمر میں جب ان کے والدین کے درمیان علیحدگی کا عمل مکمل ہوا۔تو انہوں نے نیویارک میں کالج کے لئے تیاری کا آغاز کیا۔خارجی زندگی کی ٹوٹ پھوٹ، بے قاعدگی، اور انتشار دبے قدموں ان کی شخصیت کے اندر اترتا رہا۔جو بعد میں ان کی تمام زندگی اور شخصیت پر شدت سے حاوی ہو گیا۔انہوں نے چھوٹی چھوٹی سطح پر مختلف دفاتر اور اخبارات میں کام کیا۔کچھ عرصہ اپنے والد کی Candy factory میں بھی ملازمت کی۔جو زیادہ بہتر نہ تھی۔

> He lived an unsettled life, in and out of apartment and rooms in New York city, and in Southern Connecticut sharing farmhouses with friends.-۴۲

ہارٹ کرین کی کی زندگی بے سمت چل رہی تھی۔اگر کوئی منصوبہ بندی تھی بھی تو صرف ان کے اندر، کیونکہ خارجی حالات موافق نہ تھے۔یورپ میں کافی عرصہ انہوں نے حالتِ سفر میں گزارا۔کچھ عرصہ میکسیکو میں عارضی قیام رہے۔وہ بے پناہ حساس تھے۔یہ عنصر ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔وقت کی تیز رفتاری اور حالت سفر نے ان کی شاعری میں وقت کو ایک ایسی علامت بنا دیا۔کہ جس کے پیچھے ان کی اپنی زندگی کا حوالہ بھی موجود ہے۔ہارٹ کرین کی زندگی میں تنہائی کا عنصر زیادہ تر پیش نظر رہا۔کوئی شخص ایسا نہ تھا۔جس سے اپنے محسوسات بیان کر سکتے۔باپ کی فیکٹری میں ملازمت کے دوران وہ ایک ساتھی سے غیر اخلاقی تعلقات استوار کرنے کے مرتکب ہوئے۔اس کے علاوہ اپنے ایک کسان دوست کی بیوی سے بھی ان کے مراسم رہے۔یہ عدم تحفظ تھا یا احساس کمتری کی کوئی صورت، کسی انتخاب یا معیار کو پیش نظر رکھنے کی کوئی صورت ان کے سامنے موجود نہ تھی وہ اس کا فیصلہ نہ کر سکے چنانچہ کسی حد تک حالات وواقعات سے خائف ہوتے رہے۔یہ تمام عوامل انکی شخصیت کی داخلی ٹوٹ پھوٹ میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔انکا پہلا شعری مجموعہ "White Building" ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔جس سے اندازہ ہوتا ہے۔کہ ایک نوجوان شاعر نئے اسلوب میں لکھنے کی کوشش میں ہے۔اس کے بعد بھی ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ " Crane's mind was no bigger than a pin, but it didn't matter; he was a born poet."-۴۳ ہارٹ کرین علمی وادبی سطح کی ذہانت کے حامل تھے۔آہستہ آہستہ انکی شاعری کا رنگ و آہنگ نکھرنے لگا۔اس میں تجربہ اور

مشاہدہ دونوں کی ہم آہنگی شامل ہوگئی اپنے خطوط میں انہوں نے اس نقطہ نظر کا اظہار کیا تھا۔ کہ آنے والے وقت میں ادب اور تنقید کی سمت اور اس کے تقاضے کیا ہوں گے۔ اس ضمن میں اس نے ایلیٹ کے فکر ونظر کو سراہا ہے۔ ہارٹ کرین تخلیقی صلاحیت رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی ادبی روایات سے بھی آشنا تھے۔ طویل نظم لکھنے کے اس انداز کو اپنے عہد میں زیادہ پذیرائی نہ ملی۔ لیکن بعد میں بہت حد تک اسی روایت کی پیروی کی گئی مجموعی طور پر انہیں وہ ادبی شہرت نہ مل سکی جسکے وہ خواہشمند تھے زندگی کی محرومیوں میں یہ ایک اضافی محرومی تھی۔ کرین کے ساتھ یہ مسئلہ بھی درپیش تھا کہ انہیں اعلیٰ سوسائٹی میں جانے کیلئے وافر روپیہ درکار تھا۔ یہ روپیہ کہاں سے آتا اس کے غم میں وہ اندر ہی اندر گھلتے جا رہے تھے۔ جن دوستوں نے انہیں عرصہ دراز کے بعد دیکھا۔ وہ حیران تھے۔ کہ کرین وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہوگئے ہیں۔ چہرے سے ناک نقشہ کا تناؤ غائب ہو رہا تھا۔ بالوں کی سفیدی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جس طرح کا کام کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے حالات مناسب نہ تھے۔ جس طرح سے جینا چاہتے تھے۔ حالات اس کے موافق نہ تھے۔ ادبی، سماجی اور معاشی ہر لحاظ سے وہ اپنے سماج سے مختلف راستے اور مقام پر کھڑے تھے۔ انہیں ادبی اور سماجی تقسیم کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

> Though the causes for any one's suicide are almost certain to be multiple, in the case of crane it seems an act unusually overdetermined.۔[۷۴]

کرین معاشی بدحالی میں بری طرح دھنس گئے۔ ۱۹۳۲ء میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا ان کی اپنی صحت بری طرح تباہ ہو گئی تھی۔ شراب نے رہی سہی طاقت کو بھی ختم کر دیا۔ سارے دوست بکھر چکے تھے۔ اور انکے قریبی دوست Harry crosby جس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے ''بلیک سن پریس'' میں انکا مجموعہ ''Bridge'' چھاپ دے گا۔ دو سال پہلے خودکشی کر چکا تھا۔ ان حالات میں کرین کے حواس درست نہ رہے۔ "... his leap into the ocean must have seemed one of the few choices he had left."۔[۷۵] زندگی کے تینتیس سال گزر چکے تھے اور کرین کے نزدیک شب وروز بے معنی ہونے لگے تھے مایوسی بڑھنے لگی تھی چنانچہ موت کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ "Crane's suicide was virtually preordained"۔[۷۶]

ہارٹ کرین کی ذاتی زندگی انتشار سے بھرپور تھی۔

It is to be learned
This clearing and this burning
But only by the one who
Spends out himself again.

والدین میں علیحدگی، معاشی مسائل، عزیز واقارب اور مخلص دوستوں کا فقدان ان کے لئے ایک ایسی عدم تحفظ کی فضا کا باعث بن گیا۔ کہ ہارٹ کرین کے سامنے سوائے خودکشی کرنے کے کوئی راستہ نہ تھا۔ ان کے اندر قدرت نے علمی وادبی ذہانت عطا کی تھی۔ ہارٹ کرین کو اس کا کوئی قدردان بھی میسر نہ آیا۔ ان پریشان کن حالات میں انکا مخلص دوست بھی خودکشی کر گیا تو ہارٹ کرین نے ان تمام ناسازگار حالات میں اپنے لئے صرف خودکشی کا راستہ اختیار کرنا ہی مناسب سمجھا۔

یوکیو مشی ما Yukio Mishima : (1970-1925)

خودکشی کرنے والے عالمی ادیبوں میں ایک اہم نام یوکیو مشی ما کا ہے۔ یوکیو مشی ما جاپانی لکھاری اور چالیس کتابوں کے مصنف تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ۱۸ ڈرامے، کہانیوں کے بیس ۲۰ مجموعے اور لاتعداد مضامین بھی لکھے ہیں انہوں نے زیادہ تر ادب کمرشل حوالے سے لکھا۔ وہ اپنی نسل کے نامور لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ "He was called the Japanese Hemingway, a Renaissance man." وہ جامع الصفات انسان تھا۔ ویٹ لفٹنگ، تلوارزنی کے ساتھ ساتھ، اچھے منتظم بھی تھے۔ "He was finally, an emperor worshipper, and death lover" یوکیو مشی ۲۴ جنوری ۱۹۲۵ء کو ٹوکیو میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محکمہ زراعت میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ والدہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ جو ایک سکول کے پرنسپل کی بیٹی اور ادب کی دلدادہ تھیں۔ یوکیو اپنے تین بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ انہیں مطالعہ کا شوق اور اچھے اشعار جمع کرنے کی عادت تھی۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بہت کمزور تھے۔ ان کی زندگی میں ابتدائی ۱۲ سال انتہائی اہمیت کے حامل ہیں، ان کی پیدائش پر ان کی دادی نے انہیں فوراً ان کے والدین سے لے لیا۔ اسی خیال اور احتیاط سے کہ وہ اوپر کی بلڈنگ (جہاں ان کے والدین رہتے تھے) سے گر نہ جائے۔ انہیں بہت حفاظت سے رکھا گیا۔ اس چیز نے انہیں over protected بنا دیا۔ والدین سے دوری اور ان کی محبت وشفقت سے محرومی عدم تحفظ کے احساس کے طور پر ان کی زندگی میں داخل ہوگئی۔ اسی لیے وہ دادی کے پاس رہنے والے دنوں کو اچھے انداز میں یاد نہیں کرتے۔

> My bed was placed in my grand mother's sickroom, prepetually closed and stifling with odour and sickness and old age, and I was raised there beside her sickbed... I could not believe that the world was any more complicated then a structure of builiding blocks...

۱۲ سال کے بعد جب یوکیو والدین کے پاس آئے۔ تو زندگی کا نیا موڑ اور نیا ماحول تھا۔ والدہ سے انہیں شدید محبت تھی۔ انہیں وہاں تحفظ کا احساس ہونے لگا۔ والد سے تعلق کچھ زیادہ محبت کا حامل نہ تھا۔ والد اکثر ان کے لکھنے لکھانے والی چیزوں کو ضائع بھی کر دیتے تھے۔ بنیادی طور پر یوکیو ذہین تھے۔ پھر ایک اعلیٰ سکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہاں وہ

نوجوان لکھاریوں کے نمائندہ بن گئے۔ سولہ سال کی عمر میں ایڈیٹر بنے۔ ان کی کہانی "A frost in full flower" ان کے قلمی نام سے شائع ہوئی۔

یوکیو نے اعزاز کے ساتھ گریجویشن کی۔ والد کے کہنے پر Law School میں داخلہ لیا۔ اسی دوران جنگی حالات کے تحت ان کے جماعت کے دیگر لڑکوں کو جنگ میں جانا پڑا لیکن ان کی کمزور صحت کے پیش نظر انہیں صرف دفتر اور لائبریری کے کام سپرد کیے گئے۔ یہ ان کے لیے بڑا تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ ذہنی طور پر وہ اس صورت حال کے لئے تیار نہ تھے۔ انہی دنوں وہ میڈیکل کے امتحان میں فیل ہو گئے۔ اور نوکری سے برخاست کر دیئے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور جنگ اختتام پذیر ہوگئی تو جنگ کا یہ انجام بھی بحیثیت ایک جاپانی محبّ وطن یوکیو کو مزید دکھ دے گیا۔ ان کے ذہن کو سوچ کا ایک نیا دھارا میسر آیا کہ کس طرح اپنی آزادی، تہذیب اور اقدار کی حفاظت کی جائے۔

یوکیو اب بینکنگ کے شعبے سے وابستہ ہوئے دفتر سے واپسی پر وہ بہت زیادہ لکھنے کا کام کرتے۔ اس سے ان کی صحت بری طرح متاثر ہوتی گئی۔ اور آخر والد کے کہنے پر انہوں نے نوکری چھوڑ کر صرف لکھنے لکھانے پر ہی توجہ صرف کر دی۔ شاید یہ کمزوری صحت کا ردعمل تھا کہ یوکیو نے باڈی بلڈنگ شروع کی۔

یوکیو کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے۔ کہ وہ Homo Sexual تھے۔ انہیں خوبصورت نوجوان دوست رکھنا پسند تھے۔ خاص طور پر خون، تشدد اور موت کے لئے اپنے اندر بہت کشش محسوس ہوتی تھی۔ اس کے پس پردہ بھی درحقیقت ان کے بچپن کی نا آسودہ خواہشات، صحت کی کمزوری، دبلی اور کمزور شخصیت کو کسی نہ کسی حوالے سے نمایاں کرنے کی خواہش موجود تھی۔ وہ اپنے وجود کے اندر اس وجود کی تلاش میں تھے۔ جسکا اعتراف وقت، ماحول اور سوسائٹی نہیں کر پائے تھے۔ ردعمل کے طور پر وہ صف اول میں آنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے جو کوشش کی۔ اس میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوئے۔ اور اسکا اعتراف بھی ہوا۔ لیکن وہ ہر محاذ کا فاتح بننا چاہتے تھے۔ اسی ضمن میں انہوں نے مغربی دنیا کے بھی کئی سفر کیے۔ جن میں سان فرانسیسکو، نیویارک، لندن، پیرس اور جرمنی خاص طور پر اہم ہیں۔

۱۹۵۸ء میں انہوں نے ایک پینٹر کی ۱۹ سالہ خوبصورت لڑکی سے شادی کی۔ انتہائی جدید اور دیدہ زیب گھر بنوایا جہاں انہوں نے اپنے والدین اور بعد میں دو بچوں کے ہمراہ بھرپور زندگی بسر کی۔ ۱۹۶۱ء میں انہوں نے ایک کہانی "Patriotis" کے نام سے لکھی۔ جس میں ایک لیفٹیننٹ Seppuku (ritual suicide) رسمی خودکشی کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے افسروں سے دھوکہ نہیں کرسکتا۔ دراصل یوکیو مشی ما کا ذہن ایک مخصوص سمت اور راستے پر سوچ رہا تھا۔ موت سے متعلق کئی مقامات پر وہ لکھتے ہیں۔ موت کو سوچتے ہیں۔ اور اس سوچ میں خودکشی سے متعلق بہت سے حوالے بھی شامل ہوتے جاتے ہیں۔

> Death began from the time when I set about acquiring an existence other than that of words...I cherished a romantic impulsive towards death, get at the same time I required a strictly classical body as its vehicle ... I lacked the necessary physical qualification. A powerful, tragic frame and sculpturesque muscles were

indispensable in a romantically noble death... What I wanted was some natural spontaneous suicide.

یوکیومشی ماموت کو بہادر اور فاتح سمجھتے تھے۔ جس طرح موت فطرت کے اندر موجود ہے۔ خاموشی سے ہر شے ہر انسان پر گرفت کرتی ہے۔ اسی طرح وہ ایک طاقتور جسم کے ساتھ زندگی کی گہما گہمی میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ ہر شے پر اور ہر کام میں یکتا اور قادر۔ جس طرح موت۔ پھر موت کو وہ فطرت کے ایک قدرتی غیر محسوساتی بہاؤ کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ جو ہر شے پر چھاتی چلی جاتی ہے۔

یوکیو کی زندگی میں اہم ترین موڑ اسوقت آیا جب وہ شیلڈ سوسائٹی پرائیویٹ آرمی کے نام سے تنظیم کا قیام عمل میں لائے۔ اس میں زیادہ تر نوجوان طلبہ تھے۔ جو قومی جذبے اور محبت سے سرشار تھے۔ انکا مقصد بادشاہ وقت کو تمام اندرونی اور بیرونی مخالفتوں اور منفی قوتوں سے بچانا تھا۔ کچھ نے ان کے اس اقدام کو مضحکہ خیز قرار دیا۔ کچھ نے ان کے لئے تحسین کے جملے کہے۔ اکثر نے اسے بادشاہ کی خوشامد اور پرستش کا نام دیا۔ لیکن یوکیو کو کسی بات کی پرواہ نہ تھی۔ ان کا کہنا تھا۔ کہ بادشاہ وقت کی حفاظت دراصل اپنی آزادی ملکی سالمیت اور خالص جاپانی اقدار کی حفاظت ہے۔ ۲۵ نومبر ۱۹۷۰ء کو انہوں نے اس تنظیم سے وابستہ نوجوانوں کو وردیاں پہنانا شروع کر دیں۔ خود بھی وہ پوری طرح وردی اور تلوار سے لیس ہوتے تھے۔ اسی جوش و جنون میں انہوں نے ایک روز اپنی وردی کو اپنے بدن پر ڈھیلا کیا۔ قمیض کے بٹن کھولے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھے۔ اپنی جماعت کے ایک نوجوان Morita کو بلوایا۔ اور

Morita took his place behind Mishima,holding the long sword above the head of his forty-five-years old leader. Mishima lifted his arms and in a violent movement drove the short sword into his belly.

وہ دوبارہ ہوش میں بھی آئے۔ لیکن تلوار نے ان کے معدے کو پھاڑ ڈالا تھا۔ ان کا سانس انتہائی مشکل اور تکلیف سے چل رہا تھا۔ موریٹا نے اپنی لمبی تلوار ان کی گردن کے پیچھے اتار دی۔ اور سرتن سے جدا کر دیا۔ اسی لمحہ ایک اور ساتھی نے بھی Morita کا ساتھ دیا۔ اور ان کی گردن بھی تن سے جدا ہوگئی۔ یوکیو نے مرنے سے پہلے کہا تھا۔ "... I want evidence that I died not as a literary man but as a warrior."

ان کے یہ جملے اپنے اندر ان کی زندگی، شخصیت، اس کے نشیب و فراز اور خودکشی سے متعلق وسیع معنی رکھتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر Warrior نہیں تھے۔ بلکہ ادیب تھے۔ اور ادیب کی حیثیت سے اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل، جن کا تعلیمی ریکارڈ بھی شاندار تھا۔ بیک وقت ادب کے کئی شعبوں سے وابستہ رہے۔ وہ ایک ہی وقت کئی خوابوں، محرومیوں اور ناآسودہ خواہشات کی تکمیل چاہتے تھے۔ حالات ہر مرتبہ ان کے موافق نہ تھے۔ ابتدائی زندگی میں والدین کی شفقت سے محرومی، بہن بھائیوں سے دوری، تنہائی کا کرب، بیمار دادی کے ساتھ شب و روز ان کے اندر بہت حد تک ناآسودگی کے عناصر کو ترتیب دیتے چلے گئے۔ پھر عالمی جنگ میں جاپان کی شکست بھی ایک عدم تحفظ کا احساس تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ انہیں جنگی معاملات میں شمولیت سے بھی روک دیا گیا۔ جس کی کمی اور خواہش کی تکمیل انہوں نے ذاتی طور پر ایک فوجی تنظیم بنا کر کی۔

ان کا وردی پہننا بھی اس بات کو تقویت دیتا ہے۔ کہ وہ ایک فوجی، جنگی، صحت مند اور تنومندی پر مبنی جوہر

دکھانے کا رجحان رکھتے تھے۔لیکن حالات موافق نہ تھے۔ یا لوگ انکو اسکا اہل نہ سمجھتے تھے۔ یہ تمام صورت حال ان کی خود کشی پر منتج ہوتی ہے۔اور ظاہر کرتی ہے۔ کہ وہ کس بہادری کے ساتھ مرے۔ موت کو شکست دی۔ وہ موت جو سب کو فنا کرتی ہے۔انہوں نے اپنے اس اقدام سے گویا اسکو پچھاڑ دیا۔ان کے ہر فعل کے پیچھے نفسیاتی طور پر ان کے اندر دبی ہوئی خواہشات ہیں بچپن کی محرومیاں، عدم تحفظ کا احساس، سماجی ناانصافی، قدرتی طور پر غیر صحت مند ہونا۔اور ردعمل کے طور پر وہ ان سب کی تکمیل کیلئے ہر لحہ فعال رہے اور حالتِ جنگ کو ترجیح دی ہے۔ آخر میں بھی انہوں نے خود کو ادیب نہیں جنگجو کہلانا پسند کیا یہ جنگ دراصل کسی ایک محاذ کی جنگ نہیں تھی۔ بلکہ زندگی کے محاذ سے متعلق تھی ان کی ذات اور صلاحیتوں کا اعتراف نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ اپنا وجود منوانا چاہتے تھے جو انہیں کمزور سمجھتے تھے۔ وہ انہیں بہادر بن کر دکھانا چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے موت کو بھی خود، اپنی پسند کے طریقے سے طلب کر لیا۔ان کے اندر بہادر اور فاتح کہلانے کی خواہش در پردہ موجود تھی۔ اور ان کی خودکشی کا ایک محرک جاپانیوں میں بہادری کی مخصوص رسم کو پورا کرنا بھی ہے۔ جسے ہرا کری کہتے ہیں۔ یہ روح ان کے ساتھیوں میں بھی موجود تھی۔ لیکن یوکیو کے ہاں اس رسم پر عمل درآمد کرنے میں ان کی لاشعور میں دبی ناآسودہ خواہشات اور محرومیوں کا تناسب مقابلتاً زیادہ تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ زندگی کو جس طرح تمام وقت تجربات کی نذر کرتے رہے اسی طرح خواہش مرگ کی تکمیل بھی ان کے ہاں ایک بھرپور اور آخری تجربے کی صورت دکھائی دیتی ہے۔

ایڈگر ایلن پو Edgar Allan Poe: (1849-1809)

ایڈگر ایلن پو امریکی شاعر تھے۔ نقاد تھے۔ انہوں نے مختصر کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ جاسوسی کہانیاں لکھنے کی ابتداء کی۔ بچپن میں بائرن ان کا، ہیرو اور آئیڈیل تھا۔ شیلے کے بھی پو پر اثرات ہیں۔ کیٹس کے رومانی مزاج سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے فرانسیسی علامت نگاروں کا بھی اثر لیا۔ ان شواہد سے علم ہوتا ہے۔ کہ وہ نہ صرف اعلیٰ ذوق، ذہانت اور تخلیقی صلاحیت کے حامل تھے۔ بلکہ شعروادب کی عمدہ اور مستند روایات کے پیروکار تھے بحیثیت ادیب اور نقاد اپنے وقت کے کئی ادبی پرچوں کے ایڈیٹر تھے۔

جہاں تک ان کے مزاج اور فطرت کا تعلق ہے۔ وہ تکلیف اور اذیت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ منشیات کے عادی تھے۔ خوف، حیرت، موت، رومانس ان کی کہانیوں کے نمایاں عناصر تھے۔

> Poe was also a tortured artist; he was an alcoholic and a laudanum addict... a man in terror of his own suffocation and one obsessed with death.

اس طرح پو ایک طرف اپنی صلاحیتوں کو آزماتے تھے اور دوسری طرف اپنی برداشت کو۔ اپنی تحریروں میں خوف، حیرت اور پراسراریت کی فضا ان کے لئے ایک ڈھال تھی جسکا ہالہ بنا کر وہ اس میں اپنا تحفظ تلاش کرتے تھے۔ اس سے اس بات کو تقویت بھی ملتی ہے۔ کہ ان میں دوسروں کو حیرت زدہ اور خوف زدہ کرنے کی صلاحیت موجود تھے۔ وہ اپنے والدین کی دوسری اولاد تھے۔ پو کی والدہ ٹی بی جیسے موذی مرض سے بچپن ہی میں وفات پا گئی تھیں۔ پو اور ان کی بہن یتیم ہو گئے۔ بعد میں پو ایک بے اولاد عورت کے ہاتھوں پلے بڑھے۔

پو نے ۱۴ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ وہ نسوانی حسن اور رومانوی خیالات کے دلدادہ تھے۔ باغیانہ سوچ، آزادی کے متوالے اور نت نئی خواہشات کے حامل تھے۔ جبکہ معاشی تنگدستی انہیں قدم قدم پر درپیش رہی۔

پڑھائی کے اخراجات پورا کرنے کیلئے اکثر وہ قرض اٹھاتے۔ کچھ مالی پریشانی اور کچھ لوگوں کے ناروا سلوک سے اکثر دلبرداشتہ ہو جاتے۔ شراب کثرت سے پیتے تھے۔ ان کا ایک بھائی کثرتِ شراب نوشی سے مرا۔ پو بھی شراب کا آخری قطرہ تک حلق سے اتارتے تھے اور رات گئے تک لکھنے لکھانے میں مصروف رہتے۔

"He was fired for drinking. Some times he was so sick from drink that he had

"...to stay in bed to be nursed by his aunt پو کے نزدیک ابتدائی زندگی کے غموں اور محرومیوں کو فراموش کرنے کا طریقہ شراب نوشی تھی۔

جنوری ۱۹۴۲ء میں گانا گاتے ہوئے اچانک کھانسی کے ساتھ انہیں خون کی قے آئی۔ جو واضح طور پر ٹی بی کی بیماری کا اعلان تھا۔ پو کی ماں اور ایک بھائی بھی اسی مرض کا شکار ہو کر مر گئے تھے۔ یہ پو کے لئے انتہائی مشکل اور شدید پریشانی کا زمانہ تھا۔

> ...I again hoped. At the end of the year, the vessel broke again... then again-again-again and ever once again... Each time I felt the agonies of her death... But I am constitutionally sensitive-nervous in a very unusual degree; I became insane, with long intervals of horible sainty. During those fits of absolute unconsciousness I drank God knows how often or how much.

یہاں موت وحیات کی متصادم قوتیں بھی ہیں۔ اور امید و ناامیدی کی کش مکش بھی۔ یہ شدت جذبات کا وہ نقطہ عروج ہے۔ کہ انسان موت کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ وہ یہاں جس دیوانگی کی بات کرتے ہیں۔ اس کے پیش نظر انسان میں سوچنے سمجھنے کی قوتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ قوت برداشت ختم ہو جاتی ہے۔ نشہ اس کیفیت سے انہیں جز وقتی فرار کا راستہ دکھاتا ہے۔ اور پھر موت کی طلب بڑھتے بڑھتے خودکشی پر منتج ہو جاتی ہے۔ ان کی اکثر نظموں میں موت کی طلب اور اس کی کیفیت حواس پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ نظم "Tamer lane" میں لکھتا ہے۔

> Father, I firmly do believe.
> I know, for death who comes for me, ...
> Hath left his iron gate ajar...

نظم "The Lake To" میں کہتا ہے۔

> "Death was in that poisonous wave,
> and in its gulf a fitting grave..."

۳۰ جنوری ۱۸۴۷ء کو ان کی بیوی ورجینیا وفات پا گئیں۔ اس دوران پو کا لکھنا لکھانا کم ہو گیا۔ اور وہ خود بھی بیمار پڑ گئے۔ تھوڑے عرصے کے دوران ہی دو عورتوں سے بیک وقت ان کا معاشقہ شروع ہوا۔ ایک درمیانی عمر کی شاعرہ نے جو بیوہ تھی انہیں شادی کا پیغام دیا۔ اسی دوران ایک شادی شدہ عورت سے رابطہ کیا۔ جو اپنے شوہر کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ اس منتشر الخیالی، بے راہ روی، مایوسی اور بے سمت زندگی کے ہاتھوں ایک روز زیادہ نشہ کر کے پو نے خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ ایک سرد دن انتہائی نقاہت، نشے اور بے ہوشی کے عالم میں انہیں واشنگٹن ہسپتال پہنچایا گیا۔ چار دن بے ہوش رہے۔ اور آخر ۷ اکتوبر ۱۸۴۹ء کو ۴۰ سال کی عمر میں پو کا انتقال ہو گیا۔ یہ تمام صورت حال جو غیر متوازن اور بے اعتدال رہی۔ رفتہ رفتہ موت کی طرف ہی پیش قدمی کرتی رہی ہے۔ بلکہ اقدام خودکشی ہی آخر کار خودکشی پر ختم ہوا۔

مایا کوسکی Viladimir Mayakovsky: (1930-1893)

مایا کوسکی روسی ادیب اور شاعر تھے۔ روسی انقلاب سے متاثر تھے۔ اور اس انقلاب کے ان پر عملی اور فکری دونوں طرح کے اثرات ہیں بیسویں صدی میں روسی انقلابی تحریک کے حوالے سے وہ نمایاں ترین لکھنے والوں میں سے تھے۔ اگرچہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہ تھے لیکن ان پر اس کے گہرے اثرات تھے۔

> ...he was a superb propagandist, creating thousands of poems, advertisements, posters, and slogans to sell lenin and the Soviets to the masses.

مایا کوسکی کی انقلابی سوچ ایک طرف تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جذباتی فطرت کے بھی مالک تھے۔ زیادہ سے زیادہ محبت کے متلاشی، خواتین سے وابستگی کے شائق اور اپنی ذات میں بہت حد تک تنہا۔

مایا کوسکی ۱۹ جولائی ۱۸۹۳ء کو جارجوین گاؤں میں پیدا ہوئے۔ دو بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے ان کے والد کسانوں اور زمینداروں کے ملازم تھے۔ وہ ۱۳ سال کے تھے کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔ ماں تینوں بچوں اور شوہر کی قلیل پنشن کیساتھ ماسکو آ گئیں۔ جہاں وہ مشکل سے بچوں کی پڑھائی کے قابل ہوئیں۔ ۱۴ سال کی عمر میں انہوں نے سکول چھوڑ دیا۔ اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ کام کرنے لگے۔ مارچ ۱۹۰۸ء میں ایک پریس میں چھاپہ پڑنے پر گرفتار ہوئے۔ دو مرتبہ اس کے بعد بھی گرفتاری عمل میں آئی۔ اسی دوران ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ ایک سال بعد رہا ہوئے۔ سیاسی مصروفیت کے ساتھ ساتھ یہ Painting کے لئے ماسکو آرٹ سکول میں داخل ہوگئے۔ یہ ۱۹۱۱ء کا زمانہ تھا۔ وہاں ایک نامور پینٹر نے ان کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ اور ساتھ ساتھ ان کی مالی مدد بھی کی۔

"... You wrote it yourself! he exclaimed. you are a genious ... That evening, quite unexpectedly became a poet." مایا کوسکی ایک انقلابی ذہن کے حامل ادیب اور فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے۔

شاعری میں ان کی اہم نظمیں "The cloud in trouser" اور "The Backbone Flute" کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔ چونکہ مایا کوسکی شاعری اور مصوری دونوں پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ لہٰذا اب وہ مصوروں اور شاعروں کی صف میں شامل ہوگئے۔ خاص طور پر اس گروپ کے ساتھ جو روسی ادب کی روایت کے خلاف اٹھ کھڑے

ہوئے تھے۔ یہ Futurist Movement تھی۔ دسمبر ۱۹۱۳ء میں انہوں نے ان کے تھیٹر میں اپنا ایک کھیل پیش کیا۔ جس میں خود ہی اداکار تھے۔

سیاسی سطح پر وہ اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کرتے رہے۔ فروری ۱۹۱۷ء میں آنے والے روسی انقلاب کو وہ نیا انقلاب سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ اب روس کی ادبی روایت میں تبدیلی آنی چاہیے اور یہ تبدیلی زبان، سٹائل اور ٹیکنیک وغیرہ کے حوالے سے ممکن ہوسکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ کہ روسی انقلاب جب آیا۔ تو مایاکوسکی اور ان کے ہم خیالوں کی امنگوں کے مطابق نہ تھا۔ ایک طرح سے یہ تمام صورت حال ان آئیڈیلز کی موت تھی۔ جوان ادیبوں کے ذہن میں موجود تھے۔ یہ تمام حالات مایاکوسکی کیلئے انتہائی مایوس کن تھے۔

مایاکوسکی رومانوی ذہن رکھتے تھے محبت کا پہلو ان کی فطرت، شخصیت اور زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی دوست Lili Brik کو لکھتے ہیں۔

> ...Love means everything for me? Everything but in a different way Love is life, the essential life. It is the mortor that moves the poetry, the work, all the rest. Love is at the heart of everything. If it stops, the rest will die...

ان کے نزدیک محبت کا مفہوم زندگی کے مجموعی برتاؤ سے وابستہ ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے۔ جو انسان کو اس کے مقاصد اور لائحہ عمل میں مثبت، متحرک اور کامیاب بناتا ہے۔ وہ جس محبت کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ان کے ہاں ایک خالص جذبہ ہے جس میں انہیں آلودگی گوارا نہیں۔ اس سے علم ہوتا ہے کہ وہ کچھ "پانے" اور "نہ پانے" کے درمیان زیادہ عرصہ تک جینا اور سسکنا نہیں چاہتے۔ للّی کے ساتھ ان کے تعلقات میں جب رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں۔ تو انہوں نے وہ راستہ ترک کردیا۔ کیونکہ وہ کسی طور پر کسی مفاہمت، انتظار اور مزید جذباتی شدت کے المیہ کے ساتھ زندہ رہنا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ اس کے آگے انہیں اپنے وجود کی موت نظر آتی تھی۔ ان کی اس فطرت کو سامنے رکھیں۔ تو وہ ایک شدید جذباتی نوعیت کے انتہا پسند نظر آتے ہیں۔ اور خودکشی کے حوالے سے آہستہ آہستہ کرب آگیں کیفیت میں مبتلا نہیں رہتے۔

جنوری ۱۹۲۴ء میں جب لینن کا انتقال ہوا۔ تو انہوں نے اسے بہت بڑا حادثہ سمجھا۔ اسطرح ان کے چھوٹے بڑے آئیڈیلز ٹوٹتے رہے انہوں نے اپنا آخری ڈرامہ ۱۹۲۹ء میں لکھا۔ جس میں انہوں نے صحافت اور بیوروکریسی پر شدید اعتراضات کیے یہ ان کی زندگی میں تنہائی کا شدید دور تھا۔ للّی کو لکھتے ہیں۔ "In my view, I have become a terribly proletarian poet: I have no money and do not write any poems" وہ ذہنی طور پر انتہائی غیر مطمئن اور تنہا تھے۔ ان دنوں ایک نئی فنکارہ کے ساتھ ان کے مراسم چل رہے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں اس کے ساتھ جھگڑے کے فوری بعد مایاکوسکی نے خود کو پستول سے گولی مار کر خودکشی کرلی۔ اسوقت ان کی عمر ۳۶ برس تھی۔ ان کی تمام زندگی میں ایک مسلسل ہنگامہ خیزی رہی۔ جو ان کی انقلابی سوچ اور مختلف طرح کے مشاغل پر مبنی تھی محبت میں ناکامی اور محبت کے پے در پے ناآسودہ تجربات نے انہیں بالآخر تنہائی کے کرب میں مبتلا کردیا۔ اور مایاکوسکی نے کوئی راہ فرار نہ پاتے ہوئے خودکشی کو ترجیح دی۔

رضا کمال شہزاد Raza Kamal Shehzad:

رضا کمال شہزاد تہران میں پیدا ہوئے۔ سن پیدائش ۱۶۷۷ شمسی ہے۔ شہزاد تخلص تھا۔ والد مرزا حسن کمال الدولہ میرزا یوسف صدر اعظم کے دبیر مخصوص تھے۔ چار بہنوں اور چار بھائیوں میں شہزاد سب سے چھوٹے تھے۔ خوبصورت اور نفیس انسان تھے۔ اور گھر میں سب کے چہیتے۔ بچپن سے ہی شاعری کی طرف طبیعت راغب تھی۔ لکھائی بہت عمدہ تھی۔ عمدہ تصاویر بناتے تھے۔ سردی کی راتوں میں آتشدان کے گرد کہانی کہنا اور سننا انہیں مرغوب تھا۔ ستار بجانا پسند تھا۔ شطرنج میں مہارت تھی۔ مختلف رسائل و جرائد میں لکھتے تھے۔ فرانسیسی اور انگریزی نظموں کے تراجم بھی کیئے۔ یہ تمام عوامل شاہد ہیں کہ رضا کمال شہزاد فطری طور پر اعلیٰ علمی و ادبی ذوق کے مالک تھے۔ اور قدرت نے انہیں تخلیقی جوہر فراوانی سے عطا کیے تھے۔

۱۶۹۸ء میں جب تہران میں اوپیرا دکھانے کا رواج ہوا۔ تو شہزاد نے بھی اس میں حصہ لیا اور مادام پری بابو اور آقای دریان کی رہنمائی میں اسے پیش کیا۔ جسے بے پناہ مقبولیت ملی۔ ان کا سب سے مختصر ڈرامہ ''شب ہزار و یکم الف لیلیٰ''، سٹیج پر انتہائی خوبصورتی اور کامیابی سے پیش ہوا۔ رضا کمال شہزاد کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے الگ ہٹ کر دیکھا جائے۔ تو ان کی زندگی میں حادثات زمانہ اور زندگی کے نشیب و فراز کا عمل دخل بھی بہت دکھائی دیتا ہے۔ جن کے رضا کمال نے گہرے اثرات قبول کیے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ انہی صدمات نے رضا کمال کی سوچ کا دھارا پلٹ کر رکھ دیا۔ تو بے جا نہ ہو گا جوانی میں ان کے قریبی عزیزوں کی اموات کے صدمے اٹھائے۔ ان کے والد، والدہ اور عزیز بہن کا انتقال ہو گیا۔ موت نہ صرف ان سے عزیز ترین ہستیاں چھین لے گئی۔ بلکہ ان کے بہت قریب سے گزری۔ موت سے قربت کی کشش کا بیج یہیں سے پھوٹتا ہے۔

اور جہاں تک انکی ذاتی زندگی کا تعلق ہے۔ ازدواجی زندگی کیلئے طبیعت کے موافق کوئی خاتون انہیں نہ ملی۔ ایک دو مرتبہ محبت ناکام بھی ہوئی۔ محبت کی ناکامی اور اندر کی تنہائی زندگی کی بے معنویت کا سبب بنی۔ یہ صورت حال بھی انہیں رفتہ رفتہ زندگی سے دور کرنے لگی۔ شہزاد کا تعلق تھیٹر کے ساتھ بھی تھا۔ ان دنوں تھیٹر بھی حکومت وقت کی ضرورت کے تحت غیر پسندیدہ ہونے لگا۔ جذباتی زندگی کے متزلزل ہونے کے ساتھ ساتھ عملی اور خارجی زندگی میں ٹوٹ پھوٹ کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ شہزاد نے تھیٹر سے کنارہ کشی کر کے ذاتی مصروفیت کے لئے ایک دو جگہ ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن ملازمت کے لئے اب ان کے اندر نہ تو کوئی طلب باقی تھی۔ اور نہ یکسوئی۔ زندگی جیسے ایک ہی بہاؤ پر رواں دواں تھی۔ نہ طلب، نہ تمنا، اور نہ جذباتی اتار چڑھاؤ کے مرحلے۔

زندگی میں المیہ عناصر بڑھ رہے تھے۔ والدین کی وفات کے بعد انہوں نے ہمیشہ ماتمی لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ ان کے اشعار میں یاس و نا امیدی کی جھلک نمایاں تھی۔ اسی غم کو غلط کرنے کے لئے انہوں نے افیون بھی کھانا شروع کر دی۔ بعد میں دوستوں کے کہنے پر یہ عادت چھوڑ دی۔ ۔۷۸

لیکن اس عادت کا چھوٹنا ایسا نہ تھا کہ اس سے صورتِ حال میں کوئی تبدیلی آتی یا زندگی کسی ایک سطح پر ٹھہراؤ کا عنوان بنتی۔ بلکہ اس عادت کا چھوٹنا ایسا ہی تھا۔ جیسے انسان ہر کام چاہے بے چاہے کرتا چلا جائے۔ بے دلی کے ساتھ کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ یا کیا ہو کر رہے گا۔ اس سے کوئی غرض نہ ہو کہ زندگی میں طلب، مزید اچھے کی امید اور جینے کی خواہش کا سفر اختتام پذیر ہو رہا ہے۔ ''اب وہ موت کی فکر میں تھے۔ ان کو چند ایک دوست بھی ایسے ملے۔ جو خود موت کو زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔ پانچ آدمیوں نے اکٹھے بیٹھ کر خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا۔۔'' ۔۷۹

یہ تمام رویے اور طریقہ کار زندگی کو بے معنی اور غیر فعال بنا رہے تھے۔ ہر تکلیف دہ صورت حال میں پیچھے کی طرف پلٹنے کی کیفیت تھی۔ اور حصول موت کے لئے باقاعدہ ایک منصوبہ بندی اور حکمت عملی کام کر رہی تھی۔ اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے آس پاس کی فضا اور ماحول بھی سازگار تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے۔ کہ اس انتہا پسندی تک پہنچنے کے لئے ایک باشعور انسان ابتداء سے تسلسل کے ساتھ کہاں کہاں ٹوٹتا چلا گیا۔ مثلاً ایک مرتبہ شہزاد کے ایک انتہائی قابل اعتبار نوکر نے ان کی بہن کے قیمتی زیورات چرائے۔ علم ہوا تو اس کے بعد ان کا سب پر سے اعتبار اٹھ گیا۔ یہ انتہائی حساس ہونے اور نازک مزاجی کی دلیل ہے۔ اور یہ بھی کہ انسان دوسروں کے تکلیف دہ رویے کو بدل نہ سکنے کی صورت میں خود سماج اور زندگی سے کٹتا چلا جاتا ہے۔ خودکشی کا یہ محرک زیادہ تر ادیبوں میں ایک قدرِ مشترک ہے۔ اس تمام پسِ منظر میں انتہائی دلبرداشتہ ہو کر نوکری سے برخاست ہوئے۔ نوکری چھوڑنا ان کے لئے گویا زندگی کو چھوڑ دینا تھا۔ ''اور ایک رات کوئی زہریلی دوا پی کر انہوں نے خودکشی کر لی۔ اور ایک حسین زندگی بری طرح خاک میں مل گئی۔'' ۔۸۰

رضا کمال شہزاد کی زندگی کا مطالعہ ایک حساس اور نازک مزاج تخلیق کار کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ جو زندگی کے کئی محاذوں پر بری طرح جذباتی صدموں سے دوچار ہوا۔ جس نے ایک ایسی ٹوٹ پھوٹ کو ان کے اندر نہ صرف جنم دیا۔ بلکہ اس میں شدت کے ساتھ اضافہ کیا۔ حتیٰ کہ زندگی ان کے لئے بے معنی شئے ہو کر رہ گئی۔ اور سوائے خودکشی کے ان کے سامنے راہِ فرار باقی نہ رہی۔

فرخی یزدیFurkhy Yazdi :

فرخی یزدی کا نام محمد اور فرخی تخلص تھا۔ باپ کا نام محمد ابراہیم تھا۔ یزدی ۱۲۰۶ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں یزدی انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے۔ پندرہ سال میں فرخی نے مدرسہ کی مذہبی تعلیم کے خلاف ایک نظم لکھی۔ چنانچہ سکول سے نکال دیئے گئے۔ ایک مخصوص باغیانہ روش اور آزادانہ خیالی کے حوالے سے مدرسے سے یزدی کا نکالا جانا ظاہر کرتا ہے۔ کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف ماحول اور حالات سے جلد سمجھوتہ کرنے والے نہیں تھے۔ ان کے اندر ایک انقلابی سوچ تھی۔ جو انہیں زندگی اور اس کے نت نئے تجربات کی طرف راغب رکھتی تھی۔ سکول سے نکلنے کے بعد محنت کر کے روزی کمانے لگے۔ لیکن چونکہ ذہین تھے اس لئے بے باکی اور آزادی کے ساتھ اشعار لکھتے رہے۔ جب ڈیموکریٹک پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تو اس میں شریک ہو گئے۔ بادشاہ وقت کو بھی تربیت کی غرض سے نظموں کے ذریعے پیغام دیتے تھے۔ لیکن شعروادب کے اشارات و کنایات کے پیچھے یزدی کا حکومت وقت کے لئے جو پیغام چھپا ہوا تھا۔ وہ زیادہ دیر پردۂ اخفا میں نہیں رہ سکا۔ اور ایک نظم پر غضب ناک ہو کر حاکم نے فرخی کو جیل بھجوایا۔ اور ان کے ہونٹ سی دیئے گئے۔ تین ماہ بعد فرخی جیل سے بھاگ کر تہران گئے۔ اور اپنے اشعار کے جوش اور ولولے سے قوم کے دلوں کو گرمایا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران ہجرت کر کے عراق گئے۔ انگریز کے خوف سے مختلف ملکوں میں چھپتے واپس ایران آئے۔ اس دوران مخالف قوتوں نے انہیں گولی کا نشانہ بنایا۔ مشکل سے بچے۔ کچھ عرصہ قید و بند کی صعوبتوں میں رہے۔ مجلس شوریٰ کے ممبر بھی تھے۔ لیکن ان تمام سرگرمیوں میں کہیں بھی چین اور اطمینان قلب میسر نہ آیا۔ بعض اوقات ذلت اور رسوائی کے ہاتھوں تنہائی میں چلے جاتے تھے۔ معاشی تنگدستی کا زمانہ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اور وہ حکومت کے خلاف مسلسل لکھتے رہے۔

ایک رات انہوں نے کافی مقدار میں افیون کھا کر خودکشی کرنا چاہی۔ لیکن انہیں بروقت بچالیا گیا۔ اس جرم پر قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ جیل میں انہوں نے دیگر قیدیوں کے ساتھ حکومت کے خلاف نعرہ بازی اور تقاریر کیں ان کی باغیانہ روح کو کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی رہی۔ لیکن یہ مستقل مزاجی سے اپنے محاذ پر ڈٹے رہے۔ آخر کار حکومت وقت نے انہیں

کوٹھری میں ڈال دیا، اور آسائش کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ فرخی اب جانکنی کے عالم میں تھے اور ہر وقت موت کی آرزو کرتے تھے۔ یہاں بھی حکومت کا بس نہ چلا تو ان کو ہسپتال لے جا کر کوئی زہریلی دوا دیکر مار ڈالا۔ ۸۱

فرخی یزدی کی زندگی کے المناک حادثات وواقعات نے انہیں ایک غیر اطمینان بخش زندگی کا ایسا تجربہ عطا کیا ۔جس میں ٹھہراؤ اور سکونِ قلب کا ذرہ تک نہ تھا۔ خودکشی کی کوشش کرنا، زندگی سے بیزاری اور مسلسل خود کو پے در پے مشکلات کی طرف دھکیلنا ظاہر کرتا ہے۔ کہ فرخی نے جو زندگی گزاری وہ خواہش مرگ کے حصول کے لئے ہی وقف رکھی۔

صادق ہدایتSadiq Hidayat : (1951-1903)

صادق ہدایت کی پیدائش ۱۹۰۳ء میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم تہران میں مکمل کی۔ بعد میں مزید تعلیم کے لئے فرانس چلے گئے۔ لیکن کوئی امتیازی حیثیت کی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ البتہ اس دوران مغربی اور جدید اندازِ فکر سے روشناس ہوئے۔ فرانس میں قیام کے دوران انہوں نے افسانہ نویسی کا آغاز کیا۔ جو بعد میں ''زندہ بگور اور سہ قطرۂ خون'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ وہ تجارت اور وزارتِ خارجہ کے محکموں سے وابستہ رہے۔ ایران میں ان شعبوں سے متعلق ان کی خدمات قابل ذکر ہیں۔

صادق ہدایت نے مختلف ملکوں کے سفر کیے۔ اسکا فائدہ یہ ہوا کہ وہ وہاں کی علمی و ادبی روایات سے آگاہی حاصل کرتے رہے۔ کچھ عرصہ تاشقند میں بھی گزارا۔ اور وہاں کی یونیورسٹی میں قلمی کتابوں کا مطالعہ کیا۔

صادق ہدایت کی زندگی میں انکی منشیات سے رغبت اپنا ایک خاص حوالہ رکھتی ہے۔ زندگی کے پریشان کن لمحوں میں انہوں نے منشیات اور شراب نوشی کے سہارے اپنا غم غلط کرنا چاہا۔ اس کی بے خودی اور خود فراموشی کے علاوہ صادق ہدایت ہوٹلوں اور قحبہ خانوں میں جانے کے رسیا تھے۔ اور در حقیقت اسی دوران شراب نوشی کی عادت میں بھی شدت آتی چلی گئی۔ صادق ہدایت ان لکھاریوں میں سے تھے۔ جو تخلیقی سطح کی سرگرمیوں میں بھی شراب نوشی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

جہاں تک صادق ہدایت کی ذاتی زندگی کا تعلق ہے۔ انہوں نے سادہ زندگی بسر کی۔ ان کے افراد خانہ زیادہ تر حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ لیکن ان کی طبیعت جاہ و حشمت سے بے نیاز رہی۔ عشق و عاشقی میں ایک دو مرتبہ ناکامی ہوئی۔ ان غیر مطمئن اور پریشان کن حالات میں صادق ہدایت نے

> انسانوں سے بیزار ہو کر حیوانوں سے لو لگائی۔ گھر میں ایک بلی پال رکھی تھی۔ اسی سے غایت محبت رکھتے تھے۔ کھلاتے پلاتے باتیں کرتے تھے۔ وہ تنہائی میں ان کی مونس و غمگسار تھی۔ ایک دن اتفاقاً وہ آئے تو گھر میں بلی نہیں تھی ہمسائیگی میں ایک نر ہم جنس کی آواز سن کر وہ نہ رہ سکی۔ اور گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ جب لمبی غیر حاضری کے بعد لوٹی تو صادق کو بہت غصہ آیا۔ کہ یہ بھی بے وفا نکلی۔ پستول اٹھایا اور اسے وہیں ہلاک کر دیا۔ ۸۲

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک حساس فطرت اور ایک انٹلیکچول کس طرح اقدار اور انسانوں کے بارے میں بے اعتبارگی کا شکار ہوتا ہے۔ جو اس کے اندر انسانوں، ماحول اور پھر زندگی سے بھی بیزاری کی صورت پیدا کرنے کے موجب بنتے ہیں۔ چنانچہ وہ رفتہ رفتہ تنہا ہوکر اور اپنی ذات میں سمٹ جاتا ہے۔

صادق ہدایت کی زندگی میں دنیا سے بیزاری اور انسانوں کے ساتھ ساتھ اقدار اور رویوں میں بداعتمادی کا یہ پہلو بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ جو بعد میں شدت کے ساتھ ان کی خودکشی کا حوالہ بھی بنتا ہے۔ صادق اپنی زندگی کے آخری سالوں میں بہت بیزار تھے۔ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں اپنے ایک دوست کو لکھا۔ ''اب میں زندگی سے ہار گیا ہوں۔ اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ اب نہ میں اپنے آپ کو دھوکا دے سکتا ہوں اور نہ مجھے خودکشی کی غیرت ہے۔'' ۔۸۳ یہاں زندگی اور موت ہم معنی ہو جاتے ہیں جب زندگی موت کی مانند ہے۔ تو پھر مرنے سے گریز کیوں؟ یہ بے خوفی کا پہلو ہے جسکا حصول ہر قیمت پر درکار ہے۔ اب وہ تنہائی اور گمنامی کی زندگی یا موت کو ترجیح دیتے تھے۔ اجتماعی زندگی سے انہیں کوئی انس نہ رہا تھا۔ زندگی اور موت کی ایک کش مکش تھی جس سے وہ گزر رہے تھے۔ آخر کار: ''۱۹۵۱ء کے دن بے قابو ہوکر انہوں نے خودکشی کر لی'' ۔۸۴ مایوس اور بیزار کن زندگی سے چھٹکارا پانے کا ان کے سامنے صرف یہی مناسب راستہ رہ گیا تھا۔

حوالہ جات

۱۔ Lori-L-Lake, Author, Editor, Reviewer, Instructor, Lesbian Her story, From when the name Came, internet.

۲۔ Internet

۳۔ Internet

۴۔ میراجی، مشرق ومغرب کے نغمے، اکادمی پنجاب (ٹرسٹ)، مکتبہ جدید، چوک انارکلی، مطبوعہ اردو پریس، لاہور بار اول، نومبر، ۱۹۵۸ء، ص ۳۳۸

۵۔ ایضاً، ص، ۳۴۹

۶۔ ایضاً، ص، ۳۳۸

۷۔ ایضاً، ص، ۳۴۹

۸۔ Internet

۹۔ Internet

۱۰۔ Internet

۱۱۔ Hemingway, Biographical Notes of Suicidal Poets and others, Copyrights
۱۲۔ 1997-2004, by the Academy of American Poets. (Internet).

Bashir Ahmed Chaudry Prof, Ernest Hemingway, The Old Man and the
۱۳۔ Sea, Polymer Publishers, Lahore, 1996, P,02

A.E. Hotchner, Papa Hemingway, first Published in Great Britain, 1955,
۱۴۔ Granada, Publishing, 1979, P, 167.

۱۵۔ Ibid,P, 01.

Bashir Ahmed Prof, Ernest Hemingway, The Old Man and the Sea.
۱۶۔ Polymer Publishers, Lahore, 1996, P,03..

۱۷۔ A.E. Hotchner, Papa Hemingway, Granada Publishing, 1979, P,64.

۱۸۔ Internet

A.E. Hotchner, Papa Hemingway, Great Britian, 1979, Foreword P. 47.

۱۹۔ Ibid, P, 169.

۲۰۔ Ibid, P, 168.

۲۱۔ Ibid.

۲۲۔ Ibid, P, 247.

۲۳۔ Ibid, P, 248.

۲۴۔ Ibid, P, 240.

۲۵۔ Ibid, forward.

۲۶۔ Ibid P, 251.

۲۷۔ Ibid, P, 253.

۲۸۔ Anne Stevenson, Sylvia Plath, Bitter Fame, a life of Sylvia Plath, Penguin Books, 27 Wrights Lane, London England, 1989, Preface.

۲۹۔ Edward Butscher, Sylvia Plath, Method and Madness, Seabury Press, New York, year not mentioned, P, 38.

۳۰۔ Anne Stevenson, Sylvia Plath, Bitter Fame, a life of Sylvia Plath, Penguin Books, 27 Wrights Lane, London, 1989, P, 15.

۳۱۔ Ibid, P, 146.

۳۲۔ Ibid, P, 245.

۳۳۔ Ibid, P, 16.

۳۴۔ Ibid, P, 43.

۳۵۔ Edward Butscher, Sylvia Plath, Method and Madness, the Seabury Press. New York, year not mentioned, P, 11.

۳۶۔ Anne Stevenson, Sylvia Plath, Bitter Fame, A life of Sylvia Plath, Penguin Books, London, 1989, P, 139.

۳۷۔ Ibid, P, 150.

۳۸۔ Ibid, P, 150.

۳۹۔ Ibid, P, 147.

۴۰۔ Ibid, P, 252.

۴۱۔ Ibid, P, 38.

۴۲۔ Ibid, P, 136.

۴۳۔ Ibid, P, 136.

۴۴۔ Anne Stevenson, Sylvia Plath, Bitter Fame, A life of Sylvia Plath, Penguin Books, London, 1989, P, 271.

۴۵۔ Ibid, P, 289.

۴۶۔ Biographical notes of suicidal poets and the Authors, by Academy of American Poets, updated on Apr 17, 2004.(Internet)

Anne Stevenson, Sylvia Plath, Bitter Fame, A life of Sylvia Plath, Penguin books, London, 1989, P, 291.

۴۷۔ Sylvia Plath, Biographcial notes of suicidal poets and Authors, 2004, by Academy of American Poets.

۴۸۔ Anne Stevenson, Sylvia Plath, Bitter Fame, A life of Sylvia Plath, Penguin Books, London, 1989, P, 297.

۴۹۔ Ibid, P, 266.

۵۰۔ Anne Sexton, Biographical Notes of Suicidal Poets and Authors, Copyrights (C) 1997-2004. The Academy of American Poets.

۵۱۔ Internet

۵۲۔ Internet

۵۳۔ Internet

۵۴۔ Internet

۵۵۔ Internet

۵۶۔

۵۷۔ Alice Walker, Biographcial Notes of Suicidal Poets and Authors, 2004.(Internet).

۵۸۔ From American National Biography New York, Oxford University Press, 1999, Copyrights by the American Council of Learned Societies. 1999.

۵۹۔ Ibid

۶۰۔ Ibid

۶۱۔ Biographical Notes of Suicidal poets and Authors, Copyrights (c) 1997-2004, by the Academy of American Poets.

۶۲۔ Ibid

۶۳۔ Ibid

۶۴۔ Ibid

۶۵۔ Ibid

۶۶۔ Ibid

۶۷۔ Ibid

۶۸۔ Ibid

۶۹۔ Ibid

۷۰۔ Ibid

۷۱۔ Ibid

۷۲۔ Ibid

۷۳۔ Ibid

۷۴۔ Ibid

۷۵۔ Ibid.

۷۶۔ Ibid

۷۷۔ Edger Allen Poe, Living Biography of Great poets, By Henry Thomes and Dana Lee Thomes, London, 1959, P, 436, 467.

۷۸۔ Ibid, P, 436, 467.

۷۹۔ ظہور الدین احمد، ڈاکٹر نیا ایرانی ادب، ناشر ضیائی ادب، لاہور، ۱۹۹۰، ص ۲۲۸

۸۰۔ ایضاً، ص، ۲۲۸

۸۱۔ ایضاً

۸۲۔ ایضاً، ص، ۱۳۱

۸۳۔ ایضاً، ص، [illegible]

۸۴۔ ایضاً
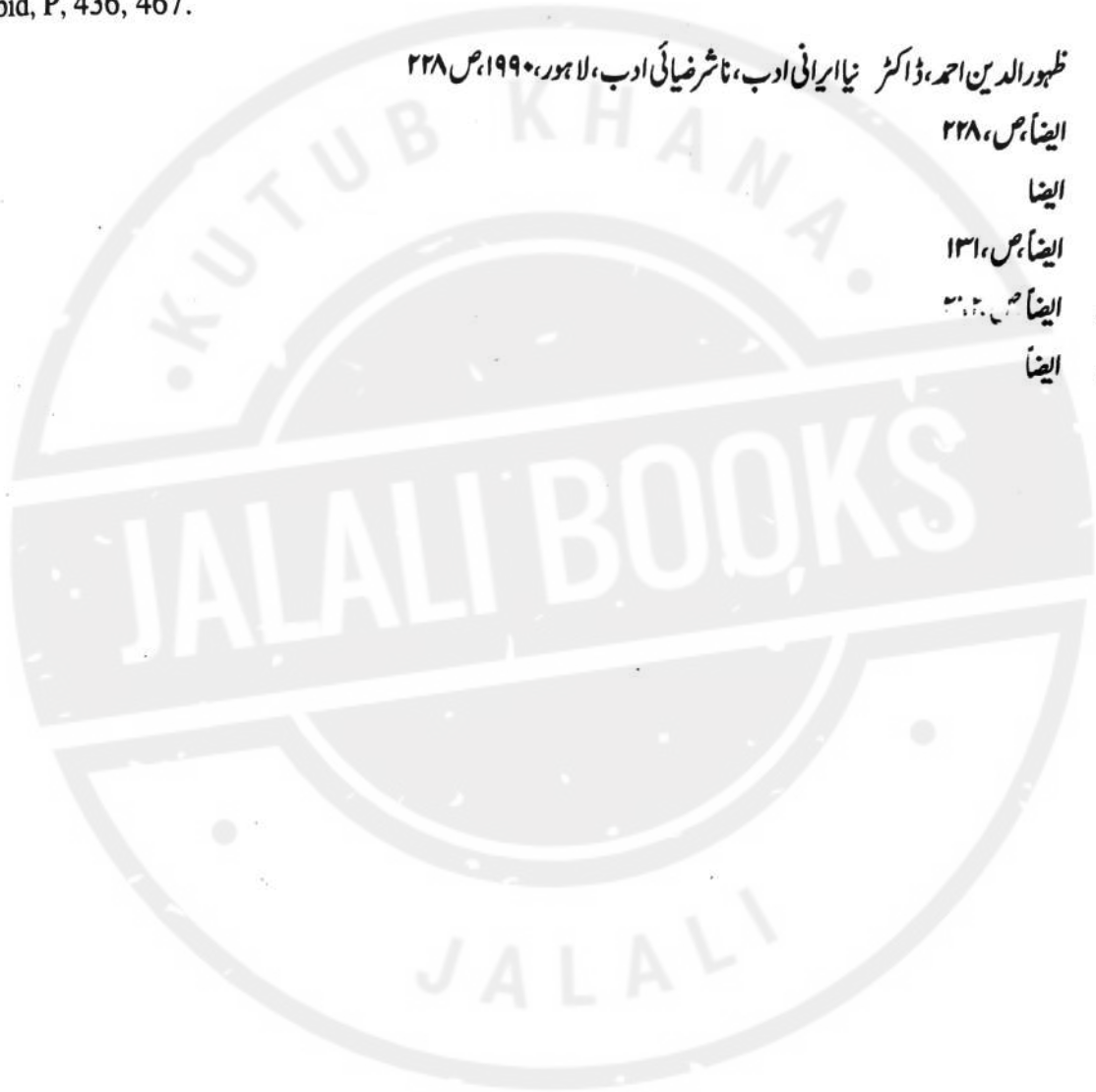
باب سوم

اردو کے وہ ادیب جنہوں نے خودکشی کی

شمس آغا (۱۹۲۲ء۔۱۹۴۵):

شمس آغا۔افسانہ نگار، ناول نگار۔ان حیثیات میں اگر چہ کوئی زیادہ نام نہیں کما سکے کہ شاید عمر عزیز آغاز کے ساتھ ہی انجام پذیر ہوگئی۔لیکن جتنا لکھا۔اسے انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ایک ادیب کی روح ان حروف میں نہ صرف جاگزیں ہے بلکہ تڑپتی ہے۔جہاں غور و فکر ہے۔بصیرت ہے۔شمس نے ۱۹۳۸ء میں مشن ہائی سکول سے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔گورنمنٹ انٹر کالج گجرات میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا۔۱۹۴۰ء میں شمس نے سٹیون سن الیکٹریکل اینڈ مکینکل کالج سے امتحان پاس کیا۔

شمس آغا جاگیردار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔انکے جدامجد اسلم خان درانی افغانستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔جو فوج میں بطور رسالدار ملازم تھے۔شمس کی پیدائش لاہور کی ہے۔جب انکے والدین میں علیحدگی ہوئی تو شمس اپنے دادا کے پاس گجرات آئے۔یہاں پر شمس کی ابتدائی زندگی اپنے چچا عبدالرحمٰن درانی اور ان کے بچوں کے ہمراہ گزری ۔لیکن

> شمس نے ذرا مختلف طبیعت پائی تھی۔وہ ایک حساس بچہ تھا۔اس کے ذہن پر اپنے والد اور والدہ کی علیحدگی کا گہرا اثر پڑا تھا۔وہ اپنی بہن کو لمبے لمبے خط لکھتا تھا۔جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی والدہ اور بہن سے شدید محبت کرتا تھا۔۔ا

شمس تعلیم کے حصول میں سنجیدہ تھے۔ان کے دادا پڑھائی کے معاملے میں بہت سخت تھے۔حتیٰ کہ لڑکیوں کی تعلیم کے بھی اس وقت حامی تھے۔شمس نصابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔تقریر کرنا، ٹکٹیں جمع کرنا، قلمی دوستی کے شوقین، فوٹو گرافی، شکار، بسنت کے میلے، پتنگ بازی حتیٰ کہ ہولی کے تہوار اور رنگوں میں بھی شامل ہوتے تھے۔شمس آغا کے آج تک دستیاب شدہ افسانوں کی تعداد نو ہے۔مثلاً خواب، شکست، سراب، اندھیرے کے جگنو، صبح و شام، کہاں، افتاد، فریب آرزو، شکوہ وغیرہ۔اور ایک ناول ''دلِ ناداں'' ہے۔جو مکمل نہیں ہو سکا۔

شمس آغا کی گمشدگی ۳ دسمبر ۱۹۴۵ کو عمل میں آئی۔اس تاریخ کو وہ دنیا کی نظروں سے روپوش ہوئے۔اسوقت ان کی عمر ۲۴ سال تھی۔یہ گمشدگی بلکہ خودکشی کا عمل اب نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ہو چکا ہے۔عمر کا یہ دور انتہائی شدتِ جذبات کا زمانہ کہلاتا ہے۔ذات، سماج، ماحول اور ہر طرح کے ناسازگار و ناموافق حالات و واقعات سے بغاوت خود بخود پیدا ہونے لگتی ہے۔انہیں احساس ذات کی شدت کہیں یا خودی و خودداری کا پہلو لیکن انسان کے اندر کچھ کر گزرنے

کی فطرت جیسے جاگ اٹھتی ہے۔ اور خاص طور پر وہ ذہن جو سماج میں، کائنات میں اپنی شناخت اپنے ہی قول وفعل کے حوالے سے تلاش کر رہا ہو۔

شمس کے والدین میں علیحدگی ہوگئی تھی۔ اس کے اثرات یقیناً ان کی آئندہ زندگی پر شدید طور سے مرتسم ہوئے۔ چھت کا ٹوٹنا، گھر کا بکھرنا، ان کی شخصیت کے اندر بھی ایک ٹوٹ پھوٹ اور بے معنویت کے ساتھ ساتھ عدم تحفظ کا احساس بوگیا۔ والد سے انکار روحانی اور جذباتی فاصلہ شدت پکڑتا گیا۔ اوراس کے برعکس اپنی ماں اور چھوٹی بہن سے ان کی محبت شدید تر ہوتی گئی۔ کیونکہ اپنی ماں سے جدا کر دیئے گئے تھے۔ تعلیم وتربیت کا سلسلہ اسوقت موقوف ہوگیا تھا۔ جب شمس کے دادا کی وفات ہوئی۔ اس دوران وہ گجرات یعنی دھدیال سے وزیرکوٹ اپنی والدہ سے ملاقات کے لئے آتے رہتے تھے۔ لیکن حصول ملازمت میں ناکامی اور معمولی ملازمت سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث وہ فراغت کا ایک لمبا عرصہ وزیرکوٹ میں رہے۔ یہاں ڈاکٹر وزیر آغا جو خود ایم اے کرنے کے بعد تلاش روزگار میں سرگرداں تھے۔ اوراس دوران فراغت کا وقت ادھر بھی تھا۔ لہذا دونوں کا شب و روز اکٹھے رہنا۔ گاؤں کے لوگوں کے مسائل، محنت کشوں کے مصائب، غربت، تنگدستی کے ایام۔ گویا زندگی کی بے معنویت کا ایک روپ ادھر بھی تھا۔ دور دراز راستوں پر گھومنا، زندگی، موت کے گوناں گوں پہلوؤں پر پہروں سوچنا، تبادلۂ خیالات دونوں کو رفتہ رفتہ فطرت کی خاموشیاں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ ایک طرف عہد شباب، داخلی زندگی کی ناآسودگی، مادی معروفیت سے فراغت کے زمانے، حد نگاہ پھیلی ہوئی کائنات، فطرت کے گوناں گوں نظارے، ان کے اپنے علم اور مطالعہ کی زبان۔ گویا مشاہدہ اور تجربہ ایک دوسرے میں ضم ہونے لگے۔ اب وہ ایک تخلیق کار سے ہم زبان تھے۔ خارجی زندگی کی بے معنویت نے جیسے داخلی دنیا میں معنویت کے در کھول دیئے۔

شمس آغا کی زندگی ایک جاگیردار گھرانے کے چشم و چراغ ہونے کے باوجود ابتداء ہی سے محرومیوں کے درمیان بسر ہوئی۔ سب سے پہلی محرومی ان کے والدین کے درمیان علیحدگی تھی۔ جس نے ان کے ماں باپ کو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے اور شمس کو اپنے بھائی بہن اور ماں سے وقتی طور پر جدا کر دیا۔ ان حالات میں ایک گھر کیا ٹوٹا۔ شمس کے اندر کی دنیا، اور پھر ان کی تمام زندگی انتشار کا شکار ہوگئی۔ اپنے دادا کے زیر سایہ شمس کچھ عرصہ آرام وسکون کے ساتھ رہے۔ پھر کبھی نہ ختم ہونے والا کرب اور مسافرت کی زندگی شمس کا مقدر بن گئی۔ معاشی زندگی کے مسائل، حصول روزگار میں مارا مارا پھرنا اوراس پر احساس خودداری اور انا کی شکست بار ہا اٹھانا پڑی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک حساس تخلیق کار کی روح جو قدم قدم پر مجروح ہوتی رہی۔ شمس کی بائیس سالہ زندگی صدموں، حادثوں، انقلابات اور تغیرات سے بھری ہوئی تھی۔

شمس آغا کو جس جس طور سے معاشی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اوراس حوالے سے دربدر کی مسافرت اختیار کرنا پڑی۔ انسانوں کے مختلف روپ اور رویے دیکھے۔ وہ شمس کی مختصر زندگی میں آزمائش کا طویل اور تھکا دینے والا دور تھا۔ خود شمس جاگیردار گھرانے کے فرد تھے۔ لیکن قسمت نے ان کے لئے حصول معاش کے دھکے لکھ رکھے تھے۔ اور ویسے بھی شمس کا دل غریبوں کی حالتِ زار دیکھ کر کڑھتا تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو شمس اپنی ایک ماہ کی دربدری کے حالات سناتے ہوئے کہتے ہیں:

میں امیر انسانوں کو قتل کرنے اور ان کی دولت چھین کر غریبوں اور ناداروں میں تقسیم

کرنے لگا تھا۔ میرے ہینڈ بیگ میں ایک فٹ لمبا چھرا تھا۔ اور کچھ پٹیاں اور ٹنکچر آیوڈین کی بوتل۔ میرا پہلا قدم یہ تھا کہ کسی ایسے آدمی کو قتل کر دیا جائے۔ جس کے پاس ریوالور ہو۔۔۔ ریوالور میرے ہاتھ آ جاتا۔ تو میں آسانی کے ساتھ ان تمام لوگوں سے انتقام لے سکتا۔ جنہوں نے۔۔۔ خیر لیکن ناکامی میری قسمت میں لکھی تھی۔۲

شمس کی اس گفتگو سے ان کے اندر موجود انسانی نفسیات کے حوالے سے اس تخریبی فطرت کا اشارہ ملتا ہے۔ جو انتہا پسندانہ رویے کے حامل ہوتے ہوئے خارجی حالات کو اپنے مطابق اور اپنی ذات کو خارج کے مطابق نہیں ڈھال سکتی۔ تو حالات کا دباؤ یا تو ان کے ہاتھوں کسی دوسرے کا قتل کرواتا ہے۔ اور یا وہ خود اپنے ہاتھوں اپنی ذات کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ شمس اس حوالے سے دوسروں کے قتل پر خود کو آمادہ تو کرتے رہے۔ لیکن آخر کار اپنے ہی وجود کو ختم کر ڈالا۔ شمس آغا کی فطرت میں ابتداء ہی سے تجسس کا مادہ تھا۔ اس تجسس کے مادے کی شمس کی زندگی میں بہت اہمیت ہے۔ کیونکہ یہی تجسس بڑھتے بڑھتے آخر کار شمس کی گمشدگی کے اسرار کے ساتھ وابستہ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

بقول ناصر بشیر

شمس کے اندر فطری طور پر تجسس کا مادہ موجود تھا۔ وہ ہر چیز کی انتہا تک جانا چاہتا تھا۔ اور وہ روزانہ فجر کی اذان کے وقت مندروں میں بجنے والے گھنٹے کی آواز سنتا تو اس کے دل میں مندر کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوتی۔۳

تجسس کے اس مادے نے شمس کی زندگی کو گویا ایک تجربہ گاہ بنا دیا۔ جس میں کچھ تجربے شمس نے خود کیے۔ اور کچھ زندگی نے اُنہیں تختۂ مشق بنایا۔ تجسس اور تجربے کرنے کا حوالہ شمس کی ابتدائی زندگی سے ہی دکھائی دیتا ہے۔ شمس چونکہ سائنس کے طالب علم تھے۔ اسلئے اکثر تجربات کرتے رہتے تھے۔ نومبر ۱۹۴۰ء میں انہوں نے ایک تجربہ کیا۔ دو الگ الگ پلیٹوں میں سیاہ اور سفید بارود بھرا۔ جلتے کوئلے سے چنگاریاں پیدا ہوئیں۔ دھماکے کی آواز پر گھر والے باورچی خانے کی طرف بھاگے۔ ”شمس مکمل طور پر آگ میں جھلس چکا تھا۔ اسکا چہرہ، بازو، ٹانگیں جل کر سیاہ ہو چکی تھیں۔۔۔ وہ چھ ماہ تک بستر پر رہا۔ اور اس دوران وہ کئی بار موت کی وادی کے قریب تر ہو گیا تھا۔“۴

شمس آغا کی تجربوں سے کھیلنے والی فطرت نے اُنہیں اس راستے پر ڈال دیا۔ کہ وہ رفتہ رفتہ چھوٹے چھوٹے تجربوں سے بڑے اور غیر معمولی تجربوں کے عادی ہو گئے۔ حتیٰ کہ زندگی جیسی انمول شئے کو انہوں نے اقدام خودکشی جیسے تجربوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اور اسی دوران آخر کار وہ زندگی کی بازی ہار گئے۔ شمس آغا رشتے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے بھانجے تھے۔ لیکن انکے ہم عمر تھے۔ شمس آغا کے ساتھ ان کی زندگی کے آخری دو سال جو خصوصیت سے ان کی ذہنی و روحانی دنیا میں انقلاب آفریں تھے۔ بسر ہوئے۔ بلکہ ان دو سالوں کو بنفس نفیس ان کے ساتھ برتا۔ اس واردات قلبی میں شریک کار رہے۔ اور وہ تجلی جو چنگاری کی مانند بھڑکی۔ اور شعلہ جوالا بننے سے پہلے ہی بجھ گئی۔ اس کی حدت اور تپش سے ڈاکٹر وزیر آغا کی روح بھی گرمائی۔ اس تجلی کا اصل مرکز شمس آغا کی ذات تھی۔

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں۔

شمس ایک جینئس تھا۔ وہ انتہائی متجسس ہونے کے علاوہ پل بھر میں مشکل سے مشکل

بات کی تہہ تک پہنچنے پر قادر تھا۔ اسکا مطالعہ زیادہ وسیع نہیں تھا۔ مگر اسکا حافظہ بلا کا تھا۔
سو وہ جو کچھ پڑھتا یا سنتا۔ اپنے اندر پوری طرح جذب کر لیتا۔ ادب بالخصوص اردو ادب سے اسے گہرا لگاؤ تھا۔۔۔ ادب کے علاوہ شمس کی ذات میں سوالات کا انمول خزانہ بھی تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم گرمیوں کی راتوں کو چار پائی پر دراز ہو کر ستاروں کو دیکھتا۔ اور اتنی وسیع و بے کنار کائنات کے بارے میں سوچتا۔ مگر کائنات کے معمے کو حل کرنے کے عام فہم نسخوں سے ہم مطمئن نہیں تھا۔ ہمیں تو ایک نئے زاویۂ نگاہ کی تلاش تھی۔ جو اس عظیم اسرار کے پردے کو چاک کر سکتا۔ ۔۵

واردات قلبی کے لئے مادی دنیا کے کسی بڑے علم کا حصول لازمی شرط نہیں۔ یہ روح کا سودا ہے۔ سوالات کی دنیا اس دل میں آباد ہوتی ہے۔ جو دل عام و عامی کی نسبت کسی اور ہی زاویہ نگاہ سے سوچے۔ تفکر کے کسی اور مرکز و محور پر متمکن ہو۔ وہ سب میں رہ کر بھی اپنے شب و روز کسی اور دنیا میں بسر کر رہا ہو۔ جو مادی دنیا کی بجائے روحانی دنیا کے منظر میں محو ہو۔ جب انسان میں اپنی پہچان کا سوال جنم لیتا ہے۔ تو اُنہیں اس پہچان کے لئے خود کو فطرت اور مناظر قدرت کے پس منظر کے حوالے سے خود کو سمجھنا ہوتا ہے۔ وہ کہاں ہے؟ ۔ کیسے ہے؟ کیوں ہے؟ ۔ اور اسی محور پر ایسے ہی اور خیالات اس کے آس پاس ہالہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنی پہچان کے لئے پہلے خود سے اجنبی ہوتا ہے۔ اپنی ذات سے دوری کے بعد پھر اپنی ذات سے قربت کا سفر جنم لیتا ہے۔ اس سفر میں اسرار ہی اسرار ہیں۔ گمشدگیاں ہوتی ہیں۔ پانے سے نہ پانے کا کھیل چلتا ہے۔ نہ جیت ہے نہ ہار۔ پانا ہی پانا ہے۔ اور ہارتے ہی چلے جانا ہے۔ لگتا ہے کہ شمس آغا کے اندر اسی سفر کا، اسی کھیل کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس کے لئے کسی مرشد کی ضرورت تھی۔ وہ مرشد جس سے وہ اس سفر کی احتیاط سیکھتے۔ اسکا سلیقہ پاتے۔ انکے ہنر سے بہرہ مند ہوتے۔ چنانچہ و۔ ع۔ خ اس روحانی سفر میں شمس آغا کے مرشد ٹھہرے۔

و۔ ع۔ خ ڈاکٹر وزیر آغا کے والد بزرگوار تھے۔ ان کے مخصوص زاویۂ فکر اور وسیع مطالعاتی نگاہ کا پس منظر یہ ہے کہ وہ مختلف علوم اور مذاہب عالم کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ وہ مطالعہ رفتہ رفتہ کتابی شکل سے نکل کر روح کا حصہ بن چکا تھا۔ دوران گفتگو عالم محویت اور روحانی سرشاری سے آنکھیں نیم وا ہو جاتیں۔ جزو کُل کے مسائل پر ان کا نقطۂ نظر یہ تھا۔

جزو کا یہ کام نہیں ۔ کہ وہ سمندر کی تلاش کرے۔ قطرے کو تو صرف یاد دلانے کی ضرورت ہے۔ کہ وہ خود سمندر ہے۔۔۔ مقدار اور حجم کا فرق بے معنی ہے۔ فرق تو جوہر کا ہوتا ہے۔۔۔ کہتے ہیں کہ صوفی کا کام فقط یہ ہے کہ وہ تمہاری آنکھوں کا رخ تبدیل کر دے۔ ایسا کرنے کے لئے آنکھوں کے سامنے آئینہ لانے کی ضرورت ہے۔ تب آنکھیں خود کو دیکھنے لگیں گی۔۔۔ لحظہ بھر کے لئے خود کو اتنا پھیلاؤ کہ ہر شئے تمہارے وجود کا حصہ بن جائے۔ بس یہی معرفت ہے۔۔۔ ۔٦

شمس آغا کے اندر جو روح کی روشنی اترنے لگی تھی۔ انہیں ایک غیر محسوساتی سا راستہ ملنے لگا۔ ایسا راستہ جسکا رابطہ اوپر ہی اوپر تھا۔ اندر ہی اندر تھا۔ بظاہر بے چینی، بے سکونی، اضطراب مسلسل۔ معرفت کے ان رنگوں میں وہ تیزی کے ساتھ گھلنے لگے۔ پگھلنے لگے۔ جو سفر رفتہ رفتہ، دھیمی دھیمی آنچ پر طے ہوتا تھا۔ اس میں تیزی آنے لگی۔

ہم مسلسل تین ماہ تک ہر روز د۔ع۔خ کی سنگت میں بیٹھتے رہے۔۔۔معرفت کا ایک سمندر تھا۔کہ ہر روز ان کے سراپا سے نکل کر ہمیں بہائے لے جاتا۔۔۔پچیس تیس سال تک انہوں نے تصوف اور ویدانت کا مطالعہ کیا تھا۔ اور ہندوستان بھر میں صوفیوں ، یوگیوں اور ویدانتیوں کی تلاش میں پھرتے رہے تھے۔۔۔ہمیں صاف محسوس ہوتا کہ انکا علم کتابی نہیں ہے۔ بلکہ روحانی تجربے سے پھوٹا ہے۔ دراصل یہ وہی فرق ہے جو مسائل تصوف بیان کرنے اور محسوس کرنے میں ہے۔۔۔ ۷

شمس کی روح اپنی معنویت سے ہمکنار ہونے چلی تھی۔لیکن اس معنویت کیلئے ،حضوریت کے لئے جس تیاری کا اہتمام لازمی ہے۔شمس اس تیاری کی بجائے کسی شارٹ کٹ کے منتظر تھے۔وہ دھیان گیان جو برگد کے عمر رسیدہ چتوں سے چلہ کشی کے بعد معرفت بنکر ٹپکا تھا۔شمس کے لئے شاید اتنا انتظار کرنا مشکل تھا۔ان کی معرفت غور وفکر کی بھٹی میں اترنے سے پہلے ہی تیز تیز قدموں چلنے لگی۔

یہاں ہمیں اس خارجی پس منظر کو بھی سامنے رکھنا ہے۔جو فطرت کے بکھرے ہوئے رنگا رنگ نظاروں پر مربوط تیز رفتاری کا موجب بن رہا تھا۔ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ تمام صورتِ حال جس مخصوص پس منظر کے حوالے سے بیان کی۔وہ فطرت کے رنگوں اور قدرت کے متنوع مزاجوں سے بھرپور ہے۔عہد شباب ، بے فکری، سرسبز و شاداب وادیوں میں دور حد نگاہ پھیلے ہوئے راستے۔منزلوں کا علم نہیں ''ہم ایک ہی وقت میں بے چین اور دکھی بھی تھے۔اور شانت اور خوش بھی۔شمس فطری طور پر زیادہ حساس اور دوربین تھا۔ان اثرات کو مجھ سے کہیں زیادہ قبول کیا تھا۔'' ۔۸

یہ صورتِ حال بس چلتے رہنا تھی۔ پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیاں ،شہروں کی ہنگامہ خیز زندگی سے بہت دور، فطرت کی خاموشیاں ۔جس میں اسرار و نیاز تھے۔شمس کے تفکر اور ان کی روح کی بیداری کو مہمیز لگا رہے تھے۔عہد شباب کی بھرپور متفکرانہ سوچ آندھی بنکر بھاگنے لگی۔فطرت جو ہر لحہ متغیر ہے۔ یہ تغیر پذیری اندر کی دنیا کو بھی اتھل پتھل کر رہی تھی۔ وزیر کوٹ کی حسین وادی کے علاوہ کشمیر کی سرزمین ، جسکا حسن دیوانگی فروش تھا۔شمس کی زندگی میں مزید انقلاب کا موجب بنا۔ان کے اندر کی پاؤں پاؤں چلتی درویشی جیسے اچانک کھڑے قد سے تن کر ان کے سامنے آگئی۔ فطرت جو اپنے حسن میں خود بدست ہے۔اپنے فسوں میں انہیں لپیٹ لیا۔

شمس نے جو افسانے لکھے۔ان کے موضوع کی فکری جہت اور زبان و بیان دونوں میں فطرت سے شدید ذہنی روحانی اور جذباتی وابستگی کے عناصر ملتے ہیں۔فطرت میں حسن اور محبت کی جوز بان ہے۔شمس اس کے ساتھ ،اس کے اندر اس کے آس پاس ہر جگہ سانس لے رہے تھے۔

ہم جلدی جلدی بس سے اترے اور پھر ایک نظر سامنے کی طرف دیکھا۔ سامنے ایک سبز رنگ کا طویل وعریض پیالہ تھا۔ جس کے بلند و بالا کنارے برف سے لدے کھڑے تھے۔ پیالے کی تہہ میں ندیوں، دھان کے کھیتوں اور درختوں نے قوسوں اور لکیروں میں کوئی پراسراری کہانی لکھ دی تھی۔ اور پورا منظر ایک جیتے جاگتے تصویری شاہکار کی طرح ہماری نظروں کے سامنے ابھر کر آ گیا تھا۔ ان کے ناقابل بیان حسن کو دیکھ کر ہماری آنکھیں خیرہ اور زبانیں گنگ تھیں۔ پھر اس سناٹے میں ایک آواز گونجی۔ یہ شمس

کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "...out of Hell into Heaven" ۔۹

یہاں کئی عوامل، کئی اسرار ایک دوسرے میں باہم ضم ہوتے نظر آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شمس اسوقت خود شباب کی اونچی اڑان پر تھے۔ بقول وزیر آغا اس زمانے میں اُنہیں محبت کا تجربہ بھی ہوا تھا۔ اس کی کسک، درد خود ایک نیا روحانی اور جذباتی تجربہ بن گیا۔ فطرت جو خود رومان پرور ہے۔ اور جس سے رومانویت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ ان کے چاروں طرف عریاں تھی۔

> وہ رک گیا۔ اور چاند کا چہرہ کانپتے ہوئے پانی میں جھلمانے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ فرط کیف سے چیخیں مارے۔۔۔ جھاڑیاں دم روکے کھڑی تھیں۔۔۔ ہاں دور، کہیں دور، میلوں پرے کوئی بانسری بجا رہا تھا۔ اسکا دل چاہا، وہ پتھر پر کھڑا ہو کر بنسری بجانے والے کو آواز دے۔ اُسے اپنے پاس بلا لے۔ یا خود بنسری بنکر اس کے جاگتے ہوئے لبوں سے جا لگے۔ اور نغمہ بنکر کائنات کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لے۔ ۔۱۰

اس تمام صورت حال میں اضافی بات پر کہ شمس کی نگاہ اس حسن اور رومان پر صرف پھسلی نہیں۔ بلکہ ایک خود رفتگی، انجذاب اور حیرت زدگی کی کیفیت نے جنم لیا۔ یہ تمام عناصر شمس کے افسانوں میں در آئے۔ اور یہیں سے ان کے اندر کے جینئس نے غور و فکر کی ایک الگ دنیا تخلیق کر لی۔ اپنا وجود، کائنات، کائنات سے رشتہ اور ان تمام مناظر اور موجودات سے اوپر اٹھ کر ان دیکھی سچائیوں کی تلاش کا سفر، ان کیلئے ایک تجسس بن گیا۔ ایسا تجسس، جس نے رفتہ رفتہ ان کے اندر کی دنیا اور ان کے ذہن کی تمام جہتوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ وہ افسانے نہیں لکھ رہے تھے۔ بلکہ انہیں بسر کر رہے تھے۔ ان کے اندر رہ رہے تھے۔ ایک انجانی دھن اور حالتِ سفر اُنہیں درپیش تھی۔

> ۔۔۔ اور جب وہ الجھی ہوئی خاموش دیواروں کی طرف دیکھ کر آسمان کی طرف نگاہ دوڑاتا تو اُسے کہکشاں کا غبار ایک ایسا راستہ دکھائی دیتا۔ جو اونگھتے ہوئے مسافروں کو دھیرے دھیرے کسی مسرور اور شاداب دنیا میں لے جائے۔ کاش وہ کہکشاں کے غبار پر تیزی سے دوڑتا ہوا اس دنیا میں پہنچ سکتا۔۔۔ ۔۱۱

یہی دنیا تھی۔ جسکا تجسس اُنہیں اپنی جانب کھینچنے لگا تھا۔ اس دنیا تک پہنچنے اور اُسے پانے کا بظاہر کوئی راستہ، کوئی سرا، ان کے سامنے نہ تھا۔ سوائے اس فطرت کے حسن کو قطرہ قطرہ چکھنے اور گھونٹ گھونٹ پینے کے، جو صبح و شام منظر پر منظر ان کے سامنے بدل بدل کر رکھ رہی تھی۔ اپنے افسانے ''شکست'' میں شمس آغا اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> ۔۔۔ جاوید نے مکان کی بالائی چھت سے ابھرتی ہوئی صبح کو دیکھا اور ساکت کھڑا دیکھتا چلا گیا۔ یہ کس کا سپنا، کس کا جہاں آرا پر تو تھا۔ کس کی سنہری زلفیں بکھریں۔ اور دنیا جگمگا اٹھی۔ وہ شہر کے تمام گرد آلود افکار اور دل خراش احساسات وہیں چھوڑ آیا تھا۔ شہر مغرور تھے۔ وہاں سر بفلک عمارتیں تھیں اور رنگین لوگ وہاں آرٹ تھا۔ تمدن اور تہذیب لیکن یہ دیوی وہاں ننگی نہ ہو سکتی تھی۔۔۔ ۔۱۲

اسی فطرت کے بارے میں ہی غور و فکر وہ پہلا زینہ تھا۔ کہ صوفی تحیر زدہ ہو گئے تھے۔ یہ گمشدگی پھر اُنہیں نئے سفر کی جانب کھینچ لے گئی۔ شمس رومانوی ذہن کے مالک تھے۔ انہیں کسی لڑکی سے محبت بھی جو ہوئی تھی۔ اس محبت میں بھی

ان کی گمشدگی کا کچھ حصہ ان سے الگ ہوگیا تھا۔ عہد شباب، محبت، صوفی، تحیر زدگی یہ سارے عوامل آپس میں ضم ہوگئے۔ شمس کے عشق کا واقعہ تقریباً سبھی ناقدین اوران کے احباب نے بیان کیا ہے۔ جوکہ درست ہے۔ اس ضمن میں دوطرح کی آراپائی جاتی ہیں۔ ایک رائے کے مطابق شمس کی عشق میں ناکامی ان کی گمشدہ موت کا اہم محرک ہے۔ جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ شمس جیسے سنجیدہ اور زندگی کے نباض شخص کے لئے محض عشق کی ناکامی اتنا بڑا حادثہ نہیں بن سکتی۔ کہ وہ زندگی سے ہی گزرجائے۔

جبکہ شمس آغا کے بھائی جمال الرحمٰن درانی کا کہنا ہے۔ ''وہ جس لڑکی کو پسند کرتا تھا۔ اس کے ساتھ شادی کرنے سے اس نے خود ہی انکار کردیا تھا''۔۱۳ شمس آغا کی موت، خودکشی یا گمشدگی کے بنیادی محرکات کو اگر سامنے رکھا جائے۔ تو ان محرکات میں قوی ترین محرک شمس کی فطرت میں موجود تفکر، تجسس اور تخلیقی ذہانت کا وہ جوہر ہے۔ جو عموماً ایک جینئس کے سامنے حیات وکائنات سے متعلق غوروفکر اور نت نئے سوالات کا درواکرتا ہے۔ چنانچہ عشق وعاشقی میں شمس کی ناکامی اپنے اندر اس حوالے سے کوئی بڑا اور توانا حوالہ نہیں بنتا۔ کہ اپنے وقت کا ایک ممتاز لکھاری، جسکے سامنے زندگی کو سمجھنے اور برتنے کا ایک بڑا پلیٹ فارم موجود ہو۔ محض عشق کی ناکامی پر زندگی کو بے معنی سمجھ کر خودکشی کرلے۔ یادنیا چھوڑدے۔ جبکہ بقول جمال الرحمٰن درانی شمس نے خود ہی اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اور اگر شمس نے انکار نہیں بھی کیا۔ تب پھر شمس کا زندگی کے منظرنامے سے نکل جانا محض عشقیہ واردات میں ناکامی نہیں ہوسکتی۔

بقول مرزاادیب

میں نے شمس آغا کی تحریروں کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے۔ اس افسانہ نگار نے زندگی کے سارے دکھوں، محرومیوں اور ناکامیوں کا زہر ایک لمحہ توقف کیے بغیر اپنی رگوں میں اتارلیا تھا۔ تو کیا عشق کی ناکامی کے زہر کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔۔۱۴

عشقیہ واردات یا عشق میں ناکامی کی صورتِ حال شمس کو زندگی میں ضرور سامنا کرنا پڑی۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ شمس کے جذبات اسکے باعث مجروح ہوئے ہوں۔ لیکن محض یہی صورتِ حال شمس کو زندگی سے بیزار اور متنفر کرنے میں فعال دکھائی نہیں دیتی۔ مولانا صلاح الدین احمد کا کہنا ہے۔ ''ناکامی عشق نے اس کی زندگی کے خاتمے سے بہت پہلے ایک درددیرینہ کی صورت اختیار کرلی تھی۔ اور جب درد ایک مرتبہ ٹیس کی منزل سے گزرجائے۔ تو اس کے ساتھ اس صورت میں بسر کرلینا۔۔ بعض اوقات آسان ہوجاتا ہے''۔۱۵

چنانچہ اس ضمن میں زیادہ اہم محرک شمس کی شخصیت کا روحانی حوالہ بنتا ہے۔

شمس کے اندر نظر کی تازگی اور اس کی رومانی وارفتگی نے بھی اس کی مدد کی ہے۔۔۔ فطرت سے ہم آہنگ ہونے کی ان کیفیات میں رومانی عناصر کی فراوانی ہے۔ ۔۔یوں لگتا ہے۔ جیسے شمس نے قطعاً غیرشعوری طور پر فطرت کو اپنی محبت کا نعم البدل دیا ہے۔۔۔۱۶

فطرت اورانسان سے محبت کی یہی جوت شاید اسوقت بھی جگی ہوگی۔ جب جزو اپنے کُل سے جدا ہوکر اس کائنات کے بحرِبیکراں میں بکھرا ہوگا۔ اور کاغذی پیرہن میں نقشِ فریادی چلا اٹھا ہوگا۔ وہ خدا ہوکر بھی آدابِ بندگی کے دائرے میں آگیا ہوگا۔ اس طرح سے کہ وہ خود مسجود ہوا۔ جو لائق مسجود بھی تھا۔ وہ صاحب نظارہ ہوکر بھی منتظر دیدار رہے۔

وہ خود اپنے وجود میں ابتداء بھی تھا۔ جو نکتہ انتہا ٹھہرا۔ وہ کس سفر پر گامزن ہوا؟ وہ سفر جو اپنی ہی ذات سے شروع ہوا۔ اور آخر کار اُسے خود ہی تک پہنچنا تھا۔ وہ اپنے وجود میں موجود تھا۔ مگر تمام سفر اپنی ہی تلاش میں کٹ گیا۔ وہ اپنا منصف آپ تھا۔ اور اپنا مجرم بھی خود۔ کتنا تحیر کتنی پیچیدگی، کتنی وحدت اور کتنا انتشار تھا۔ اس ''میں'' اور ''تو'' کی تکرار میں۔ وحدت نے اپنے ہی وجود سے ایک حصہ جدا کرتے ہوئے اُنہیں روح کے اسرار، ان کے کرب کو برتنے اور سہنے کے آداب نہ سکھائے۔ بس اس حصے میں، اس قطرے میں یہیں پر، اسی کے آس پاس ہی ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ کوئی اس دوران پردے سے الجھتے الجھتے بے فیض رہ گئے۔ اور کوئی اس پردے کے اس پار گئے بھی تو حیرت زدگی اور بڑھ گئی۔ نئی دنیا، نئے اسرار، نئی کیفیت۔ جز و پھر الجھاوے میں تھا۔ اور الجھاوے ہی میں ہے۔ اپنی بے معنویت سے متصادم۔ ثمس بھی انہی میں ایک نام، ایک قطرہ جو معنویت کیلئے محوسفر رہا۔ وہ و۔ع۔خ کے ساتھ اپنی روحانی ساعتوں میں مشغول تو ہوئے۔ لیکن اس کے وجود میں کتنی وسعت تھی۔ اس مٹی میں کتنی نمی تھی؟۔ کہ کسی دوسرے جزیرے کو پودے کو پھلنے پھولنے میں مدد ملتی۔ یہاں پھر نئے سوالات اٹھنے لگے ہیں۔

لیکن بقول وزیر آغا ان اثرات نے ان کی اپنی روحانی دنیا میں ضم ہو کر کیا شکل اختیار کی۔ یہ سوال ایک الگ صورت اختیار کر لیتا ہے۔

> کہنے لگے۔ اب سے چند لمحات پہلے میں یہاں اس سبزے پر بیٹھا تھا۔ چاروں طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ کائنات نے گویا دم سادھ لیا تھا۔ نہر کے اس کنارے پر سے ایک فاختہ اڑی۔ اور ان درختوں کے اوپر سے ادھر کو گھوم گئی۔ اور مجھے یکا یک محسوس ہوا۔ کہ کائنات کی ہر شئے درخت، پانی، زمین اور آسمان گھومنے لگے ہیں۔ گھومنے لگے ہیں۔ اور میں پھیل رہا ہوں۔ تم شاید یقین نہ کرو۔ کہ میں نے خود کو ایک نقطہ سے ابھر کر چاروں اطراف میں اس برق رفتاری سے پھیلتے ہوئے دیکھا ہے کہ میں چند لمحوں میں آکاش سے زیادہ وسیع ہو گیا تھا۔ کوئی شئے باقی نہیں رہی تھی۔ نہ زمین تھی نہ آسمان۔ نہ چرند، نہ پرند، نہ درخت، نہ کھیت۔ صرف ''میں'' باقی رہ گیا تھا۔ خیالات کی پرواز تک رک گئی تھی۔ صرف اپنے پھیلاؤ اور لامحدود وسعت کا ایک بے پایاں احساس باقی رہ گیا تھا۔ ۔۱۷

اس روحانی تجربے کی واردات جب و۔ع۔خ نے سنی تو فرمایا کہ ''یہ انو بھاؤ ہے۔ مگر قبل از وقت ہوا ہے''۔۱۸ مگر اس انو بھاؤ میں بڑی شدت اور جلد بازی تھی۔ جس میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل بھی شامل تھا۔ اس میں وہ دھماکہ خیز مواد بھی بھرا ہوا تھا۔ جس نے طور کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ اس میں ''معراج'' کے راز و نیاز ابھی نہ ابھرے تھے۔ شاید غار حرا کی مدھم مدھم سرگوشیوں کی لو سے روح پسینہ پسینہ ہو گئی تھی۔ اس مرحلے پر جلد بازی نے وہ ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ دیں۔ جس نے معرفت کی بوند بوند ان کے اندر اتارنی تھی۔ یہاں تو ایک ہی سانس میں سب کچھ وجود کے آر پار ہو گیا۔ کچھ کہنے، سننے اور سمجھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ راستوں کے پیچ و خم برتنے کا سلیقہ ہی ہاتھ نہ آیا۔ انہیں عہد شباب کی جلد بازی کہیں یا جذبات کی حوصلگی۔ جس نے ہجر اور وصال کو ہم معنی کر دیا۔
بقول ڈاکٹر وزیر آغا

> شمس آغا کو جب روحانی تجربہ ہوا تو اس کی عمر شاید بائیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ یہ ایک ادھورا روحانی تجربہ تھا۔ اگر تجربہ بھرپور ہوتا تو شمس کی عمر اتنی چھوٹی تھی کہ وہ اس تابناک لمحے سے باہر آ ہی نہ سکتا۔ تاہم اس کے گہرے اثرات اس کی شخصیت پر مرتسم ہوئے۔ اور وہ زندگی کے باقی چند سال ایک بے تپوار کشتی کی طرح ڈولتا پھرتا۔ ۔۱۹

یہ ان کے بہت دکھ کے زمانے تھے۔ اور یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی دوران انہوں نے شاہکار افسانے لکھے۔ وہ جیسے سمجھنے لگے تھے کہ کائنات کے سارے راز ان پر منکشف ہو گئے ہیں۔ اور اگر نہیں ہو رہے۔ تو وہ ان کی تلاش میں بھٹکنے لگے۔ خودکشی کا پروگرام بنانا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ انہیں جیسے بہت جلدی تھی۔ وزیر کوٹ میں انہوں نے خودکشی کی کوشش کی۔ وہ زہر پی کر کمرے میں مقفل ہو گئے تھے۔ مگر بروقت بچا لیے گئے۔ خودکشی کی اس کوشش میں بچ جانے پر وہ بہت نالاں تھے۔ ۱۹۴۵ء کا پورا سال گویا انہوں نے بے معنویت کا کرب برداشت کرنے میں گزار دیا۔ اب وہ بہت حد تک مادی ضرورتوں، حتیٰ کہ قریبی رشتوں کی چاہت سے بھی گریزاں ہو رہے تھے۔ ان پر کسی ان دیکھی دنیا کا خیال اور اس کی محویت پوری طرح مسلط ہو چکی تھی۔ اب وہ زندگی سے زیادہ موت کی بات کرتے اور موت میں بھی خودکشی ان کا محور و مرکز تھی۔ وہ غیر محسوساتی طور پر تیزی کے ساتھ ان کی جانب بڑھ رہے تھے۔

ڈاکٹر وزیر آغا شمس کے اندر خودکشی کی طرف رغبت کے عوامل کو مزید اس طرح سے واضح کرتے ہیں۔

> کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ اسے کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا حادثہ پیش نہ آ جاتا۔ قلم بناتے ہوئے یا کوئی اور کام کرتے ہوئے ہاتھوں کو زخمی کر لینا۔ تو اس کا معمول بن گیا تھا۔ شہر جاتے تو کسی نہ کسی تانگے گھوڑے سے ٹکرا جاتا۔ نفسیاتی لحاظ سے یہ سب حرکات لاشعوری طور پر خودکشی کر لینے کے مترادف تھیں۔ لیکن مسلسل قنوطیت، آرزوؤں اور امیدوں کی موت اور ایک تاریک ماضی کی موجودگی میں آہستہ آہستہ یہ جذبہ شعوری سطح پر بھی آ گیا۔ ۔۲۰

ان عوامل سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمس کا روحانی جہاں متغیر ہو رہا تھا۔ وہ ایک حیرت کا عالم تھا۔ اور حیرت کا عالم ایک سالک کو جس طرح سے اپنی ہی ذات میں گم سم کر دیتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت شمس پر طاری رہنے لگی تھی۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا

> روحانی تجربے نے شمس پر مادے کی دنیا کی بے معنویت کو اس حد تک آشکار کر دیا تھا۔ کہ وہ بعض اوقات جذباتی رشتوں کو بھی مسترد کر دیتا تھا۔ سو وہ المناک صورتِ حال پیدا ہوئی۔ جس سے نجات پانے کیلئے اس نے خودکشی کا پروگرام وضع کیا۔ ان دنوں وہ بے حد دکھی تھا۔ ۔۲۱

یہ ضرور ہے کہ و۔ع۔خ کے ساتھ ان کی روحانی بیٹھک اور متصوفانہ نشستوں سے ان کی اندر کی دنیا کو کسی حد تک سہارا ملا۔ لیکن ان کی روح اپنی تسکین کے لئے آوارہ خرام ہی رہی۔ وہ بہت سے سوالات کو خود سلجھاتے، بہت سی باتوں کا جواز خود تلاش کرنے کے شاید متمنی تھے۔ لیکن اندر کی بے قراری میں صبر نہ تھا۔ خواب اور حقیقت، معنویت اور بے

معنویت اور اس طرح کی دیگر متصادم قوتوں میں جکڑ کر وہ بے بس ہو گئے۔ اب جسے زندگی کہتے ہیں۔ وہ اسے سعی لاحاصل سمجھنے لگے تھے۔

> روشنی کی ایک جھلک پا کر وہ ساری زندگی اور اس سے منسلک حیاتیاتی سطح کی تخلیق کاری کو بے معنی اور لاحاصل سمجھنے لگا تھا۔ وہ دراصل چکی کے دو پاٹوں میں آ گیا تھا۔ اور بالآخر جب یہ پاٹ ایک دوسرے کے قریب آئے تو وہ ان میں پس کر رہ گیا۔ ۲۲

اسی دوران جبکہ وہ پہلگام اور اچھابل کی حسین وادیوں میں ایک نئی اور انوکھی زندگی کو برت رہے تھے۔ اور وہاں کا لوٹ لینے والا حسن، انجذاب کی صورت ان کے لہو میں بھی بہہ رہا تھا۔ شمس گم سم یوں لگتے تھے۔ کہ جیسے خارجی زندگی سے وہ تمام رابطے توڑ چکے ہیں اور اگر یہ رابطے تمام تر نہیں ٹوٹے۔ تو بہت حد تک ان کی گرہیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ بس ان کے کھل جانے کا کوئی لمحہ آنے والا تھا۔ جنگلات سے ڈھکے ہوئے برف پوش پہاڑ، ندیوں کے تیز بہتے ہوئے جھرنے اور ان برف پوش پہاڑوں کی چوٹیاں دھوپ، سبزے اور ہوا کی سرد لہروں میں کئی روپ بدلتیں۔ ان کا چولا بدلتا رہتا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ شمس کی روح بھی نئی نئی کروٹ بدلتی رہتی۔ وہ دور دور ندیوں کے کناروں پر بھٹکتے پھرتے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر اب وہ تنہا جانے لگے تھے۔ اسی دوران بقول ان کے ان کی ملاقات ایک لکڑہارے سے ہوئی جس نے پہاڑ کی بلند چوٹی پر انہیں مزید آگے جانے سے روکا۔

اسی صورتِ حال کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کا کہنا ہے۔ ''میں ہر بار اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ لکڑہارا باہر کی زندگی میں کہیں نہیں تھا۔ خود شمس کے وجود کا ایک حصہ مجسم ہو کر ان کے سامنے آ گیا تھا''۔ ۲۳ ڈاکٹر وزیر آغا کی اس رائے میں شمس کے روحانی تجربے کے زیر و بم اور اسے اس کی کسی انتہائی کیفیت اور صورتِ حال سے دوچار ہونے میں بہت مدد ملتی ہے۔ کیونکہ لکڑہارا خود ایک علامت ہے جو لکڑی کو تراش خراش کر اپنی مرضی کے مطابق ڈھالتا اور اس سے کوئی نئی چیز بناتا ہے۔ لیکن اگر یہ تراش خراش ضرورت سے زیادہ ہو جائے یا اس کو تراشنے کے وقت کوئی کنارا، کوئی کونہ چھوٹا بڑا ہو جائے۔ تو اصل شئے، اصل صورت بن نہیں پاتی۔ گویا وہ اصل مقصود ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ جس کیلئے لکڑی کو تراشا گیا۔ اور محض ایک سعی لاحاصل اور ٹوٹ پھوٹ کا عمل باقی رہ جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ شمس کے اندر کے لکڑہارے نے خود انہیں خبردار کیا ہو۔ کہ وہ تحیر کی جس بلندی پر پہاڑ کی جس چوٹی پر کھڑے ہیں۔ اس کے آگے ہرگز نہ بڑھیں۔ کہ شاید ان حد بندیوں سے سرمو انحراف کرنے پر فرشتوں کے بھی پر جل جاتے ہیں۔ وہ تو پھر انسان تھے۔ شدت جذبات میں نہائی ہوئی عمر۔ خود کو تشفی بھلا کیونکر دے پاتے۔ جس طوفان نے بعد میں آنا تھا۔ وہ تو آیا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ سرکش موجوں کو کہیں نہ کہیں سے روانی کا سندیسہ مل گیا تھا۔

> شمس کے لئے اسرار ختم ہو گیا تھا۔ اسے محسوس ہوتا کہ اس نے کائنات کے راز کو پالیا ہے۔ اور اب اس کے زندہ رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔ میں اس سے بحث کرتا اور کہتا کہ خودکشی ضرور کریں گے۔ مگر ابھی نہیں، دس برس کے بعد! ۔ مگر شمس کو بڑی عجلت تھی۔۔۔۔ ۲۴

شمس کو یہ تجربہ رات کی تاریکی، تنہائی اور پہاڑ کی چوٹی پر ہوا تھا۔ یہ خود فریبی کی کوئی صورت تھی۔ یا واقعی وہ اس

مقام پر تھے۔ جہاں مزید زندہ رہنا ان کے لئے محال تھا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس بے معنویت سے نکلنا چاہتے تھے۔ جس نے ان کے شب و روز کو شعلہ آشام بنا رکھا تھا۔ یا بہت ممکن ہے کہ جس اسرار کی تلاش میں وہ حیرت زدہ اور گم سم ہو گئے تھے۔ اس کی کوئی آہٹ روح کی دہلیز نے سن لی ہو۔ اور اب وہ اس آہٹ کے سرور کو کسی قیمت گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا اس زندگی سے، اس مادی خول کی قید سے نکلنے کا وہ کوئی راستہ تلاش کرنے لگے۔ اور یہ راستہ اب ان کے سامنے صرف خود کشی کی صورت ہی ممکن تھا۔ اس کے حصول میں اب وہ راستے کی ہر رکاوٹ کو روند ڈالنا چاہتے تھے۔ اب اس منصوبے میں، اس ارادے میں وہ کسی کو خاطر میں لانے کے لئے تیار نہ تھے۔ ''وہ مجھ سے شکایت کرتا رہا۔ کہ میں اس کے راستے میں رکاوٹ تھا۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ وہ کسی روز چپکے سے چلا جائے گا۔ اور دور پہاڑوں میں جا کر خود کو ختم کر لے گا''۔ ۲۵

بظاہر وہ قدرے پرسکون تھے۔ بلکہ بقول ڈاکٹر وزیر آغا جب وہ اپنے ناول ''دلِ ناداں'' کا مسودہ مولانا صلاح الدین احمد کے حوالے کر کے آئے تو بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ اسوقت گمان بھی نہ ہوسکتا تھا۔ کہ وہ اندر ہی اندر کس بات کی کتنی تیاری کر چکے ہیں۔ یہ تین دسمبر ۱۹۴۵ء کا دن تھا۔ لاہور میں وہ دونوں موچی دروازے میں اپنے عزیز کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور واپس وزیر کوٹ جانے کی تیاریوں میں تھے۔ تیار ہونے کے بعد شمس نے وزیر آغا کو دوبارہ بالوں میں برش کرنے کیلئے اوپر کمرے میں بھیجا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد جب وزیر آغا نیچے آئے تو شمس نہ تھے۔ بہت آوازیں دینے اور تلاش کرنے پر بھی شمس کا نشان نہ ملا۔ بعد میں شمس کی باقاعدہ منصوبہ بندی اور ارادے کا وزیر آغا کو علم ہوا۔ کیونکہ نیچے کرسی پر وزیر آغا کا کوٹ پڑا تھا۔ اس میں سے وزیر آغا کا بٹوہ غائب تھا۔ زادِ راہ کے لئے مسافر کو کچھ نہ کچھ رقم تو چاہیے تھی۔ جو بقول وزیر آغا چند دن کے بعد بذریعہ ڈاک میں چھوٹے چھوٹے تحفوں کے ہمراہ انہوں نے کسی حد تک لوٹا دی تھی۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے اس بیان کردہ واقعہ سے علم ہوتا ہے۔ کہ شمس آغا نے باقاعدہ ایک منصوبہ بندی اور مصمم ارادہ کے اپنے گھر بار اور عزیز و اقارب کو خیر باد کہا تھا۔ اس صورتِ حال سے اس بات کو بھی تقویت ملتی ہے کہ شمس نے خودکشی کی نیت سے ہی اپنے پیاروں کو الوداع کہا تھا۔ ورنہ انکا یوں اچانک چلے جانا اور واپس پلٹنے کا خیال بھی نہ آنا بے معنی نظر نہیں آتا۔ جبکہ اس انتہائی جذباتی عمر میں انہوں نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ جذبات کی شدت اگر شمس کو سب کچھ ترک کر دینے پر آمادہ کر سکتی تھی۔ تو جذبات کی یہی شدت ان کی واپسی کے در بھی کھول سکتی تھی۔ جبکہ ایسا نہیں ہوا۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ شمس کی گمشدگی کے بعد یہ سوال اور قیاس شدت سے اٹھا۔ اور جواب تک اپنے اندر اسرار رکھتا ہے۔ کہ شمس نے خودکشی کی یا اس کی وجہ کچھ اور ہے؟

بقول ڈاکٹر وزیر آغا

> شمس نے خودکشی کی ہے۔ اس نے دہلی سے جو پارسل بھیجا تھا اس میں میرا وہ بٹوہ بھی تھا۔ جو شمس میرے کوٹ سے نکال کر لے گیا تھا۔ اگر بٹوہ خالی آتا۔ تو مجھے امید ہوتی۔ کہ شمس زندہ رہنا چاہتا ہے۔ لیکن شمس نے کس فوری ضرورت کیلئے صرف دو سو روپے لیے تھے۔ باقی پیسے واپس کر دیئے۔ گویا اس نے اس طرح سے واضح کر دیا تھا۔ کہ اب اسے ان روپوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ۲۶

زادِ راہ سے اضافی رقم بھلا اس دور دیس کے مسافر نے کیونکر پاس رکھنی تھی لیکن اس رابطے سے علم تو ہوتا کہ شمس

دہلی کے کسی ہوٹل میں ہے۔ وزیر آغا ان کی تلاش کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

> میرے اندر والے نے مجھ سے پوچھا تھا۔ کہ ایک شخص جو تم سے چھپتا پھر رہا ہو۔ کیا وہ دہلی کے ایک ہوٹل میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ ناممکن بات تھی۔۔۔ کیونکہ شمس کسی صوبے کی سرحد کو نہیں۔ بلکہ زندگی کی سرحد کو پار کرنے کے لئے گیا تھا۔ ۲۷

اُنہوں نے اسی دوران جو خطوط اپنے اہل خانہ کو لکھے۔ اس میں بھی "سفر" کا خصوصیت سے ذکر موجود تھا۔ جو ان کی دانست میں یقیناً "سفر" ہی تھا۔ لیکن بقول وزیر آغا "۔۔۔ مگر مجھے معلوم تھا۔ کہ یہ کس قسم کا سفر تھا۔۔۔"۔ ۲۸ گویا وہ اس سفر کی حقیقت، شمس کے ارادے اور اب وہ کہاں ہوسکتا ہے۔؟ اس کے اہل خانہ کو بتانے سے قاصر تھے۔ تاکہ خونی رشتوں کے ہاتھ سے امید کا دامن چھوٹنے نہ پائے۔ لیکن ان سب کے باوجود شمس کی گمشدگی کسی کیلئے بھی بے معنی نہیں تھی۔ اور انسانی نفسیات کی اپنی بھی ایک خودفریبی رہتی ہے۔ اس حوالے سے شمس کی ماموں زاد محمودہ آغا کا کہنا ہے۔

> شمس کسی صورت خودکشی نہیں کرسکتا تھے۔ وہ آج بھی زندہ ہے۔ وہ جینئس تھا۔ حالات نے اسکا ساتھ نہیں دیا۔ ۱۹۴۵ کے آخر میں ان کی ننھیال میں جائیداد کے جھگڑے شروع ہوچکے تھے۔ وہ امن پسند تھا۔ اور کسی ایک پارٹی کا ساتھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اور کوئی راستہ نہ پاکر گھر چھوڑ دیا۔ ۲۹

محمودہ آغا کی رائے اپنی جگہ درست ہوسکتی ہے۔ لیکن جائیداد کے جھگڑوں سے پریشان ہوکر کوئی ہمیشہ کیلئے اپنے عزیز، گھر بار حتی کہ زندگی کو ترک کردے بعید از قیاس لگتا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی رشتوں کی اپنی بھی ایک خوش فہمی ہوتی ہے۔ وہ کسی صورت خون کی جدائی کا صدمہ جدائی کے خیال سے نہیں سہتے۔ بلکہ ان کی امیدوں میں ایک چراغ ہمیشہ روشن رہتا ہے۔ جس کی لو کبھی تیز اور کبھی مدہم ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے شمس آغا کے بھائی جمال الرحمٰن درانی شمس کی خودکشی کی بات کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "کوئی فوری حادثہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور حادثہ کے بعد بچ جانے کی صورت میں یادداشت بھی کھوسکتی ہے۔۔۔"۔ ۳۰ شمس آغا کے قریبی عزیزوں کے یہ قیاس اپنی جگہ درست ہیں۔ کیونکہ کسی کے ساتھ کہیں پر کوئی بھی حادثہ ہوسکتا ہے۔ کوئی ناگہانی آفت بھی آسکتی ہے۔ لیکن شمس آغا جب سب کی نظروں سے اوجھل ہوئے۔ تو وہ شعور کی پختگی کی عمر پر تھے۔ انہوں نے اپنی مختصر زندگی میں گرم و سردِ زمانہ شدت کے ساتھ جھیلے تھے۔ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں سے تو ان کی خبر ملتی۔ یا خود شمس کو پردۂ غیاب سے عالم ظہور میں آنے کا خیال آسکتا تھا۔ انسان پھر انسان ہے۔ عزائم، ارادے، پچھتاوے سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اور پھر شمس کی گمشدگی شمس کی خودکشی کا حوالہ اسلیے بھی بنتی ہے۔ کہ شمس کی زندگی میں جو انکا مخصوص رویہ تھا۔ ان کا جو مزاج اور طریقۂ زندگی تھا۔ اور اس کے علاوہ شمس نے جس ذہنی تیاری اور ارادے کی پختگی کے ساتھ سب کو چھوڑا۔ وہ سب کوئی معمولی باتیں نہیں تھیں۔

اس ضمن میں ناصر بشیر کا خیال ہے کہ

> جاتے وقت اپنے نامکمل ناول کا مسودہ مولانا صلاح الدین احمد کو دے کر جانا بھی اس بات پر دال ہے۔ کہ وہ واقعی خودکشی کا ارادہ رکھتے تھے۔ اگر انہیں خودکشی نہ کرنی ہوتی تو کم از کم وہ اپنا نامکمل ناول انہیں ہرگز نہ دیتے بلکہ اسے مکمل کر کے ان تک پہنچاتے۔ ۳۱

ناصر بشیر کی یہ رائے اس لئے درست نظر آتی ہے۔ کہ شمس ایک ادیب تھے ادب اور ادیب کے حوالے سے انہیں ناول کی تکمیل کر کے اپنی ادبی ساکھ اور شہرت کا خیال ہونا چاہیے تھے۔ لیکن جاتے وقت شمس ادب کیا دنیا کا خیال بھی ترک کر چکے تھے۔ اس لیے کہ انہیں اب لوٹ کر یہاں نہیں آنا تھا۔ اس ضمن میں شمس کی ذہنی کیفیت اور ان کے ارادے کی پختگی کا اندازہ شمس کے ان الفاظ سے بھی ہوسکتا ہے۔

بقول شمس آغا ''فوری تغیر ہمیشہ شدید ہوا کرتا ہے۔ اسکا عمل اور اثرات واقعی بے پناہ ہوتے ہیں۔'' ۳۲۔ شمس کے خاموشی کے ساتھ چلے جانے اور پھر اس کے بعد شمس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ یا کیا ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں مرزا ادیب کا قیاس ایک منفرد اور رومانوی طرز احساس کا حامل ہے۔

> شمس آغا اندرونی شکست و ریخت کے صدمے چھپائے زندگی کا سفر طے کر رہا تھا مجھے یاد پڑتا ہے کہ آغا صاحب نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ کہ وہ غالباً پہاڑ کی چوٹی کی طرف جا رہا تھا۔ کہ گر پڑا۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہی ہوا ہوگا۔۔۔ اپنے انتہائی مضمحل اور کمزور جسد کے ساتھ اس نے کہیں نہ کہیں آخری سانس ہی تو لینا تھے۔ یہ کسی پہاڑ کی بلندی پر لے لیے اور پھر اس کے بے جان جسم کو برف کے کسی تودے نے اپنے اندر ڈھانپ لیا۔ برف کے تودے نے مامتا ماری ماں کی طرح قدرت کے ایک بہت بڑے خوبصورت، بہت پیارے بچے کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ ۳۳۔

مرزا ادیب کی رائے اگرچہ اپنے اندر رومانوی نقطہ نظر رکھتی ہے۔ لیکن اس میں حقیقت کا پہلو یہ ہے کہ شمس کو واقعی اپنی زندگی میں فطرت کا حُسن بے چین رکھتا تھا۔ قدرت کے رنگارنگ نظارے، ان کی کشش انہیں ہمہ وقت مضطرب اور بے قرار رکھتی تھی۔ اور بقول ڈاکٹر وزیر آغا کے شمس کا پہاڑوں پر جا کر تنہائی کے لمحے گزارنا، راتوں کی خاموشی بیتانا، کسی طور پر بے معنی بات نہیں ہوسکتی۔ لہذا یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ شمس سب کی نظروں سے دور ہو کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر موت سے ہم آغوش ہوئے ہوں۔ یہ لمحہ دو لمحہ کی کیفیت پر مبنی گمشدگی کا خیال نہیں تھا۔ بلکہ ایک فکر ایک سوچ اپنے ارادے کی پختگی کے ساتھ مسلسل محوِ سفر تھی۔ بقول صلاح الدین احمد

> موت کی طرف شمس کی پیش قدمی محض جذباتی نہیں تھی۔ بلکہ سوچے سمجھے ہوئے منصوبے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس پر نسبتاً چھوٹی عمر میں زندگی کی بے معرفی کا انکشاف ہوگیا تھا۔ وہ زندگی کی قدروں کو پرکھنے میں بے رحمی کی حد تک سنجیدہ تھا۔ ۳۴۔

شمس سماج کے رویوں سے دل برداشتہ تھے۔ انسان کے ''موجود'' ہونے سے ''ناموجود'' ہونے کے درمیان کا خلا، جسکو پر کرنا، ہر ایک کے بس میں نہیں ہوتا۔ شمس پر اس کے اسرار کھلنے لگ گئے تھے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ زندگی میں بھی وہ بہت سے ایسے تجربے کرتے تھے۔ جن سے انہیں چوٹ اور درد محسوس ہو۔ وہ اپنے ''موجود'' کو دیکھنا، آزمانا اور پرکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ متعدد بار ان کی خودکشی کے لئے کوششیں اسی زمرے میں آتی ہیں۔ اسی طرح کا ایک واقعہ اسوقت پیش آیا۔ جب شمس وزیر آغا کے ساتھ رہتے تھے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا

> کمرے میں جا کر اسے پلنگ پر لٹا دیا۔ اور پھر یک لخت میری نظریں قریب کی میز کی طرف اٹھ گئیں۔ اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میز پر اس کے افسانے ''صبح و شام''

کا مسودہ پڑا تھا۔ اور ساتھ ایک سفید کاغذ پر جلی حروف میں لکھے ہوئے یہ الفاظ تھے۔
"میں خودکشی کر رہا ہوں"۔ میری زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا۔ مجھے نہیں پتہ تھا۔ کہ میں کیا کروں۔ معاً میں اطلاع دینے کو باہر کی طرف لپکا لیکن اس نے مجھے سختی کے ساتھ روک لیا۔۔۔ پر اسرار علاج کا آغاز ہوا۔ جس نے اسے اس روز بچا لیا۔ پوٹاشیم پرمینگنیٹ کے استعمال سے زہر آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر خارج ہوتا رہا۔۔۔ پورے دس گھنٹے میں، میں اسی کے ساتھ کمرے میں بند رہا۔ ان دس گھنٹوں میں اس پر نینداور غنودگی کے کئی بڑے بڑے حملے ہوئے۔ لیکن یہ جانتے ہوئے کہ اگر ایک بار یہ سو گیا۔ تو پھر کوئی طاقت اسے بیدار نہ کر سکے گی۔ میں نے اسے سونے نہیں دیا۔ شام تک وہ خطرے سے باہر تھا۔۔۔ ۳۵

یہ تو شمس کو بظاہر موت سے بچانے اور اسے ایک نئی زندگی کی طرف لانے کی تدبیر تھی۔ لیکن شمس خود روحانی طور پر اپنے وجود سے گزرنے کا جو ارادہ کر چکے تھے۔ وہ صرف شمس خود ہی جانتے تھے۔ وزیر آغا نے اس ضمن میں کہا

خودکشی کی اس کوشش میں میں نے اسے بچایا تو تھا۔ لیکن وہ مجھ سے خفا رہا۔ کہ میں نے کیوں ایسا کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ کہیں اسے میں خودکشی کرنے سے دوبارہ نہ بچاؤں۔ اس نے مجھے اپنے خودکشی کے ارادے میں شامل نہ کیا۔ اور نہ ہی میری نظروں کے سامنے اقدام خودکشی کیا۔ اور پر اسرار گمشدگی میں ہی اس نے اپنے اس ارادے کو تکمیل دے دی۔ ۳۶

ان تمام شواہد اور عوامل سے علم ہوتا ہے۔ کہ شمس کی گمشدگی محض گمشدگی نہیں تھی۔ بلکہ ایک جینئس کی، ایک ادیب کی تخیر وجود کے حوالے سے خود کو یقینی اور عملی طور پر موت کے سپرد کرنے کا اقدام تھا۔

شکیب جلالی (۱۹۳۳ـ۱۹۶۶ء) :

سید حسن رضوی نام اور شکیب تخلص تھا۔ یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ بقول انکی اہلیہ کے تاریخ پیدائش ۱۹۳۳ء ہے۔ شاعری کا آغاز ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ شکیب جلالی کا آبائی وطن علی گڑھ کا ایک قصبہ جلالی تھا۔ ان کے بزرگ سادات رضویہ کے متوسط طبقے کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ شکیب کے دادا کا نام شجاعت حسین اور پردادا کا نام شفاعت حسین تھا۔ دونوں فوج میں ملازم تھے۔ شجاعت حسین کے دو لڑکے تھے۔ سید شبیر حسین اور سید صغیر حسین۔ شجاعت حسین اپنے ان دونوں بیٹوں کے ہمراہ بدایوں آ گئے۔ شبیر حسین نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ جبکہ شکیب کے والد صغیر حسین نے زبیدہ خاتون سے شادی کی۔ سید صغیر حسین محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ پہلے یہ قصبہ جلالی اور بریلی میں رہے۔ اور بعد میں بدایوں آ گئے۔ شکیب انہی کے بیٹے تھے۔ شکیب جلالی کی زندگی مجموعی طور پر مسائل و مصائب میں بسر ہوئی۔ یہ مسائل تلاش معاش کے علاوہ ذہنی و نفسیاتی امراض کے حوالے سے بھی تھے۔ کیونکہ ان امراض کو بڑھانے میں یقیناً شکیب کے خارجی و ساجی ماحول کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ وہ امراض تھے۔ جنہیں ہم شکیب کے حوالے سے کسی حد تک موروثی کہہ سکتے ہیں۔

شکیب جلالی نے چھٹی جماعت تک بریلی میں تعلیم حاصل کی۔ اور پھر اپنے نانا کے ہمراہ بدایوں آئے۔ میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں پاکستان آ گئے۔ شکیب جلالی کی ۱۹۵۶ء میں شادی ہوئی۔ انکے دو بچے بیٹا حسین اقدس رضوی اور بیٹی حنا بتول ہیں شکیب والدین کی اکلوتی اولاد نرینہ تھے۔ اور چار بہنوں کے اکلوتے بھائی۔ والدہ کا انتقال بچپن میں ایک حادثے میں ہوا۔ یہ حادثہ اس نوعیت کا تھا۔ کہ شکیب کے والد نے اپنی کچھ ذہنی الجھنوں اور امراض کے ہاتھوں مجبور ہو کر شکیب کی والدہ کو ریل کی پٹڑی پر دھکا دیا۔ اور وہ ٹرین کی زد میں آ کر ہلاک ہو گئیں رفتہ رفتہ والد کا ذہنی توازن درست نہ رہا۔ بدایوں میں ان کے انتقال کے بعد شکیب بہنوں کے ہمراہ راولپنڈی آئے۔ مختلف ادبی ماہناموں اور ہفت روزہ کے ایڈیٹر رہے۔ اخبارات کی ملازمت سے بھی منسلک رہے۔ بہنوں کی شادیاں اور ان کی نگہداشت سب شکیب کی ذمہ داری ٹھہری۔ تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی میں شکیب کی ملازمت رہی۔ ملازمت کے دوران جوہر آباد اور بھکر میں بھی تعینات رہے۔

جب والدہ کا انتقال ہوا۔ تو شکیب کی عمر تقریباً نو برس تھی۔ انہوں نے یہ حادثہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بچپن کی عمر، ناپختہ ذہن اور آنکھوں کے سامنے یہ خونی ڈرامہ شکیب رفتہ رفتہ نفسیاتی مسائل کا شکار ہوتے چلے گئے۔ ان کے لاشعور میں تڑپتی ماں کی جدائی اور اسکا ناقابل برداشت دکھ ہمیشہ کے لئے دفن ہو گیا۔ کچھ خارجی زندگی کے مسائل اور کچھ نفسیاتی امراض ۱۲ نومبر ۱۹۶۶ء ۳۲ سال کی عمر میں ریل گاڑی کے آگے آ کر خودکشی کر لی۔ اور سرگودھا میں دفن ہوئے۔

شکیب جلالی کی خودکشی کا پہلا اور بنیادی محرک ایک نفسیاتی حوالہ ہے۔اس نفسیاتی حوالے نے ان کی شخصیت پر شدت کے ساتھ اثرات ڈالے۔حادثے کی نوعیت کچھ اس طرح سے ہے کہ شکیب جب تقریباً نو دس برس کے تھے۔تو ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے والد نے شکیب کی والدہ کو ٹرین کے سامنے دھکا دیا۔جس سے ان کی والدہ کی موت واقع ہوگئی۔یہ حادثہ بریلی ریلوے سٹیشن پر وقوع پذیر ہوا۔شکیب کے والد کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔کہ وہ محکمہ پولیس میں ملازم تھے وہاں سے معطل ہوئے ذہنی کرب کے باعث بہت سے وظائف کیے۔ چلے کاٹے، دماغی توازن بگڑنے لگا۔تو کچھ عرصہ کے لئے پاگل خانے داخل کراوئے گئے۔لیکن صورتحال میں خاطر خواہ تبدیلی نہ آئی۔

شکیب جلالی کے والد صاحب کے جو بھی ذہنی و نفسیاتی عوارض تھے۔ان کے ضمن میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ان آراء میں باہم تھوڑا بہت اختلاف ضرور ہے لیکن بنیادی حوالہ ایک سا ہے۔یہ درست ہے کہ شکیب کے والد کچھ روحانی تجربے کرتے تھے۔وہ پیری مریدی اور روحانیت کے قائل تھے۔ایک بے خودی کا عالم رہتا تھا۔اور وہ چلہ کشی کا راستہ اختیار کیے ہوئے تھے۔

اس ضمن میں سیدہ پروین اپنے تحقیقی مقالہ میں لکھتی ہیں۔''جب وہ معرفت کے نور میں پوری طرح ڈوب گئے۔تو لوگ انہیں پاگل یا دیوانہ کہنے لگے۔اور کوئی انہیں پہنچا ہوا بزرگ گرداننے لگا''۔۳۷

اس سے قدرے مختلف رائے امتیاز کلثوم کی ہے۔

> دوران ملازمت سید صغیر حسین چند کوتاہیوں کی بنا پر افسران بالا کی نگاہوں میں معتبر نہ رہے۔۔۔ملازمت سے دلبر داشتہ ہو گئے۔اس اثنا میں روحانیت کا سودا سمایا۔نوبت یہاں تک پہنچی۔کہ لوگ دیوانہ سمجھنے لگے۔۔۳۸

جہاں تک ان کی ملازمت کے مسائل کا تعلق ہے۔یہ انہیں ضرور درپیش تھے۔اور انہی کے باعث انہوں نے دلبرداشتہ ہو کر خود کو زیادہ تر عبادت و ریاضت میں مشغول کر لیا۔یہ بظاہر بھی ہے کہ وہ بقا پر نارمل دکھائی نہ دیتے تھے۔اور اسی کیفیت میں ان کی اہلیہ (والدہ شکیب) کی ان کے ہاتھوں حادثاتی موت واقع ہوئی۔اس ضمن میں پرویز بزمی لکھتے ہیں۔''شکیب کے والد ایک ذہنی عاضے میں مبتلا تھے اور اس عارضے کی وجہ سے اپنے گھر کے سامنے سے گزرنے والی ریلوے لائن پر اپنی بیوی کو اٹھا کر گاڑی کے آگے پھینک دیا''۔۳۹

شکیب کے والد جس مخصوص ذہنی و روحانی کیفیت سے دوچار تھے۔اسے بعض ذہنی عارضہ کہتے ہیں۔بعض دیوانگی اور پاگل پن کا نام دیتے ہیں۔اور بعض نے اسی کیفیت کو جزوقتی جنون کہا ہے۔اس ذہنی حالت کو کوئی بھی نام دے لیں۔بات ایک ہی ہے کہ شکیب کے والد ذہنی طور پر ایک نارمل انسان نہیں تھے۔اور ان کی اسی کیفیت نے ایک روز ان کی بیوی کی جان لے لی۔اس حوالے سے غلام جیلانی اصغر لکھتے ہیں''شکیب کے والد نے دیوانگی کی کیفیت میں ایک دن اپنی بیوی کو اٹھا کر ریل کے آگے دھکا دے کر گرا دیا''۔۴۰

اس ضمن میں جب شکیب کے اہل خانہ سے ملاقات کے دوران بات چیت ہوئی۔تو شکیب کے والد کے کچھ اسی قسم کے ذہنی و نفسیاتی مسائل زیر بحث آئے۔جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اسی جنونی کیفیت میں انہوں نے ایک روز اپنی اہلیہ کو ریل کی پٹڑی پر دھکا دیا تھا۔

بقول محدثہ خاتون

شکیب کے والد کے ذہنی اور نفسیاتی سطح پر کچھ مسائل تھے۔ انہیں لوگ اکثر معرفت کے حوالے سے دیکھتے تھے۔ شاید انہیں کسی بزرگ نے یہ مشورہ بھی دیا تھا۔ کہ معرفت کی اگلی منزل میں تمہیں اپنی کسی نہایت قیمتی شے کی قربانی دینا ہوگی۔ لہذا ایک مرتبہ دوران سفر انہوں نے بریلی سٹیشن کے قریب اپنی بیوی کو دھکا دیا۔ اور وہ جاں بحق ہو گئیں۔ ۔۴۱

اس ضمن میں شکیب کی ہمشیرہ نے قدرے فرق بات کہی ہے۔ جس میں جزوی صداقت تو موجود ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں موجود بعض نکات کی نہ تو کہیں سے تصدیق ہو سکی۔ اور نہ ان کی وضاحت ملی۔ مثلاً شکیب جلالی کی ہمشیرہ کا کہنا ہے کہ "سننے میں آیا ہے۔ کہ میرے والد صاحب نے روحانی طاقت کا ریاض کیا تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ بچپن میں بھائی جان نے بے موسم پھل یا کوئی انہونی چیز کی ضد کی۔ تو فوراً ہو گئی۔"۔۴۲

مندرجہ بالا تمام آرا کے مجموعی مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک مخصوص ذہنی حالت جسے دیوانگی یا جنون کا نام دے سکتے ہیں۔ شکیب کے والد نے اپنی بیوی کو ٹرین کے آگے پھینک دیا۔ جس سے ان کی موت واقع ہوگئی۔ یہ المناک صورت حال اور اندوہناک حادثہ جو کمسن شکیب جلالی اور ان کی بہنوں نے آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی نفسیاتی بیماری اور ذہنی عدم توازن کی صورت بعد میں شکیب جلالی کی خودکشی کا موجب بنا۔ بہر حال شکیب کے سامنے ان کی والدہ کی یہ اذیت ناک موت شکیب کی زندگی کا ایک حادثہ اور ایک المیہ تھا۔ جس نے شکیب کی زندگی کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ شکیب جلالی کے بیٹے اقدس رضوی کا کہنا ہے کہ "میرے بابا نے یہ منظر اپنی بہنوں کے ہمراہ دیکھا۔"۔۴۳ کمسن شکیب نے گھر کے آنگن میں عزیز از جان ہستی یعنی ممتا کی دلدوز موت کا وہ منظر دیکھا۔ جس نے زندگی بھر کے لئے انہیں حیرت کدوں کا باسی بنا دیا۔ کئی سوالات اندر ہی اندر جنم لیتے تھے۔ اور جواب کوئی نہ تھا۔ اس واقعہ کی بدولت شکیب کی ذات میں کئی دنیاؤں نے بیک وقت جنم لیا۔ یہ دنیا میں انتقام، ممتا سے محرومی کے کرب، لہو کے چھینٹوں سے لبریز منظر، اپنی بے بسی اور بے اختیاری کا شدید احساس، تحفظ ذات کا سوال اور ایسے ہی کئی دوسرے عوامل سے عبارت تھیں۔ ان دنیاؤں کے عنوانات میں فکر کا تنوع تھا۔ درد و الم میں جلتے بجھتے لمحے اب شکیب جلالی کی کل کائنات تھے۔

درد کا دیپ جلتا رہا، دل کا سونا پگھلتا رہا
ایک ڈوبے ہوئے چاند نے رات بھر خون رلایا مجھے

خون اور لہو کے چھینٹوں کا بلاشبہ ان کی والدہ کی حادثاتی موت سے براہ راست تعلق دکھائی دیتا ہے۔

فصیل جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدود وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

بقول ڈاکٹر وزیر آغا "شکیب کی شاعری میں خون بہت ہے۔"۔۴۴

لہو لہو ہوں سلاخوں سے سر کو ٹکرا کر
شکیب باب قفس کیا کہوں، کس آن کھلا

آ کر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی وہ چھوڑ گیا ہے چٹان پر

یہ وہ دکھ تھا۔ جو اندر ہی اندر شکیب کی روح کو گھائل کر گیا۔

شکیب روح میں طوفان کا شور باقی ہے
میں اپنا درد کسی ساز پر سنا نہ سکا

شکیب اسوقت کمسن تھے یہ عمر کا وہ مرحلہ ہوتا ہے۔ جب بچہ باپ کی نسبت ماں کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

بقول سیدہ پروین

ایڈی پس الجھاؤ بھی شکیب کی خودکشی کا محرک لگتا ہے۔ کہ ماہرین نفسیات کے نزدیک بیٹا باپ کی بجائے ماں سے قریب ہوتا ہے۔ وہ ماں کو آئیڈیل بناتا ہے۔ لہذا آئیڈیل کی موت اُنہیں اپنی موت نظر آتی ہے۔ لہذا شکیب نے بھی ویسی ہی موت کو قبول کیا۔ ۔۴۵

اور پھر شکیب والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اس حوالے سے ماں کا پیار ضرورت سے زیادہ میسر آیا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی قابل غور ہے۔ کہ جب والد سرکاری ملازمت سے معطل نہیں ہوئے ہوں گے۔ تو گھر میں کتنا امن اور سکون ہوگا۔ لیکن ملازمت کے چھوٹ جانے سے نہ صرف ان کے والد متاثر ہوئے۔ بلکہ یہ چڑ چڑاپن تمام گھر اور افراد کا ذہنی سکون اور مالی آسودگی کو چاٹ گیا ہوگا۔ لامحالہ گھر کے تمام افراد اس نشیب زمانہ کا شکار ہوں گے۔ پھر اسی دوارن شکیب نے اپنی بہنوں کے ہمراہ والدہ کی المناک حادثاتی موت دیکھی تو گویا مشکلات کا بہاؤ یک لخت کبھی نہ ختم ہونے والے ریلے کی صورت اختیار کرتا گیا۔ والد پہلے ذہنی مریض تھے۔ چنانچہ گھر کی ذمہ داریاں اور تمام تر فرائض کی انجام دہی شکیب کے کندھوں پر آن پڑی۔ جو انہوں نے ممکنہ حد تک نبھائی اور نبھانے کی کوشش میں سرگرداں رہے۔ بظاہر زندگی نارمل دھارے پر ہی تھی لیکن شکیب کے اندر ہی اندر جو ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی اور جس کرب سے وہ گزر رہے تھے۔ اسکا اندازہ صرف شکیب کو ہی تھا۔ والد کے ہاتھوں والدہ کی المناک موت کا صدمہ چندروزہ دکھ پر مبنی نہ تھا۔ بلکہ یہ تو حساس لکھاری کیلئے قدم قدم پر موت کی دستک اور آہٹ سننے کے مترادف تھا۔ والدہ کا قاتل باپ تھا۔ لہذا شکیب کے اندر انتقام کیسے ٹھنڈا ہوتا۔ بیٹے کے ناطے وہ باپ سے بدلہ لینے کے مجاز نہ تھے۔ لہذا یہ دکھ وہ اندر ہی اندر پالتے چلے گئے۔ جو رفتہ رفتہ ایک نفسیاتی اور ذہنی گھٹن کے طور پر عارضہ بن گیا۔ اور آخر کار ان کی خودکشی کا بنیادی محرک بنا بقول عارف بلے ''شکیب کا ٹرین کے آگے خودکشی کرنے کا عمل ظاہر کرتا ہے کہ اس طرح شکیب اپنے باپ سے ماں کا انتقام لینا چاہتے تھے۔'' ۔۴۶

اگرچہ شکیب کے والد شکیب کی خودکشی کے وقت تک وفات پا چکے تھے۔ لیکن لاشعوری طور پر شکیب اپنے والد کو وہ صدمہ اور اذیت پہنچانا چاہتے تھے۔ جو شکیب نے اس ضمن میں خود برداشت کی وہ اپنے آپ سے بھی انتقام لینا چاہتے تھے۔ کہ بحیثیت بیٹا وہ اس خونی ڈرامے سے اپنے والد کو کیوں روک نہ پائے۔ اپنی والدہ کو کیونکر نہ بچا سکے۔ یہ تمام سوالات وجوابات بے اختیاری، بے بسی اور تکلیف دہ احساسات ان کے لاشعور کا کربناک حصہ بن گئے۔ یہاں خود سے انتقام کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ اپنے حوصلے کو آزمانا، اپنی آزمائش سے آپ ہی گزرنا، بھی موت کی کیفیت کو تجرباتی سطح پر محسوس کرنا اور کبھی زندگی کی آہٹ کو موت کی دستک میں ضم کر دینا۔ گویا موت کے کئی رنگ اس انتقامی صورت سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ یہاں موت کی جانب شکیب کی پیش قدمی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

زندگی تجھ سے شکایت کیا کریں
آج ہم سے موت بھی شرما گئی

اور یہ ایک انسانی فطرت بھی ہے کہ ایک حساس انسان خارجی جبر کو روکنے سے عاجز ہو۔ تو تھک ہار کر اکثر وہ خود سے ہی انتقام لیتا ہے۔

مرجھا کے کالی جھیل میں گرتے ہوئے بھی دیکھ
سورج ہوں میرا رنگ مگر دن ڈھلے بھی دیکھ

چنانچہ شکیب کی خودکشی کے محرکات میں یہ نفسیاتی حوالہ بہت بڑا محرک نظر آتا ہے۔ جس میں انتقامی رویہ نمایاں ہے۔ اور یہ بھی خود سے انتقام لینے کی ایک صورت ہے کہ شکیب نے اسی طرح، اسی طریقے سے خودکشی کی، جس طریقے سے ان کی والدہ کی موت واقع ہوئی تھی۔ اگر ہم اسے والدہ کی حادثاتی موت کے حوالے سے باپ سے انتقام کی صورت کہیں تو یہ صورت نفسیاتی حوالے سے لاشعوری کہلائے گی۔ کیونکہ باپ تو پھر باپ ہی ہے اس کی شفقت بچے کے لئے ایک بڑی پناہ گاہ کا درجہ رکھتی ہے۔ شکیب سے مامتا پہلے ہی چھن چکی تھی۔ اور ان کے والد جو ذہنی طور پر مفلوج ہونے کے باعث ہندوستان میں پاگل خانے میں زیر علاج تھے۔ وہاں سے شفایاب ہو کر جب وہ اپنی بہن کے پاس پنڈوال پہنچے۔ تو شکیب کو اطلاع ملی کہ ان کے والد صاحب انہیں ملنے کے لئے بے تاب ہیں شکیب اپنے والد صاحب کو ملنے کے لئے تیاری میں ہی تھے کہ ان کے والد صاحب کے انتقال کی خبر آئی۔ یہ ۱۹۶۵ء کا واقعہ ہے شکیب پر اس حادثے کا گہرا اور شدید ردعمل ہوا۔ پرسہ کے لئے آنے والوں کے سامنے شکیب زاروقطار رورہے تھے اور جب غم کی شدت کسی طور پر کم نہ ہوئی تو بقول محدثہ خاتون "میں نے شکیب صاحب کی بہن کے سسر سید نذیر علی شاہ کو سرگودھا سے بلوایا۔ شاہ صاحب جب بھکر پہنچے تو شکیب صاحب روتے ہوئے یہ کہہ کر ان سے لپٹ گئے کہ اباجی آپ آگئے"۔۴۷

شکیب جلالی کی خودکشی کے نفسیاتی حوالے کے ضمن میں یہ حوالہ بھی قابل ذکر ہے کہ اپنی مامتا سے بچھڑنے کے بعد شکیب اس گود کی گرمی، اسکا تحفظ اور اس کی محبت کو ریل کی پٹڑی پر جیسے تلاش کرتے رہے۔ جہاں یہ اندوہناک حادثہ رونما ہوا تھا۔ بقول ڈاکٹر انوار احمد "شکیب کے لئے ریل کی پٹڑی گویا مامتا کی گود ثابت ہوئی۔ جس پر سر رکھ کر وہ ابدی نیند سو گئے"۔۴۸

یہ درست ہے کہ شعراء نے اکثر موت اور موت سے متعلق موضوعات کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ لیکن شکیب کے یہاں موت کا حوالہ روائیتی نہیں۔ بلکہ تجرباتی سلسلہ کا حامل نظر آتا ہے۔ موت کا بیان ان کے یہاں نہ تو خوفزدگی کا حامل نظر آتا ہے اور نہ موت ایک اٹل حقیقت کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ ان رسمی اور روایتی حوالوں کی بجائے یہاں موت کے لئے تجسس موجود ہے۔ شکیب کو موت کی کشش اپنی طرف کھینچنے لگی۔ وہ موت کی لذت سے گزرنے کے لئے مواقع تلاش کرنے لگے۔ اس ضمن میں کہا جاسکتا ہے کہ شکیب کے یہاں موت کی جستجو اس کی طلب کی حوالوں سے نمو پذیر ہوئی۔ غم ذات، دوستوں کی بے اعتنائی کا گلہ، موت کے موضوع پر ان کا فکری تناظر اور پھر یہ فکری جہت جب ان کے شعور ذات کا حصہ بنتی ہے۔ تو وہ اپنے آپکو گویا موت کی وادی میں اترتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔

یہ دیکھنا تھا بچانے بھی کوئی آتا ہے
اگر میں ڈوب رہا تھا تو ابھر بھی گیا

جینے کے ساتھ موت کا ہے ڈر لگا ہوا
خشکی دکھائی دی ہے سمندر کو خواب میں

جھکی چٹان ، پھسلتی گرفت ، جھولتا جسم
میں اب گرا ہی گرا تنگ تاریک گھاٹی میں

موت کی طلب رفتہ رفتہ شکیب کی شاعری میں محض ان کی ذاتی زندگی کے حادثے اور سانحے کا ردِعمل نہیں رہتی۔ بلکہ ان کے فکر کی پختگی موت کی حقیقت پر مسلسل غور وفکر کی حالت میں رہتی ہے۔ اس ذائقے کا احساس سمٹ کر گویا ان کی زبان پر آ گیا تھا۔ ورنہ بات اگر صرف خودکشی ہی کی تھی تو خودکشی کسی بھی اور حوالے اور ذریعے سے ممکن ہو سکتی تھی۔ بقول کشور ناہید ''شکیب نے اسی طرح مرنا پسند کیا۔ جیسے اس نے اپنی والدہ کو مرتے دیکھا۔ یہ یقیناً شکیب کا نفسیاتی حوالہ بنتا ہے۔''۔۴۹

شکیب جلالی کی خودکشی لمحہ لمحہ موت کی کیفیت اور اس کے تسلسل سے گزرنے کا ایک عمل نظر آتی ہے یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ کسی لمحہ بھی اس لاشعوری خواہش مرگ سے آزادانہ ہو سکے۔ بقول احمد ندیم قاسمی ''بچپن میں والدہ کی طرف سے اس طرح کی خونی ہلاکت شکیب کے ذہن پر گہرے اثرات چھوڑ گئی۔''۔۵۰

یہ عوامل ظاہر کرتے ہیں کہ شکیب جلالی کی خودکشی کسی فوری اور محض جذباتی ردِعمل کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ ان کی زندگی کا یہ بنیادی اور عظیم حادثہ انہیں رفتہ رفتہ موت اور جستجوئے موت سے ہم آہنگ کرتا چلا گیا۔ موت انہیں کئی حوالوں سے اپنی طرف کھینچنے لگی۔

یہ کون بتائے عدم آباد ہے کیسا
ٹوٹی ہوئی قبروں سے صدا تک نہیں آتی

جب کبھی موت کا خیال آیا
زیست میں کوئی دلکشی نہ رہی

احمد ندیم قاسمی نے اس حوالے سے دورانِ ملاقات بتایا کہ شکیب جلالی آخری دنوں میں اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے خط آتے ہیں جن میں مجھے یہی کہا جاتا ہے کہ تمہاری قربانی دینے کا وقت آ گیا ہے۔ جلد قربانی دو اس بات کی مزید وضاحت اس نے کبھی نہیں کی ہم اسے ہمیشہ سمجھاتے تھے کہ ایسی باتیں مت کیا کرو۔ یہ سب غلط باتیں ہیں دورانِ تحقیق جب میری شکیب جلالی کے اہل خانہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ایسے خطوط کی صداقت سے انکار کرتے ہوئے یہ ضرور کہا کہ شکیب جلالی یہ بات اکثر کہتے تھے کہ اب میں زندہ نہیں رہوں گا البتہ قربانی اس حوالے سے ضرور کہی جا سکتی ہے کہ شکیب نے تمام زندگی اپنی بہنوں کی نگہداشت کی وہ بھی قربانی ہی کی صورت ہے۔ یہ تمام باتیں کرتے ہوئے شکیب جلالی کی اہلیہ محدثہ خاتون نے خصوصیت کے ساتھ اس بات کا ذکر کیا۔

آخری دنوں میں وہ اکثر کہتے میں نہیں رہوں گا تم ہی بچوں کو پالو گی میرا باندھا ہوا ابام

ضامن اتار کر رکھ دیا بچوں کو پیار کیا اور مجھے گلے لگا کر بہت روئے کہتے تھے کہ تم پر بہت برا وقت آئے گا شام ساڑھے تین بجے وہ گھر سے نکل گئے۔ ساڑھے پانچ بجے اطلاع آئی کہ خودکشی کر لی شدید زخمی حالت میں ہسپتال لائے گئے وہیں انتقال ہوا۔ اس حالت میں مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔۔۵۱

قربانی کے حوالے سے جو صورتِ حال سامنے آتی ہے اور شکیب کا اپنی اہلیہ کو یہ کہنا کہ میں نہیں رہوں گا تم ہی تنہا بچے پالوگی۔ یا یہ کہنا کہ میرے بچوں کی ماں کو کبھی کچھ نہ ہو۔ یہ تمام نفسیاتی عوامل ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ شکیب کے اندر کا انسان ان کے وجود کی خارجی ٹوٹ پھوٹ کے ردِعمل میں بہت طاقت پکڑ گیا تھا۔ قربانی دینے کا تقاضا اس کی طرف سے زور پکڑتا گیا اس اندر کے طاقتور انسان نے ہی چاہا کہ باپ جو قاتل ہے خونی ہے اسے مرجانا چاہیے اور ماں جسکا ڑین تلے خون کر دیا گیا۔ اُنہیں ہر حالت میں زندہ رہنا چاہیے اس فیصلہ کن مرحلے پر شکیب کے اندر کا انسان باہر آ گیا۔ اور شکیب کے حوالے سے خودکشی کا اقدام اسی طاقتور انسان کے ہاتھوں ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شکیب نے بصورتِ دیگر اپنے باپ جو والدہ کے قاتل تھے انہیں ہلاک کر دیا۔ اور اپنی ماں جنکا خون ہوا تھا اس حوالے سے اپنے بچوں کی ماں کو زندہ رکھا۔ اس حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شکیب کی خودکشی اپنی ماں کی ناگہانی حادثاتی موت کے حوالے سے کوئی اکہرا ردِعمل ظاہر نہیں کرتی بلکہ یہ ردِعمل شکیب کے یہاں کئی نفسیاتی تہہ داریوں میں سے گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اور یہ بھی نفسیاتی تہہ داری ہی کی ایک صورت ہے کہ شکیب نے کمسنی میں والدہ کی حادثاتی موت کا جو اتنا بھرپور اور بھیانک روپ دیکھا۔ اس سے وہ خائف نہ ہوئے۔ بلکہ رفتہ رفتہ موت کی حقیقت اور اس حقیقت کی نفسیات سے ہم آہنگ ہونے لگے۔ اور جب موت شکیب کیلئے قابل قبول ہوئی تو صورتِ حال یہ تھی کہ موت شکیب کے یہاں زندگی ہی کا متبادل بن چکی تھی۔ اس میں بھی ایک نئی حیات تھی۔ کئی راز، اور کئی اسرار اس ان دیکھی دنیا سے وابستہ تھے جو موت کی کیفیت کو بسر کرتے کرتے شکیب پر آشکار ہوئے۔

ہنس ہنس کے گلے ملے قضا سے
تکمیل حیات کر گئے ہم

یہ کائنات ہے میری ہی خاک کا ذرہ
میں اپنے دشت سے گزرا تو بھید پائے بہت

موت شکیب کیلئے راہِ فرار نہ تھی بلکہ زندگی یہاں موت کے تصادم ہی سے نمو پذیر نظر آتی ہے۔ یہ موت کے ساتھ شکیب کے رومانس کی ایک صورت بھی ہے کہ وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی موت کی کیفیت، لذت اور اس کی مخصوص نوعیت کو محسوس کرتے اور اس میں زندگی گزارتے نظر آتے ہیں۔

مرگ و ہستی کا مٹا کر احساس
زندگی موت سے ٹکرائی ہے

موت نے آج خودکشی کر لی

زیست پر کیا بنی خدا جانے

موت کی وابستگی کا جو سفر جذباتی اور نفسیاتی حوالے سے شروع ہوا تھا۔ وہ کائنات کی ایک بڑی سچائی اور فکری گہرائی سے وابستہ نظر آتا ہے۔

رازِ حیات و موت بڑا عاشقانہ ہے
عنوان دو ہیں اور مکمل فسانہ ہے

ایک انسان کی حقیقت کیا ہے
زندگی سے اسے نسبت کیا ہے

اب موت کو پانا زندگی کو جیتنا ہے۔

عزم نے زندگی کو جیت لیا
اپنی پستی پہ موت شرمائی
آندھی اٹھے تو اڑا لے جائے
موج بپھرے تو بہا لے جائے

موت کے ساتھ شکیب کی روحانی، جذباتی اور نفسیاتی وابستگی نے ان کی شاعری میں سفر کی ایک خاص نوعیت کو جنم دیا۔ یہ سفر ایک استعارہ بن جاتا ہے۔ ''اِس دنیا'' سے ''اُس دنیا'' کا۔ یہ کیفیت ان کی شاعری میں ایک ایسی علامت کے طور پر ابھرتی ہے۔ جس نے آہستہ آہستہ شکیب کو زندگی سے موت کی طرف پیش قدمی کیلئے تیار کیا۔ یہ حالتِ سفر ان کے اشعار میں بھی اکثر دکھائی دیتی ہے۔

میں اوج کہکشاں سے بھی آگے نکل گیا
کچھ حوصلے بڑھے تھے میرے اعتبار کے

سفر کی یہ کیفیت ارتقاء کی صورت کو ظاہر کرتی ہے۔

میں وہ نہیں جو ہار گیا موجِ درد سے
پھر پھوٹتی ہے سُرخ کلی شاخ زرد سے
جب سے سفر کو مان لیا میں نے زندگی
خنجر کی دھار پر بھی کبھی ڈولتا نہیں

یہ سفر ان کے لئے نئی حیات کا پیغام لیکر آتا ہے۔ جس کے لئے وہ بڑے پر اعتماد دکھائی دیتے ہیں ان عوامل کے پیش نظر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شکیب کی خودکشی کے ساتھ جو صرف نفسیاتی حوالہ وابستہ کیا جاتا ہے وہ درست نہیں کیونکہ یہ نفسیاتی پہلو رفتہ رفتہ شعور و آگہی کے مراحل طے کرتا ہوا حیات و ممات کے اسرار کے ساتھ بھی منسلک نظر آتا ہے۔

شکیب کی خودکشی کے محرکات میں ایک نمایاں محرک انکا اپنے عہد سے اپنے ماحول سے عدم مطابقت کی صورت

ہے ہرزمانے اور ہر عہد میں دردمند دل اور بڑے اہل قلم نے اس بات رونا رویا۔ کہ ماحول انہیں سازگار نہیں ہے۔ زمانے نے ان کی ناقدری کی ان کی فطری صلاحیتوں کو پائمال کیا ان کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ انہیں جذباتی اور ذہنی صدمے پہنچائے۔ اہل قلم کا یہ شکوہ کچھ ایسا بے جا نہیں ہوتا اور ایسے حالات میں زمانے کی ستم ظریفیاں Show کی طرف حساس دلوں کی نازک مزاجی کو گھلا گھلا کر ختم کر دیتی ہیں۔ یا ایسی صورت میں یہ دردمند دل جذباتی poisoning کش مکش میں مبتلا ہو کر خودکشی کر لیتے ہیں شکیب جلالی کے حوالے سے یہ بات ان کی خودکشی کا ایک بڑا محرک ہے کہ وہ اپنے عہد سے مطابقت نہ کر پائے۔ ذاتی زندگی کے سانحے کے اثرات ایک طرف، ان کے دوست احباب اور دیگر اہل کرم کے ہاتھوں شکیب نے جو جذباتی اور ذہنی صدمے اٹھائے شکیب کی خودکشی کے محرکات سے یہ عوامل نظرانداز نہیں کیے جاسکتے۔ شکیب جلالی کی بیگم محدثہ خاتون نے اس ضمن میں تفصیلاً بات کی۔

> یہ درست ہے۔ کہ شکیب جلالی نے کمسنی میں اپنی والدہ کی دردناک حادثاتی موت دیکھی یہ ان کی زندگی کا ایک عظیم حادثہ ہی نہیں بلکہ ایک بڑی محرومی بھی تھی۔ لیکن انسان محرومیوں میں مرتا نہیں یہ درست ہے کہ شکیب کو بہت سے لوگ چاہتے تھے لیکن دشمنوں کی کمی بھی نہ تھی یہ دشمنی ان سے شاعری کے حوالے سے تھی۔ سرگودھا، جوہرآباد اور بھکر وغیرہ چھوٹے شہر ہیں۔ یہاں ایک شاعر اگر اپنی پہچان بنا رہا تھا۔ تو یہ بات شکیب کے اکثر ہم پیشہ کو کھٹک رہی تھی۔۔۵۲

اس ضمن میں پرویز بزمی کا کہنا ہے ''جس چیز نے انہیں پاگل خانے اور پھر ریل کی پٹڑی پر پہنچایا وہ بھکر کے احباب کا سلوک تھا۔''۔۵۳

شکیب کے ساتھ بچپن میں ان کی والدہ کی المناک موت کا حادثہ گزر چکا تھا۔ ان حالات میں ان کے احباب کی پیشہ وارانہ رقابت نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ایک حساس قلمکار کے لئے اس کی داخلی اور خارجی زندگی سخت پریشانی کا موجب بن رہی تھی۔ اور پھر یہ وقت شکیب کا عہد شباب تھا۔ عمر کا وہ حصہ جو شدتِ جذبات سے بھرپور ہوتا ہے۔ ایسے وقت کے لگے گھاؤ کا ردِعمل بھی اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔ چنانچہ غم جاناں اور غم دوراں کی تلخی نے ملکر ایک حساس لکھاری کی داخلی زندگی میں تہلکہ مچادیا۔ ان کی شاعری میں اکثر مقامات پر دوست احباب کی بے وفائی اور ان کی مفاد پرستی پر مبنی موضوعات نظر آتے ہیں۔

سلوک زمانہ سے تنگ آ گیا ہوں
بیاباں بسانے کو جی چاہتا ہے

دور سحر و شام سے گھبرائے ہوئے ہیں
ہم گردش ایام سے گھبرائے ہوئے ہیں
غم زندگانی سے اکتا گیا ہوں
مگر غم اٹھانے کو جی چاہتا ہے

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

یہ حقیقت ہے کہ شکیب اپنے بعض احباب کے رویے سے بہت دلبرداشتہ تھے۔ یہ بات صرف ان کی شاعری تک محدود نہیں بلکہ بیگم شکیب جلالی نے اس حوالے سے کہا ''مجھے اکثر کہتے تھے۔ کہ میرے بعد اگر کسی سے ہاتھ ملاؤ تو دیکھنا کہ تمہاری انگلیاں بھی موجود ہیں یا نہیں۔''۔۵۴

یہ صورت حال ظاہر کرتی ہے کہ شکیب اپنے ماحول سے انسانی رویوں سے کتنا بددل اور بے یقین ہو چکے تھے یہ بداعتمادی ایک حساس قلمکار کے اندر اپنے عہد سے خفگی اور شکایت کی صورت کو نمایاں کرتی ہے۔ حالانکہ اپنی والدہ کی محبت کا صدمہ جھیلتے ہوئے بھی بظاہر وہ بالکل نارمل انسان تھے۔ بقول محدثہ خاتون ''ہنسنا بولنا، خوش مزاج، خوش گفتار، قہقہے لگانا انکی عادت تھی، تمام احباب کے ساتھ محبت کرتے تھے۔ بہت مہمان نواز تھے تنہائی صرف اسوقت انہیں درکار ہوتی۔ جب وہ کچھ لکھنے کا کام کرتے تھے۔''۔۵۵

ان حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہ والدہ کی موت کے بعد وہ داخلی طور پر اگرچہ شدید صدمے اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے تھے۔ اور یہ اضطرابی صورت حال ان کی داخلی شخصیت کا جزو لازم بن چکی تھی۔ لیکن بظاہر وہ بہت حد تک نارمل زندگی گزار رہے تھے۔ پڑھنے کا شوق، مطالعہ کا شغل، زندگی کی گہما گہمی میں وہ شریک کار تھے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا ''شکیب کا آخر دم تک پتہ نہیں تھا کہ وہ خودکشی کرنے والے ہیں''۔۵۶

ادبی حلقے میں ان کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کا شہرہ تھا وہ ہمہ صفت اور ہمہ جہت قلمکار تھے۔ محدثہ خاتون کے بقول شکیب ہر طرح کی کتابیں پڑھتے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس ضمن میں شکیب جلالی کے بیٹے اقدس رضوی نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

> انہوں نے مائیکل انجلو اور موپساں کے افسانوں کے ترجمے کئے۔ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت پر بھی لکھا۔ چینی زبان کے افسانے ترجمہ کیے۔ صحافت کے میدان میں بھی قابل ذکر کام کیا۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان پر عمدہ مضامین لکھے۔ ان کی شگفتہ تحریریں بھی موجود ہیں۔ اس حوالے سے بابا جان ہمہ جہت شخصیت کے مالک اور اعلیٰ پائے کے لکھاری تھے۔۔۵۷

شکیب کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیت نے دوستوں سے زیادہ اپنے مخالفین کی تعداد میں اضافہ کیا۔ یہاں وہی المیہ جنم لیتا ہے۔ کہ جینئس کی قدر ان کا عہد اس طرح سے نہیں کر پاتا۔ جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ احباب کے ناروا سلوک اور پیشہ ورانہ رقابت نے شکیب کے تلخ تجربات میں شدت کے ساتھ اضافہ کیا۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ نامساعد حالات کے ہاتھوں شکیب کی حد درجہ حساس طبیعت شدید طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی ان کی یہ حساس فطرت بھی ان کی خودکشی کا نمایاں محرک نظر آتی ہے۔ اس کے ہاتھوں وہ پاگل پن کی کیفیت میں بھی رہنے لگے۔ گھر سے ہسپتال اور ہسپتال سے پاگل خانے منتقل کئے گئے۔ وہاں سے ذہنی صحت مندی کا سرٹیفکیٹ ملنے کے باوجود وہ مکمل طور پر سنبھل نہ پائے۔

شکیب کے نفسیاتی مسائل کو مزید بڑھانے میں ان کے احباب نے گویا زیادہ تن دہی سے کام کیا۔ اس حوالے سے اکثر و بیشتر یہ حربہ بھی اختیار کیا گیا۔ کہ ادبی مجالس اور شعری نشستوں میں انہیں بلانے سے گریز کیا جاتا تھا۔ شکیب جلالی

کے بیٹے اقدس رضوی نے گھمبیر آواز میں اس موضوع پر بات کرتے ہوئے کہا۔

> انہوں نے پنڈی، لاہور سے جو رسالے نکالے۔ بند ہو گئے اور کسی کے بند نہیں ہوئے شکیب کو کیوں پارٹیوں میں بلایا نہیں جاتا تھا انکا شعری مجموعہ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ جبکہ انتقال ۱۹۶۶ء میں ہوا تھا۔ کچھ عوامل ایسے ضرور رہے۔ جو ان کو Supress کرتے رہے۔ ایک جینئس ایک حساس ادیب اپنے وقت میں بری طرح نظر انداز ہوا۔ ان حالات میں اگر شکیب پاگل نہ ہوتے تو کیا کرتے۔ ۔۵۸

شکیب جلالی کے اہل خانہ سے جب اس حوالے سے وضاحت چاہی گئی کہ وہ کون سے عوامل تھے جو بقول ان کے شکیب کو ذہنی طور پر پریشان کرتے رہے۔ تو اس ضمن میں انہوں نے معذوری ظاہر کی۔ اور کسی مخصوص نام یا حوالے کا تذکرہ کرنے سے گریز کیا۔ لیکن یقیناً ان کا ہم پیشہ طبقہ ہی ہو سکتا تھا۔ جو ایک طرف شکیب جلالی کے منفرد اسلوب اور شاعرانہ عظمت سے خائف تھا۔ تو دوسری طرف ان کے نفسیاتی مسائل اور حد درجہ حساس طبیعت سے آگاہ بھی تھا۔ اس ضمن میں پروفیسر توصیف تبسم کا یہ کہنا بہت اہم ہے کہ:

> یہ خلیل رام پوری شاعر تھے اور شکیب کے ساتھ تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی میں ملازمت کرتے تھے۔ شکیب کو انہوں نے بہت Torture کیا حتیٰ کہ یہ بھی کہا کہ تمہارے بچے تمہارے نہیں ہیں۔ ۔۵۹

ان نفسیاتی الجھنوں نے شکیب جلالی کو حقیقی طور پر نفسیاتی مسائل میں مبتلا کر دیا۔ لاشعوری طور پر انہیں وہ باتیں درست لگنے لگیں۔ جو ان کے نام نہاد مخلص احباب انہیں ذہنی تکلیف پہنچانے کے لئے کرتے تھے۔ اس مخصوص حلقے کی سازشوں نے یقیناً ایک فنکار کی تخلیقی سطح کو مثبت و متحرک راستے سے ہٹا دیا تھا۔ شکیب کی بیگم محدثہ خاتون نے کچھ اسی قسم کی بات اپنے حوالے سے بھی کہی "شکیب یہ کہنے لگے۔ کہ میں کسی کیمپ سے اٹھا کر لائی گئی ہوں۔ حالانکہ میں ان کی خالہ زاد تھی۔" ۔۶۰

غرض کہ شکیب کے ایک مخصوص حلقہ احباب نے ان کی حساس طبیعت، ان کی نفسیاتی الجھنوں اور زندگی کی محرومیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ شکیب کے مسائل اور ذہنی پریشانیوں میں اضافہ اور پھر خودکشی کے محرکات میں بھی ان کا کردار بہت اہم رہا۔ اس ضمن میں ان کی بیگم نے مزید انکشافات کیے۔

> بعض لوگ کہتے ہیں کہ شکیب کو دوستوں نے سگریٹ میں کچھ کھلا دیا تھا اور جب وہ ذہنی الجھنوں کا شکار ہوئے تو بعض لوگ ان کی شاعری کی چیزیں اٹھا کر چلتے بنے۔ کوئی ان کی طرف سے روکنے والا نہ تھا۔ ۔۶۱

امتیاز کلثوم نے اپنے تحقیقی مقالے میں شکیب جلالی کے بارے میں اسی حوالے سے لکھا ہے کہ شکیب اکثر کہتے تھے "مجھے کسی نے سگریٹ پلا دی ہے۔ وہ اس طرح مجھ سے زندگی چھین رہے ہیں۔" ۔۶۲ اس حوالے سے اثر زندگی کا کہنا ہے۔ "۔۔۔ وہ اپنے قریبی دوستوں سے بھی سگریٹ لیتے ہوئے یہ کہہ کر پھینک دیتے تھے کہ اس میں چرس بھرا ہے۔" ۔۶۳

پرویز بزمی شکیب کی اسی ذہنی کیفیت اور ان کے دوستوں کے ناروا سلوک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان دنوں اس میں چڑچڑاپن آ گیا تھا اپنے ہاتھوں میں مختلف ادبی رسالے لیے لوگوں کو دکھاتا پھرتا اور کہتا دیکھو اس شاعر نے میری یہ ترکیب چرا لی ہے۔ اس نے میرا خیال اڑا لیا ہے فلاں نے میرا یہ مصرعہ سرقہ کر لیا ہے۔۔۶۴

سیدہ پروین اپنے تحقیقی مقالے میں اس حوالے سے لکھی ہیں:

جب وہ تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے محکمہ میں ملازم ہوا اور جوہر آباد میں تعیناتی ہوئی اسوقت نعیم تاج انفارمیشن افسر تھا۔ خدا جانے وہ نااہل تھا یا کسی بری نیت کا آدمی تھا۔ وہ مختلف موضوعات پر مضمون لکھنے کیلئے شکیب جلالی کو دے دیتا۔ اور شکیب کے لکھے ہوئے مضامین اپنے نام سے شائع کرواتا۔ اسکا شکیب کے ذہن نے برا اثر قبول کیا ۔۔۶۵

کسی نے سگریٹ پلائی ہو یا نہ ہو لیکن ایک بات طے ہے کہ شکیب کے لاشعور میں خارجی ماحول سے خوفزدگی کا عنصر جڑ پکڑ چکا تھا۔ یہ صورت حال صریحاً شکیب کی تخلیقی صلاحیتوں کے نکھرنے، ان کے نفسیاتی مسائل میں اضافہ کرنے اور انکی ادبی کاوشوں کو ناجائز طریقے سے اپنے مفاد میں استعمال کرنے کی مذموم سازش نظر آتی ہے۔ اور ان حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شکیب جلالی کے ساتھ بچپن میں والدہ کی موت کے حوالے سے جو حادثہ گزر چکا تھا۔ اس حادثے کی جذباتی ونفسیاتی نوعیت کا سب کو علم تھا۔ اور سبھی یہ جانتے تھے کہ شکیب داخلی طور پر کس کرب اور اذیت سے دوچار رہتے ہیں۔ لہذا ان کے داخلی کرب کو مزید بڑھا کر انہیں ادیبوں کے نمایاں ناموں کی فرست سے خارج کرنے کے عملی اقدامات کئے گئے ۔انہیں نفسیاتی مریض بنا کر ان سے ہمدردیاں جتائی گئیں۔ جبکہ بقول اقدس رضوی ''شکیب جلالی کی وفات پر بھکر میں مٹھائی بانٹی گئی یہ بات ہمیں ہماری والدہ کے ماموں نے بتائی تھی۔ جو ماشااللہ بقید حیات ہیں۔'' ۔۶۶

مٹھائی کن لوگوں نے بانٹی تھی؟ اقدس رضوی نے اس کی وضاحت کرنے سے گریز کیا۔ قیاس ہے کہ یہ وہی لوگ ہوں گے جو شکیب کے ہم پیشہ تھے ان کے ادبی حلقے سے تھے اور جو شکیب کی نفسیاتی الجھنوں سے نہ صرف کھیلے بلکہ ان میں مزید اضافے کا باعث بنتے رہے۔ ان تمام حالات سے مجموعی طور پر شکیب جلالی کی خودکشی کے جو محرکات سامنے آتے ہیں ان کے پیش نظر یہ بات پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ شکیب نے بچپن میں اپنے والد کے ہاتھوں والدہ کی موت کا جو حادثہ دیکھا تھا ماتا سے محرومی کا وہ جس طرح شکار ہوئے۔ ان کی حساس فطرت نے یہ اثر اتشدت سے قبول کیے۔ جو بالآخر ان کے لئے نفسیاتی مسئلہ بن گئے۔

والدہ کی حادثاتی موت شکیب کی خودکشی کا نفسیاتی محرک بنی درست ہے اور یہی نفسیاتی پہلو شکیب کی زندگی، ان کی شخصیت اور پھر ان کی خودکشی کے حوالے سے زبان زد عام ہوا۔ اور اکثر صرف اسی پہلو کو شکیب کی خودکشی کا محرک جانا گیا۔ لیکن اس نفسیاتی مسئلہ کو نفسیاتی مسائل بنانے میں ان کے احباب کی ستم ظریفوں نے اہم ترین کردار ادا کیا۔ سماج کا یہ ناروا سلوک اور ان کے ساز گار رویے بھی شکیب کی خودکشی کے محرکات میں برابر کے شریک ہیں۔

جہاں تک شکیب کی خودکشی کے محرکات میں مزید عوامل کا تعلق ہے سیدہ پروین نے اپنے تحقیقی مقالے شکیب جلالی (شخصیت وفن) میں بڑی شد و مد اور وثوق کے ساتھ شکیب کے معاشی مسائل کا حوالہ دیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

سماجی اعتبار سے شکیب معاشرے میں کم درجہ رکھتا تھا۔۔۔ شکیب کو اس بات کا

احساس تھا کہ معاشرے میں اسکا کوئی مقام نہیں ہے۔۔۔شکیب نے اگر ملازمت کی
ہے تو وہ بھی کوئی قابل رشک نہیں۔ بلکہ وہ کلرک ہی رہا۔۔۔۶۷

کم سماجی درجے سے مراد مقالہ نگار کیا لیتی ہیں۔کیا شکیب کے پاس کوئی افسری نہیں تھی۔ پرتعش زندگی میسر نہیں تھی۔کیا شکیب اسے محرومی سمجھتے ہوئے کسی بڑے سماجی نام اور مقام کے لئے سرگرداں تھے۔کیا شکیب کی زندگی اور ان کی زندگی کی جدوجہد کا کوئی پہلو اس بات کی غمازی کرتا ہے۔اور کیا ان کی شاعری سے کسی ایسے خیال کی بُو آتی ہے۔کہ شکیب سماج میں کسی بڑے درجے کی ملازمت کو پانے کے لئے جائز و ناجائز ذرائع استعمال کرتے رہے۔یا یہ کہ کوئی بڑا سماجی درجہ نہ ملنے پر شکیب کے اندر ٹوٹ پھوٹ اس انتہا درجے پر پہنچ گی۔ جو آخر کار خودکشی پر منتج ہوئی ہو کیونکہ مقالہ نگار نے واضح طور پر لکھا ہے۔کہ شکیب کو اسکا احساس تھا۔کہ معاشرے میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے۔ایک خوددار، حساس اور فطری طور پر ذہین قلمکار کے لئے اس سے بڑی اہمیت اور حیثیت اور کیا ہو سکتی ہے۔کہ دوسرے اس کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کو رشک و حسد کی نگاہ سے اس لیے دیکھیں۔کہ وہ خود اس عطیہ خُداوند سے تہی ہیں اور پھر ناجائز طریقے سے اس کی ادبی کاوشوں کا اگر وہ سرقہ کرتے بھی ہیں۔تو یہ درحقیقت اسی حساس قلمکار اور شکیب جلالی جیسی بلند قامت ادبی شخصیت کی عظمت کا اعتراف ہی ہے۔جس کے سامنے دوسرے خود کو بونا سمجھتے ہیں۔

وہ اسی حوالے سے شکیب کیلئے رقابت رکھتے تھے۔کہ ان کے پاس شکیب کا سا دماغ، اس کی تخلیقی سطح اور اس جیسی سوچ نہ تھی۔اور یقیناً ایک بڑے ادیب کے پاس ایسی دولت، عزت اور سماجی وادبی رتبے کے سوا کوئی اور دولت یا ناموری کیا ہو سکتی ہے۔رہی بات شکیب کی کلرکی کی۔تو کلرک ہونا ایک بڑے ادیب کی شخصیت پر نہ تو کوئی بدنما دھبہ ہے۔ اور نہ اس کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی اس سے چمک ماند پڑتی ہے۔اور نہ شکیب جلالی نے اس کلرکی کو اپنے لیے باعث ندامت جانا۔لہذا مقالہ نگار سیدہ پروین کا معاشی حوالے سے شکیب کے خودکشی کے محرکات میں ایک اضافی نوعیت کا محرک تلاش کرنا بے معنی دکھائی دیتا ہے۔اس محرک کا ان کی خودکشی کے نمایاں اور امتیازی محرکات میں تلاش اگر بے معنی نہیں۔تو بامعنی بھی نہیں ہے۔کیونکہ اسی کلرکی کی کمائی سے ہی انہوں نے محنت کرتے ہوئے ایک بڑے کنبے کی پرورش کی۔اور پھر شکیب کے حوالے سے ان کی معاشی تنگدستی اس نوعیت سے دوچار ہوتی نظر نہیں آتی۔کہ انسان خودکشی جیسے انتہائی اقدام سے دوچار ہو جائے۔بقول ڈاکٹر رشید امجد

زندگی میں بے شمار لوگ معاشی مسائل سے دوچار ہوتے رہے ہیں لیکن خودکشی ہر ایک
نہیں کرتا یقیناً معاشی حوالے کے علاوہ بھی کوئی حساس اور سنگین نوعیت کی صورتِ حال
ہی انسان کو اس انتہائی اقدام کی طرف راغب کرتی ہے۔۔۶۸

چنانچہ شکیب کے سامنے والدہ کی حادثاتی موت، سماجی رویوں کی تلخی ناقدریٔ زمانہ جیسے امور تو سنگین ہو سکتے ہیں کلرکی اور کم آمدنی اس حوالے سے محرک خودکشی نہیں بنتی۔اور پھر جب ہم بات کرتے ہیں کہ شکیب ایک فطری ذہانت کا مالک حساس قلمکار تھا۔تو اس فطری ذہانت کے ساتھ خودداری اور عزتِ نفس خودرو پودوں کی طرح انسانی شخصیت کی حدود میں اُگنے لگتی ہیں۔اس سے قناعت پسندی جنم لیتی ہے۔لہذا اس تمام پس منظر میں شکیب جلالی کی خودکشی کے حوالے سے ان کے معاشی مسائل کو نمایاں سرخی دینا درست معلوم نہیں ہوتا۔بقول احمد ندیم قاسمی ''میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شکیب کی خودکشی کے محرکات کسی طور بھی معاشی نہیں تھے۔بلکہ نفسیاتی تھے۔۔۶۹

اسد جعفری کا اس ضمن میں کہنا ہے کہ

''اس کے حالات بھی بہتر تھے۔اس کے کندھوں پر کسی قابل ذکر ذمہ داری کا بوجھ نہیں تھا۔البتہ احساس کا بوجھ ضرور تھا۔''۔۷۰ اسی حوالے سے جب میں نے شکیب جلالی کی اہلیہ سے وضاحت چاہی۔تو انہوں نے کہا: ''معاشی مسئلہ ان کی خودکشی کے محرکات میں شامل نہیں ہے۔ بلکہ ان کے انتقال کے وقت ہمارے معاشی حالات تو بہت بہتر تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ شدید نفسیاتی اور ذہنی دباؤ کا شکار تھے۔''۔۷۱ لہٰذا اس تمام صورت حال کی حقیقت ظاہر کرتی ہے کہ شکیب جلالی جو بچپن میں اپنی والدہ کی ناگہانی حادثاتی موت کے المیے سے براہ راست متاثر ہوئے۔اور یہ المیہ رفتہ رفتہ نفسیاتی حوالے سے ان کے لئے روگ بنتا چلا گیا۔ممکن ہے کہ اگر اس نفسیاتی مسئلہ کو بعد کی زندگی میں سازگار ماحول ملتا۔تو اس نفسیاتی مسئلہ میں شدت نہ آتی۔ کیونکہ انسانی فطرت میں خارجی ماحول کے اثرات بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔مثبت اور منفی دونوں طرح دھارے ساتھ ساتھ بہتے ہیں۔ پھر مخصوص حالات کے پیش نظر یا مثبت صورت حال پنپتی ہے۔یا منفی رجحانات غلبہ پالیتے ہیں۔

شکیب جلالی کے ساتھ یہی ہوا۔مخصوص حلقہ احباب نے ان کے نفسیاتی مسائل کو بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ادبی حلقے میں انہیں نیچا دکھانے کے لئے انہیں نظرانداز کیا گیا۔ذہنی ایذا پہنچایا گیا۔انہیں نت نئی الجھنوں میں مبتلا کیا گیا۔اور پھر ایک حساس، ذہین اور منفرد طرزِ شاعری کا حامل شاعر حقیقی زندگی کی مسرتوں سے کٹ کر نارمل طرزِ زندگی سے بھی منہ موڑ گیا۔اسی حالت نے انہیں پھر پاگل خانے تک پہنچایا۔خارجی سطح پر مخالف حالات کا دھارا اسی رخ بہتا رہا۔اور بالآخر وہ خودکشی کے مرتکب ہوئے۔ خارجی صورت حال اگر شکیب کے موافق ہوتی۔تو بہت ممکن ہے کہ حالات اس سنگین نوعیت کے حامل نہ ہوتے۔

شبیر شاہد: (۱۹۴۹۔۱۹۷۴)

شبیر شاہد اردو شاعری کا ایک نام ہے۔ جو اپنے کمال پر پہنچنے سے پہلے ہی اپنے مخصوص فکری پس منظر میں غروب ہو گیا۔ شبیر کے والد خوشاب کے زمیندار تھے۔ زمینداری کے علاوہ وہ زراعت سے متعلق اپنا کوئی بزنس بھی کرتے تھے۔ شبیر اس زمیندار گھرانے کے اکلوتے بیٹے تھے۔ جنہیں زمینداری سے زیادہ علم و ادب سے دلچسپی تھی۔ لہذا انہوں نے اپنی تمام تر توجہ پڑھنے لکھنے کی طرف مبذول کر دی۔

شبیر شاہد ایک توانا جسم و جان کے حامل صحت مند نوجوان تھے۔ شگفتہ طبیعت کے مالک تھے۔ گھر میں چونکہ کوئی مالی پریشانی نہ تھی۔ لہذا مکمل ذہنی سکون کے ساتھ وہ حصول علم کی طرف راغب ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں شبیر نے گورنمنٹ کالج جوہر آباد سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور ان کی شاعری کا آغاز بھی وہیں سے ہوا تھا۔ گورنمنٹ کالج جوہر آباد کے مجلّہ میں انکا ابتدائی کلام شائع ہوا تھا۔

شبیر شاہد نے اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ اور امتحان میں ٹاپ کرنے پر انہیں گولڈ میڈل ملا۔ شبیر شاہد کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو نکھرنے کا وہاں بہت موقع ملا۔ استادوں کے وہ منظور نظر تھے۔ ایک پروگریسو ذہن رکھنے کے باعث وہ کالج کی نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔ سجاد باقر رضوی جو انگریزی کے استاد تھے۔ اور ایم اے اردو کو تنقید کا مضمون پڑھاتے تھے۔ شبیر کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ دونوں کے اندر شاعرانہ جوہر بھی انہیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا۔

بقول ضیاالحسن

> ادبی حلقوں میں انہیں خوب پذیرائی ملی۔ جسکا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ان کی تخلیقات ''سویرا'' اور ''فنون'' جیسے مستند اور موثر جرائد میں شائع ہونے لگیں۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ''سویرا'' میں شائع ہونا معیار کی علامت ہوتا تھا۔ ۔۲۷

شبیر مطالعہ کے بہت شوقین تھے۔ طلسم ہوشربا اور روسی لکھاریوں کو نسبتاً زیادہ پڑھتے تھے۔ لیکن وہ کتاب جس نے شبیر شاہد کی زندگی کی بساط پلٹ دی۔ وہ ''ہرمن ہیسے'' کی کتاب ''سدھارتھ'' ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ شبیر نے کئی مرتبہ کیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ شبیر کا حیات و ممات سے متعلق غور و فکر بھی بڑھتا چلا گیا۔

حصول تعلیم سے فراغت کے بعد شبیر کا قیام لاہور ہی میں رہا۔ کیونکہ شبیر کو وہاں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں

ملازمت مل گئی تھی۔ اور اس کے علاوہ اب وہ سنجیدہ علمی وادبی محفلوں کے روح رواں تھے۔ انہی علمی وادبی محفلوں نے شبیر کی علم دوستی کو مزید جلا بخشی۔ وہ اردو کی کلاسیکی شاعری کا بہت شعور رکھتے تھے۔ ان کی مخصوص فکری جہت نے ''سدھارتھ'' کی فلسفیانہ فکر کو اپنے اندر اس طور سے جذب کیا۔ کہ ایک روز خاموشی کے ساتھ دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اور باوجود کوششیں بسیار وہ دستیاب نہ ہو سکے۔ اور بقول محسن عباسی ''شبیر کو سمندر کی گہرائیاں بہت پسند تھیں۔ کبھی کبھی خائف رہتے تھے۔ شاید پانی کی نذر ہو گئے۔''۔۷۳

کچھ اسی حوالے سے شبیر شاہد ہوسٹل سے اپنے والد کو خط لکھتے ہیں۔

> میرا اپنا کام پوری رفتار سے جاری ہے۔ مطالعہ میں کمی نہیں آنے دیتا۔ بس ابھی تک تو یہی مقصد ہے کہ جب تک زندگی کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ اسوقت تک یہ پتہ چلانے کی کوشش کی جائے۔ کہ زندگی کا مقصد کیا ہے۔ یہ اور بات ہے۔ کہ مقصدیت مجھ سے دن بدن دور ہوتی جا رہی ہے۔ ۷۴

زمین ، آدم ، شجر، حجر، پھول اور تارے
تمام آنی ، تمام فانی ، رواں ہے پانی

شبیر کی خواہش مرگ میں جو شدت تھی۔ اسکا ایک بنیادی محرک یہ تھا۔ کہ شبیر فطری ذہانت رکھنے والے ایک غیر معمولی انسان تھے۔ غیر معمولی ذہانت رکھنے والا انسان جب حصول علم کے مراحل میں تفکر سے کام لے۔ تو شعور وآگہی کے نہ صرف نئے نئے در وا ہونے لگتے ہیں۔ بلکہ وہ غیر محسوساتی طور پر ادراک کی منزلوں کو چھونے لگتا ہے۔ شبیر شاہد قدرتی طور پر ایسی ہی ذہانت کے مالک تھے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی جو شبیر شاہد کے ہم جماعت اور ان کے ساتھیوں میں سے ہیں کا کہنا ہے۔ ''شبیر میرا کلاس فیلو تھا۔ وہ غیر معمولی انسان تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا۔ تو بہت بڑا تخلیق کار ہوتا''۔۷۵

شعور وآگہی کا اپنا ایک کرب اور داخلی اضطراب ہوتا ہے۔ جو حصول علم کے ساتھ ساتھ مزید بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ذہانت غور وفکر کی بھٹی میں نئے نئے سوالات کو جنم دیتی ہے۔ فکر وتدبر ایسے ایسے حقائق کی تلاش میں ان اہل علم کو سرگرداں کر دیتے ہیں۔ جہاں صرف آبلہ پائی باقی رہ جاتی ہے۔ اور انہیں اطمینان قلب میسر نہیں آتا۔ اور شبیر شاہد تو پھر ایک فطری شاعر تھے۔ محسوسات سے بھرے ہوئے۔ حساس دل ودماغ رکھنے والے انسان۔ جنہوں نے اپنے فطری شاعرانہ جوہر کو اس طرح سے بھی نکھارا کہ انہیں شاعری کی کلاسیکی روایت سے گہرا شغف تھا۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ اپنے شاعرانہ جوہر میں انفرادیت پسند بھی تھے۔

بقول ضیاالحسن

> وہ اپنے موجود سے غیر مطمئن اور بھرپور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ شاعری کے حوالے سے وہ نہ صرف کلاسیکی روایت کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ بلکہ جدید Sensibility بھی رکھتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے۔ کہ انہوں نے اردو شاعری کے جدید دور کا آغاز کیا۔ تو غلط نہ ہوگا۔ وہ ایک Trend-setter شاعر تھے۔ ۷۶

شبیر شاہد کی سیرت وکردار کا یہ پہلو ظاہر کرتا ہے کہ شبیر نہ صرف غیر معمولی خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ بلکہ ان کے اندر یہ جوہر بھی موجود تھا کہ قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کو محنت وریاضت سے کیسے مزید جلاء دی جا سکتی ہے۔

چنانچہ بحثیت شاعر انہوں نے اپنے فطری جوہر کو مطالعہ اور غور وفکر سے مزید بڑھایا اور سنوارا۔ اس وجہ سے ان کے اندر حیات و کائنات کے اسرار کا تجسس مزید بڑھا۔ کیونکہ جو کچھ انہیں علم کی ریاضت نے دیا۔ وہ ان کی فطری صلاحیتوں کے امتزاج سے انہیں فکر کے ایک ایسے راستے پر لے گیا۔ جہاں وہ ایک منفرد اور مختلف طرزِ احساس کے حامل بن گئے۔ اس ضمن میں شبیر کے سیرت و کردار کو نکھارنے میں یقیناً لاہور اورینٹل کالج کی علمی و ادبی فضا اور وہاں کے مشفق و محنتی اساتذہ کا بڑا عمل دخل ہے۔ شبیر کے ضمن میں جتنے بھی ادیبوں، ناقدین اور شبیر کے قریبی دوستوں سے راقمہ کا رابطہ ہوا۔ یہ بات ہر مقام پر سامنے آئی۔ کہ شبیر کے مخصوص ذہنی و فکری پس منظر میں دو اہم شخصیات کا اثر زیادہ رہا۔ ایک سجاد باقر رضوی اور دوسرے ناصر کاظمی۔ بقول ضیاالحسن

> شبیر شاہد کی شعری تربیت دو شخصیتوں کے زیر اثر ہوئی۔ سجاد باقر رضوی اور ناصر کاظمی۔ شبیر شاہد نے ان کے تخلیقی اختلاف کے Synthesis پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی۔ سجاد باقر رضوی غالب پسند کلاسیکی رویوں کے پیروکار، ذہنی ٹھہراؤ، مستقل اور ٹھوس رویے رکھنے والے انسان تھے۔ جبکہ ناصر کاظمی میر پرست، رومانوی مزاج رکھنے والے مضطرب انسان تھے۔ ۷۷

گویا شبیر کی ذہنی و فکری نشو و نما میں ان دونوں نامور ادبی شخصیات نے اہم کردار ادا کیا۔ شبیر نے خود اسکا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے۔

باقر کا شاگرد ہوں شاہد
ناصر کا متوالا ہوں

سجاد باقر رضوی سے شبیر شاہد کی قربت اور ذہنی وابستگی کے حوالے سے پروفیسر احمد جاوید کا کہنا ہے۔ ''سجاد باقر رضوی سے شبیر بہت قریب تھے۔ دونوں شاعر تھے۔ اور دونوں شیعہ مسلک رکھتے تھے۔ سجاد باقر رضوی شاعری میں شبیر کی سنجیدگی کے معترف تھے۔'' ۷۸

شبیر کے ضمن میں سجاد باقر رضوی کا کیا کہنا تھا۔؟ اس ضمن میں بقول ضیاالحسن

> سجاد باقر رضوی صاحب کہتے تھے۔ کہ جانے سے پیشتر ان کے رویے میں محسوس کی جا سکنے والی تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔۔۔ جانے سے پہلے شبیر شاہد نے ''ہرمن ہیسے'' کا ناول ''سدھارتھ'' پڑھا۔ جس کے بارے میں وہ اکثر باتیں کیا کرتے تھے۔ ان پر اس ناول نے بھی گہرے اثرات ڈالے۔ اور ان کی ذہنی کایا کلپ کا باعث بنا۔ انہوں نے کئی راتیں راوی کنارے دریا سے باتیں کرتے گزاریں۔'' ۷۹

جرمن مصنف ''ہرمن ہیسے'' کی کتاب ''سدھارتھ'' کا حوالہ شبیر کے ضمن میں ان سے آگاہی رکھنے والی کم و بیش ہر شخصیت نے دیا ہے۔ یہ ناول ''ہرمن ہیسے'' کا شاہکار ناول ہے۔ جس پر ۱۹۶۴ء میں اسے ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ جہاں تک ناول کے موضوع کا تعلق ہے۔ یہ فلسفیانہ موضوع ہے۔ ایک مغربی ادیب نے اپنی ذات کی تلاش کے حوالے سے روحانیت کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ ''سدھارتھ'' کے کردار کا اصل ''سدھارتھ'' یعنی مہاتما بدھ سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ان دونوں کرداروں میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ ''سدھارتھ'' کا کردار روح اور مادے کے

درمیان ایک کش مکش میں مبتلا انسان ہے۔ جو تجسس اور تحیر کی فضا میں اپنی پہچان کے سفر پر نکلا ہے۔ اور آخر کار وہ تمام مراحل سے گزرنے کے بعد محسوس کرتا ہے۔ کہ دنیا میں اہم ترین چیز محبت ہے۔ یہ کائنات ہمارے لیے غور و فکر کی جگہ ہے۔ اسے چھوڑنے سے دنیا کو ترک کرنے سے اپنی ذات کو تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ شبیر شاہد اس فلسفیانہ حوالے سے یقیناً اپنی تلاش اور اپنے وجود کی پہچان کے متلاشی تھے۔ اور اس کتاب میں فلسفے کی جو تمام فضاء پھیلی ہوئی ہے وہ شبیر کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا کہنا ہے۔ ''شبیر شاہد ''ہرمن ہیسے'' کی کتاب ''سدھارتھ'' پڑھ رہے تھے۔ اس کتاب کے شبیر پر گہرے اثرات تھے۔''-۸۰ شبیر شاہد پر ''سدھارتھ'' کے اثرات کا حوالہ دو طرح سے محسوس ہوتا ہے کہ ایک تو شبیر کی فطرت کا ''سدھارتھ'' کے موضوع سے مطابقت رکھنا۔ اور دوسرا مغربی ادب کے اثرات جو اردو کے ادیبوں پر مرتب ہوئے۔ وہ صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ یہ بات اس حوالے سے قابلِ ذکر ہے کہ مغربی ناول کے یہ اثرات شبیر نے اس شدت کے ساتھ لیے۔ کہ ان کی زندگی کا ورق تمام ہو گیا۔ بقول ڈاکٹر سہیل احمد خان ''شبیر شاہد تصور کی دنیا میں چلے گئے۔ ''ہرمن ہیے'' کا ناول ''سدھارتھ'' انہیں میں نے پڑھنے کو دیا تھا۔ اس میں دریا کا واضح حوالہ موجود ہے۔ شبیر بھی دریا کا ذکر زیادہ کرتے تھے۔ ویسے بھی اگر دیکھیں تو پانی عدم کی علامت ہے۔''-۸۱

اردو کے ادیبوں نے مغربی ادب کے اثرات بعض اوقات اس شدت کے ساتھ عملی صورت میں لیے۔ کہ یہ تجربہ اور ان کی زندگی کی صورت ایک ہی ٹھہری۔ ''سدھارتھ'' میں دریا کا حوالہ شبیر کی عملی زندگی میں آنا، دریائے راوی کے کنارے اس سے باتیں کرتے راتیں گزارنی۔ یہ عوامل ان کی ذہنی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ شبیر اب اپنے مطالعہ اور مشاہدے کو تجربے میں لا رہے تھے۔

پروفیسر احمد جاوید کا یہ کہنا ہے

> ''ہرمن ہیے'' کا ناول ''سدھارتھ'' کو شبیر بہت پڑھتے تھے۔ Discussion کرتے تھے۔ اس کے علاوہ طلسم ہوشربا ان کے مطالعہ میں زیادہ رہتی تھی۔ ان کے سوالات عموماً اس طرح کے ہوتے۔ کہ کائنات کیا ہے۔؟۔ موت کیسی ہو سکتی ہے؟۔ یہ فطرت کیا شئے ہے؟۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ لیکن ایک بات جو میں محسوس کرتا تھا۔ کہ شبیر سنجیدہ ادبی بحثوں میں ہمیشہ غیر معمولی غور و فکر پر مبنی سوالات کیا کرتے تھے۔ -۸۲

گویا شبیر جس تجربے سے گزرنے کی حالت میں تھے اور جس قسم کی وہ سوچ رکھتے تھے۔ جسطرح کے سوالات کرتے تھے۔ وہ شبیر کی اندرونی کش مکش کے غماز تھے۔ یہ تمام حالات و واقعات ثابت کرتے ہیں۔ کہ شبیر کی شدید خواہش مرگ کا ایک اہم محرک ان کی ذاتی اور فطری ذہانت ہے۔ راقمہ نے اس ضمن میں جن جن شخصیات سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بنیادی طور پر شبیر کی اسی خصوصیت کا تذکرہ کیا۔ یہ ذہانت شبیر کو شعور و آگہی کے حوالے سے خود اپنی ذات سے مکالمہ کی منزل پر لے آئی تھی۔ یہ صورتِ حال دراصل ایک انٹی لیکچول کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اپنے اندر ہی اندر غور و فکر کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتے چلے جانا۔ شبیر اب انہی راستوں کے مسافر تھے۔ اور موت کے لئے انتہائی متجسس رہتے تھے۔

بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری

> شبیر شاہد میرے پرانے شاگرد تھے۔ میں ان کے ایم اے کے مقالے کا گائیڈ بھی

تھا۔ انھوں نے ٹاپ (Top) کیا تھا۔ ان میں ائی لیکچول پرابلم تھی۔ موت انھیں بہت پر کشش لگتی تھی۔ ان پر بدھ ازم کے اثرات تھے۔ ۸۳

بدھ ازم کے اثرات کے حوالے سے اگر شبیر کی گمشدہ موت کا جائزہ لیا جائے۔ تو ترک دنیا کی صورت لگتی ہے۔ شبیر نے اگر واقعی گوتم کی طرح دنیا ترک کر دی تھی۔ تو گوتم کی طرح انہیں کبھی نہ کبھی تو واپسی کا خیال آنا چاہیے تھا۔ اس طرح ترک دنیا کے مسلک پر شبیر کا قائم رہنا یا نہ رہنا تو الگ بحث ہے۔ لیکن کم از کم پینتیس چالیس برسوں میں کبھی کہیں پر ان کی واپسی کی کوئی نہ کوئی آہٹ، کسی نہ کسی دہلیز پر سنائی دی جانی چاہیے تھی۔ لیکن شبیر نے جو قدم اٹھایا۔ اس میں یہاں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی۔

اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی کا کہنا ہے۔ ''شبیر شاہد کے ساتھ یہ مسئلہ تھا۔ کہ خود کو دوسروں سے منفرد اور کلاس میں سب کے درمیان خود کو misfit سمجھتا تھا۔ اُس کی موت بھی شاید اسی اسرار کے ساتھ وابستہ ہے۔'' ۸۴ شبیر شاہد خود کو دوسروں کے درمیان اسی لیے misfit سمجھتے تھے۔ کہ وہ خود کو سب سے مختلف پاتے تھے۔ شعورِ ذات کا جو کرب ان کے اندر اتر چکا تھا۔ وہ انہیں دوسروں میں نظر نہ آتا تھا۔ اس کے علاوہ ذہانت کا اپنا جو احساسِ تفاخر ہوتا ہے۔ وہ یقیناً شبیر میں موجود تھا۔ بقول ڈاکٹر سہیل احمد خان ''شبیر شاہد ذہین انسان تھے۔ ایم اے اردو میں ٹاپ کیا تھا۔'' ۸۵

اگر زندگی کے معاملات میں وہ دوسروں سے ممتاز و منفرد تھے۔ تو یقیناً اپنی موت کے بارے میں وہ جو منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اور جس طریقے سے وہ خواہش مرگ کی تکمیل کے لئے اپنا ذہن بنا چکے تھے۔ وہ بھلا دوسروں کے ساتھ کیونکر تبادلۂ خیالات میں لاتے۔ وہ اپنی فکر میں، اپنے ارادوں میں، اپنے خوابوں میں گم و مست و مگن تھے۔

بقول پروفیسر احمد جاوید ''اس بات پر حیرت بھی ہے۔ اور افسوس بھی کہ شبیر نے دنیا، زندگی۔ کچھ بھی کہہ لیں چھوڑتے ہوئے کسی کو بھی اعتماد میں نہیں لیا۔ یہ بات وہ ضرور کہتے تھے کہ اس شہر سے اب نکلنا چاہیے۔'' ۸۶ شہر سے مراد صرف شہر لاہور محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ شعراء کے نزدیک دل اور زندگی بمعنی شہر لیے گئے ہیں۔ دل بھی امنگوں، خواہشوں اور رونقوں کے میلے سے بھرا ہوتا ہے۔ شبیر یقیناً دل کے حوالے سے خواہشوں کے شہر سے نکلنا چاہتے تھے۔ اور ان میلوں اور رونق کی جگہ انہیں ان سناٹوں کی تلاش تھی۔ جن میں ان کے وجود کی دھجیاں اڑتے ہوئے انہیں محسوس ہوتیں۔ جہاں روح اپنی مستی اور سرشاری میں رقص کناں ہوتی۔ جہاں شعورِ ذات کی بجلیاں ان کے وجود کو جلا کر بھسم کر دیتیں۔ اور بالفرض صرف ''شہر لاہور'' اس حوالے سے مراد لیا جائے۔ تو اس صورت میں ایسی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ کہ جیسے شبیر اس شہر سے باہر زندگی کا کوئی رنگ دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس حوالے میں اتنی توانائی اس لیے نظر نہیں آتی۔ کہ ان پر زندگی کے تمام رنگ آشکار ہو چکے تھے۔ اسی لیے وہ زندگی سے نکلنے کا راستہ تلاش کر رہے تھے۔ اور پھر شہر لاہور سے نکلنے کے بعد کا سفر جو بعد میں حقیقت بنا) جس پُراسرار کہانی کے عنوان سے وابستہ ہے۔ وہ ''شہرِ دل'' سے رخصت ہونے کی کیفیت ہے۔ نہ کہ ایک شہر کی زمینی اور جغرافیائی حالت کے ساتھ جسم و روح کی گمشدگی وابستہ کر دی جائے۔

شبیر کی خواہش مرگ، وصال مرگ سے مسلسل نبرد آزما تھی۔ نہ صرف شبیر کا مخصوص رویہ موت سے متعلق خود سے مکالمہ اور احباب سے موت کے موضوع پر سنجیدہ نشستیں اس کا حوالہ بنتی ہیں۔ بلکہ شبیر کی شاعری خود موت کی طرف پیش قدمی کا استعارہ دکھائی دیتی ہے۔

بقول ضیاء الحسن

اُن کی دستیاب شاعری کا بنیادی استعارہ پانی ہے۔ پانی قوتِ حیات ہے۔ رواں دواں ہے۔ اجنبی سرزمینوں کو رواں رہتا ہے۔ زندگی کے تغیر کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور زندگی کی طرح آگے کو رواں رہتا ہے۔ کہیں یہ زندگی کا استعارہ ہے۔ کہیں وقت کی علامت اور کہیں ابدیت کا سمندر ہے۔۔۔ یہ پانی صورت بدل بدل کر کائنات تشکیل دیتا ہے۔ کبھی یہ بادل، کبھی دریا ہے۔ کبھی شاداب جھیل، کبھی لہو بنکر رگوں میں گردش کرتا ہے۔۔۔ پانی وہ بنیاد ہے۔ جس پر زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ پانی اور زندگی لازم وملزوم ہیں۔ ۔۸۷

پانی، دریا، سمندر، سفر سب کے سب شبیر کی شاعری میں زندگی کے فانی ہونے اور ایک چل چلاؤ کی علامت لیے ہوئے ہیں۔ لیکن اس حوالے سے پانی کی علامت سب سے زیادہ، وسیع اور شدت کی حامل ہے۔ شبیر کی نظموں کے زیادہ تر عنوانات میں پانی، دریا اور عمر رواں کی واضح علامتیں دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً سدا رہے گی روانی، عمر رواں بھی اک شجر ہے، عمر رواں بھی ایک دریا ہے، عمر رواں ہے بہتا پانی، عمر رواں بھی ایک دیا ہے، عمر رواں ایک جادوگر ہے، عمر رواں بھی اک صحرا ہے، عمر رواں کا سایہ ہوں میں وغیرہ

سدا رہے گی یہی روانی ، رواں ہے پانی
بہاؤ اسکا ہے جاودانی رواں ہے پانی

بہے یہ پانی ، بہے برابر ، بہے نہ ساگر
یہیں رتیں روپ ، رنگ ، منظر ، بہے نہ ساگر

یہاں دور کی آواز جو صداؤں میں ڈھلتی ہے۔ لنگر کا اٹھایا جانا اور سمندروں کا بلاوا واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے۔ کہ شبیر کی ان دیکھی دنیا اور دیوار کے اُس پار کی زندگی کی طرف خاموشی کے ساتھ روانگی ہے۔

سنو یہ آواز دور کی لہر کی صدا ہے
اٹھاؤ لنگر کہ پھر سمندر بلا رہا ہے
عمر رواں بھی اک دریا ہے
اک دریا صحرا جیسا ہے

شبیر شاہد کی شاعری جن علامتوں اور استعاروں سے بھری ہوئی ہے وہ سب زندگی کی بے معنویت کے عکاس ہیں۔

عمر رواں ہے بہتا پانی
پانی کی سمتیں انجانی

شبیر پر یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی۔ کہ حیات و کائنات کا وجود، اور اس کے تمام تر مناظر تیز رفتاری کے ساتھ اپنے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

عمر رواں بھی اک شجر ہے

اک شجر بے برگ و ثمر ہے

عمر رواں بھی ایک دریا ہے
ایک دیا گھر گھر جلتا ہے

شبیر رفتہ رفتہ موت کی انجانی راہوں کی طرف رواں دواں ہیں۔
بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ''شبیر شاہد اکثر کہتے تھے۔ کہ زندگی بے معنی ہے۔ بیکار ہے۔ اور زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں۔'' ۔۸۸

عمر رواں کا سایہ ہوں میں
ہر دم ڈھلتا رہتا ہوں میں

شبیر زندگی اور موت کو جس زاویہ نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ اب وہ اپنی ذات کو اسی پس منظر کے حوالے سے دیکھنے کے لیے متفکر تھے۔ وہ بخوبی جانتے تھے۔ کہ جبکہ انکا اپنا وجود بھی اس کائنات کا حصہ ہے۔ تو پھر اسے بقا کیونکر ملے گی۔ شبیر شاہد کے عشقیہ اور جذباتی نوعیت کے معاملات کے بارے میں کچھ آراء بھی پائی جاتی ہیں۔
مثلاً محسن عباس کا کہنا ہے

پروفیسر مظفر بتاتے ہیں کہ ایک روز شبیر کو میں نے اورینٹل کالج کی لائبریری کے سامنے پسینے سے شرابور دیکھا۔ ان کے ساتھ ایک خاتون بھی تھیں۔ وہ خاتون بہاولپور کی تھیں۔ شبیر کے والد نے اُس خاتون کا رشتہ شبیر کے لئے مانگا تھا۔ مگر شبیر نے انکار کر دیا تھا۔ وہ خاتون آجکل بہاول پور کالج میں پروفیسر ہے۔ ۔۸۹

شبیر کے ساتھ یہاں جس خاتون کا ذکر آیا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ کیا وہی عورت تھی۔ جو بقول کم وبیش شبیر کے تمام دوستوں اور ناقدین کے اورینٹل کالج میں ہی پڑھتی تھی۔ اور شبیر سے ایک کلاس جونیئر تھی۔ اگر یہ وہی خاتون تھی۔ تو شبیر نے اس سے شادی کرنے سے کیوں انکار کیا۔ جبکہ اس خاتون کے گھر والوں نے اپنی رضامندی دیدی تھی۔ یہاں ڈاکٹر اجمل نیازی جو شبیر شاہد کے کلاس فیلو ہیں۔ اور اسوقت اس خاتون کو جانتے بھی تھے۔ کیونکہ اگر وہ شبیر شاہد سے ایک جماعت جونیئر تھی۔ تو یقیناً سب کلاس فیلوز کے علم میں وہ خاتون اور شبیر کا اس وقت افیر ہوا ہو گا۔
بقول اجمل نیازی ''شبیر شاہد اپنے سے ایک جماعت جونیئر ایک لڑکی سے عشق کرتے تھے۔ اور وہ لڑکی کتنی اور دلچسپی رکھتی تھی۔'' ۔۹۰ یہ بات اگر اس حوالے سے مان لی جائے تو شواہد صاف ظاہر ہیں کہ شبیر نے اُس لڑکی سے شادی کرنے سے اس لئے انکار کیا تھا۔ کہ انہیں اس بات کا رنج و ملال تھا۔ کہ وہ لڑکی کیونکر کسی اور کی محبت میں گرفتار ہے۔ جبکہ شبیر کا اس لڑکی کے ساتھ عشق کا یہ عالم تھا کہ بقول محسن عباس ''شبیر کے حوالے سے جن لوگوں نے بھی اس خاتون کا ذکر کیا ہے۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ شبیر جب بھی بہاول پور کی اس خاتون کا ذکر سنتا تھا تو پسینے میں نہا جاتا تھا۔'' ۔۹۱
یہ عوامل ظاہر کرتے ہیں۔ کہ شبیر اس خاتون سے عشق میں کتنے سچے اور سنجیدہ تھے۔ کہ نہ تو اس کی بے وفائی کے باعث اس سے شادی کی۔ اور نہ ہی اس کی محبت کو اپنے دل سے نکال سکے۔ یقیناً جب وہ زندگی میں بے معنویت کی بات کرتے ہیں۔ تو ناکام عشق کی یہ داستان اس کا ایک نمایاں محرک بنتی ہے۔ اس ضمن میں قابل غور پہلو یہ ہے کہ شبیر جہاں

زندگی اور معاملات زندگی میں ایک بے معنویت کی فضاء میں سانس لے رہے تھے۔ وہاں لحہ بھر کے لئے عشق و محبت کے شعلے کی حدت بھی ان کیلئے آسودگی فراہم نہ کرسکی۔ محبت میں ناکامی شبیر کیلئے ایسی ہی تھی۔ جیسے لحہ بھر کے لئے کوئی اپنے لئے سایہ تلاش کرے۔ لیکن دوسری ہی ساعت میں اس سائے کو تیز دھوپ کھا جائے۔ شبیر شاہد کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔

بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ''شبیر شاہد ایک نوجوان، ذہین اور حساس انسان تھا۔ محبت میں ناکامی کے معاملے کو شبیر شاہد کی گمشدہ موت کے محرکات سے خارج نہیں کیا جاسکتا''۔۹۲ عشق کی ناکامی ایک عام شخص کو بھی مضطرب اور بے چین رکھ سکتی ہے۔ لیکن اس کی بدولت ایک ذہین، حساس فنکار جس طرح اپنی انا کی شکست سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کے خواب جسطرح سے ٹوٹتے ہیں اور جس طرح اس کی خودداری مجروح ہوتی ہے۔ شبیر ان مراحل کی شکست وریخت سے نہ صرف دوچار ہوئے۔ بلکہ اس اپنی انا کا مسئلہ بنا کر زندگی سے بھی بیزار ہو گئے۔ اس طرح محبت کی ناکامی کو بھی ہم شبیر کی خواہش مرگ کے محرکات سے الگ نہیں کرسکتے۔ جس کے باعث انہیں زندگی بے معنی دکھائی دینے لگی تھی۔ شبیر کے ناکام عشق کا تذکرہ کم وبیش شبیر کے تمام احباب اور مداحوں نے کیا ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر سہیل احمد خان کا کہنا ہے''شبیر شاہد کا کسی لڑکی سے ناکام آفیئر بھی تھا''۔۹۳ شبیر کو زندگی میں بے معنویت کی صدائیں چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھیں۔ بیس برس کی شدتِ جذبات سے بھرپور عمر میں اُن کا سنجیدہ مطالعہ ان کے غوروفکر کی عادت، ناپختہ تجربے اور مشاہدے سے نہ سمجھنے اور نہ سمجھانے کی صورتِ حال انہیں تیزی کے ساتھ زندگی سے دور لے جارہی تھی۔ ان کی شاعری میں بہت واضح اور بھرپور طریقے سے یہ طرزِ احساس موجود ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی کا چراغ گل کر کے کسی اور دیس کی روشنیوں کی طرف کھنچے جارہے تھے۔ ان عوامل سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ شبیر خودکشی کے حوالے سے اپنی زندگی کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔

فرطِ حیرت سے بھرا گھر دیکھتا رہ جائے گا
ہم چلے جائیں گے دروازہ کھلا رہ جائے گا

ہوائے غربت کی لہر انفاس میں رواں تھی
نئے سفر کا چراغ سینوں میں جل رہا تھا

اس ضمن میں شبیر کے دوستوں کا نقطۂ نظر بھی کچھ اس سے ملتا جلتا ہے۔ بقول ڈاکٹر اجمل نیازی ''شبیر شاہد کی گمشدگی زیادہ تر خودکشی کا حوالہ بنتی ہے''۔۹۴ شبیر جس مخصوص فکری تناظر کی زد میں تھے۔ ان کے خوابوں کا جہاں جتنا وسیع اور عظیم تھا۔ اس حوالے سے وہ اکثر اظہار خیال بھی کرتے تھے۔ ۲۸ نومبر،۱۹۷۳ء کو اس ضمن میں شبیر اپنے والد کو لاہور سے خط میں لکھتے ہیں۔ ''میں اپنی دھن میں، اپنے خوابوں میں اور اپنے وجود میں گم رہا ہوں، میرے خواب میرے وجود سے زیادہ قدیم اور بہت زیادہ بڑے ہیں۔ میں دن بدن ان میں گرفتار ہوتا چلا جارہا ہوں''۔۹۵

شبیر نے اپنے جن خوابوں اور متلاطم جذبات کا ذکر کیا ہے یہ خیالات ومحسوسات اُن کے صرف اپنے والد کے نام خط سے ہی ظاہر نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کا یہ مخصوص رویہ اُن کے احباب بھی شدت کے ساتھ محسوس کررہے تھے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا کہنا ہے''شبیر شاہد کے مخصوص رویے اور اس کی باتوں سے ہمیں ڈر لگتا تھا۔ کہ شبیر کہیں خودکشی نہ کرلے''۔۹۶

شبیر کا خودکشی پر مبنی رویہ اسوقت نہ صرف محسوس کیا جا رہا تھا۔ بلکہ اس حوالے سے ان کی شاعری میں بھی شدت آتی جا رہی تھی۔

فراق کا گیت گا رہا تھا مغنیِ شب
فلک پہ صبح سفر کا تارا نکل رہا تھا

بدن پہ طاری تھا خوف گہرے سمندروں کا
رگوں میں شوقِ شناوری بھی مچل رہا تھا

شبیر کی موت اور وہ بھی خودکشی کے امکانات کے حوالے سے۔ بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

شبیر شاہد ہم سے اورینٹل کالج میں پڑھتا تھا۔ اسے گم ہوئے بھی تقریباً ۳۵، ۴۰ سال ہو گئے ہیں۔ خودکشی کا chance اسلئے ہے۔ کہ جاتے ہوئے وہ دوستوں سے معافی مانگ کر اور تمام سامان، کتابیں ٹھکانے لگا کر گئے تھے۔ ۔۹۷

شبیر کے اندر موت کی پیاس تھی۔ اور موت شبیر کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ چنانچہ دونوں کے درمیان رفتہ رفتہ فاصلے اور راستے سمٹنے لگے۔

ہمیں پہنچنا ہے نیل کے دوسرے کنارے
اُٹھاؤ لنگر کہ پھر سمندر بُلا رہا ہے
اک دریا کا پیاسا ہوں میں
اک دریا میرا پیاسا ہے

شبیر شاہد کی خواہش مرگ میں جو شدت اور جلد بازی دکھائی دیتی ہے۔ اُس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی شارٹ کٹ کے ذریعے عدم کے بحر بیکراں میں اترنا چاہتے تھے۔ اور یہ شارٹ کٹ سوائے خودکشی کے، کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان کا کہنا ہے۔ ''شبیر اکثر دوستوں سے کہا کرتا تھا۔ کہ زندگی بے معنی شے ہے۔ میں نو دس سال کے لئے کہیں غائب ہو جاؤں گا۔ میرا قیاس ہے۔ کہ شبیر نے دریا میں چھلانگ لگائی تھی۔'' ۔۹۸ ڈاکٹر سہیل احمد نے شبیر کی جس ذہنی کیفیت کا ذکر کیا ہے۔ وہ کیفیت ظاہر کرتی ہے کہ شبیر زندگی کے اسرار کا تجربہ کرنے کیلئے، ان تک رسائی پانے کیلئے دوستوں اور اقرباء سے دور چلے جانا چاہتے تھے۔ روزمرہ زندگی کے معاملات اور جکڑ بندیوں سے نکل کے وہ ابدیت کے سمندر میں اترنے کے لئے بے قرار تھے۔ اس کے لئے اگرچہ شبیر نے بقول ڈاکٹر سہیل احمد اپنے لیے دس برس کا عرصہ موزوں سمجھا تھا۔ لیکن انہیں شاید یہ خبر نہ تھی۔ کہ وہ ازل اور ابد کے درمیان جن اسرار کی تلاش میں بھٹکنے کیلئے نکلے تھے۔ وہاں زمان و مکاں کی قید نہیں رہتی۔

ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات۔ وہاں تو صرف رمز و اسرار کے دریا بہتے ہیں۔ اور تحیر و نارسائی کا کرب انسان کے ساتھ باقی رہ جاتا ہے۔ شبیر کو بھلا کیونکر یہ تحیر عالم امکانات میں پلٹنے دیتا۔ لہذا وہ اُسی عالم بالا کی طرف دریائے حیرت میں غوطہ زن ہو گئے۔

ڈاکٹر اجمل نیازی کا کہنا ہے ''شبیر شاہد کی موت خود ایک اسرار ہے۔ سمندر شبیر کو بہت پر کشش لگتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اسی کا حصہ بن گیا ہو۔ بہر حال شبیر کیلئے اگر ہم معدوم کا لفظ استعمال کریں۔ تو مناسب ہوگا''۔۹۹ شبیر اس لحاظ سے واقعی معدوم ہو گئے کہ انہوں نے نہ کسی کے سامنے آغاز سفر کیا۔ اور نہ کسی کو انجام سفر سے آگاہی دی۔ گویا وہ اپنے ''ہونے'' سے ''نہ ہونے'' کے درمیان لاپتہ ہو گئے۔ چنانچہ ان کی گمشدگی، ان کا لاپتہ ہونا، اپنے پیچھے چہ میگوئیاں چھوڑتا چلا گیا۔ قیاس آرائیاں ہوئیں۔ گمشدگی کے لئے مقدمات درج ہوئے۔ تلاش و جستجو کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن تمام انفرادی اور اجتماعی کوششیں رائیگاں چلی گئیں۔ شبیر نے نہ واپس آنا تھا۔ اور نہ آئے۔ کیونکہ وہ تو خود ہمیشہ جانے کیلئے ہی گئے تھے۔ چنانچہ ان کی گمشدگی کے تقریباً پینتیس سال سوالات پر سوالات کو جنم دیتے گئے۔ اسرار بڑھتے گئے۔ لیکن شبیر کی برآمدگی اور ان کے واپس آنے کے تمام امکانات معدوم ہوتے چلے گئے۔

بقول ضیاء الحسن'' کافی عرصہ ان کی تلاش کی جاتی رہی۔ لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ان سے تعلق رکھنے والے آج بھی ان کو یاد کرتے ہیں۔ لیکن دیکھا جائے۔ تو شبیر شاہد زندگی کے منظر نامے سے نکل گئے ہیں۔''۔۱۰۰ ان تمام عوامل کی روشنی میں چند نکات وضاحت طلب ہیں، جن کے بارے میں ممکنہ غور و فکر سے ایک نتیجہ خیزی پر مبنی صُورت حال کی گنجائش نکلتی ہے۔ کہ شبیر کی موت کا معمہ آخر کیا ہے یا کیا ہوسکتا ہے؟

شبیر کے جہاں تک ذاتی اور گھریلو حالات کا تعلق ہے۔ وہ ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے کا چشم و چراغ تھے۔ والدین کی محبت و شفقت اور ان کی تمام جائیداد کے وارث۔ اس لحاظ سے نہ صرف شبیر کے اپنے خواب تھے۔ بلکہ والدین کی بے پناہ خواہشیں شبیر کے ساتھ وابستہ تھیں۔ جس طرح کہ ایک عام شخص اور اس کے والدین اس کے بارے میں رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے اپنے والد کے نام خط میں شبیر لکھتے ہیں۔

> مجھے معلوم ہے کہ میرے یہ مشکل پسند اور صبر آزما خواب آپکے لیے پریشانی کا باعث ہیں۔ مجھے یوں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جیسا کہ اب میں ہوں۔ لیکن یہ بات بھی کم ہے۔ کہ میں ویسا بھی ہوں۔ جیسا کہ کبھی ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں بدل رہا ہوں۔ ہر لمحہ، ہر پل، ہر گھڑی۔۔۔ میری عمر میرے ساتھ چل رہی ہے۔ پھر آپ جانتے ہیں کہ اچھی فصل اور اچھا پھل دینے والے پودے بہت دیر لگا دیتے ہیں۔ میں جب اس قابل نہیں تھا کہ ایسی باتیں سوچ سکوں۔ جیسی اب لکھ رہا ہوں۔ تو اسوقت میرے خواب بالکل مختلف طرح کے تھے۔۔۔ دولت کے خواب، افسری کے خواب لیکن وہ اب سب کچھ ایک خواب بن چکا ہے۔۔۔۔۱۰۱

اس صورتِ حال سے واضح ہوتا ہے۔ کہ شبیر مادی زندگی کے شاہانہ تقاضوں، جاہ و جلال اور شان و شوکت سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ جب وہ اپنے گھر سے حصول علم کی تلاش میں نکلے ہوں گے۔ تو یہ تمام خواہشیں اور خواب ان کے ہمراہ ہوں گے۔ جو رفتہ رفتہ بھربھری مٹی کے ذرات کی طرح ان کے وجود سے جھڑتے چلے گئے۔ شواہد بتاتے ہیں کہ شبیر علم کی پکی لگن رکھنے والے ایک پیدائشی ذہین انسان تھے۔ شعری و ادبی ذوق کے وہ نہ صرف حامل تھے۔ بلکہ اس حوالے سے ان کا مطالعہ فزوں تر ہو رہا تھا۔ دورانِ تعلیم ہی وہ بحیثیت شاعر ادبی حلقوں میں اپنی ایک منفرد پہچان بنا چکے تھے۔ اور ایک نئے صاحبِ طرز اسلوب کے حامل شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ پھر حصول تعلیم کے بعد انہیں ملازمت بھی مل گئی

تھی۔ یعنی بظاہر ایسی کوئی کمی شبیر کی زندگی میں نظر نہیں آتی۔ جو ذہنی و روحانی طور پر انہیں زندگی سے متنفر کر دیتی۔ اور وہ کسی پریشانی سے اُکتا کر خودکشی کا راستہ اختیار کرتے۔ یا ان کا کردار زندگی کی پریشانیوں کے باعث گھر سے بھاگے ہوئے شخص سے مماثل ہوتا۔

بقول پروفیسر احمد جاوید ''شبیر شاہد کی زندگی میں بظاہر کوئی ایسی بات یا محرک نظر نہیں آتا۔ جسے ہم خودکشی کے حوالے سے دیکھ سکیں۔ ماسوائے اس کے، کہ ان کا انٹیلیکٹ انہیں بے چین کیے ہوئے تھا''۔۱۰۲ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ انٹیلیکٹ کیا ہے۔ اسکا بیج یقینی طور پر شبیر کی داخلی اور روحانی دنیا سے پھوٹا تھا۔ اور جس کی عکاسی نہ صرف اُن کی شاعری میں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی۔ بلکہ اکثر ان کا اظہار انہوں نے اپنے والد کے نام خط میں بھی کیا۔ اپنے والد کے نام چند سطور میں وہ اپنی اس کیفیت کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں۔

> ایک آگ نے میرے چاروں طرف ایک لامحدود الاؤ روشن کر دیا ہے۔ جیسے میلوں تک پکی ہوئی فصل دھوپ میں چمک رہی ہو۔ یہ آگ، یہ فصل مجھے ہر لحظہ مصروف رکھتی ہے۔ اس نے میری کایا پلٹ دی ہے۔ آپ پریشان نہ ہوا کریں۔ کتابیں میرے لیے بالکل اسی طرح ہیں۔ جیسے آپکے لیے بیج اور کھاد۔۔۔۔۱۰۳

اس حوالے سے شبیر شاہد کے اندر صرف حیات وممات سے متعلق سوالات تھے۔ چونکہ فطری طور پر وہ خود ذہین تھے۔ حصول علم کے لئے اورینٹل کالج لاہور میں اعلیٰ تعلیمی و علمی درسگاہ سے فیضیاب ہوئے۔ جہاں ان کی تخلیقی اور علمی صلاحیتوں کو نکھرنے کے بے پناہ مواقع میسر آئے۔ ان کے اساتذہ کرام میں بڑے اور اہم نام شامل ہیں۔ ادب شناس دوستوں کی محفل میں شبیر کا شریک کار ہونا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس تمام حلقے میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتے تھے۔ چنانچہ ان تمام حوالوں سے شبیر کو محرومی نہیں۔ بلکہ افضل مقام ملا۔ وہ حصول علم اور جس طرح کے مطالعہ کے زیر اثر تھے۔ انہیں دراصل اس مشاہدے اور تجربے کے ساتھ ماپنے لگے۔ موت وحیات پر مبنی سوالات، تفکرِ کائنات، ''موجود'' سے ''ناموجود'' تک کا سفر اور ''ناموجود'' سے ''موجود'' تک کی گواہی کے اسرار انہیں بے چین کیے ہوئے تھے۔ ''سدھا رتھ'' کا علم خاص طور پر شبیر کی ذہانت کے ہتھے چڑھ چکا تھے۔ اور وہ اس کے عملی تجربے اور مظاہرے کی فکر میں تھے۔ ''سدھا رتھ'' پھر آگے سے پیچھے اور داخل سے خارج کی طرف پلٹا تھا۔ لیکن شبیر کے اٹھتے ہوئے قدم اور روح کی سرگوشیاں انہیں آگے ہی آگے کی طرف لے گئیں۔ اور چونکہ شبیر کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ وہ ابدی تلاش میں گمشدگی کے جس سفر پر روانہ ہونے جارہے ہیں۔ دنیا، دنیا دار اور ان کے مخلص ساتھی انہیں کہیں اس ارادے سے روک نہ لیں۔ جو باقاعدہ ایک منصوبہ بندی کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ لہذا بظاہر وہ نارمل رہے۔ اور نارمل دکھائی دیتے رہے۔ لیکن ان کے اندر کا جہاں بدل چکا تھا۔

یہ صورت حال ایسی تھی۔ کہ شبیر کی ذات، انکا مطالعہ، تجربہ مشاہدہ، حال وقال سب ایک جان ہو چکے تھے۔ اور انہوں نے اس اکائی کو ٹوٹنے سے بچانے کیلئے نہ تو کسی سے مشورہ کیا۔ اور نہ اپنا کوئی خیال یا ارادہ ظاہر کیا۔ اور اسرار کی تلاش میں خود اسرار کا عنوان بن گئے۔ یہ ایک انٹیلکچول کا ذہنی اور فکری پروسس تھا۔ جس سے وہ گزرے۔ اور گزرتے رہے۔ انہیں نہ تو کوئی مالی مشکلات درپیش تھیں اور نہ زندگی کے ایسے جنجال۔ جن سے گھبرا کر وہ زندگی سے فرار کا راستہ اختیار کرتے۔ اور اگر محبت میں ناکامی کو ہی صرف محرک سمجھیں تو پھر بات اس حوالے سے اتنی قوی محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کی شاعری زندگی، موت اور کائنات سے متعلق جن جن سوالات سے بھری ہوئی ہے۔ وہاں صرف سنجیدہ نظری اور تفکر کا

راج دکھائی دیتا ہے۔ محض جذباتی اور عشقیہ صدمات کی بات دکھائی نہیں دیتی۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے خودکشی کے حوالے سے ادیبوں کی جس مخصوص ذہنی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ خودکشی کے وقت اپنے اندر کے انتشار کو سمیٹ نہیں پاتے۔ اور اُس لمحے کی زد میں آ کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ بہت ممکن ہے۔ کہ شبیر کے اندر کی کش مکش جو ابھی ناپختگی اور نوعمری کے مرحلے پر تھی۔ اُسے کوئی روحانی راہنمائی اور پیر و مرشد مل جاتا۔ تو وہ اپنی ہی چتا میں نہ جل مرتے۔ بلکہ وہ اپنی روح کی آگ کو اپنے اندر ہی جذب کر لیتے۔ لیکن اُنہوں نے ان تمام روحانی مرحلوں سے گزرنے کی بجائے ایک ہی قدم اٹھایا۔ جو پہلا بھی تھا اور آخری بھی۔ اور اسی میں وہ اپنے وجود کے طلسم سے نکل گئے۔ شبیر کی اچانک گمشدگی اور کبھی واپس نہ آنے والی صورتِ حال میں یہ بات اس حوالے سے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ کہ شبیر داخلی طور پر جن فکری تغیرات کی طوفانی یلغار کی زد میں تھے۔ اُس ضمن میں پروفیسر ضیاالحسن کا کہنا ہے۔ کہ

> شبیر نے اپنے والد کو ایک خط میں لکھا تھا۔ کہ اب میں باقر صاحب سے آگے نکل گیا ہوں۔ اب میں ایسے آدمی کے پاس جاتا ہوں۔ جو مجھے سائنس کی باتیں بتاتا ہے۔ میری سوچ کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ باقر صاحب بتاتے تھے۔ کہ شبیر شاہد کو سائنس کی باتیں بتانے والے صاحب صلاح الدین محمود تھے۔ صلاح الدین محمود ایک اچھے شاعر اور نستعلیق انسان تھے۔ وہ جو ہر شناس بھی تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک اچھے سکھانے والے نہیں تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے۔ کہ کس آدمی کو کس وقت کیا بات بتانا چاہیے۔ اور کیا پڑھوانا چاہیے۔ اُن کا خلوص اور محبت بجا۔ لیکن جذبات سے معمور شبیر شاہد کے لئے کئی باتیں قبل از وقت ثابت ہوئیں۔ ۱۰۴

گویا شبیر شاہد اپنے اندر کے روحانی معاملات و مراحل کی ابتدائی منزل پر ہی جان سے گزر گئے۔

سارا شگفتہ (۱۹۵۴ء۔۱۹۸۴ء):

شاعرہ سارا شگفتہ کا تعلق کراچی سے تھا۔ ان کا خاندانی پس منظر واضح اور مربوط انداز میں پردہ اخفا میں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کے خاندان کا کوئی علمی اور ادبی حوالہ نہیں ملتا۔ اور نہ ہی سارا کے علاوہ اس خاندان کی کوئی سماجی اہمیت یا کسی اور حوالے سے اس کی کوئی وجہ شہرت ہے۔ اس ضمن میں کچھ معلومات تو سارا کی تحریروں اور خصوصاً ان کے خطوط سے حاصل ہوتی ہیں لیکن ان معلومات کی صداقت بھی مشکوک ہے۔ اور کچھ معلومات جو سارا کے دوستوں اور احباب وغیرہ سے حاصل ہوئیں۔ اور جو خود سارا کے حالات اور معمولات زندگی سے مماثل بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ان تمام ملی جلی معلومات سے سارا کے ابتدائی حالات زندگی اور ان کا خاندانی پس منظر کچھ اس طرح سے ہے۔

سارا ایک نچلے درجے کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ چھ بہنیں اور چار بھائی تھے۔ معاشی تنگدستی اور غربت کے باعث حصول تعلیم کے امکانات معدوم رہے۔ اور اس پر اس خاندان کا المیہ یہ کہ سارا کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ جبکہ ان کی والدہ کے ساتھ ان کے والد نے پسند کی شادی کی تھی۔ اسکی وضاحت سارا کے خطوط سے بھی ہوتی ہے۔ جو انہوں نے امریتا پریتم کو لکھے کہ خاندان والے مجھ پر اعتراض کرتے ہیں کہ:

> تم نے امی کے عشق کا واقعہ کیوں لکھا کہ وہ تمہارے والد سے پنگھٹ پر ملا کرتی تھیں۔۔۔
> میں سوچنے لگی کہ میری ماں تو ایک عظیم عورت تھی کہ اس نے اپنے خاندان کو خیر باد کہا۔ اور میرے والد سے چھپ کر شادی کر لی۔۔۱۰۵

ان حالات میں سارا اور انکے بہن بھائی نہ صرف سمیت اپنی والدہ کے دو وقت کی روٹی کے محتاج ہو گئے۔ بلکہ باپ کی عدم سرپرستی کے باعث ان تمام بہن بھائیوں کو وہ فضا فراہم ہوئی جس نے گھر کی ایک مجموعی فضابندی کو منتشر کر کے رکھ دیا۔ باپ کی بے اعتنائی کا احساس تحفظ کی کمی اور پیٹ کی بھوک کا خیال۔ یہ تینوں دھارے تین مختلف سمتوں میں ان کی زندگی کے بہاؤ میں شامل ہو گئے۔ سارا چونکہ حساس تھیں۔ انہوں نے اس صورت حال کا شدید اثر لیا۔ ان کی شاعری اور ان کے خطوط میں اس حوالے سے بکھرے ہوئے لیکن بہت حد تک واضح اشارے ملتے ہیں۔

> باپ کی ترنگ ایک دوسری عورت نکلی باپ کی تو بارات نکل گئی۔۔۔ ماں اکثر پریشان رہنے لگی۔۔۔ اکثر چولہے میں آگ چاٹنے کے لئے کچھ نہ ملتا۔۔۔ ایک دن ماں دوہرے نقاب میں چھپی گھر سے نکلی۔ اور پھول پرونے والوں کا دکھ لے کر آ گئی۔ ہم

سب بہن بھائی پھول پرویا کرتے۔۔۔ پھول پرونے سے پیٹ کی آگ ٹھنڈی نہ ہوتی۔ایک روز پڑوسن نے ماں سے کہا کہ کب تک چولہا نہیں دہکے گا میں زکوٰۃ کے پیسے سارے محلے سے اکٹھے کر کے لائی ہوں ۔۔۔ اور پھر سارے بچوں کی فرمائشیں۔۔۱۰۶

ابتدائی زندگی کے ان تلخ حالات میں شخصیت کے اندر جو ٹوٹ پھوٹ ممکن ہو سکتی ہے سارا کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں اس ٹوٹ پھوٹ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ایک طرف وہ سماج کے جس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں وہ طبقہ نہ صرف گمنامی میں رہتا اور گمنامی کی موت مرتا ہے بلکہ نامساعد حالات کی چکی کا پہیہ یہاں ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔سارا کے اندر جوان کی حساس فطرت تھی اس نے اس طرح سے بغاوت کی۔کہ نہ تو گمنامی کی زندگی جیا جائے اور نہ گمنامی کی موت مرا جائے یہاں سے ان کی زندگی کا جو سفر شروع ہوا۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ آغاز سفر سے ہی ان کی خودکشی کے محرکات اپنی جگہ پکڑنے لگتے ہیں۔

سارا کی خودکشی کے محرکات میں بنیادی محرک خود ان کی اپنی شخصیت اور مخصوص فطرت ہے جس میں یقین اور مستقل مزاجی کا شدید فقدان نظر آتا ہے۔نہ تو اس کے پس پردہ کوئی نمایاں سماجی، تعلیمی اور تہذیبی حوالہ موجود تھا جو ایک خاندانی وراثت کے طور پر انہیں منتقل ہوتا اور نہ خود سارا کے پاس کوئی خاص تعلیم تھی جو ان کی شخصیت کی تعمیر ٹھوس بنیادوں پر سرانجام دیتی۔چنانچہ ان کی شخصیت کی داخلی سطح تربیت سے بے بہرہ رہی۔جس سے سماج میں انسان بہتر اور مہذب انداز میں جینے کا سلیقہ سیکھتا ہے۔ابتدائی زندگی کی محرومیاں، باپ کے ہاتھوں آنگن کا بٹوارہ ہونا اور تنگدستی کے عذاب نے سارا کی شخصیت میں دراڑیں ڈالدیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نمایاں شگافوں میں بدلتی چلی گئیں۔ابتدائی زندگی کا یہ خاموش احتجاج رفتہ رفتہ ان کے اندر جڑ پکڑنے لگا۔وہ اعتماد اور بداعتمادی دونوں رویوں کے سنگم پر چلتی دکھائی دیتی ہیں۔وہ جن خاندانی حالات سے نکلیں اور پے درپے زندگی کے جن تلخ ترین حالات سے دوچار ہوتی رہیں۔ان مسائل سے نبٹنے، حالات کو سلیقے سے برتنے اور مشکلات کی گتھیاں سلجھانے میں جس ذہنی شعور، فہم وادراک، تحمل اور مستقل مزاجی کی ضرورت تھی۔وہ ان میں ناپید رہا۔

تعلیم کی کمی، تربیت کا فقدان، بردباری، مستقل مزاجی اور سنجیدہ نظری جیسے خصائص جو کسی شخصیت کو ٹھوس بنیادوں پر تشکیل دیتے اور متوازن بناتے ہیں۔وہ ان سے بے بہرہ رہیں لیکن ان کے اندر ایک دوسری شخصیت بھی رفتہ رفتہ پروان چڑھنے لگی۔یہ وہ شخصیت ہے جو اُنہیں ناموری کی خواہش عطا کرتی ہے۔اُنہیں پڑھے لکھے طبقے میں پہچانے جانے کا احساس بھی عطا کرتی ہے۔لیکن عملی سطح پر یہ سب کچھ حاصل کرنے کے راستے ان کے سامنے مسدود تھے۔صرف ان کی حساس فطرت تھی جو انہیں ہر لمحہ بے چین کیے رہتی تھی۔منزل کا تعین تو دور کی بات ان کے پاس تو راستوں کی پہچان کا ہنر بھی نہیں تھا۔اسی کے باعث وہ زندگی کو محض خارجی سطح پر تجربوں کی نذر کرنے لگیں۔ان کی پے درپے شادیاں بھی انہی تجربوں ہی کی ایک سند بنتی ہیں۔اگر ان کی شخصیت میں توازن ہوتا۔تو وہ زندگی کے نشیب وفراز جنم وادراک کی پگڈنڈی پر گامزن رہتے ہوئے اپنی مشکلات کا حل تلاش کر سکتی تھیں۔کیونکہ کسی انسان کی زندگی مشکلات سے خالی نہیں ہوتی۔لیکن مشکلات سے گھبرا کر خودکشی کا راستہ اختیار کرنے میں بھی شخصیت کا عدم توازن بنیادی محرک ثابت ہو سکتا ہے۔جس کے باعث انہوں نے تمام زندگی بے سمت گزار دی۔

سارا کی خودکشی کے ضمن میں ان کی ناکام شادیوں نے اہم کردار ادا کیا۔لیکن اس ناکامی کو نقطہ انتہا تک پہنچانے میں ان کی اپنی مخصوص اور غیر متوازن شخصیت کا ہی بڑا ہاتھ ہے۔سارا نے جہاں بھی ان شادیوں اور شوہروں کا ذکر کیا تفصیل نہیں بتائی۔کہ ان شوہروں کے نام کیا تھے۔ان کا تعلق کس علاقے سے تھا۔صرف پہلے شوہر دوسرے شوہر اور اسی طرح بعد کے تمام شوہروں کی درجہ بندی کرتے ہوئے انہوں نے ان شادیوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن ایک بات واضح ہے کہ یہ شادیاں زیادہ تر سارا کی اپنی مرضی اور پسند سے ہوئیں۔جس میں اکثر ان کے اہل خانہ شریک نہیں ہوئے۔اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے معاملات میں بہت حد تک اپنی مرضی اور فیصلوں کو اہمیت دیتی رہیں۔اور ایک ناکامی کے بعد بغیر سوچے سمجھے زندگی کے مزید پر خطر راستوں کا انتخاب کرتی رہیں۔پہلے شوہر کے ساتھ ناکام ازدواجی زندگی کے تجربے کے متعلق سارا اپنے خطوط میں لکھتی ہیں ”اس گھر میں تین برس رہی۔ساس بوٹیاں گن کر رکھا کرتی تھی۔مگر میں گھر سے باہر قدم نکالنا نہیں جانتی تھی۔اول تو برقعہ پہنا کرتی۔“ ۔۱۰۷

اسی گھر کی سختیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ یہ بتاتی ہیں کہ شوہر نے مجھے باپ کے جنازے میں بھی جانے سے روکا سارا کے خطوط سے علم ہوتا ہے کہ ان کی یہ شادی نو سے دس برس تک چلی۔اور اس پہلی شادی کے خاتمے کا سبب وہ بیان کرتی ہیں کہ

> ایک روز میری بھانجی میرے گھر پر آ کر رہی اسوقت میرا چھوٹا بیٹا سات سال کا تھا۔۔آدھی رات کو دوسرے کمرے سے آواز آئی۔آنٹی آنٹی۔۔۔میں نے دیکھا کہ میرا شوہر زبردستی میری بھانجی کے ساتھ ہم بستر ہونا چاہتا ہے۔۔۔میں اپنی ایک سالہ بیٹی کو اٹھا لائی۔اور کہا کہ اگر سونا ہے تو اپنی بیٹی کے ساتھ سو۔۔۔اسی رات مجھے طلاق ہو گئی۔۔۱۰۸

اسوقت تک سارا تین بچوں کی ماں بن چکی تھیں یہ درست ہے کہ حالات ان کے لئے تلخ ترین ہوتے جارہے تھے۔شوہر کا ان سے بچے چھین لینا سارا کا ان کے تعاقب میں میانوالی، جہاں ان کے شوہر کا گھر تھا۔وہاں پہنچنا بچوں کا سارا کو عدالت سے ملنا۔دوبارہ شوہر کا دھوکہ دہی سے بچے لے جانا۔ان تمام معاملات و مراحل میں وہ یقیناً شدید ذہنی کرب اور اذیت سے دوچار ہوئیں۔اور پھر بچوں سے جدائی کا کرب جو انہوں نے زندگی کے آخری لمحوں تک جھیلا۔ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔اس کا تذکرہ انہوں نے خود بھی کئی خطوط میں کیا ہے۔

> میرے سامنے۔۔۔میرے بچے اپنی سوتیلی ماں سے بہت پیار کرتے۔ایک بچے کو میں بہلا پھسلا کر الگ کمرے میں لے گئی اور کہا بیٹا مجھے ایک بار ماں کہہ دے اس نے ماں نہیں کہا میری ہچکیاں بندھ گئیں وہ ڈر کے مارے کمرے سے بھاگ گیا۔۔۔میں بچوں سے بے انتہا محبت کرتی ہوں جب ان کا نام لیتی ہوں تو میری کوکھ میں درد ہونے لگتا ہے۔۔۱۰۹

لیکن شاعرہ عذرا عباس کی یہ رائے اپنی جگہ بہت اہمیت کی حامل ہے۔”سارہ کو بچے کیسے پیار کرتے جب بچے اس کے پاس تھے تو سارا سوشل بننے کے شوق میں صبح سے شام تک گھر سے غائب رہتی۔نہ بچوں کی بھوک پیاس کا ہوش۔نہ ان کی خبر گیری کا خیال۔“ ۔۱۱۰ اس ضمن میں سارا کے تیسرے شوہر افضال احمد سید کا بیان ہے کہ ”ایک مرتبہ مجھے ان

کے بچے دیکھنے کا اتفاق ہوا لگتا تھا کہ ان کا باپ انہیں بہتر تربیت کر رہا ہے۔'' ۔۱۱۱

بہر حال اس ضمن میں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ بحیثیت ماں سارا نے بچوں کی جدائی کا کرب ضرور جھیلا اب یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہی اس بات کی کہیں سے وضاحت ہوسکی۔ کہ یہ بچے سارا کے پہلے شوہر سے تھے یا دوسرے شوہر سے کیونکہ احمد جاوید جو سارا کے دوسرے شوہر ہیں بقول عذرا عباس '' جاوید احمد سارا کے تیسرے شوہر ہیں ''۔۱۱۲

جبکہ افضال احمد سید کے مطابق '' سارہ نے مجھ سے تیسری شادی کی تھی۔'' ۔۱۱۳

اور شادی کے انہی ابتدائی تجربوں کا ذکر کرتے ہوئے سارا نے لکھا کہ گھر کی سبزی دال سے چونی چونی بچا کر انہوں نے نویں جماعت پاس کی اور معلوم یہی ہوتا ہے کہ سارا کی تعلیم نویں جماعت تک ہی رہی۔ کیونکہ بقول ان کے تیسرے شوہر افضال احمد سید '' سارہ کے پاس میٹرک کی سند نہیں تھی۔'' ۔۱۱۴ اس میں حقیقت کچھ بھی ہو۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ سارا نے پہلی شادی، جو بقول سارا کے چودہ برس میں ہوئی تھی۔ نو دس برس ازدواجی زندگی کی انتہائی تلخیاں برداشت کیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ ان تجربوں سے سبق سیکھتیں۔ اپنے اہل خانہ کی معاونت سے حالات کی درستی کی طرف مائل ہوتیں اس کے برعکس سارا نے اپنے گھر جانے کی بجائے ایک بیوہ کے گھر رہنے کو ترجیح دی۔ یہ بھی ان کی فطرت کا ایک غیر متوازن پہلو سامنے لاتا ہے۔ اسی دوران سارا نے ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان کھولی۔ اپنی ملازمتوں کا جب سارا ذکر کرتی ہیں تو ان کی متلون مزاجی پھر ایک نئے تجربے سے گزرتی ہے۔

> آج سے پانچ برس پہلے کہنے کو ایک شاعر میرے ساتھ فیملی پلاننگ میں سروس کرتا تھا۔ میں بہت بانماز ہوتی تھی۔۔۔ پڑھنے لکھنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ اتنا ضرور تھا۔ کہ شاعر لوگ بڑے پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔۔۔ ایک شام شاعر صاحب کہنے لگے مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے پھر ایک ریستوران میں ملاقات ہوئی اس نے کہا شادی کروگی؟ دوسری ملاقات میں شادی طے ہوگئی۔ ۔۱۱۵

سارا نے خود اعتراف کیا ہے کہ اس شادی میں ان کے اہل خانہ شامل نہ ہوئے۔ حالات کی تنگدستی تھی نکاح کی رسم انتہائی سادگی سے انجام پائی۔ سارا کے نزدیک اس نئی شادی کے حوالے سے احساس تحفظ ضرور پیش نظر ہوا ہوگا۔ لیکن جتنی عجلت میں انہوں نے اس شادی کا فیصلہ کیا۔ وہ قابل توجہ ہے۔ نت نئے تجربوں سے نبرد آزما ہوتی ہوئی ان کی مخصوص فطرت ہی کا شاخسانہ ہے کہ وہ بالآخر خودکشی پر بھی آمادہ ہوئیں۔ وہ ایک تجربے کی ناکامی کے بعد بے دھڑک اگلے تجربے کی بھٹی میں کود جاتی تھیں۔ یہاں سارا کی فطرت کے کئی اور رخ بھی اس حوالے سے سامنے آتے ہیں۔ وہ پڑھے لکھے طبقے کے درمیان اپنی پہچان بنانا چاہتی تھیں۔ یہاں انہوں نے خود لکھا ہے کہ وہ اسوقت تک پڑھنے لکھنے کے حوالے سے شعروشاعری کا شغف نہ رکھتی تھیں اور شاعر ہی ان کے نزدیک پڑھا لکھا طبقہ تھا۔ اس شادی کے حوالے سے شوکت عابد کا کہنا ہے '' سارا نے شاعری تقریباً چوبیس پچیس سال کی عمر میں شروع کی تھی۔ ایک دن احمد جاوید نے مجھے بتایا۔ کہ اب ہماری بیگم بھی شاعری کرنے لگی ہیں۔'' ۔۱۱۶

سارا کو قدرت نے ایک ایسا موقع فراہم کیا تھا کہ اگر وہ چاہتیں تو بہتر اور مثبت انداز میں سنجیدہ نظری کے ساتھ وہ اپنے اندر کے تخلیقی جوہر کو تربیت کر سکتی تھیں۔ بقول عذرا عباس

احمد جاوید سے شادی کے وقت سارا کی عمر چوبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جبکہ احمد
جاوید انیس برس کے تھے۔ احمد جاوید بہت نیک، شریف اور پڑھے لکھے انسان تھے۔
سارا خوش نصیب تھی۔ کہ ایک پڑھے لکھے ماحول میں آئی۔ ۔۱۱۷

لیکن ان کی مخصوص فطرت اس پڑھے لکھے ماحول کو بھی شاید اس طرح اپنے اندر جذب نہ کر سکی۔ جس طرح اس انداز میں ممکن ہو سکتا تھا۔ ان کا ایک غیر ذمہ دارانہ رویہ مسلسل بلکہ قدم بہ قدم زندگی میں ان کے ہمراہ رہا۔ جس نے سارا کو کہیں پر بھی زندگی کو قرینے اور شعور کے ساتھ برتنے کا موقع نہ دیا۔ یہ ضرور کہ احمد جاوید کے ساتھ ان کی شادی کا جو عرصہ گزرا۔ اس میں مالی مشکلات بھی تھیں۔ جنکا اکثر ذکر انہوں نے اپنے خطوط میں بھی کیا ہے۔ شوکت عابد بھی اس ضمن میں کہتے ہیں "یہ درست ہے کہ احمد جاوید کے ساتھ جب سارا کی شادی ہوئی تو ابتداء میں مالی مشکلات رہیں۔ لیکن بحیثیت شوہر احمد جاوید سارا کے اچھے شوہر ثابت ہوئے۔" ۔۱۱۸

سارا نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اور یہ بات بھی درست ہے کہ سارا احمد جاوید سے علیحدگی کے بعد انہیں کبھی کبھار خط لکھا کرتی تھیں۔ جس میں سارا ان کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کو یاد کرتی ہیں۔ لیکن احمد جاوید کے ساتھ سارا کی علیحدگی جن حالات میں ہوئی سارا خود اس ضمن میں لکھتی ہیں۔

گھر میں روز تعلیم یافتہ شاعر اور نقاد آتے ۔۔۔ ایک شام دوست شاعر صاحب
تشریف لائے۔ اور بولے مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ لیکن پہلے آپ قسم
کھائیں کہ برا نہیں مانیں گی۔ بہت ضد کے بعد میں نے قسم اٹھالی اس نے کہا کہ میں
آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں میں نے کہا میں شادی شدہ ہوں۔ میری اور تمہاری
شادی کیسے ہو سکتی ہے۔؟ ۔۱۱۹

اس گفتگو سے سارا کی فطرت اور خصوصاً مرد حضرات کے ساتھ ان کے رویوں کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ ایسے رویے، ایسی گفتگو اور ایسا تاثر دینا۔ جس میں دور دور تک سوسائٹی کی شادی شدہ عورت، جو بچوں کی ماں بھی ہے غیر محتاط دکھائی دیتی ہے یہاں بہت سے سوالات کا جواب اور بعد میں سارا کی خودکشی کے محرکات میں خود سارا کی شخصیت کے اہم پہلو کا حوالہ بھی موجود ہے کہ سارا کی شخصیت میں آخر کیا بات تھی کہ ان کے شادی شدہ ہونے کے باوجود ان کے گھر میں ان کے شوہر کا ایک دوست انہیں شادی کی پیش کش کرتا ہے یہ بات اسی پر بس نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک روز اپنی سہیلی کے استفسار پر سارا اس شاعر کا ذکر اور اس کیلئے اپنی پسندیدگی کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں۔ "میں موڈ میں تھی ہنس کر کہا اچھا ہے خوبصورت ہے سمارٹ ہے۔۔۔" ۔۱۲۰

چنانچہ سارا کی ایسی غیر ذمہ دارانہ شخصیت اور غیر متوازن رویے نے احمد جاوید کے ساتھ ان کے ازدواجی تعلق کو ختم کر دیا احمد جاوید کے ساتھ سارا کی شادی ختم ہونے کے بارے میں عذرا عباس کا کہنا ہے:

سارا کی احمد جاوید کے ساتھ شادی کے ختم ہونے کی ایک اور اہم وجہ سارا کی انتہائی غیر
ذمہ دارانہ روش ہے۔ سارا نے شادی کے وقت احمد جاوید سے یہ بات پوشیدہ رکھی کہ
وہ اس سے پہلے شادی شدہ تھی بلکہ وہ بچوں کی ماں بھی تھی۔ ۔۱۲۱

اور سارا نے پھر ایک نیا ازدواجی تجربہ کیا اس شاعر دوست کیلئے لکھتی ہیں۔ "میں نے اس سے پوچھا کیا نام

صرف شادی کرنا چاہتے ہو اس نے کہا ہاں تو میں نے کہا جاؤ سارے شہر میں کارڈ چھپوا دو اور پرسوں بارات لیکر آجانا۔''۔۱۲۲

سارا اپنی مخصوص فطرت کے ہاتھوں پے در پے جن لغزشوں کی دلدل میں دھنستی جا رہی تھیں انہیں شاید علم نہ تھا کہ اس طرح وہ نہ صرف بحیثیت عورت اور ایک ماں۔ اپنا مقام، اپنا وقار کھو رہی تھیں۔ بلکہ اس کی انتہا پر پہنچ کر اُنہیں بالآخر زندگی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ انہوں نے زندگی کو صرف عجلت میں کیئے گئے فیصلوں کی آماجگاہ سمجھا۔ ان تجربوں سے سبق نہ سیکھا۔ شادی کا جو نیا بندھن انہوں نے باندھا چند روز بعد ہی اسکا احوال سارا ان الفاظ میں لکھتی ہیں۔

> شادی کے ایک ہفتہ بعد ساس، نندوں کی نفرتوں کی وجہ سے شاعر صاحب نے مجھے اتنا مارا۔ کہ مجھے زمین پر لٹا کر میرے سینے پر کودنے لگا۔ مجھے کسی سے ملنے جلنے کی اجازت نہ تھی۔ میرے ہر آنے والے کی شک کو نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔۔۱۲۳

سارا کی یہ شادی بھی ناکام ہوئی جو بقول افضال احمد سیّد'' یہ شادی تقریباً نو ماہ تک رہی''۔۱۲۴ ان ناکام شادیوں کی داستان مسلسل چلتی رہتی ہے۔ اور اس ضمن میں سارا طلاق کے وجود کو دین و مذہب کی رو سے اس طرح واضح کرتی ہیں۔''اگر عورت کو یہ لوگ ایک ہی جگہ مرکھپ جانے کو کہتے ہیں تو اسلام میں طلاق کیوں رکھی گئی تھی۔''۔۱۲۵ گویا وہ مذہبی اور سماجی قوانین اور ضابطوں کو اپنی منشاء کے مطابق سمجھتی اور بسر کرنا چاہتی تھیں۔ اس طرح سارا کے اپنے کہنے کے مطابق ان کی جو آخری شادی تھی۔ اس کا احوال بھی انہوں نے ہر جگہ نہایت ناگواری کے ساتھ کیا ہے سارا اپنے آخری شوہر کے لئے لکھتی ہیں؛

> ۔۔۔ہمارے ہاں عورت سگریٹ پیئے تو اسے گولی ماردی جاتی ہے۔۔۔ادھر آؤ میرے پیر دباؤ۔۔۔ پڑھنے لکھنے پر پابندی۔۔۔ آخری خصم جاگیردار تھا۔ شادی کے چند روز بعد اس کی ذلتوں سے تنگ آ کر میں نے بڑی مشکل سے طلاق لے لی تھی۔
> ۱۲۶۔

سارا کے یہ تمام حالات ظاہر کرتے ہیں کہ انہوں نے زندگی کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیا۔ سماج اپنی روایات اور مزاج میں جن تمدنی، تہذیبی، مذہبی اور اخلاقی ضابطوں کا پابند ہوتا ہے۔ اس کی پابندی سے تھوڑا بہت انحراف تو ممکن ہے انسان کی فروگذاشت بن جائے۔ لیکن ان ضابطوں کو توڑنا ایک طرف، اگر انہیں پاؤں تلے روندا جائے۔ تو فرد واحد اپنے خودساختہ، بے بنیاد اور منفی رویوں کی زد میں خود ہی کچلا جاتا ہے۔ یہی سارا کے ساتھ ہوا۔ جوان کی خودکشی کا بہت بڑا محرک ثابت ہوا۔ کیونکہ پھر سماج کے اندر ایک باعزت زندگی بسر کرنے اور مثبت انسانی اقدار کے ساتھ جینے کے تمام دروازے ان پر بند ہوتے چلے گئے۔ ایسے ہی مایوس کن حالات نے اُنہیں بقول سارا''میں نے زندگی میں چار خودکشیاں کی ہیں''۔۱۲۷

یہ چار خودکشیاں دراصل خودکشی کرنے کی کی چار مختلف کوششیں تھیں اور یہ کوشش اسی وجہ سے ہوتی رہی کہ وہ زندگی کو مخصوص اخلاقی ضابطے اور توازن کے ساتھ بسر کرنے سے گریزاں رہیں۔ اگر سارا کے رویے میں یہ جلد بازی اور لاابالی پن نہ ہوتا۔ تو بہت ممکن ہے کہ وہ خودکشی کے عمل سے نہ گزرتیں۔ ان کی حد درجہ جذباتی طبیعت میں عملی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے کا شعور نہ تھا۔ وہ اس ضمن میں کتنی غیر محتاط اور غیر سنجیدہ رہیں۔ اسکا ثبوت خود ان کی تحریروں میں کئی جگہ ملتا

ہے۔ جس سے اس بات کا بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ وہ بہت حد تک خود بھی جانتی تھیں کہ ان کے بعض خیالات اور عمل سوسائٹی کے حوالے سے کتنے نامناسب اور ناگوار تصور کیے جاتے ہیں۔

> کالی کتوں کی آوازیں آتی ہیں۔ سارا سارا۔ کون ہے۔ جانتی ہوں۔ کتا گوشت کی دکان پر بھونک رہا ہے۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے۔ چلو، یہ بیوقوفیاں کروں۔۔۔ بیگرنوں دوسرے مردوں سے مکالمہ کرنے کی وجہ سے گھر والے بھی نفرت کرنے لگے ہیں۔۔ ۱۲۸

اس حوالے سے سارا ایک اور جگہ لکھتی ہیں ''گھر والوں اور اس نام نہاد سوسائٹی کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں پاگل نہیں رہتی۔۔۔ خاندان کی لڑکیوں تک کو مجھ سے دور رکھنے کی تاکید کی جاتی ہے۔'' ۔۱۲۹

اپنی انہی عادتوں کو وہ ایک اور خط میں جو امرتا پریتم کے نام ہے، تاریخ ۲۳ اپریل ۱۹۸۳ء میں قدرے وضاحت سے ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں

> یہ لگ رہی ہے کہ میری بیوقوفیوں کی وجہ سے بھائی، [illegible] شوہر اور سب عزت دار سوسائٹی مجھے بڑی نفرت سے دیکھتی ہے۔۔۔ [illegible] تو نہیں بول رہے۔ اور میں اپنی چھوٹی چھوٹی چوریوں کی [illegible] میں مصروف ہوں۔ چند روز پہلے اچھے لوگوں نے مجھ سے کہا [illegible] صاحب آپ ہمارے گھر مت آیا کریں۔ اپنی دشمنوں میں [illegible] رات گئے [illegible] آ رہی ہوں تو بھائی کی آنکھیں لال کیوں ہو جاتی ہیں۔۔ ۱۳۰

یہاں سارا نے درحقیقت دوسرے لفظوں میں خود اپنی اخلاقی بے راہ روی کا اعتراف کیا ہے۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ وہ کیسے اور کیونکر سماجی اور اخلاقی ضابطوں کو پامال کر رہی ہیں۔ ایک جگہ سارا لکھتی ہیں ''میری زندگی میں کئی مرد آئے۔'' ۔۱۳۱ اس حوالے سے عذرا عباس کا کہنا ہے ''سارا کی شادیوں کی تعداد تو ایک طرف ہے۔ اس کے جذباتی تعلقات ان گنت رہے۔'' ۔۱۳۲

کشور ناہید نے اس ضمن میں واضح طور پر کہا: ''سارا Sex Maniac تھی۔ نشہ کرتی تھی منہ میں کچھ نہ کچھ ہوتا تھا''۔۱۳۳ اس حوالے سے جب عذرا عباس سے بات ہوئی۔ تو انہوں نے وثوق کے ساتھ کہا:

> سارا کم مائیگی کا شکار تھی۔ اور اسی کم مائیگی کے حوالے سے میں کہوں گی۔ کہ ایسا شخص یا تو کھانا زیادہ کھاتا ہے یا سیکس کی طرف چلا جاتا ہے۔ سارا سیکس کی طرف مائل تھی۔ اچھے برے کی تمیز نہ تھی۔ خود کو مظلوم ظاہر کرتی تھی۔۔ ۱۳۴

یہ سارا کی اخلاقی بے راہ روی کا سبب ہی تھا۔ کہ وہ بے مقصد وقت بے وقت بے خوفی کے ساتھ گھومتی پھرتی تھیں۔ عذرا عباس نے اس بارے میں ایک واقعہ بیان کیا۔ ''ایک رات بغیر وجہ وہ تین بجے میرے گھر آئی۔ میری سرزنش پر ناراض ہو کر تھوڑی دیر بعد پھر باہر ٹیکسی پکڑتی ہے۔ اور چلی جاتی ہے۔'' ۔۱۳۵ سارا کی اخلاقی اور جنسی بے راہ روی کے بارے میں جو شواہد ملتے ہیں ان سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان تمام حالات و واقعات نے سارا کے ہاتھوں اپنا ایک خود ساختہ ضابطۂ اخلاق اور طرزِ حیات تخلیق کر دیا تھا۔ جس نے سارا کو مکمل طور پر زندگی کے ہر موڑ پر شکست دینی شروع کر دی۔ ایک ایسی شکست، جو انہیں رفتہ رفتہ زندگی کی ہر سانس سے کاٹنے لگی۔ وہ ہر جگہ مظلومیت کی داستان بنتی چلی گئیں۔ اب وہ

سوسائٹی کے ہاتھوں مضحکہ خیزی پر مبنی ایک عنوان تھیں۔ یہ راستے، یہ رویے اُنہیں تیزی کے ساتھ موت کی طرف فرار کا راستہ دکھا رہے تھے۔ وہ ہر جگہ بے ٹھکانہ تھیں۔ اور بخوبی جانتی تھیں کہ زندگی کے کس موڑ پر کہاں کیا ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ لیکن قدم پھر بے سمت تھے ایسے حالات میں سوسائٹی کا ردعمل ناگزیر تھا۔ جس کا حوالہ اکثر و پیشتر سارا کے خطوط سے ملتا ہے۔ اب سماج میں سارا کے تمام رشتے، رابطے ردعمل کی صورت انکا گھیراؤ کر رہے تھے۔ اسی دوران ان کے اندر ایک ایسے سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔ جہاں اُنہیں گھوم پھر کر اپنی ہی ذات کی طرف لوٹنا تھا۔ لیکن اس لوٹنے کے عمل میں خوفزدگی، تنہائی، مایوسی اور مظلومیت کے کئی حوالے بھی سارا کے ساتھ وابستہ ہو چکے تھے۔ اپنے خطوط میں کہتی ہیں: ''ایک لفظ فروش کے ہاں گئی۔ کہنے لگا۔ فلاں کی بیوی کہہ رہی تھی کہ شاعرہ تو اچھی ہے۔ پر دو پٹہ کی سوجھ بوجھ نہیں ہے۔'' ۔۱۳۶ اس ضمن میں اپنی والدہ کے رویے کے حوالے سے سارا لکھتی ہیں: ''تجھے ذرا سی غیرت نہیں۔ کیا کیا باتیں لکھتی رہتی ہو۔ اور اس پر خودکشی کر کے بوڑھی ماں کو سلاخوں کے پیچھے رکھنا چاہتی ہو۔'' ۔۱۳۷

اور جب چوتھے شوہر سے طلاق ہوئی تو: ''میرا بہنوئی آیا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ اس نے اخبار مجھے دیا اور کہا پڑھو میں نے اخبار لیا اور پڑھنے لگی سارا شگفتہ نے اپنے چوتھے شوہر سے بھی طلاق لے لی''۔۱۳۸ اور جب والدہ کی وفات ہوگئی۔ تو چھوٹے بھائی نے کہا: ''ماں تھی تو اور بات تھی۔ تمہاری آزادیاں، سگریٹ پینا ہم برداشت کیے ہوئے تھے۔'' ۔۱۳۹

اپنے دوسرے بھائی کے رویے کا ذکر کرتے ہوئے سارا لکھتی ہیں:

> تم رات گئے واپس کیوں آتی ہو۔۔۔ تم اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔ میں نے اسی وقت اپنی کتابیں اٹھائیں اور سڑک پر چلنے لگی۔ آوازوں کا ایک قافلہ میرے ساتھ چل رہا تھا۔ اسکا کیا ہے یہ تو کہیں بھی سوسکتی ہے۔ ۔۱۴۰

کشور ناہید اس ضمن میں لکھتی ہیں کہ: ''میں ہندوستان گئی اس حوالے سے میں نے سارا کے کئی قصے سنے۔ سخت شرمندگی ہوئی۔'' ۔۱۴۱ یہ سب کچھ اب سارا کو اسی لئے درپیش تھا کہ انہوں نے سماج کی ان اخلاقی اور تہذیبی حد بندیوں کو توڑ دیا تھا۔ جن کے اندر رہتے ہوئے انسان کو زندگی میں محتاط رہنے کا سلیقہ ہاتھ آتا ہے۔

اس ضمن میں شوکت عابد نے دوران گفتگو کہا: ''سارا نے شاید اسکا لحاظ نہیں رکھا کہ جن راستوں کی نزاکت کے باعث سماج میں انسان محتاط ہو کر چلتا ہے۔ فردِ واحد اس سے انحراف کی صورت میں خود بخود کچلا جاتا ہے۔'' ۔۱۴۲ بقول گوہر سلطانہ عظمی: ''کسی نے بتایا کہ سارا شگفتہ تو تمام دن آرٹس کونسل میں بیٹھی سگریٹ پیتی رہتی تھی۔ اور اکثر نشہ میں نظر آتی تھی۔ شراب، سگریٹ اور دوسرے نشے اُنہیں گھیرے ہوتے تھے۔'' ۔۱۴۳

افتخار عارف اس سلسلہ میں کہتے ہیں۔۱۴۴ "She was a free bird" سارا کے کردار میں اخلاقی حدود کی جو شدید ٹوٹ پھوٹ تھی۔ اور اس کے سارا کی شخصیت پر جو شدید اور منفی اثرات مرتسم ہو رہے تھے ان کے بارے میں افتخار عارف نے مزید کہا ۱۴۵۔ "...not merely high person" سارا انہی عوامل کے باعث اب ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار رہی تھیں۔ اور غیر محسوساتی طور پر یہ عمل ان کے اندر شروع ہو چکا تھا۔

سارا کی خودکشی کے ان محرکات کے علاوہ ایک اور محرک یہ بھی تھا جس کا اندازہ ان کے خطوط اور خود سارا کے دوست احباب کی باتوں سے بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ سارا کو سوشل بننے کا شوق تھا۔ ناموری اور شہرت پانے کی ایک ایسی

خواہش ان کے اندر موجود تھی جس کی تکمیل وہ راتوں رات کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن اس سوشل زندگی کا اصل مفہوم اور اس کی جانب جاتے ہوئے مثبت راستے شاید ان کی نگاہِ انتخاب میں نہ آسکے۔ اس حوالے سے ان کے ہاں Fanticies بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے دوہری شخصیت کے کئی روپ ابھرتے ہیں ان کے اندر کی شخصیت جو ناموری اور شہرت کا خواب لیے ہوئے ہے۔ وہ سارا کی خارجی اور ظاہری شخصیت سے ہم آہنگ نہیں اس لئے کہ اندر کی شخصیت حساس بھی ہے۔ وہ کچھ بننا چاہتی ہے۔

لیکن شخصیت کا خارجی حوالہ کوئی نمایاں اور قابل ذکر تعلیم و تربیت سے بہرہ ور نہیں وہ جہاں عملی طور پر خود کو شاعروں اور پڑھے لکھے طبقے کے درمیان دیکھتی ہیں۔ وہاں لاشعوری طور پر ایسے خوابوں اور Fanticies کا بھی شکار ہو گئیں۔ جن کا دُور دُور ان کی عملی زندگی اور ان کی شخصیت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ ایک خود فریبی بھی تھی۔ اور اپنی محرومیوں اور نا آسودہ خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کی سعی ناتمام بھی۔ اس طرح جب ہم سارا کی خودکشی کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ تو اس میں ایک یہ محرک بھی بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ کہ وہ یقین اور بے یقینی کے درمیانی راستے پر زندگی بسر کر رہی تھیں جس میں بے یقینی پر مبنی عوامل زیادہ قوی دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے باعث وہ داخلی اور تصوراتی سطح پر ایک ایسی دنیا تخلیق کر لیتی ہیں۔ جسکا حقیقی اور عملی زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ لیکن اس سے ان کی نا آسودہ خواہشات کی تسکین ضرور ہوتی تھی۔ اس تصوراتی دنیا میں رہ کر کبھی وہ خود کو دنیا کے نامور ادیبوں کے حوالے سے دیکھتی ہیں۔ کبھی اپنے ساتھ ملکی اور عالمی سطح پر ایسے معاملات اور واقعات وابستہ کر لیتی ہیں۔ جو صرف ان کی تخیلاتی دنیا کی پیداوار تھے۔ مثلاً جب وہ اپنی زندگی کی محرومیوں اور خصوصاً ادب کے حوالے سے خود کو دیکھتی تھیں تو عالمی سطح کے لکھاریوں کا حوالہ دے کر بالواسطہ ان بڑے ناموں میں خود کو شامل کرنے کی کوششیں کرتی تھیں۔

اسی طرح وہ اپنے فرانس کے دورے کا حوالہ بھی دیتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس سطح کے لکھاریوں میں شامل ہوں جو صرف ملکی سطح پر ہی نہیں بلکہ غیر ملکی ادب کے حوالے سے بھی اپنی پہچان رکھتے ہیں" ۔۔۔ جون کے آخری ہفتے میں، میں فرانس گئی تھی۔ اور وہاں کے چھوٹے سے حادثے میں تیسرے روز ہی میرے دائیں کندھے کے پاس تین فریکچر آ گئے۔ کچھ دیر مجھے ہسپتال رہنا پڑا۔ پھر وہیں ایک ہوٹل میں ۔۔۔"۔ ۱۴۶

کبھی وہ اپنے روزمرہ معاملاتِ زندگی میں دنیا کے نامور ادیبوں اور نقادوں کا تذکرہ کرتی ہیں: "۔۔۔ ٹیگور کا ایک گیت یاد آ رہا ہے۔۔۔ گھر میں روز تعلیم یافتہ شاعر اور نقاد آتے اور ایلیٹ کی طرح بولتے۔۔۔"۔ ۱۴۷

بقول عذرا عباس

> یہ سب جھوٹ ہے۔ چونکہ یکے بعد دیگرے دو شعراء کے ساتھ بیاہی گئی۔ گھر میں بھی ادبی نشستیں اور مباحث ہوتے ایک دو مشاعروں میں بھی شریک ہوئی۔ لہذا ان حوالوں سے محض سنے سنائے ناموں کو اس نے پھر اپنی تحریروں میں استعمال کیا۔ ۱۴۸

اس ضمن میں کشور ناہید کا کہنا ہے۔ "سارا سے مجھے دو تین مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ بلکہ ایسے موقعوں پر جسے ہم ادبی گفتگو کہہ سکتے ہیں۔ وہ شرکت سے گریز کرتی تھی۔"۔ ۱۴۹ اسی بات کو کشور ناہید نے اپنے گھر میں منعقدہ ایک خصوصی نشست کے حوالے سے اس طور بیان کیا۔ سارا ایک مرتبہ میرے گھر آئی تھی۔ ادیبوں

کی Get together تھی۔ زیادہ تر خاموش رہی۔ کسی ادبی گفتگو یا بحث میں حصہ نہیں لیا۔ اور جتنا وہ بولی۔ اس کے گفتگو کرنے کا انداز غیر مربوط اور ناشائستہ سا لگا۔ گفتگو میں Logic نہیں تھی۔ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ کہ "She is a writer" ۔۱۵۰

سارا کی شخصیت کے مجموعی حوالے سے اور خصوصاً اس شخصیت کی شاعرانہ جہت کے ضمن میں دوران تحقیق مختلف اہل قلم اور خود سارا کے دوست احباب نے خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سارا کی شخصیت دیکھنے میں بھی غیر متاثر کن تھی۔ ان پر پڑھے لکھے ہونے کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ ادبی مباحث میں شرکت سے گریز کرتیں۔ البتہ شعر سنانے کو کہا جاتا۔ تو بقول کشور ناہید ''نظم سنا دیتی تھی۔'' ۔۱۵۱

عام طریقہ گفتگو میں سارا کے ہاں شائستگی کا فقدان تھا۔ اس کی نشست و برخاست غیر محتاط اور غیر متوازن رویوں کی حامل تھی۔ شخصیت کی اٹھان پتہ دیتی تھی کہ اس کی بنیادوں میں بہت اندر کہیں شکست و ریخت کا عمل جاری و ساری ہے۔ تعلیم کا وجود جس حد تک کسی شخصیت کو نکھار سکتا ہے۔ سارا نے اس کی خواہش اور جستجوئے ناتمام تو کی۔ لیکن کامیابی ہاتھ نہ آسکی۔ اور جہاں تک خاندانی پس منظر کا تعلق ہے۔ اس میں بھی تعلیم کا فقدان دکھائی دیتا ہے۔ سارا خود اپنی والدہ سے کے بارے میں لکھتی ہیں۔ ''وہ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔'' ۔۱۵۲

عذرا عباس کا اس کے بارے میں کہنا ہے ''ایک آدھ مرتبہ سارا کے ایک دو بہن بھائی دیکھے ان کا طریقہ کار بہت سادہ اور معمولی سا تھا۔ لگتا نہیں تھا کہ وہ پڑھے لکھے ہیں۔'' ۔۱۵۳

سارا کی اپنی ظاہری شخصیت کا حوالہ دیتے ہوئے کشور ناہید کا کہنا ہے۔ ''سارا دیکھنے میں پینڈو لگتی تھی۔'' ۔۱۵۴

افتخار عارف نے دوران گفتگو اس ضمن میں کہا: سارا واجبی صورت کی مالک تھی لگتا نہیں تھا کہ وہ کوئی لکھاری ہیں۔'' ۔۱۵۵

جبکہ پروفیسر احمد جاوید نے اپنی رائے کا اظہار اسطرح سے کیا: ''سارا معمولی شکل وصورت کی مالک تھیں۔ آنکھوں میں عجب طرح کی وحشت اور خوفزدگی نظر آتی تھی۔'' ۔۱۵۶

ان آراء میں صداقت کا پہلو اس لئے نظر آتا ہے۔ کہ سارا کی ابتدائی گھریلو زندگی میں نہ تو انہیں کوئی علمی و ادبی وراثت ملی۔ تعلیم واجبی تھی۔ اور جہاں تک ان کے مطالعہ کا تعلق ہے۔ سوائے دو شعراء کے، جن کے ساتھ سارا کی شادی ہوئی۔ اور وہ بھی چند ماہ سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی۔ اور اس دوران بقول سارا زندگی کے بدترین مصائب کا انہوں نے سامنا کیا۔ لہٰذا مطالعہ کا موقع اور وسیع مطالعاتی نگاہ کے پنپنے کے مواقع معدوم نظر آتے ہیں۔ شوکت عابد کا اس ضمن میں کہنا ہے: ''وہ شاعروں کے حوالے سے شاعرہ بنتی گئیں۔'' ۔۱۵۷

سارا نے Fanticies کا شکار ہو کر ملکی سطح پر بعض ایسے واقعات کو اپنے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو دوران تحقیق بے بنیاد ثابت ہوئے۔ مثلاً سارا لکھتی ہیں :

> سارا تو اسوقت بھی نہیں روئی جب لاہور قلعے میں ڈکٹیٹر نے میری بے حرمتی کی۔ یہ ایک بڑی داستان ہے۔ آنے والا وقت اس سے بڑی داستان کیا لکھے گا۔ جہاں بے زبان سلاخوں اور بے زبان بیڑیوں کو میرا قدم جانا گیا۔۔۔'' ۔۱۵۸

سارا نے لاہور قلعہ کے حوالے سے اپنی حراست اور تشدد کا جو ذکر کیا ہے۔ امرتا پریتم اس ضمن میں لکھتی ہیں: ''سارا کے ایک خط میں صرف اتنا جانتی ہوں۔ کہ اُنہیں بیس (۲۰) دن حراست میں رکھا گیا تھا سارا نے بھی ان دنوں کی

تفصیل نہیں لکھی۔''۔۱۵۹

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ سارا نے امریتا پریتم کو اتنے اہم واقعہ کی تفصیل کیوں نہیں لکھی۔ جبکہ امریتا سارا کے تمام حالات وواقعات سے پوری طرح آگاہ تھیں۔ ان میں مکمل دلچسپی لے رہی تھیں۔ ان کی سوانح مرتب کرنا چاہتی تھیں۔ اور سارا نے بھی سب سے زیادہ جو خطوط لکھے وہ امریتا کو ہی لکھے۔ جن میں انہوں نے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے اور ہر ہر واقعہ کی وضاحت لکھی۔ چنانچہ دوران تحقیق اس حوالے سے جن نامور ادیبوں، شعراء اور خود سارا کے قریبی دوست احباب سے رابطہ ہوا۔ تو سب نے اس بات کی تردید کردی، کہ سارا نہ کبھی کسی سیاسی حوالے سے لاہور قلعہ میں زیر حراست رہیں۔ اور نہ ان پر تشدد ہوا۔

پروفیسر احمد جاوید کا کہنا ہے:

> میں نہیں سمجھتا کہ سارا کے ساتھ کبھی ایسا ہوا ہو اور اگر ایسا ہوا ہے تو پھر یہ واقعہ سارا کے حوالے سے انتہائی اہم نوعیت کا واقعہ ہوگا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ساتھ ایسا ہوا نہیں نہ یہ کبھی پڑھا اور نہ کبھی سنا ہے۔۔۱۶۰

کشور ناہید اس حوالے سے کہتی ہیں:

> یہ سراسر غلط ہے کہ سارا کبھی لاہور قلعہ میں زیر حراست رہی میں تو خود لاہور میں موجود تھی۔ اور ان تمام لکھاریوں کو میں ذاتی طور پر جانتی ہوں۔ جنہیں کسی سیاسی وجوہ کے باعث قلعہ میں رہنا پڑا۔ اور پھر سارا کی کسی حوالے سے کوئی سیاسی حیثیت نہیں بنتی ۔۔۔''۔۱۶۱

شاعرہ عذرا عباس نے بھی اس بات کی تردید ان الفاظ میں کی: ''یہ تو میں آج آپ سے سن رہی ہوں۔ کہ سارا لاہور قلعہ میں بیس روز زیر حراست رہی۔ محض Fanticy ہے اور کچھ نہیں۔''۔۱۶۲ اس صورتحال سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ سارا لاشعوری طور پر خود کو ایک ایسی دنیا اور ایک ایسے طبقے کے حوالے سے دیکھتی تھیں۔ جو طبقہ فکری طور پر زندگی میں بڑے بڑے مقاصد کے حصول کی جنگ لڑتا ہے۔ جیلیں کاٹتا ہے اور پھر وقت انہیں ناموری بھی عطا کرتا ہے۔ شاید سارا اسی ناموری کی خاطر بے بنیاد قصوں اور واقعات کو خود سے وابستہ کرتی رہیں۔ اس ضمن میں سارا کا ایک اور بیان بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اور وہ بیان ''انسانی صحیفہ'' سے متعلق ہے۔ یہ ''انسانی صحیفہ'' سارا کے خطوط کے حوالے سے علم ہوا۔ کہ کوئی سیاسی نوعیت کی کتاب ہے۔ جو سارا نے اس نام سے لکھی ہے اور یہ کتاب اس کی کسی بڑی فکر پر محیط ہے۔ ملکی اور غیر ملکی سطح پر اس کتاب کی اشاعت اور اسکا تعارف فی الوقت ناممکن ہے۔ کیونکہ حالات بقول سارا ساز گار نہیں تھے۔

امریتا کو اس حوالے سے سارا نے لکھا۔''انسانی صحیفہ'' کے بارے میں ابھی ذرا محتاط ہوں۔ اور پاکستان میں وہ کتاب چھپ بھی نہیں سکتی۔ مجھے پتہ ہے۔ یہ کتاب چھپنے کے بعد میری سزا پھانسی سے کم نہیں ہوگی لیکن مجھے پرواہ نہیں ''۔۱۶۳

''انسانی صحیفہ'' کے حوالے سے سارا نے امریتا کو ۲۷ اپریل ۱۹۸۳ میں خط لکھا تھا امریتا نے اسکا ذکر ان الفاظ میں کیا: ''خط میں ان کاغذات کا پتہ ٹھکانا لکھا تھا۔ کہ وہ کراچی میں کسی جگہ پڑے ہیں۔ ایک طرح سے زمین دوز ہیں لیکن وہ سب لکھنا یہاں مناسب نہ ہوگا۔ وہ غلط ہاتھوں میں بھی جا سکتے ہیں۔''۔۱۶۴ اگر سارا اور امریتا پریتم دونوں کے ان

خطوط کے اقتباسات کو سامنے رکھا جائے۔تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج سارا کی خودکشی کو بیس برس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے جبکہ امریتا پریتم کی وفات کو محض چند ماہ گزرے ہیں۔ سارا کی کتابیں اور اس کی سوانح کو امریتا نے شائع کروایا۔ان کے نام سے سارا اکیڈیمی کے قیام میں بھی امریتا فعال رہیں۔تو پھر انسانی صحیفہ جیسی اہم نوعیت کی کتاب شائع کیوں نہ ہو سکی۔اگر پاکستان میں اس کتاب کی اشاعت کے لئے حالات کبھی سازگار نہ ہو سکے ہوں۔تو ہندوستان سے بھی اس کی اشاعت ممکن نہ ہو سکی۔جبکہ امریتا نے سارا کی کتب ہندوستان سے بھی شائع کیں۔

بقول ڈاکٹر رشید امجد ''انسانی صحیفہ'' کے نام سے کسی کتاب کا تذکرہ سارا شگفتہ کے حوالے سے آج تک میرے علم میں نہیں آیا''۔۱۶۵ پروفیسر احمد جاوید کہتے ہیں ''انسانی صحیفہ'' سارا شگفتہ کے حوالے سے، ایک نئی سی بات لگتی ہے''۔۱۶۶ شاعرہ عذرا عباس نے اس سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔اور کہا ''مجھ سے سارا نے کبھی اسکا تذکرہ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ روزمرہ زندگی کا تقریباً ہر واقعہ مجھ سے بیان کرتی تھی۔''۔۱۶۷

اس ضمن میں کشور ناہید نے حیرت کا اظہار کیا:

> بڑی بات ہے اگر سارا نے اس نوعیت کی کوئی کتاب لکھی اُنہیں تو منظر عام پر آنا چاہیے تھا زندگی میں نہ سہی اس کی موت کے بعد ہی اسے شائع کر دیا جاتا۔ایسا نہیں ہے ایسی کوئی کتاب سارا نے نہیں لکھی۔۔۱۶۸

اسی طرح کی بے بنیاد باتیں سارا امریتا کو ایک اور حوالے سے بھی لکھتی ہیں اور یہ حوالہ ان کے خطوط کا ہے یہاں بھی وہ خود فریبی کے ہاتھوں ایک ڈرامائی انداز اور ایک طرح سے اپنی انفرادیت اور اہمیت کا اظہار چاہتی ہیں۔ امریتا پریتم کو لکھتی ہیں۔'' یہاں بہت سختی ہے۔میرے بہت سے خطوط سنسر ہو جاتے ہیں۔''۔۱۶۹ سارا کے اس انداز کے پیچھے ایک تو ان کا اپنی انفرادیت کو ظاہر کرنا دکھائی دیتا ہے اور دوسرے ایسے نمایاں ادیبوں کے درمیان انہیں اپنا نام دیکھنے کی خواہش بھی ہے۔جو کسی نہ کسی سیاسی وجوہ سے حکومت کے زیرِ عتاب رہے۔ جہاں تک ایک مخصوص دور میں ایک مخصوص ملکی اور سیاسی صورتِ حال کے تحت ادیبوں کے خطوط وغیرہ سنسر ہونے کا سوال ہے اس ضمن میں دورانِ تحقیق میری مختلف ادیبوں اور اہلِ قلم سے بات ہوئی تو مجموعی تاثر یہی تھا جو کشور ناہید نے ان الفاظ میں دیا:

> یہ تمام ادیبوں کا مشترکہ مسئلہ تو تھا لیکن زیادہ تر اہم اور نامور لکھاری ہی اس زمرے میں آتے ہیں صرف ایک مخصوص فرد کے حوالے سے کوئی ایسی مخصوص پابندی والی بات نہیں۔کہ اسے کوئی سرخی بنا دیا جائے۔۔۱۷۰

لیکن سارا کے طریقہ کار سے بہت حد تک اس بات کا علم ہوتا ہے کہ سارا کو کسی خبر کی سرخی اور شہرت کا حصول درکار تھا۔یہ شہرت کسی حوالے سے ہی ملے۔اس لحاظ سے اس کی فطرت کا یہ پہلو بھی ان کی خودکشی کے محرکات میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔کیونکہ خودکشی کا عمل ایک ایسا انسانی فعل ہے جس میں نہ صرف اس خبر کو سرخی ملتی ہے اور وہ بھی ادیبوں یا نامور لوگوں کے حوالے سے۔بلکہ اس خبر میں سنسنی بھی پائی جاتی ہے۔اس خبر کی سنسنی خیزی میں اسوقت مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب عالم شباب میں خودکشی کا عمل وقوع پذیر ہو۔سارا کے ساتھ یہ حوالے بھی موجود ہیں۔تیس سال کی عمر میں انہوں نے زندگی کو جس ہنگامہ خیزی اور نت نئے تجربوں کے درمیان بسر کیا۔اور اس پر ان کی موت، جو خودکشی کا باعث ہوئی۔یہ تمام ہنگامہ خیزی اپنے اندر حالات کے نشیب و فراز کی انتہائی تیز رفتاری، سنسنی خیزی اور نگارنگی رکھتی ہے۔اس سے پتہ

چلتا ہے کہ وہ ہر ہر قدم پر توجہ اور شہرت کو حاصل کرنے کی خواہاں تھیں اور انہوں نے خود کو حالات کے تیز بہاؤ کے سپرد کر دیا تھا۔ سارا کے ہاں زندگی کو برتنے، تجربوں کی بھٹی سے گزرنے کا جو عمل ہے۔ وہ دھیمے سروں میں ان کی شخصیت کے اندر جذب ہو کر ردِ عمل کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ بلکہ سارا ہر واقعہ، ہر کیفیت اور ہر عمل کا فوری، شدید اور ایک ایسا ردِ عمل ظاہر کرتی تھیں، جس میں احتجاج کی انتہائی نوعیت اور سنسنی خیزی کا پہلو موجود ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے ان کی خودکشی کا ایک نمایاں محرک ان کی فطرت میں پائی جانے والی یہ سنسنی خیزی بھی ہے۔ جس میں ان کی جلد بازفطرت اور جذباتی پن نے اہم کردار ادا کیا۔ سنسنی خیزی پیدا کرنے کا یہ انداز ان کی تحریروں سے بھی عیاں ہے۔

اسی ضمن میں سارا لکھتی ہیں: ''جب شوہر نے باپ کے جنازے پر جانے نہیں دیا۔ تو میں نے دیوار پھلانگی اور بھاگتی ہوئی اپنے والد کے جنازہ تک پہنچی۔'' ۔۱۷۱ شوہر کی اجازت کا نہ ملنا ایک طرف لیکن دیوار پھلانگنا، بھاگنا جیسی علامات ظاہر کرتی ہیں کہ سارا کسی کام کے طریقہ کار کا انتخاب غیر سنجیدگی، ہنگامہ خیزی اور سنسنی خیز انداز میں کرتی تھیں۔ یہاں اپنے ایک شوہر کی فائرنگ کے واقعہ کا ذکر کرتی ہیں: ''گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی کبھی کوئی سنسناتی ہوئی گولی میرے دائیں اور کبھی بائیں اور کبھی سر سے گزر جاتی۔ اتنے میں ایک جیپ رکی اور کسی نے مجھے اٹھا کر گاڑی میں پھینک دیا۔'' ۔۱۷۲ سارہ یہاں پورے منظر کا بیان نہ صرف سنسنی خیزی کے ساتھ کرتی ہیں بلکہ ایک ایسی تصویر پیش کرتی ہیں جہاں وہ نازک ترین صورت حال میں بھی چونکا دینے والے طریقہ کار سے متصادم ہیں۔

> میں سیڑھیوں سے ایک چیخ کی طرح اتری۔ میرے ہاتھ میں تین روپے تھے۔ میں اپنی ایک دوست کے ہاں پہنچی۔ اور تین سو روپے قرض مانگے۔۔۔ میں پھر دوہری چیخ کے ساتھ سیڑھیوں سے اتری۔ ننگے پیر سڑک پر دوڑتی ہوئی بس میں سوار ہوئی۔۔۔ ۔۱۷۳

دوڑنا، بھاگنا، چیخنا، ایک مقام سے دوسرے مقام تک برق رفتاری سے پہنچنا۔ ساری علامتیں ان کی فطرت کی جلد بازی اور تحمل کی کمی کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً ایک مقام پر سارا لکھتی ہیں: ''۔۔۔ صبح پانچ بجے دیوار پھلانگ کر ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئی۔'' ۔۱۷۴ سارا ہر کام کے طریقہ کار کو عام انداز سے ہٹ کر کرنے میں اپنی باغیانہ روش کا اظہار اور اس حوالے سے حیرت زدگی کی کیفیت کو جنم دیتی ہیں۔ چونکہ وہ طریقہ کار ان کی فطرت اور ان کے مزاج کا خاص رنگ ہے۔ اس لئے انکی تحریروں سے جگہ جگہ نمایاں ہے۔

اپنے ایک شوہر کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

> اس نے تکیے کے نیچے سے چاقو نکالا۔ اور میرے سینے پر وار کرنے لگا۔ میں اوندھی ہوئی۔۔۔ موت مجھے چھو چھو کر گزرتی رہی۔ میں لڑتی رہی۔ آخر چاقو کا بھرپور وار اس نے میرے سینے پر کرنا چاہا۔ میں نے ٹانگ آگے کر دی۔ اور میری بائیں ٹانگ پر بھرپور چاقو لگا۔ ۔۱۷۵

سنسنی خیزی پیدا کرنے کے اس انداز سے ان کی مظلومیت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ ''رات کے دو بجے تھے اور میں سڑکوں پر رینگ رہی تھی۔ خون بہت بہہ چکا تھا۔ میں چل نہیں سکتی تھی۔ میں سڑک کے کنارے بیٹھ گئی۔ آخر ایک سکوٹر والے نے مجھے گھر پر چھوڑ دیا۔'' ۔۱۷۶ ان تمام واقعات اور صورت حال سے بخوبی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سارا نے

خارجی جبر کوکئی صورتوں میں بسر کیا۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ انہوں نے اس جبر کو شدت کے ساتھ سامنا کیا۔ اور اسکا سامنا کرتے ہوئے وہ ساتھ ہی ساتھ سراپاً احتجاج بھی بنتی چلی گئیں۔ اس احتجاجی صورتِ حال میں جہاں تک ممکن ہو سکا۔ سارا نے سنسنی پھیلائی۔ جس کے باعث وہ ایک طرف مظلومیت کی تصور بنیں۔ تو دوسری طرف خوفزدگی کی ایک کیفیت جنم لیتی ہے۔ جو قاری کو ذہنی طور پر سارا کے حوالے سے کسی نئی یا حادثاتی صورتِ حال کے پیدا ہونے کی خبر دیتی ہے۔ اس ضمن میں سارا کی متعدد بار خودکشی کی کوششیں بھی اہمیت کی حامل ہیں اور صرف کوشش ہی نہیں ۔ بلکہ اس خودکشی کی پیشگی اطلاع دینا، کوئی تحریر، کوئی خبر دوسروں کے لئے چھوڑنا۔ جس سے دوسرے فوری طور پر ان کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ سارا کوئی ایسا کردار، ایسی کہانی بننا چاہتی تھیں ۔ جو فوری طور پر دوسروں کو ان طرف متوجہ کر سکے جس سے دوسرے حیرت زدہ ہوں۔ انہیں مظلوم کہیں ان سے ہمدردی کا اظہار کریں۔ لہٰذا ان تمام عوامل کو ہم سارا کی خودکشی کے محرکات سے خارج نہیں کر سکتے۔ سنسنی خیزی یقیناً ان کی فطرت میں شامل تھی۔ اور آخر کار جب وہ خودکشی کر لیتی ہیں تو اس موقع پر بھی وہ دوست، احباب کے نام اس حوالے سے تحریریں اور خطوط چھوڑتی ہے۔ جو کچھ ان کی خودکشی سے پہلے اور کچھ خودکشی کرنے کے بعد ان کے دوستوں کو موصول ہوئے۔

سارا کی خودکشی کے محرکات میں ایک اور اہم محرک Male dominating سوسائٹی کا مخصوص رویہ بھی ہے۔ جہاں عورت کی تخلیقی صلاحیتوں کو پنپنے کے مواقع فراہم ہونا ناممکن نہیں۔ تو مشکل ضرور ہو جاتے ہیں۔ اور آزادیٔ نسواں کے حوالے سے اگر عورت بے سمت ہونے لگے۔ تو اس بے سمتی کو دم آخر تک پہنچانے میں مرد کا سماج کہاں تک اور کس طرح اپنا مخصوص رویہ ظاہر کرتا ہے۔ سارا کی شخصیت اور ان کی زندگی جو آخر کار خودکشی پر منتج ہوئی۔ اسکا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ درست کہ اس میں زیادہ ہاتھ خود سارا کی غیر متوازن اور غیر سنجیدہ شخصیت کا بھی ہے۔ جس پر کافی حد تک بات ہو چکی ہے۔ یہاں یہ بات خارج از بحث نہیں کہ ان حالات میں اگر عورت سوسائٹی میں اپنا کوئی صحیح اور مثبت مقام بناتی ہے۔ تو اس کے لئے اسے سوسائٹی کے سماجی اور اخلاقی ضابطوں کے اندر رہ کر مثبت انداز میں مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو منوانا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے سارا کی شخصیت میں ان اوصاف کا فقدان تھا۔

بقول عذرا عباس ''اگر کوئی عورت خود ہی سوسائٹی میں خود کو باعزت درجہ نہیں دیتی۔ تو مرد کیونکر اسکا احترام کرے گا۔ سارا کا میل جول ان لوگوں سے بھی تھا۔ جن سے بات کرنا ہم مناسب نہیں سمجھتے۔''۔۱۷۷ گوہر سلطانہ عظمی اسی حوالے سے لکھتی ہیں:

> انگلیوں میں سگریٹ دبا کر مردوں کے درمیان بیٹھ کر ادب کے صرف ان حصّوں کی بات کی۔ جس میں جنس کا ذکر زیادہ تھا۔ اس لئے اس کے اردگرد جمع ہونے والے مردوں نے بھی اُنہیں جنسی حوالے سے دیکھا۔۱۷۸

سارا کی شخصیت میں یہ کمزوریاں ضرور تھیں لیکن ان کمزوریوں کے باعث وہ مرد سماج کے ہاتھوں ہی زیادہ تر تختۂ مشق بنیں۔ عورت اور مرد کو سوسائٹی گاڑی کے دو پہیوں کا نام دیتی ہے۔ لیکن جہاں تک گاڑی کے اس پہیے کا تعلق ہے۔ اس کی ذراسی لغزش اور کوتاہی گاڑی کے دوسرے پہیے کے ہاتھوں بجائے اصلاح اور درستی کے بدترین حالت تک پہنچا دی جاتی ہے۔ مرد کا سماج اپنے قول و فعل میں تضاد رکھتا ہے۔

زندگی کی دوڑ میں اس کے ساتھ شریک عورت کی کمزوریوں پر اس کی گہری نظر ہوتی ہے۔ جہاں اس کے ہاتھ

ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع آئے وہ شاید لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کرتا۔ اس حوالے سے سارا مرد کے سماج میں بد ترین تجربات سے گزریں۔ جنھوں نے اُنہیں رفتہ رفتہ انتہائی مایوسی، تنہائی اور آخر کار خودکشی کے عمل سے دوچار کرنے میں اپنا حصہ ڈالا۔ بحیثیت شاعرہ ان میں جس قدر جو تخلیقی صلاحیت تھی۔ اس تخلیقی صلاحیت کی نمو پذیری کے دوران وہ مرد سماج کے جبر کا نشانہ بنیں۔ غالباً اپنی تیسری شادی کے حوالے سے لکھتی ہیں: ''میرے لکھنے پڑھنے پر بھی پابندی تھی۔ میں ٹائلٹ میں جا کر شعر لکھا کرتی اور کتا بکتا۔ عظیم شاعرہ میرے بوٹ پالش کر رہی ہے۔۔۔۔۱۷۹ اسی حوالے سے وہ اپنے چوتھے شوہر کے حاکمانہ رویے کے متعلق ان الفاظ میں لکھتی ہیں: ''شاعرہ کا سانس اب میری مٹھی کے برابر ہے۔۔۔ تم دو کوڑی کی شاعرہ۔ علم تو تمھیں آدھی روٹی بھی نہیں دیتا''۔۱۸۰

یہ بحث اپنی جگہ الگ ہے کہ سارا کی ان باتوں میں گو سوفی صد سچائی نہ ہو لیکن وہ ان تلخ تجربات سے ضرور گزریں۔ اس کی ترجمانی سارا کی تحریروں کے علاوہ خود مختلف اہل قلم نے بھی کی ہے۔ افسانہ نگار پروفیسر احمد جاوید کا کہنا ہے کہ ''اگر وہ (سارا) کچھ لکھتی تھی۔ یا لکھنا چاہتی تھی۔ تو پھر اس کے ساتھ یہ تمام نا مناسب سلوک کسی صورت درست نہیں تھا''۔۱۸۱

افتخار عارف نے اس بارے میں کہا ''سارہ کو Torture کیا گیا۔ یہ درست ہے''۔۱۸۲

بقول گوہر سلطانہ عظمیٰ

لوگوں نے اُنہیں شاعرہ سمجھ کر مقام دینے کی بجائے عورت سمجھ کر ہاتھ صاف کیا۔ سارا نے اس صورتِ حال کا ذکر اپنے اشعار میں اسطرح سے کیا ہے۔ تم کس کنبے کی ماں ہو۔ ریپ کی۔ قید کی۔ بٹے ہوئے جسم کی یا اینٹوں میں چنی ہوئی بیٹیوں کی۔ ۱۸۳

سارا نے خود مرد کے کردار کو اس کے ہر منفی زاویے سے بخوبی دیکھا۔ اور پھر کھل کر اسکا اظہار کیا۔ مرد کا ایک کردار وہ بھی تھا۔ جس نے باپ کی حیثیت سے اُنہیں سوتیلی ماں کا تحفہ دیا۔ انہیں وہ عدم تحفظ دیا۔ جو بعد میں اُنہیں کبھی کسی صحیح پناہ تک نہیں لے گیا۔ پھر پہلے شوہر کا کردار جس نے اُنہیں تنہا اور بے اختیار عورت سمجھ کر بچے چھین لیے۔ جو تمام عمر کا کرب بنکر اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ پھر تمام زندگی قدم قدم پر مرد انہیں جس جس صورت میں ملا۔ اسکا جیسا رویہ اور کردار رہا۔ سارا نے بلا جھجک اُنہیں اپنی شاعری اور خطوط میں رقم کیا۔ یہ سوچے بغیر کہ کہاں پر وہ خود کتنی ملوث اور قصوروار ہے۔

اور پھر جب انسانوں کا سناٹا ہوتا ہے
ہمیں مرنے کی مہلت نہیں دی جاتی

ستاروں کی پکار آسمان سے زیادہ زمین سنتی ہے
میں نے موت کے بال کھولے
اور جھوٹ پر دراز ہوئی

میں موت کے ہاتھ میں ایک چراغ ہوں

جنم کے پہیئے پر موت کی رتھ دیکھ رہی ہوں

کون جانے ڈال کتنے رنگ بوئے گی
پر ہماری قبر ہمیں بوتی نہیں

میری ہاتھوں میں کوئی دل مرگیا ہے
موت کی تلاشی مت لو
انسان سے پہلے موت زندہ تھی
آنکھ گھٹ کر رہ گئی ہے
موت قہقہہ لگانا چاہتی ہے
لیکن میرے پاس وقت اورہنسی کم ہے
بدن سے دل اکھڑ گیا ہے

امریتا پریتم کو ایک خط میں سارا لکھتی ہیں۔

ایک تنقیدی بیٹھک میں ایک جملہ کچھ اس طرح کا تھا۔ سارا اپنے جسم میں اور اپنی شاعری میں تمیز پیدا کر۔۔۔ایک دن ایک شاعر نے کہا۔ نماز پڑھا کرو۔ حالانکہ اسکا قد جائے نماز سے بھی چھوٹا تھا۔ پھر ایک نقاد بولا بیٹی یہ لچھن اچھے نہیں۔ اور رومال سے اپنی رال پونچھنے لگا۔ کسی اور نے کہا۔ بن جال کی مچھلی ہے۔ پر میں تو بہن کہہ چکا۔ اب تم نبٹو۔۔۔سوسائٹی کے نسلی کتوں کا یہ حال ہے۔ ۔۱۸۴

یہ تمام صورتحال سارا کی اپنی شخصیت کے حوالے ہی سے کہہ لیں۔ لیکن اب مرد کا سماج اس ضمن میں اپنا ردعمل ظاہر کررہا تھا۔ امریتا کے نام ہی سارا لکھتی ہیں۔

چندروز پہلے یونیورسٹی کے کچھ شاعر نما لڑکے نے کہا۔ سارا صاحبہ، نشست ہے آپکے اعزاز میں! بڑی ضد کے بعد میں نے کہا اچھا گئی تو اکیلا گھر اور ایک تنہا لڑکا۔ مجھے کہنے لگا، کافی بکواس کے بعد ایک رات میرے ساتھ گزاریے۔۔۔ ۔۱۸۵

اب تمام صورتِ حال کچھ اس طرح سے بھی واضح ہوتی ہے۔ کہ سماج صرف سارا کی کمزوریوں سے ہی فائدہ نہیں اٹھاتا رہا۔ بلکہ تذلیل اور تمسخر کے ساتھ اُنہیں مضحکہ خیزی کا نشانہ بناتا رہا۔ اور سماج کے یہ رویے سارا کو اندر ہی اندر زندگی کے مثبت موڑ اور مزاج سے کاٹتے چلے جارہے تھے۔ وہ اب سماج کے لئے محض ایک کھلونا تھیں۔ ’’ایک نشست میں ایک شاعر نے کہا سارا صاحبہ! خبر پڑھی تھی۔ کہ آپکے گھر والوں نے آپکو عاق کردیا ہے۔ آپ میرے گھر رہیے ۔‘‘ ۔۱۸۶

اسی حوالے سے ایک اور جگہ لکھتی ہیں: ’’بہت دنوں سے سنتی آرہی تھی۔ جی سارا تو مجھ سے عشق کرتی ہے۔ سارا تو آسان ہے۔۔۔‘‘ ۔۱۸۷ اب سارا خود بھی بخوبی سمجھتی تھیں کہ وہ اس حوالے سے روز بروز نت نئی خبروں کا عنوان

بنتی ہیں۔'' جانے کہاں ہے پیر تو سوال کرتے ہیں۔ کسی شاعر، ادیب کے گھر پہ تو کل کے اخبار میں یہ خبر چھپے گی۔ سارا شگفتہ آج کل فلاں شاعر یا ادیب کو داد دے رہی ہے۔''۔ ۱۸۸ سماج میں رہتے ہوئے سارا اس قسم کے جن حالات سے گزر رہی تھیں ایسا نہیں کہ سارا مرد کے اس رویے کے سامنے ڈٹی نہیں۔ یا احتجاج نہیں کیا۔ جتنا ان میں دم خم تھا۔ اتنا ہی وہ ڈٹ سکتی تھیں۔ کہ زبان سے وہ کچھ کہہ سکتیں۔ قلم سے کچھ لکھ سکتیں۔ چنانچہ سارا نے ایسا کیا۔ اور اس کے لئے سارا نے بہت سخت اور عامیانہ زبان بھی استعمال کی۔ مثلاً جب پہلا شوہر ان کے بچے چھین لے گیا۔ تو وہ گھر تلاش کرتی ہوئی وہاں پہنچیں ''اندر سے میرا شوہر نکلا۔ کتیا! تو یہاں بھی پہنچ گئی ہے۔ میں نے کہا۔ ہاں یزید! میں یہاں بھی پہنچ گئی ہوں ''۔۱۸۹

پھر سارا ایک اور شوہر کیلئے لکھتی ہے'' وہ تیسرا کتا تھا۔ یہ کنجر ہاتھ مجھے اور کتنا زہر پلائیں گے۔''۔۱۹۰ اسی طرح ایک اور شوہر کے رویے اور اپنے ردِ عمل کو وہ ان الفاظ میں رقم کرتی ہیں۔'' بن مانس میں تیرے حرم میں نہیں رہوں گی۔ اس نے مجھے اتنا مارا۔ کہ میرے جسم پر نیل پڑ گئے۔ میں برابر انہیں گالیاں دیتی رہی۔ اور جتنا ہوسکا۔ ہاتھ اٹھایا''۔۱۹۲

لیکن سارا کی طرف سے اس تمام احتجاجی صورتِ حال کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلا۔ مرد کا سماج قوی تھا۔ سارا تنکے کی مانند اس طاقت کے سیلاب میں بہہ گئیں۔ ابتداء میں سارا سراپا احتجاج تھیں۔ لیکن پھر انہیں رفتہ رفتہ مظلومیت کی طرف پسپائی ملنے لگی۔ یہ ان کی شخصیت کی شدید ٹوٹ پھوٹ کا مرحلہ تھا۔ وہ سماج میں رہتے ہوئے تیزی کے ساتھ تنہا ہوتی جا رہی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں واضح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ سماج سے نہیں، بلکہ زندگی سے کٹ رہی تھیں۔

انکی کئی نظموں کے نام اور حوالے موت، کفن اور قبر کی زندہ تصویریں دکھائی دیتے ہیں مثلاً'' یہ روز کون مرجاتا ہے''،'' بے وطن بدن کو موت نہیں آتی''،''موت کی تلاشی مت لو''،'' زندگی کی کتاب کا آخری صفحہ'' وغیرہ۔

اسی طرح ان کے اکثر اشعار میں موت کی جانب پیش قدمی نظر آتی ہے۔

وہ آنسو جو میرے مرنے کے بعد
میرے دامن کو تر کر دیں
انہیں انہیں آنکھوں میں رہنے دینا

جنم کے سکے تو مل گئے موت کا سکہ نہ ملا
ثواب کماؤ

میری مٹی سارے موسم جان چکی تھی
تلاش صرف کفن کی تھی

وہ قدم قدم لحد اترتی ہے اور روز قبر کی گواہی دیتی ہے
کاغذ چنتی ہے

تمام رشتے ناطے انہیں پہلے ہی ٹھکرا چکے تھے۔ اب جان پہچان کا ہر دروازہ ان پر بند ہو رہا تھا۔ ''شاعر ونثی حضرات کے گھر جاتی ہوں۔ تو ایک سرخی اخبار میں لگی ہوگی۔ کہ سارا نے فلاں رات فلاں شاعر کے ساتھ گزاری۔''۔۱۹۲

اسی حوالے سے ایک اور جگہ لکھتی ہیں:

میں اپنی ایک بہت اچھی دوست رضیہ کی جھونپڑی میں رہنے کیلئے چلی گئی۔اس نے میرا بہت خیال رکھا۔آدھی آدھی روٹی ہم دونوں کھالیا کرتے تھے۔خیراتی ہسپتال سے دوا لاتے تھے۔۔۔اسی گھر کا واقعہ ہے اچانک گلی میں شور اٹھا۔دیکھا باہر بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔آپ نے جوان عورت کو گھر میں رکھا ہوا ہے۔جی یہ کوئی شریف عورت نہیں لگتی۔۔۔یہاں سے نکالیں۔جانے کہاں سے بھاگ کر آئی ہے۔۔۱۹۳

سماج کا یہ رویہ ہر لحاظ سے سارا کے لئے کتنا کٹھن اور نا قابل برداشت ہو چکا تھا۔اسے وہ بخوبی سمجھ رہی تھیں۔ جیسے وہ ہر مقام، ہر جگہ اور ہر تعلق داری میں غیر اہم اور غیر ضروری قرار دی جا چکی تھیں۔''ایک بہن گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ بہنوئی نے کہا۔جہاں سارا شگفتہ ہوگی۔وہاں ہم لوگ نہیں رہ سکتے۔۔۔''۔۱۹۴

اس حوالے سے پروفیسر احمد جاوید کا کہنا ہے:

سارا سے میری ملاقات بہت مختصری ہے۔سن ٹھیک سے یاد نہیں۔غالباً ۱۹۷۶ کی بات ہے میں شہزاد منظر کے ساتھ ریڈیو پاکستان گیا تھا۔ اقبال فریدی ان دنوں ریڈیو پروڈیوسر تھے۔عبید اللہ علیم اور عطاالحق قاسمی کے بھائی ضیاالحق قاسمی بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔میرا تعارف ہوا۔تو سارا چونک اٹھی۔شاید ان کے سابقہ شوہر کے نام کے ساتھ میرے نام کی مناسبت تھی۔سارا نے اسی مختصر سی ملاقات میں ایک نہیں دو تین مرتبہ مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔لیکن اقبال فریدی نے آہستہ سے منع کیا۔ کہ اس کے ساتھ مت ملنا۔شاید اسوقت اس کے سکینڈلز بہت تھے۔''۔۱۹۵

صورت حال کو یہاں تک پہنچتے پہنچتے سارا کی کہانی کی گھما گھمی بہت حد تک ماند پڑ چکی تھی۔اب سوسائٹی کا ردِ عمل تھا۔اور اس ردِ عمل کی سختیاں۔ان تمام عوامل اور تلخ ترین صورت حال کے تحت سارا کا ایک نارمل حالت میں رہنا بعید از قیاس تھا۔سوال یہ ہے کہ انسان کب تک تذلیل برداشت کر سکتا ہے۔یہ الگ بحث ہے۔کہ اس تذلیل تک سارا کیسے اور کیونکر پہنچیں عورت تھیں، تنہا تھیں، حساس تھیں۔لہذا سماج کے ساتھ مقابلے سے خارج، بے بس اور پسپا ہوگئیں۔پے در پے محرومیوں اور زیادتیوں کا لقمہ بنتے بنتے وہ نفسیاتی طور پر اپنا ذہنی توازن کھونے لگیں۔رفتہ رفتہ انہیں پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔آئے روز ہسپتالوں میں داخل کروائی جاتی ہیں۔سارا کی تحریروں اور خود سارا کے حوالے سے سارا کے گھر والوں کے رویے سے بھی علم ہوتا ہے۔کہ سارا کا کیسے اور کہاں کہاں اہل قلم اور سوسائٹی نے استحصال کیا۔سارا اپنی والدہ کے حوالے سے لکھتی ہیں۔''جانے کیا کر دیا ہے تجھے ان شاعروں نے۔ان کالی زبان والوں نے۔۔۔''۔۱۹۶

اس ضمن میں وہ خود لکھتی ہیں''۔۔۔اور پھر جو شاعر حضرات تھے۔انہوں نے میری دیوانگی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور مجھے اور ذلیل کیا۔میں بالکل پاگل ہوگئی۔میری امی مجھے پاگل خانے چھوڑ آئی۔۔۔''۔۱۹۷ اسی اہل قلم طبقے کے حوالے سے سارا مزید لکھتی ہیں''کیا پاکستان اور کیا ہندوستان کے ان شاعر نما ادیب دوست نما لوگوں پر لعنت بھیجتی ہوں۔۔۔''۔۱۹۸

ایک اور خط میں سارا اسی حوالے سے لکھتی ہیں''بہت قریب سے دیکھا ہے ان لٹریچر فروشوں کو۔انہوں نے

کبھی مجھے ایک لڑکی، ایک عورت سے زیادہ نہیں جانا۔ اور وہ بھی ایک خاموش زاویے سے۔ یہ کھوکھلے پانچ پائی سے بھی کم ہیں۔''۔۱۹۹

سارا کی شخصیت کے تمام پرت اب اس حد تک پائمال ہو چکے تھے۔ کہ وہ مکمل طور پر مظلومیت کی داستان بن کر خود کو دہرانے لگیں۔ اسی مظلومیت اور محرومیوں پر مبنی انہوں نے امریتا کے ساتھ مسلسل خطوط نویسی کی۔ لیکن اب احتجاج سے زیادہ اپنی پسپائی اور پائمالی کی وہ کیفیات تھیں۔ جوان کے بچے کھچے وجود کو ریزہ ریزہ کر رہی تھیں۔ کبھی ہسپتال، کبھی پاگل خانہ۔ اور پھر اسی حوالے سے خودکشی کی کوششیں ہوئیں۔ جو وہ پہلے بھی اسی حالت اور اضطرابی کیفیت میں کرتی رہیں۔ ۲۲ مئی ۱۹۸۱ء کو امریتا کے نام سارا نے لیاقت ہسپتال سے جو خط لکھا۔ اس میں ان الفاظ میں وہ اپنی دماغی حالت بیان کرتی ہیں۔

> امریتا بہت بیمار ہوں۔ الیکٹرک سے علاج ہو رہا ہے۔ اعصاب پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ کبھی کبھی ہاتھ کانپتے ہیں۔ زبان کانپتی ہے۔ اب شاید جسم میں کمزوری کی حالت ہے۔۔۔ راستہ بھولنے لگی ہوں۔ چہرے بھولنے لگی ہوں۔ رپورٹ پڑھی۔ تو دماغی رپورٹ میں لکھا تھا۔ آئندہ دورہ خطرناک ہو سکتا ہے۔۔۔۔۲۰۰

ایک اور خط میں امریتا کو لکھتی ہیں ''کبھی تو ذہنی توازن ہی بگڑ جاتا ہے۔ امی بتاتی ہیں کہ میں رات کو کپڑے اتار دیتی ہوں۔ اور جانے کیا کیا بولتی رہتی ہوں۔ ہر دوسرے تیسرے روز یہ دورہ پڑ جاتا ہے۔''۔۲۰۱ تلخ ترین حالات کے اس پس منظر میں جہاں سوسائٹی مکمل طور پر ایک مایوس، تنہا، ذہنی و نفسیاتی بیمار عورت کو رد کر چکی تھیں۔ اس کے سامنے سوائے تلاش موت اور زندگی کی گھٹن سے فرار کوئی اور راستہ نہ تھا۔ بلا شبہ ان کی خودکشیوں کی پے در پے کوششیں اس عبارت کا عنوان بنتی ہیں۔ سارا لکھتی ہیں۔ ''میں نے چالیس گولیاں کھائیں اور امی کے پاس سوگئی۔ آنکھ جھپکی۔ تو دیکھا جناح ہسپتال کے صرف وارڈ تک پہنچی ہوں۔''۔۲۰۲

خودکشی کی ایسی ہی کوشش کے حوالے سے سارا لکھتی ہیں۔ ''۔۔۔ اس رات امی نے مجھے چائے لا دی۔ اور میں نے چائے کے ساتھ زہر بھی پی لیا۔ اور ایک چھوٹا سا خط لکھا۔ کہ میں خودکشی کر رہی ہوں۔۔۔''۔۲۰۳ خودکشی کی ان کوششوں کی پیچھے سارا کی مخصوص فطرت کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ سارا واقعی زندگی سے مایوس، بیزار اور ناامید ہو چکی تھیں۔ اس لئے وہ فرار کا راستہ تلاش کرتی ہیں۔ اور انہیں موت کی آرزو ہے۔ دوسری بات جو اس حوالے سے سمجھ میں آتی ہے۔ کہ بار بار سارا خودکشی کے اقدامات سے اور وہ بھی اعلانیہ طور پر خط لکھ کر خودکشی کی خواہش کو دوسروں پر واضح کرنا۔ ظاہر کرتا ہے۔ کہ سماج کی طرف سے مکمل طور پر رد کیے جانے کے بعد وہ دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے خود کو کسی خبر کی سرخی بناتی رہیں۔ چاہے یہ خبر خودکشی کے حوالے سے ہی کیوں نہ ہو۔ یہ حالات سارا کے اندر کی شدید ذہنی تھکن اور سماج کے ہاتھوں ان کی پسپائی کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ خودکشی کے حوالے سے توجہ حاصل کرنے کی خواہش کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے۔ کہ اپنی زندگی کے آخری سالوں، بلکہ آخری چند ماہ میں سارا کا جس شخص کے ساتھ جذباتی تعلق قائم ہوا۔ وہ احمد سعید ہے۔ جو بقول سارا وہ کارخانہ دار ہے۔ سعید سے سارا اپنے جذباتی تعلق کو اس طرح بیان کرتی ہیں:

> میں نے مرد سے ہمیشہ نفرت کی ہے۔ اس کی وجہ میرا باپ ہے۔۔۔ آج میں یہ بات

کہتی ہوں سعید، میرے دل میں تمہارے لئے بے پناہ محبت جاگ گئی ہے۔لگتا ہے
جیسے تم نے مجھے روح سے سجادیا ہو۔۔۲۰۴

سارا نے سعید کو یہ خط ۲۹ اگست ۱۹۸۳ء میں لکھا ہے۔اور اس کے دوران سعید سارا کے اقدام خودکشی میں بھی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔''۔۔۔خودکشی کیوں کرنے لگی تھیں۔ میں سرسری آواز میں بولی، یونہی زمین کا موسم بدلنے کے لئے۔''۔۲۰۵

سعید سارا کے لئے بے انتہا ہمدردی رکھتا تھا۔سارا کی زندگی میں شاید یہ آخری پناہ گاہ تھی۔ جو سارا کی حیرتوں اور وحشتوں میں شریک ہوئی۔اسی لیے وہ اپنی خودکشی کی خواہش، موت کی تمنا کا آخری آخری اظہار بھی جب کرتی ہیں تو وہ سعید کے نام سے لکھتی ہیں۔

دنیا کی ساری زمین پر ایک تم ہو۔تم ہو سعید۔جس نے سارا کو جانا۔زندگی کے بیکراں عذابوں کے بعد تم سے ملاقات۔میرا اور تمہارا بیکراں پیار۔۔۔آنکھیں بجھ گئیں۔تو میں پھر بھی تمہارا انتظار کرتی رہوں گی ۔۔۔زندگی کی تلاش کو آج ختم کرتی ہوں۔۔۔انتہائی آنسوؤں کے ساتھ، تیری سارہ! تیری اپنی سارا ۔۲۰۶

سارا نے سعید کو یہ خط اپنی خودکشی سے چار دن پہلے ۱۳ مئی ۱۹۸۴ء کو لکھا۔سعید کے نام اسی تاریخ میں سارا کے لکھے ہوئے تین خطوط ہیں۔جو ان کے جذبات کی انتہائی شدت کے عکاس ہیں۔اور اس ضمن کا آخری خط ہے۔جس میں سارا کی تحریر ظاہر کرتی ہے کہ جیسے وہ مرنے کے بعد بھی سعید سے مخاطب ہیں۔اور اس آخری خط میں سارا نے اپنا نام سارا سعید لکھا ہے۔سعید کے نام لکھتی ہیں۔''سورہے ہو؟ جاگو نا! نہیں تو میں بھی سو جاؤں گی۔۔۔تم باتیں کرو سعید، میں سن رہی ہوں۔۔۔پیار، پیار، پیار۔۔۔اپنے سعید کی سارا۔۔۔''۔۲۰۷

سارا کی تحریر کا یہ انداز ہ سارا کی خودکشی کے محرکات میں ایک اضافی اور نئے محرک کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ یہ وہ محرک ہے جس کے ساتھ سارا کی تمام زندگی کا حوالہ وابستہ ہو جاتا ہے۔وہ سارا کا رومانوی مزاج ہے۔لیکن وہ رومانوی مزاج نہیں۔ جسے ہم رومانویت کا کوئی مثبت، صحت منداور توانا رویہ کہہ سکیں۔ وہ رومانویت کو عشق ومحبت کے معاملات اور جذباتی سطح پر بسر کرتی ہیں ان کی رومانوی فطرت میں کوئی گہرائی، گیرائی اور تعمیری صورت دکھائی نہیں دیتی۔ بقول شوکت عابد''سارہ نارمل نہیں تھیں، پراسرار شخصیت کی مالک تھیں، انکے ساتھ جنسی مسائل بھی تھے۔سارا کی رومانویت کو ہم بیمار رومانویت کا نام دے سکتے ہیں۔''۔۲۰۸ ان تمام عوامل کی روشنی میں سارا کی خودکشی کے محرکات پر بات کرتے ہوئے اگرچہ اس کی اپنی شخصیت بہت فعال نظر آتی ہے۔لیکن اس ضمن میں مرد سماج کا مخصوص رویہ ایک بڑا اور نمایاں محرک دکھائی دیتا ہے۔بقول پروفیسر احمد جاوید''سارہ کی خودکشی Male dominating سوسائٹی کا چہرہ بے نقاب کرتی ہے۔''۔۲۰۹

اگر مرد سماج کا یہ مخصوص رویہ ان کی محروم اور ناکام زندگی میں اضافے کا باعث نہ ہوتا۔تو بہت ممکن ہے کہ سارا خودکشی نہ کرتیں۔اور اگر وہ خودکشی کے لئے آمادہ بھی ہوتیں۔تو اس بات کی گنجائش نکلتی ہے۔کہ ان کی خودکشی کا یہ عمل مزید کچھ عرصہ کے لئے تعطل کا شکار ہو جاتا۔کیونکہ سارا کی زندگی جس ہنگامی صورت حال سے گزرتی رہی۔اس میں سارا کو ایک تجربے کی ناکامی اور محرومی سے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔کہ ایسی ہی تلخ صورت حال سے وہ پھر فوری طور پر دوچار ہو جاتی تھیں۔اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سارا مستقل مزاج اور ثابت قدم نہیں تھیں۔

بقول گوہر سلطانہ عظمی ''ثابت قدم ہونے کے لئے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جبکہ سارا نے ہر بار اور ہر حال میں کسی نہ کسی مرد کا سہارا لیا۔ یوں ٹوٹنے کا عمل ہوتا رہا''۔ ۲۱۰ ایسی صورت حال کو پیدا کرنے میں مرد سماج نے اہم اور بنیادی کردار ادا کیا۔ اور اسی ہنگامہ خیزی کے دوران ہی آخر کار وہ خودکشی کی طرف عملی طور پر مائل ہوگئیں۔

سارا کی خودکشی کے ضمن میں ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ کیا ان کی شاعری میں خودکشی یا موت سے متعلق کوئی ایسا فکری حوالہ موجود ہے۔ جسے سارا کی خودکشی کے ضمن میں خالصتاً ایک ادیبانہ، علمی یا فکری محرک قرار دیا جاسکے۔ اس ضمن میں جب ہم سارا کے خاندانی پس منظر، ان کی زندگی اور شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو ان کی شاعری کے حوالے سے ایسے فکری محرک کی تلاش بے سود دکھائی دیتی ہے۔ جو سارا تک وراثتاً منتقل ہوئی ہو۔ لہٰذا ان کی شخصیت کی اٹھان میں ایسے علمی وشعری عوامل ناپید دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک Lower Middle Class طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ البتہ ذہنی اور فطری طور پر وہ اس طبقے سے اس لحاظ سے مختلف ضرور تھی۔ کہ ان کی حساس طبیعت اُنہیں اس طبقے سے فرق انداز میں اپنی پہچان پیدا کرنے کی خواہش عطا کر رہی تھی۔ لیکن کسی واضح سمت کا ان کے سامنے تعین نہ ہوا تھا۔ البتہ ان کی تحریروں سے واضح طور پر اس بات کا انداز ہوتا ہے۔ کہ وہ شاعر حضرات کو پڑھا لکھا طبقہ سمجھتی تھیں۔

بقول عذرا عباس ''سارا جب بھی میرے پاس آتی۔ تو کہتی آپ بہت اچھے شعر کہتی ہیں مجھے بھی شعر کہنے کا بہت شوق ہے۔ شاعر لوگ مجھے بہت پڑھے لکھے لگتے ہیں''۔ ۲۱۱ اسوقت تک سارا کی ایک یا دو شادیاں ناکام ہوچکی تھیں۔ اس کے بعد وہ احمد جاوید کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھیں۔ احمد جاوید ایک پڑھے لکھے اور ادبی ذوق کے حامل انسان تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سارا کی شاعری کے لئے پسندیدگی بھی اس شادی کی ایک وجہ بنتی ہے۔ احمد جاوید کے ساتھ سارا کا جو وقت گزرا۔ اسی دوران سارا نے شعر کہنے شروع کیے۔ جسکا کچھ حوالہ پچھلے صفحات میں بھی آچکا ہے۔

بقول شوکت عابد ''سارہ نے چوبیس پچیس سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ ان کے پہلے شعر کا مصرعہ غالباً یہ تھا۔ نابینا کی جھولی دو روشن آنکھیں رکھتی ہے''۔ ۲۱۲ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے۔ تو سارا کی شاعری کا عرصہ پانچ سے چھ سالوں پر محیط ہے۔ کیونکہ تقریباً تیس برس کی عمر میں، سارا نے خودکشی کی۔ چنانچہ یہ بات اپنی جگہ معنی رکھتی ہے کہ اتنا مختصر عرصہ کسی شاعری میں کسی ایسی بڑی سوچ اور فکری عنصر کو جنم نہیں دے سکتا۔ جسے ہم موت یا حیات بعد موت آشوب آگہی کا نام دے سکیں۔ اور پھر وہ سارا کے مخصوص حوالے سے،، جس نے ان پانچ چھ سالوں میں کئی جذباتی وابستگیوں کا نشیب وفراز دیکھا۔ کئی ازدواجی بندھن ناکام ہوئے۔ اور ان کی زندگی کے یہی آخری چند سال مسلسل محرومیوں کے حوالے سے ہنگامہ خیز رہے۔ اس دوران نہ تو وہ کسی بڑے ادبی پلیٹ فارم پر فعال رہیں تعلیم بھی واجبی تھی۔ اور مطالعاتی نگاہ بھی اس گہرائی اور گیرائی کی متحمل نہ تھی۔ جن سے حیات وممات کے بڑے بڑے اسرار وابستہ ہوتے ہیں۔ البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ سارا کے اندر شاعری کی کوئی چنگاری ضرور موجود تھی۔ پروفیسر احمد جاوید اس ضمن میں لکھتے ہیں۔'' یہ چنگاری ضرور موجود تھی۔ جو اپنے اظہار کے لئے موقع کی تلاش میں تھی''۔ ۲۱۳ اور یقیناً سارا کو یہ موقع اسوقت میسر آیا۔ جب احمد جاوید کے ساتھ سارا کی شادی ہوئی۔ گھر پر شاعر حضرات کا آنا جانا اور ادبی نشستوں کے باعث اس چنگاری کو ہوا ملی۔ یہاں پر بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ کہ سارا نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اور شعر کہنے شروع کیے لیکن یہ اشعار زیادہ تر سارا کی اپنی ہی زندگی کا ایک واضح حوالہ دکھائی دیتے ہیں۔

ان میں کسی بڑے ویژن یا موت کی طرف کسی بڑے فکری پہلو کی وہ پیش رفت دکھائی نہیں دیتی۔ جسے ہم رفتہ رفتہ سارا کی خودکشی سے وابستہ کر سکیں۔ وہ موت کا ذکر اپنے مخصوص انفرادی تجربوں اور ناکام زندگی کے حوالے سے کرتی ہیں۔ بقول کشور ناہید ''ہر فنکار کے فن میں اس کی اپنی زندگی کے تجربے ہوتے ہیں لیکن سارا نے اپنی سوانح کا یہ حوالہ بالواسطہ نہیں بلاواسطہ پیش کیا ہے۔''-۲۱۴ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ موت یا جستجوئے موت کا عنصر سارا کے ہاں کسی وسیع مطالعاتی نگاہ یا فکری حوالے سے نہیں۔ بلکہ ذاتی زندگی کے ناکام تجربوں کے حوالے سے آیا ہے۔ جسے ہم ان کی خودکشی کے ضمن میں کسی ادیبانہ محرک کے ساتھ وابستہ نہیں کر سکتے۔ اور جہاں کہیں اس کی شاعری میں اس حوالے سے فکری جہت کا احساس ہوتا بھی ہے تو وہاں اکثر مقامات پر ان کے شاعر شوہروں کا رنگِ شاعری بھی چھایا ہوا ہے۔ جو ایک فطری امر کہلا سکتا ہے۔ کشور ناہید اس حوالے سے کہتی ہیں۔ ''ہاں! افضال سید کے ساتھ شادی کے زمانے میں سارا کے اکثر اشعار پر افضال کے رنگِ شاعری کا گمان ہوتا ہے۔''-۲۱۵

سارا کی خودکشی کے ان تمام محرکات کا جائزہ لینے کے بعد جو حقائق سامنے آتے ہیں۔ ان کیمطابق سارا کی خودکشی کے محرکات میں کوئی عالمانہ، ادیبانہ یا فکری محرک موجود نہیں۔ یہ نچلے درجے کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہوئی ایک عورت کی خودکشی ہے۔ جس نے سوسائٹی میں اپنی پہچان منفرد انداز میں پڑھے لکھے طبقے کے درمیان کرانی چاہی۔ لیکن مسلسل ناکامیاں انکا مقدر بنتی چلی گئیں۔ اس کی وجہ ایک تو ان میں تعلیم کی کمی تھی۔ اور پھر جس طبقے کے ساتھ انکا تعلق تھا۔ اس نے سوائے ٹوٹ پھوٹ اور محرومیوں کے انہیں کچھ نہ دیا۔ خود یہ زندگی کو باشعور انداز میں برتنے کا سلیقہ نہ جانتی تھیں۔ فہم و ادراک اور سنجیدہ نظری کا ان میں شدید فقدان تھا۔ اپنی شناخت بنانے اور اپنی ذات کو منوانے کے لئے انہوں جو ذرائع اور حربے استعمال کیے وہ سماج کی نگاہ میں کسی طرح بھی لائق تحسین نہ تھے۔ ان کی شخصیت جو کھوکھلی بنیادوں پر استوار تھی۔ اس کے باعث سارا کے اندر وہ یقین جنم نہ لے سکا جو انہیں مضبوطی کے ساتھ ایک مقام پر قدم جمانے میں معاون ہوتا سارا نے اپنی زندگی کو داخلی اور فکری سطح پر نہیں۔ خارجی قوتوں اور عارضی سہاروں کے بل بوتے پر حل کرنا اور بسر کرنا چاہا۔ ازدواجی زندگی کے پے در پے تجربے بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ وہ ٹھہراؤ کے ساتھ زندگی کے کسی تجربے سے گزرنے کی شاید صلاحیت نہ رکھتی تھیں۔ اسی کے باعث ان کی شخصیت پر اعتماد بنیادوں پر استوار نہ ہو سکی۔ لہذا وہ بے دریغ سماج کی مخالف قوتوں کی بھینٹ چڑھتی چلی گئیں۔ ایک طرح سے وہ سماجی بائیکاٹ کے مرحلے تک پہنچ چکی تھیں۔ ان کی زندگی میں سوائے مایوسی، تنہائی، نشہ بازی اور مظلومیت کے اظہار۔ اور کوئی واضح اور مثبت صورتِ حال نظر نہیں آتی۔ ہسپتالوں میں زیرِ علاج رہنا، پاگل خانے میں قیام کرنا، سڑکوں پر آوارہ گھومنا کوئی در اور ٹھکانہ انکا منتظر نہ تھا۔ اسی عالم میں انہوں نے تین چار مرتبہ خودکشی کی کوشش کی۔ لیکن بچالی گئیں۔ آخر ۵ جون ۱۹۸۴ء کو سارا نے ایک مایوس کن زندگی کے ہاتھوں ٹرین کے آگے خودکشی کر لی۔ یہ خودکشی کسی حوالے سے بھی ایک ادیبہ، شاعرہ کی خودکشی نہیں بلکہ معاشرے کی ایک ستائی اور دھتکاری ہوئی عورت کی خودکشی ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت اسطرح سے کی جا سکتی ہے کہ سارا کی شخصیت کو اگر ہم دو حصوں میں تقسیم کر دیں۔ ایک حصے کو بحیثیت شاعرہ اور دوسرے حصے کو ایک عورت کے حوالے سے دیکھا جائے۔ تو بھی سارا کی خودکشی معاشرے کی ستائی ہوئی عورت کی خودکشی کہلائے گی۔ جس نے خود بھی اپنی زندگی کو سماج کے اخلاقی ضابطوں سے توڑ کر بسر کیا۔ اس انداز کی خودکشی میں زندگی کی ناکامی، مایوسی، تنہائی اور ناامیدی کے محرکات دکھائی دیتے ہیں۔ اور اگر سارا کی خودکشی کو صرف ان کی شخصیت کے دوسرے حصے بحیثیت شاعرہ دیکھا جائے تو سارا کی شاعری

میں موت کی تمنا اور موت سے متعلق ان کی فکری جہت کے وجود اور اس کے حوالے قدرے معدوم نظر آتے ہیں۔ اگر موت کی تمنا ہے تو ذاتی زندگی کی ناکامیوں اور محرومیوں سے گھبرا کر وہ خواہش مرگ رکھتی ہیں جس میں موت کے حوالے سے کوئی فکری اور علمی پہلو دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن سارا چونکہ شاعرہ تھیں۔ لہذا ان کے فن میں موجود موت کا حوالہ اور خواہش مرگ کے عنصر کو ہم ان کے خودکشی کے ارادے کا پیش خیمہ کہہ سکتے ہیں۔ بحیثیت شاعرہ موت اور حیات بعد موت سارا کے یہاں اس سطح کا فکری پلیٹ فارم نہیں ملتا۔ جو انہیں رفتہ رفتہ خواہش مرگ کے راستے پر گامزن کرتا ہوا خودکشی کے راستے پر لے گیا۔ شعر و ادب کا کسی قدر تخلیقی جوہر جو سارا کے اندر موجود تھا۔ سارا کی اخلاقی، سماجی اور جنسی بے راہ روی اس جوہر کو مثبت انداز میں پنپنے کے بہتر مواقع فراہم نہ کر سکی۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ادیبوں نے جب اور جہاں اس سطح کی اخلاقی اور جنسی گراوٹ میں خود کو ڈالا۔ اور بے راہ روی کا شکار ہوئے۔ پھر رفتہ رفتہ اس راستے نے انہیں خودکشی کی طرف مائل کیا۔ یا وہ اسی سبب سے اس راستے کی طرف دھکیل دیئے گئے۔
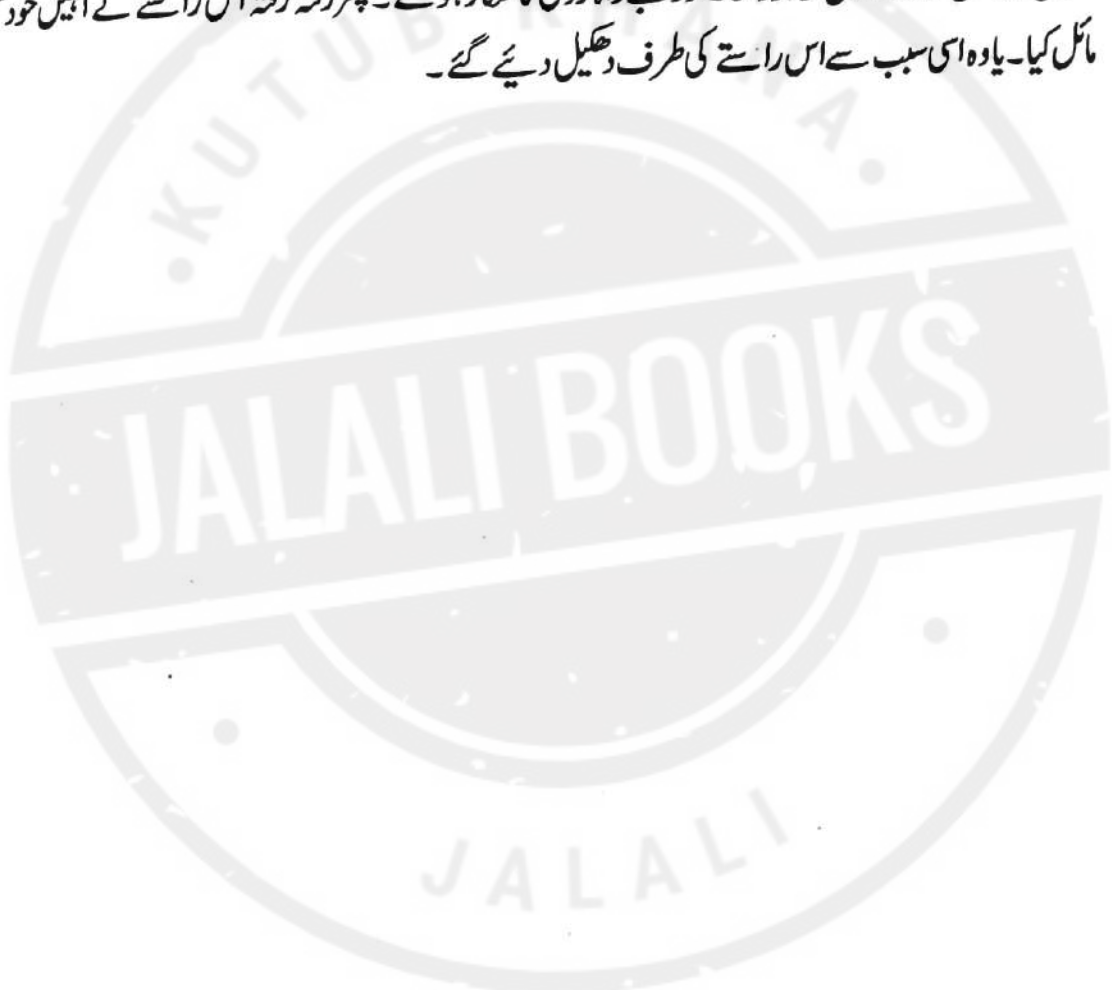
آنس معین (۱۹۵۹۔۱۹۸۶):

آنس معین جنکا شمار اردو ادب میں خودکشی کرنے والے شعرا میں ہوتا ہے۔ ملتان سے تعلق رکھتے تھے۔ آنس کا تعلق ایک معزز اور مذہبی گھرانے سے تھا۔ والد اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ گھر میں مذہبی مجالس کا انعقاد ہوتا تھا۔ بقول عارف بلے

> تصوف ہمارے گھر کا Subject اور ورثہ ہے۔ رات ہمارے گھر میں رتجگا رہتا ہے۔ ہم فجر کی نماز کے بعد سوتے ہیں۔ ہم پنجتن پاک کے ماننے والے ہیں خواجہ معین الدین چشتی سے ہماری خاندانی نسبت ہے۔ ۲۱۶

گھر کا یہ ماحول یقیناً آنس کی زندگی اور ان کی شخصیت کو منفرد اور ٹھوس بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ اس ضمن میں عارف بلے کا کہنا ہے آنس کا عقیدہ بہت مضبوط تھا۔ وہ اللہ اور نبی آخرالزمان پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ آنس ہر طرح کی کتب اور خصوصاً فلسفہ، تصوف اور نفسیات کا مطالعہ کرتے تھے۔ ان عوامل سے ظاہر ہوتا ہے کہ گھر کے علمی، ادبی اور مذہبی ماحول نے آنس کو کم عمری ہی سے ایک مثبت اور سنجیدہ سوچ عطا کی۔ جنہوں نے ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔

بقول فخر الدین بلے

> آنس فی الحقیقت بہت ہی پیارا بچہ تھا۔ عہد طفلی میں کھیل کے دوران یا کھلونوں اور ٹافیوں وغیرہ پر بچے جھگڑ بھی پڑتے ہیں۔ لیکن آنس کو ہم نے اس زمانے میں بھی بھائیوں بہنوں یا کسی اور سے کبھی جھگڑتے نہیں دیکھا۔ وہ کم آمیز ضرور تھا۔ مگر عموماً مسکراتا رہتا تھا۔۔۔ دھبہ تو بڑی چیز ہے وہ اپنے لباس پر معمولی سی شکن تک برداشت نہیں کرتا تھا۔۔۔ ۲۱۷

اس حوالے سے آنس کے دوست کلیم فارانی کا کہنا ہے۔

> آنس اس اعتبار سے بڑا نفیس آدمی تھا۔ بلکہ اس کی زندگی میں کبھی مجھ سے پوچھا جاتا۔ کہ نفاست کیا ہوتی ہے تو میں آنس کو لا کر کھڑا کر دیتا۔۔۔ اس کی زندگی کی ہر چیز میں ایک ترتیب تھی۔ ایک سلیقہ تھا ایک حسن تھا۔۔۔ ۲۱۸

آنس کی زندگی میں یہ ترتیب، حسن اور نفاست ان کی زندگی کے اس رخ کی نشاندہی کرتی ہے۔ کہ آنس زندگی کو ایک مخصوص انداز فکر، سلیقے اور اصول کے تحت گزارنے کے حامل تھے۔ لہذا ایسا انسان زندگی کی بے اصولی اور بے ترتیبی سے محتاط ہو کر چلتا ہے۔ اور جہاں کہیں اس اصول اور احتیاط میں وہ رخنہ انگیزی کو دیکھتا ہے۔ تو ردِعمل کے طور پر تمام ٹوٹ پھوٹ اس کے باطن میں ہوتی ہے۔ چنانچہ آنس کی خودکشی کے محرکات میں ان کی فطرت کے اس پہلو سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

آنس کم آمیز تھے۔ دوسروں کیلئے ہمدردی، خلوص اور اکثر ان کی طرف سے دکھی رہتے تھے۔ سب سے خندہ پیشانی سے ملنے کے باوجود بھی ایک فاصلہ برقرار رکھتے تھے نہ تو انہوں نے مشاعروں میں شرکت کر کے خود کو منوانے اور مشہور ہونے کی خواہش رکھی۔ اور نہ ہی اپنے کلام کی اشاعت میں بڑے شاعروں اور ادیبوں کے در کھٹکھٹائے۔ آنس کی خودکشی کے محرکات کے ضمن میں پہلی اور بنیادی شے آنس کی شاعری کا جائزہ ہے۔ جس سے واضح طور پر اس بات کا یقین کیا جاسکتا ہے۔ کہ آنس کی فکری سطح نہ صرف عام شعراء سے مختلف ہے بلکہ یہ فکری سطح سرعت کے ساتھ خواہش مرگ کے ساتھ وابستہ نظر آتی ہے۔ ان کے نزدیک شاعر فطری ہوتا ہے۔ اور شعر فہمی بھی ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی۔ یہ بات ان کی اپنی زندگی اور شاعری پر بھی صادق آتی ہے۔ ان کی شاعری زندگی تھی اور زندگی شاعری بن گئی۔ اندر اور باہر، خارج اور داخل میں کوئی فاصلہ نہ رہا۔

بقول ڈاکٹر انور سدید

> آنس معین کی غزل اس کی زندگی کا استعارا ہے۔ اس نے مصرعے موزوں نہیں کیے۔ بلکہ اس طوفان کی اطلاع دی ہے۔ جو گرد و پیش میں واقعات کی صورت اس کے دل پر یلغار کر رہا تھا۔ وہ تضادات کی زد میں تھا۔ ۲۱۹

لیکن اس کی خبر اس کی زندگی میں شاید کسی کو نہ تھی۔ بقول فخر الدین بلے

> ہم اس کی تخلیقات اور اس کی باتوں کو محض شاعری سمجھتے رہے۔ اس کے بھائی بہنیں اور احباب ''دانشور'' کہہ کر اسکا مذاق اڑاتے رہے۔ اس کی چھوٹی بہن اکثر اس سے کہتی تھی۔ کہ آنس بھائی آپکی شاعری میں تو بس اندر اور باہر کے آدمی میں جنگ ہی ہوتی رہتی ہے۔ ۲۲۰

اور حقیقت بھی یہی تھی اور یہ بھی کہ اندر کا سچ باہر کے جھوٹے خول کو تڑا کے ساتھ توڑ رہا تھا۔

اس کے پیچھے چھپی ہیں کتنی دیواریں
جسم کی یہ دیوار گرا کر دیکھوں گا
عجب انداز میں یہ گھر گرا ہے
میرا ملبہ میرے اوپر گرا ہے

یہ شکست وریخت محض خارجی یا مادی سطح پر نہیں تھی۔ بلکہ ظاہری وجود کی دیواریں گرا کر آنس کے اندر کے سچ کی یہ زبان، اسکا یہ لہجہ سب کو چونکا گیا۔ وہ شہسوار جو اس کوہ و دمن کے شناور تھے۔ حیرت زدہ تھے۔ آنس کے والد نے اسی حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا کو لکھا۔ ''سرگودھا میں سب سے پہلے آپ نے آنس کی سوچ کو غیر معمولی اور اس کے لہجے اور

اشعار کو چونکا دینے والا کہا تھا۔ اور یہ بھی فرمایا تھا۔ کہ اس کے بعض اشعار سے تو مجھے خوف آتا ہے۔۔۔''۔۲۲۱
یہ خوف اشعار اور لہجے کا نہیں تھا۔ بلکہ اس سے خوف تھا جو آنے والے کل میں ہونے والا تھا۔ ان کے اشعار جس خونی افق پر طلوع ہو رہے تھے۔ یہ خوف ان سمتوں کی نشاندہی کر رہا تھا۔

انجام پر پہنچوں گا میں انجام سے پہلے
اب میری کہانی بھی سنائے گا کوئی اور

ہماری مسکراہٹ پر نہ جانا
دیا تو قبر پر بھی جل رہا ہے

وسعت دریا میں گم ہو جاؤں گا
ایک بچے کی طرح سو جاؤں گا

آنے والا کل طشت از بام تھا۔ لیکن بظاہر آنس مطمئن اور پرسکون تھے۔ ان کے رویے میں عام طور پر خودکشی کرنے والوں جیسا کوئی طریقہ کار اور رجحان طبع دکھائی نہ دیتا تھا۔
بقول ڈاکٹر وزیر آغا'' وہ بظاہر انتہائی پرسکون تھا۔ اور اسکا وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ کہ اس کے اندر کتنے طوفان موجزن ہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کے اشعار میں مجھے شکیب جلالی والا کرب محسوس ہوتا تھا۔''۔۲۲۲ اس کرب میں خوف کی کیفیت بھی ہے۔ اور سفر کا بھی ایک واضح حوالہ موجود ہے۔ یہ سفر کیا سفر تھا؟ ایک دنیا سے دوسری دنیا تک کا سفر، باہر سے اندر کا سفر، پستی سے بلندی کا سفر، تشکیک سے ایمان کے آب حیات تک کا سفر، وہم وگمان سے حقیقت اولیٰ کی جستجو کا سفر۔ سارے زاویے، ساری سمتیں آنس کے سفری استعارے کی زد میں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے اشعار میں تمام استعارے جو جگہوں، مکانوں، دنیاؤں، دریاؤں اور گلیوں وغیرہ پر مشتمل ہیں کم وبیش اسی سفر کا ہی حوالہ بنتے نظر آتے ہیں۔

رہتا ہوں جس زمین پر وہی اوڑھ لوں گا
جائے اماں اک اور بھی ہوتی ہے گھر کے بعد

ہے میرے اندر بسی ہوئی ایک اور دنیا
مگر کبھی تم نے اتنا لمبا سفر کیا ہے

اندر کی دنیا سے رابطہ بڑھاؤ آنس
باہر کھلنے والی کھڑکی بند پڑی ہے

بات اگر ان بند کھڑکیوں کی ہو۔ اندر کے خوف کی ہو۔ تو اس خوف کی کئی سمتیں ہوسکتی ہیں۔ یہ خوف روح کے ار جانے کا خوف ہے۔ جو اندر کی دنیا کا خارج سے عدم مطابقت کے باعث بھی ہے۔ لیکن بات یہ بھی ہے کہ اس خوف

نے کوئی بہت زیادہ روپ اختیار نہیں کیے۔اس خوف کو وجود ملنے کے ساتھ ہی انکا ایک نا معلوم اور غیر محسوساتی سا سفر شروع ہو گیا۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے آنس کی شاعری کا آغاز ۱۹۷۷ء میں ہوا۔ اور تقریباً نو برس میں انہوں نے ڈیڑھ سو سے زیادہ غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ ان غزلوں اور نظموں میں نہ تو کوئی ادوار کی تقسیم کی واضح صورت ہے۔ اور نہ ان کی فکر میں ارتقاء کی کوئی ایسی کیفیت ۔ جو ایک دور کو دوسرے سے فرق کرتی جائے ۔ بلکہ مجموعی طور پر ان کی شاعری کے بنیادی مزاج کی کیفیت ایک سی رہتی ہے۔ اور اسی بنیادی مزاج کا رنگ رفتہ رفتہ گہرا ہونے لگتا ہے۔ اور یہ رنگ ذات، کائنات، معرفت، روح اور زندگی کی بے معنویت میں معنویت کی تلاش کے رنگ ہیں۔ ''جن میں حقیقتِ ذات و کائنات کی دریافت اور معرفت و اماں کی یافت کے لئے ظاہر و باطن کی کش مکش کا مادہ تسلسل نمایاں ہے۔ جو بالآخر اس کی موت پر منتج ہوا''۔۲۲۳

بقول ڈاکٹر وحید قریشی ''آنس کے یہاں احساس تنہائی بہت ہے۔''۔۲۲۴ آنس کی مختصر زندگی کا سفر خوف، اضطراب، تلاشِ حق اور عجلت پر مبنی ہے۔ اس کے ردعمل کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ خارج سے کٹ کر صرف اپنے اندر کی دنیا میں، اپنی ذات کے اندر ہی سمٹ جانا۔ یہاں اس سمٹنے میں سکوت و جمود کی کیفیت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں معاملہ فرق ہے۔ یہاں ذات کے اندر سمٹنے اور خارج سے خوفزدگی کے بعد اس کے اندر کے سفر کا در کھل جاتا ہے۔ اور حیرت زدگی اسوقت مزید بڑھ جاتی ہے۔ جب اس سفر کے اسرار جاننے سے روح عاجز ہے لیکن اسکا شوق پرواز بے قرار و چند ہوتا جاتا ہے۔ شواہد بتاتے ہیں کہ آنس اس مقام تک پہنچا ضرور تھا۔

بقول انور جمال

> ایک تو اُنہیں بیرون ذات کوئی ایسا سورج نظر نہ آیا۔ جو اس کے اندرونی نظام شمسی سے وسیع تر ہو۔۔۔ دوسری اہم بات جو آنس کو مصطفیٰ زیدی اور شکیب سے الگ پہچان دیتی ہے۔۔۔ وہ ہے متصوفانہ تجربہ۔ صوفیانہ فکر اور Self Realization (عرفان ذات)۔۔۔ چنانچہ آنس کے جینئس کا مصطفیٰ زیدی اور شکیب جلالی سے موازنہ کرنا ادبی، فکری و رتنقیدی غلطی ہوگی ۔۔۲۲۵

یہاں یہ بحث خارج از موضوع ہے کہ مصطفیٰ زیدی، شکیب اور آنس کا باہمی موازنہ اور تقابل کہاں اور کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہ ضرور کہ یہ تمام نام اسی پس منظر میں حیات و کائنات کے حیرت کدوں کی نذر ہوئے لیکن اصل سوال آنس کے متصوفانہ تجربے اور عرفان ذات کے حوالے سے ہے۔ متصوفانہ تجربہ کیا ہے، اسکا آغاز اسوقت ہوتا ہے۔ جب عرفان ذات وقوع پذیر ہو جائے۔

بقول ڈاکٹر وحید قریشی ''جب ہم کسی کے مرنے پر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا عَلَيْهِ رَاجِعُوْن پڑھتے ہیں۔ تو دراصل ہم مرنے والے کیلئے نہیں بلکہ اپنی ہی ذات کے حوالے سے اور اپنے ہی لوٹنے کا ذکر کرتے ہیں۔''۔۲۲۶

آنس اس حوالے سے عرفانِ ذات کی سیڑھی پر قدم رکھ چکے تھے۔ زندگی کی بے معنویت میں انہیں معنویت کی تلاش تھی۔ حیات کے آخری ورق کی تلاش۔ اب اس کی تلاش میں انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا۔ جو راستہ اپنایا۔ وہ فرق تھا۔ سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ کیا وہ اس اندر کے اسرار سے ہم آہنگ ہونے کے ادب و آداب اور ان کے قرینوں سے نابلد تھے۔ اس ریاضت کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ جو روح کو آبلہ پائی کے بعد انا الحق کا ذائقہ عطا کرتی ہے۔ اس حوالے سے ان

کے یہاں بظاہر متصوفانہ تجربے کی بھٹی میں سلگنے اور سلگتے رہنے کا عمل کم کم نظر آتا ہے۔ ایسا عمل جس میں انتظار، صبر، کشف، کرامتیں، دید، شنید اور ہجر کا کرب سب کچھ شامل ہو جاتا ہے۔ یہاں تو کھیل شروع ہوتے ہی خاتمے کا مرحلہ آ گیا۔

میں زندگی کی یکسانیت سے اکتا گیا ہوں کتابِ زیست کا جو صفحہ پلٹتا ہوں۔ اس پر وہی تحریر نظر آتی ہے۔ جو پچھلے صفحے پر پڑھ چکا ہوتا ہوں۔ اس لئے میں نے ڈھیر سارے اوراق چھوڑ کر وہ تحریر پڑھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو آخری صفحے پر لکھی ہوئی ہے۔ ۔۲۲۷

اور متصوفانہ تجربے کے حوالے سے ذہن اس پہلو سے بھی سوچتا ہے۔ کہ کیا اس سفر میں مرشد کا وجود وجود ہوتا ہے۔ آنس کے ہاں کیا وہ خانہ خالی رہا۔ کیا یہاں توسنِ عمر کی لگام اسکے ہاتھ سے چھوٹے جاتی تھی۔ کیا وہ عمر کے جس مرحلے پر تھے۔ شدتِ جذبات نے تلاشِ حق میں عجلت برتی۔ یا پھر عشق کی ایک جہت نے قصہ تمام کر دیا۔ یعنی ان کے آس پاس کہیں نہ کہیں کوئی محرک اور سبب ایسا بھی تھا۔ جس نے آتشِ عشق کو مہمیز لگائی۔ اس ضمن میں بقول ان کے والد اس واقعہ کی بھی اہمیت ہو سکتی ہے۔ ''۔۔۔۔ایک محفل میں ان کے ایک صوفی دوست نے کہا تھا۔ کہ اگر لوگوں کو دوسری دنیا کے حسن و جمال اور خوبصورتی کی خبر ہو جائے۔ تو شاید آدھے سے زیادہ انسان خودکشی کر لیں۔'' ۔۲۲۸اس واقعہ کا ذکر آنس کے بھائی عارف بلے نے بھی کیا اور وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ آنس نے اس واقعہ کا کافی اثر لیا تھا اس بات میں کافی حد تک وزن موجود ہے۔ کیونکہ آنس عہدِ شباب کے نازک اور حساس دور سے گزر رہے تھے۔ جذبات و احساسات میں شدت تھی۔ پھر ان کی شاعری کا مزاج بھی اسی رخ بہہ رہا تھا۔ لہذا بعید از قیاس نہیں۔ کہ آنس کے شب و روز دوسری دنیا کے سحر میں مبتلا ہوتے گئے ہوں۔

اور پھر وہ خارجی ماحول کے حوالے سے سماج کے مجموعی اور عمومی رویے میں ضرور ایک تضاد محسوس کرتے تھے۔ اس احساس میں کرب بھی ہے۔ اور شدت بھی۔ اس ضمن میں وہ محتاط بھی ہیں اور خوفزدہ بھی۔ اس حوالے سے وہ اپنے وجود کے اندر اور باہر کو بھی کھوج رہے ہیں۔

بدن کی اندھی گلی تو جائے اماں ٹھہری
میں اپنے اندر کی روشنی سے ڈرا ہوا ہوں

تو جستجوئے سحر میں نکلے تو اسقدر احتیاط رکھنا
کہ تیری پرچھائیں تک بھی تجھ کو قدم اٹھائے ہوئے نہ دیکھے

آنس بظاہر ایک نارمل انسان تھے۔ نارمل سطح پر سوچتے تھے۔ ان کے نقطۂ نظر میں بھی لچک تھی۔ ''لوگوں نے میرے ساتھ اگر کوئی زیادتی کی بھی ہے۔ یا کسی نے میرا کچھ دینا ہے تو وہ میں معاف کرتا ہوں۔ خدا میری بھی زیادتیوں اور گناہوں کو معاف فرمائے۔'' ۔۲۲۹ آنس کی خودکشی اس لحاظ سے بھی قابلِ غور ہے۔ کہ ان کے رویے کی خارجی سطح بہت حد تک نارمل انسانوں جیسی تھی فکر میں موجوں کا تلاطم تھا۔ لیکن بظاہر وہ ایک خاص رکھ رکھاؤ اور نفاست کے ساتھ زندگی کی گہما گہمی میں شریک کار تھے۔ یہاں یہ سوال ابھرتا ہے کہ تصوف، روحانیت، اور وجدانی کیفیت پر مبنی جو احساس آنس کے اندر نہ صرف پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ بلکہ یہ واردات اپنی پختگی کے سفر پر تیزی کے ساتھ گامزن ہو چکی تھی۔ اسی دوران کہیں پر کوئی خاص نوعیت کے ایسے حالات یا حادثات منظر سے ابھرے۔ جنہوں نے روح کے اس سفر میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ کشف و کرامات کی لاٹھی ہاتھ سے گری نہیں۔ بلکہ ٹوٹ گئی۔ ان سوالات کا جواب یقیناً ضرورت محسوس کرتا ہے۔

کہ آنس کی ذاتی اور گھریلو زندگی کے حوالے سے دیکھا جائے۔ کہ ایسے کون سے سنگین، نازک اور فوری نوعیت کے معاملات تھے۔ جنہوں نے آنس کی زندگی کا نہ صرف رخ موڑ دیا۔ بلکہ عنوانِ حیات کے ورق پلٹ دیئے۔

بقول آنس کے اہل خانہ گھریلو اور ذاتی زندگی میں وہ سب کے لئے ہمدرد مخلص، تمام رشتوں کے درمیان ہر جذبے سے سرشار، حصول روزگار میں مشغول، لکھنے لکھانے میں منہمک۔ گویا آنس کے اہل خانہ نے زبانی یا تحریری طور پر کہیں بیان نہیں دیا۔ کہ آنس کی زندگی میں سرکاری یا جذباتی ونفسیاتی سطح پر ایسی الجھنیں موجود تھیں۔ جنہوں نے رفتہ رفتہ نا مساعد حالات کے پیش نظر آنس جیسے حساس شاعر کے لئے مسائل کا روپ دھار لیا جبکہ اس ضمن میں دورانِ تحقیق یہ بات منظر عام پر آئی۔ کہ آنس کا اپنے دفتر میں کام کرنے والی ساتھی خاتون سے جذباتی تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اور دونوں کے درمیان بات سنجیدگی کے ساتھ شادی کے حوالے سے چل رہی تھی۔ اس ضمن میں جب راقمہ کی آنس معین کے بھائی عارف بلے سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا۔

> ہمارے گھر میں بیٹوں اور بیٹیوں سے پوچھ کر رشتے کیے جاتے ہیں آنس نے کبھی نہیں کہا کہ میں کسی کو پسند کرتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ آنس نے بنک میں اپنے ساتھ کام کرنے والی لڑکی سے شادی کی خواہش کا اظہار کی۔ والدہ نے حامی بھر لی۔ کہ ہم وہاں ضرور جائیں گے۔ ۔۲۳۰

اس صورتِ حال سے متضاد کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ پہلے یہ کہا گیا کہ آنس نے کبھی اس خواہش کا اظہار ہی نہیں کیا۔ کہ وہ کسی لڑکی کو پسند کرتے ہیں۔ اور پھر ساتھ ہی یہ کہنا کہ آنس نے اپنی ساتھی لڑکی سے شادی کا خیال ظاہر کیا۔ اس سے علم ہوتا ہے کہ آنس ضرور اپنے دفتر کی ساتھ کام کرنے والی خاتون سے سنجیدگی کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور اس ضمن میں دونوں کو مسائل درپیش تھے۔

جبکہ بقول فخر الدین بلے" شادی کیلئے لڑکی کے انتخاب کا معاملہ بھی اس نے یہ کہہ کر گھر والوں پر چھوڑ دیا تھا۔ کہ اس کی نظر میں سب سے بہتر وہ لڑکی ہوگی جو کنبے میں بہتر طور پر ایڈ جسٹ ہو سکے۔" ۔۲۳۱ آنس کے عشق اور شادی کے معاملے میں یہ آراء ان کے اہل خانہ کی ہیں۔ جبکہ بقول صلاح الدین درویش" ۔۔انہیں ایک خاتون سے محبت ہو گئی۔ یہ دل لگی آنکھوں آنکھوں میں بلند ہو کر عشق کی سطح پر پہنچ گئی۔ یہ خاتون اسی بنک میں ملازم تھی۔ جس میں آنس ملازمت کرتے تھے۔ ۲۳۲

صلاح الدین درویش نے اس ضمن میں زاہد بن عبداللہ کے حوالے سے معلومات جمع کیں۔ اور اس خاتون سے بھی انٹرویو کیا۔ جن کے ساتھ آنس کے عشق کا سلسلہ چلا تھا۔ زاہد بن عبداللہ اسی دفتر میں ملازم اور آنس کے قریبی راز دار دوست تھے۔ تفصیل کے مطابق دونوں شادی کے خواہاں تھے۔ بقول صلاح الدین درویش" دونوں میں اچھی خاصی انڈرسٹینڈنگ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے گھریلو اور شخصی حالات سے بخوبی آگاہ تھے۔ اکثر سیر وتفریح کیلئے اکٹھے نکل جایا کرتے تھے۔" ۔۲۳۱ جہاں تک شادی کا سوال ہے آنس اور وہ خاتون دونوں مسائل کا شکار تھے۔ خاتون کی پہلے منگنی ہو چکی تھی۔ جو اس نے آنس کے کہنے پر توڑ دی تھی۔ اب آنس کے گھر والوں کی رضامندی کا سوال تھا۔ جو اس شادی کیلئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ بقول صلاح الدین درویش

خاتون نے انٹرویو میں بتایا۔ کہ تین مرتبہ آنس نے خود انہیں کہا تھا کہ ہم سول کورٹ

میرج کر لیتے ہیں۔ کیونکہ آنس کے گھر والے شاید اس شادی پر رضامند نہ تھے۔
خاص کر والدہ کو منا سکتے۔ لیکن آنس کو دنیا میں سب سے زیادہ محبت اپنی والدہ سے
تھی۔ وہ کسی بھی صورت ان کی دل آزاری نہ کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ آنس کی والدہ کسی
اور جگہ آنس کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔۔۔۔ ۲۳۴

چنانچہ آنس کو اپنے گھر سے اس شادی کی اجازت نہ مل سکی۔ اور خاتون نے سول کورٹ میرج کرنے سے انکار کردیا۔ لہذا دونوں کے درمیان جذباتی رابطہ منقطع ہوگیا۔ اور بد دل ہو کر آنس نے اپنے دفتر کی کسی اور برانچ میں تبادلہ کروا لیا۔ ان حالات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ آنس عہد شباب میں محبت کی چوٹ کا صدمہ نہ سہہ سکے۔ انکے اہل خانہ نے یا تو ان کی خودکشی کے اس محرک کو در خور اعتنا نہیں سمجھا۔ یا پھر شعوری طور پر اس پہلو کی پردہ پوشی کی گئی۔ لیکن بات یہ ہے کہ محبت میں ناکامی کا داغ یقیناً ان کی خودکشی کے محرکات میں سے ایک ایسا محرک ہے۔ جس نے اکثر ادیبوں کو یا تو خودکشی پر آمادہ کیا یا انہیں عمر بھر نشہ کا عادی بناتے ہوئے لحہ بہ لحہ موت کے راستے پر گامزن کردیا۔ آنس کی خودکشی کے محرکات میں کئی باوثوق ذرائع سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ آنس کی خودکشی کا ایک فوری محرک ان کے دفتر سے سرکاری رقم کا غبن تھا۔ وہ بنک میں جس شاخ کے انچارج تھے۔ اس شاخ سے متعلقہ رقم کا خرد برد ہوا تھا۔ سی۔ آئی۔ اے اس کی تفتیش پر مامور تھی۔ لیکن اس حوالے سے جب آنس کے اہل خانہ سے بات ہوئی۔ تو اس پہلو کی نہ تو کوئی وضاحت ہوئی اور نہ آنس کی خودکشی کے محرکات میں کسی ایسے بڑے اور نازک سرکاری مسئلے کا ذکر کیا گیا۔ البتہ آنس کے بھائی عارف بلے نے اس ضمن میں کہا: ''آنس دفتری معاملات میں ہر دلعزیز اور محنتی تھا۔ انہیں وہاں اس قسم کا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا۔ جسے ہم اس کی خودکشی کے محرکات میں شامل کریں۔'' ۔ ۲۳۵

لیکن دوران تحقیق اس قسم کے شواہد ملے ہیں۔ جنہیں ہم کسی صورت آنس کی خودکشی کے پس منظر میں خارج از بحث نہیں کر سکتے۔ ابھی آنس اپنے دفتر کے ساتھی خاتون کے ساتھ جذباتی تعلق کے ختم ہونے کا صدمہ جھیل نہ پائے۔ کہ بینک کے کسی کارندے نے تقریباً ۳۰ ہزار روپے سرکاری رقم خرد برد کر دی۔ بدقسمتی سے آنس اسی شاخ کے سربراہ تھے۔ اس دوران تفتیش میں آنس کو بھی شامل کیا گیا۔ آنس کیلئے رقم کے خرد برد کا مسئلہ یقیناً بڑا تھا۔ لیکن اس سے بڑھ کر بات عزت اور بے عزتی کی تھی۔ اس بات کی تصدیق اس خاتون نے بھی کی۔ جس کے ساتھ آنس کا عشق چل رہا تھا۔

بقول صلاح الدین درویش ''۔۔۔ خاتون نے بتایا۔ کہ اس سلسلہ میں آنس پر زیادہ شبہ کیا گیا۔ کیونکہ وہ اس شاخ کے انچارج تھے۔'' ۔ ۲۳۶ اس سلسلے میں بعض آراء کے مطابق ایف۔ آئی۔ اے نے بنک فراڈ کا جو کیس تیار کیا تھا۔ اسکا فیصلہ آنس کی وضاحت تک نہیں ہوا تھا۔ جبکہ صلاح الدین درویش کا کہنا ہے۔

ایک نہایت ہی معتبر راوی۔۔۔ جس نے اپنا نام اور پتہ مقالہ نگار کو لکھنے سے منع
کیا ہے۔۔۔ کا کہنا ہے۔ کہ موت سے ایک روز قبل بنک فراڈ کیس کا فیصلہ ہو چکا تھا۔
اور اس کے ملنے والے تمام شواہد آنس کے خلاف گئے اور ایف۔ آئی۔ اے والوں
نے سزا اور جرمانہ سے متعلق آنس کو اشارہ کر دیا تھا۔۔۔۔ ۲۳۷

یہ حالات ظاہر کرتے ہیں۔ کہ آنس کی ذہنی کیفیت کیا تھی۔ اور وہ موت سے ایک دن قبل حتیٰ کہ جس دن خودکشی کی۔ بے چینی اور اضطراب کی حالت میں دفتر گئے۔ اپنے قریبی احباب جس میں وہ خاتون بھی شامل تھی۔ بے ربط اور

الجھی ہوئی باتیں کرتے رہے۔ اور موت سے تقریباً تین گھنٹے قبل اپنے قریبی دوست زاہد بن عبداللہ سے ملنے بھی گئے۔ ملاقات اگر چہ نہ ہو سکی۔ لیکن آنس کی دلی اضطرابی کیفیت کا اس سے اظہار ضرور ہوتا ہے۔

بحث اس سے نہیں کہ آنس مجرم تھے یا نہیں تھے۔ بلکہ ان شواہد سے یہ بات آنس کی خودکشی کے محرکات میں بہت اہم اور قرین قیاس دکھائی دیتی ہے۔ آنس خود اور اپنے خاندانی پس منظر کے حوالے سے لوگوں کی نظروں میں معتبر تھے۔ حساس تھے اور ایک باعزت زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے لئے یہ اذیت ناک صورت حال جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ آنس کی ذہانت، شہرت اور قابلیت کے پیش نظر پیشہ وارانہ رقابت نے کوئی کردار ادا کیا ہو۔ یا جس خاتون سے آنس کا جذباتی تعلق تھا۔ آنس کی وجہ سے اس خاتون کی سابقہ منگنی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ اپنے گھر والوں کی مخالفت کے باعث وہ اس خاتون سے شادی بھی نہ کر پائے کہ اس کے لواحقین کا کوئی ردعمل ہوا ہو۔ اور کسی مبینہ سازش کے تحت آنس کو بنک فراڈ میں ملوث کر کے انہیں بے عزت کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

یہ تمام صورتِ حال ظاہر کرتی ہے۔ کہ آنس کی خودکشی کے محرکات میں سرکاری رقم کے اس خرد برد نے جو باقاعدہ ایک مقدمے کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ اہم کردار ادا کیا۔ ایک حساس انسان کی اس سے بڑھ کر اور بے عزتی کیا ہو سکتی تھی۔ کہ وہ سزا یافتہ مجرم کے طور پر سماج کے سامنے آتا۔ لہٰذا انہوں نے موت کو ہی اپنے لیے جائے اماں سمجھا۔ اور جان سے گزر گئے۔ بات یہ ہے کہ ایسے معاملات کو ایسے نازک حالات میں ادیبوں کے لواحقین یا تو اپنے خاندانی وقار کی پردہ پوشی کے سبب شعوری طور پر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ یا ان کے نزدیک یہ المناک صورتحال جو خودکشی کے عمل پر منتج ہوتی ہے۔ کسی اخلاقی یا نفسیاتی نوعیت یا کیفیت سے وابستہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ اخلاقی یا نفسیاتی نوعیت کی کیفیات بظاہر دکھائی نہیں دیتیں۔ شاید اسی لئے بعض اوقات ان حالات میں ان عوامل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کچھ اس طرح کی صورتحال آنس کی خودکشی کے محرکات سے بھی وابستہ ہے۔ آنس کے والدِ محترم نے آنس کی خودکشی کے موقع پر جہاں آنس کی ذاتی اور گھریلو زندگی کے حوالے سے کسی ناخوشگوار واقعہ یا بات کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح انہوں نے آنس کے دفتری معاملات میں بھی کسی فوری تکلیف دہ معاملہ کی نشاندہی نہیں کی۔ جسکا آنس نے شدید اثر لیا ہو۔ اور اس کے باعث آنس ذہنی دباؤ کا شکار ہوئے ہوں۔

آنس کے والد کا کہنا ہے۔

> بینک میں جہاں وہ کام کرتا تھا چھوڑے بڑے سب اس کی شرافت کے اور صلاحیت کے معترف تھے۔۔۔ اس نے فارن ایکس چینج کی تربیت میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ اور اس کی فارن پوسٹنگ متوقع تھی۔ ۲۳۸

جبکہ آنس نے اس ضمن میں اپنے آخری خط میں جو خودکشی کے وقت ان کی جیب سے برآمد ہوا لکھا ہے۔ "مجھے نہ تو گھر والوں سے کوئی شکایت ہے نہ دفتر والوں سے۔ نہ باہر والوں سے۔ بلکہ لوگوں نے مجھ سے اتنی محبت کی ہے کہ میں اسکا مستحق بھی نہیں تھا"۔ ۲۳۹ آنس کے اس آخری خط کا متن، الفاظ اور لب و لہجہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آنس نے جن جن لوگوں سے کوئی شکایت نہ ہونے کا حوالہ دیا ہے۔ در پردہ اس میں شکایت ہونے کی رمز موجود ہے۔ ورنہ وہ یہ بھی لکھ سکتے تھے کہ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ چونکہ شاعر تھے حساس تھے بااصول تھے۔ لہٰذا خاندانی وقار کا بھرم رکھتے ہوئے حقائق کی پردہ پوشی میں احتیاط برتی۔ اس ضمن میں صلاح الدین درویش کا کہنا ہے۔

چونکہ آنس ایک خاص علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کے والد اعلیٰ سرکاری ملازم تھے۔ ایک خاص خاندانی مقام تھا۔ اور اعلیٰ نسبی کا احساس یہ تمام ایسی چیزیں تھیں کہ آنس کو اپنی موت پر بھی پردہ ڈالنا پڑا۔ ۲۴۰

یہاں اس حوالے سے آنس کی موت پر پردہ ڈالنے کی بات درست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن صرف انہی ذاتی، گھریلو اور سرکاری نوعیت کے مسائل کو ہی اس موت کیلئے جواز نہیں بنایا جاسکتا۔ کیونکہ اس صورت میں آنس کی شاعری کی ایک مخصوص و منفرد فکری سمت جو شدت کے ساتھ خواہش مرگ سے وابستہ تھی۔ اور جس نے اس عہد کے نامور ادیبوں اور شاعروں کو بھی چونکا دیا تھا۔ بے معنی ہو جاتی ہے۔ جبکہ آنس کی خودکشی کے محرکات میں اس خواہش مرگ پر مبنی شدت احساس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں تک خارجی ماحول کی مشکلات کا تعلق ہے۔ انسان میں دو طرح کی صورت حال ممکن ہوسکتی ہے۔ ایک تو یہ دیکھنا کہ انسان اپنی طبیعت اور مزاج کے حوالے سے کہاں تک ان حالات کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ان حالات کو قبول نہ کر سکنے کی صورت میں کیا رویہ اختیار کرتا ہے۔ دوسروں کیلئے مسئلہ بننے کی بجائے مسائل اور ان کا حل اپنی ذات کے اندر سمیٹ لیا۔ یہ مسائل ذات کے بھی ہیں، اور کائنات کے بھی داخل کے بھی ہیں۔ اور خارج کے بھی۔ آنس کے اس رویے کی ترجمانی ان کی شاعری سے بھی بخوبی ہوتی ہے۔

چھوٹ جائیں قیدِ شب سے رسمِ خود سوزی کے بعد
آؤ جگنو بن کے نکلیں روشنی اوڑھے ہوئے

گہری سوچ ،لمبے دن اور چھوٹی راتیں
وقت سے پہلے دھوپ سروں تک آ پہنچی

حیرت ہے جو یوں میری طرف دیکھ رہے ہو
لگتا ہے کبھی تم نے سمندر نہیں دیکھا

آنس کی شاعری کا یہ رویہ واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے کہ آنس ایک طرف اپنے اندر کی دنیا کے حیرت کدوں کے باسی تھے۔ تو دوسری طرف زندگی کی خارجی فضا ان کیلئے اطمینان بخش نہ تھی۔ وہ اندر کے جس سفر پر دھیمے دھیمے انداز میں گامزن تھے۔ اس سفر کو قدرے مختلف انداز میں خارجی ماحول کی تلخیوں نے عجلت میں طے کرایا۔ چونکہ وہ شاعر تھے حد درجہ حساس تھے جو دیکھ رہے تھے اشعار میں رقم کر رہے تھے جو محسوس کرتے تھے۔ شاعرانہ پیرایۂ بیاں میں سمو دیتے۔ اس حوالے سے کہا جاسکتا ہے۔ کہ آنس کے شاعرانہ تجربے اور مشاہدے میں حد فاصل کھینچنا محال ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آنس نے خارجی زندگی کے مسائل کو بھی اپنی فکر کی داخلی بنت میں ضم کر دیا تھا۔ بہت ممکن ہے۔ کہ محض اسی سبب سے بھی اکثر آنس کی خودکشی کا محرک انکی شاعری کا یہ مخصوص مزاج اور رویہ قرار پایا۔ جبکہ شواہد اس کے برعکس بھی تھے۔ اس ضمن میں دوران تحقیق آنس کی خودکشی کے حوالے سے ان کے مزید مسائل کا بھی علم ہوا۔ جو بلاشبہ آنس کی خودکشی کے محرکات میں شامل ہوتے ہیں۔

جہاں تک آنس کی خودکشی کے محرکات اور ان کے مسائل کا تعلق ہے۔ تو ابھی تک دو طرح کے مسائل کی واضح طور پر نشاندہی ہوئی ہے۔ جن سے آنس شدید ذہنی کرب سے گزرے۔ اور جو آنس کی خودکشی کے حوالے سے اہم محرکات

کی حیثیت رکھتے ہیں۔ایک آنس کی محبت کا ناکام تجربہ اور دوسرا آنس کے دفتری مسائل جو یقیناً شدید نوعیت کے تھے۔ لیکن دوران تحقیق اکثر مقامات پر باوثوق ذرائع سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ آنس کے اپنے گھر والوں اور خصوصاً اپنے والد سے نفسیاتی اور اخلاقی حوالے سے نمایاں اختلافات تھے۔جن کی نوعیت خاصی پیچیدہ تھی۔آنس اس ضمن میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔سوائے جلنے اور کڑھنے کے وہ اس حوالے سے اپنے قرابت داروں کے مخصوص رویوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

بقول شوکت عابد

> آنس کے اپنے والد صاحب سے اخلاقی نوعیت کے شدید اختلافات تھے۔وہ انتہائی حساس انسان تھا۔اندر ہی اندر صدمہ اٹھا رہا تھا۔جس روز وہ خودکشی کرنے گیا۔انہی معاملات پر وہ اپنے اہل خانہ سے الجھا۔اور انہیں واضح طور پر کہا کہ اگر یہ صورت حال ایسی ہی رہی تو میں خود کو ختم کرلوں گا۔شاید اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔اور آنس نے واقعی اپنے آپکو ختم کرلیا۔۔۲۴۱

ایسے مخصوص حالات کی بازگشت ملتان کے علمی و ادبی حلقے میں بھی مجھے محسوس ہوئی۔ کسی نے بھی نہ تو اس کی کھل کر وضاحت کی۔اور نہ ہی اس بات کو پوشیدہ رکھا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ معاملہ آنس کی خودکشی کے حوالے سے اہم بھی تھا۔اور سنجیدہ بھی۔ڈاکٹر انوار احمد نے اس سلسلے میں کہا ''ہاں کوئی ایسی صورت حال تھی جو کسی اخلاقی ونفسیاتی نوعیت کے حوالے سے آنس اور خصوصاً ان کے والد صاحب کے درمیان وجہ اختلاف تھی۔''۔۲۴۲

کچھ اسی قسم کے پوشیدہ گھریلو معاملات کی نشاندہی صلاح الدین درویش نے بھی اپنے تحقیقی مقالے میں کی ہے۔اس میں انہوں نے آنس کے گہرے دوست زاہد بن عبداللہ کے حوالے سے لکھا ہے۔

> موت سے چند دن قبل آنس کے گھر میں ایک ایسا گھریلو نوعیت کا فیصلہ ہوا جو آنس کی پسند سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ جو آنس چاہتے تھے وہ نہ ہو سکا۔اسکا ذکر انہوں نے اپنے دوست زاہد سے بھی کیا۔زاہد کا کہنا یہ ہے کہ آنس اس فیصلے کے حق میں نہ تھے۔ اس لئے وہ خاصے پریشان رہتے تھے۔ تاہم زاہد نے بتایا۔ کہ میں اور وہ (آنس) کبھی بھی ایک دوسرے کے گھریلو معاملات میں دخل اندازی نہ کرتے تھے۔ اس لئے صحیح صورتحال سے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔البتہ زاہد کی رائے یہ ہے کہ بات قرین قیاس ہے کہ آنس کی خودکشی کا سبب یہ واقعہ بھی ہو۔۔۲۴۳

ان تمام حقائق سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ آنس کے اپنے اہل خانہ سے جس مخصوص حوالے سے اختلافات تھے۔وہ آنس جیسے حساس اور مخصوص ضابطہ حیات رکھنے والے شاعر کیلئے نا قابل قبول تھے۔ بظاہر وہ ان حالات کے اندر رہ رہے تھے۔لیکن یہ صورتحال برداشت نہ کرسکنے کے باعث وہ جس ذہنی کرب سے دوچار تھے۔اس کیفیت کو سوائے آنس کے اور کوئی نہ جانتا تھا۔ممکن ہے کہ آنس نے اپنے قریبی دوست زاہد بن عبداللہ سے اس بات کا ذکر کیا ہو۔جو محسوس ہوتا ہے کہ کیا ہوگا جسکا اظہار بہت حد تک زاہد کی مندرجہ بالا گفتگو سے بھی ہوتا ہے۔لیکن ایک مخلص دوست کی طرح انہوں نے آنس کے ان گھریلو معاملات [illegible] اسی طرح آنس اپنے اہل

خانہ کے اس مخصوص رویے پر صرف کڑھ ہی سکتے تھے۔اگر وہ حساس نہ ہوتے شاعر نہ ہوتے تو اس صورت میں بہت ممکن تھا کہ وہ صرف گھر والوں کو دھمکی ہی دے پاتے یا غصے کے عالم میں گھر چھوڑ دیتے۔لیکن آنس نے اپنے مخصوص ضابطۂ حیات کے مخالف اپنے گھر کے آنگن میں کہیں کوئی شگاف دیکھا۔اور اس کے سامنے بند نہ باندھ سکے۔تو گھر ہی نہ چھوڑا۔ بلکہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر دنیا ہی چھوڑ دی۔لہذا آنس کی خودکشی کے محرکات کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان مخصوص گھریلو معاملات ومسائل کا اس ضمن میں نمایاں کردار نظر آتا ہے۔

بقول ڈاکٹر وحید قریشی ''آنس درحقیقت اپنے کچھ گھریلو معاملات سے مطمئن نہیں تھا۔جب آنس نے خودکشی کی تو میں نے اس کے والد فخر الدین بلے سے اس حوالے سے پوچھا تھا۔جسکا مجھے کوئی جواب نہیں ملا''۔۲۴۴

یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ خارجی زندگی میں اس طرح کے مسائل ومعاملات اکثر لوگوں کو پیش آتے ہیں لیکن تمام لوگ خودکشی سے نہیں گزرتے لیکن آنس کے ساتھ معاملہ اس لئے فرق تھا۔کہ حساس فطرت رکھنے والے نوجوان شاعر،نفیس طبع،اصول پسند،جو اپنی زندگی میں ایک مخصوص ضابطۂ حیات کے حامل تھے۔زندگی کی بے ترتیبی اور اس کے غیر اخلاقی رویوں کے شاید متحمل نہ ہوسکے۔

عارف بلے آنس کی مخصوص فطرت ، مزاج اور ان کی اصول پرستی کے حوالے سے کہتے ہیں ''آنس میں perfection تھی۔اصول کا اتنا پکا تھا کہ مرنے کیلئے جارہا ہے۔اور جس نے واپس آنا نہیں تھا۔وہ پلیٹ فارم کا ٹکٹ لیتا ہے۔یہ ٹکٹ مرنے کے بعد اس کی جیب سے برآمد ہوا''۲۴۵ یہ حالات اور خود ان کے بھائی کی آنس کے لئے یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ آنس بے اصولی اور غیر اخلاقی صورتحال میں نہ تو جی سکتے تھے۔اور نہ ایسے حالات کو دیکھتے رہنا انہیں گوارا تھا۔اور یہ بات طے ہے کہ آنس اس تمام ناآسودہ پس منظر میں خودکشی کے لئے اپنا ذہن بنا چکے تھے۔اور یہ بات اہم ہے کہ انہوں نے اپنے اس فیصلے میں کسی کو شریک نہیں کیا۔اس سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔کہ وہ اپنے تمام مسائل کو اپنی ذات کے اندر سمیٹ لینا چاہتے تھے۔البتہ جو خط آنس کی جیب سے ان کی موت کے بعد برآمد ہوا۔اس کے بارے میں دو متضاد آراء ملتی ہیں۔آنس کے بھائی عارف بلے کا اس ضمن میں کہنا ہے۔

> موت سے دو دن پہلے وہ ہیٹر کے پاس بیٹھا آخری خط لکھ رہا تھا۔اور مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا تھا اس کی موت کے بعد افسوس ہوتا رہا کہ کاش میں آگے بڑھ کر تحریر پڑھ لیتا ۔خط لے لیتا۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی ذہنی سوچ بدل جاتی ۔ارادہ تبدیل ہو جاتا ۔۔۲۴۶

جبکہ آنس کے دفتر کی ساتھی خاتون جنکا آنس کے ساتھ جذباتی تعلق کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔انہوں نے اس ضمن میں بقول صلاح الدین درویش بتایا۔

> جس روز وہ موت کی طرف لحہ بہ لحہ بڑھ رہے تھے۔وہ بنک میں مجھ سے ملنے خودکشی کے صرف تین گھنٹے قبل آئے۔مجھ سے اور دفتر کے ملازمین سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھ سے ایک کاغذ طلب کیا۔ اس پر کچھ لکھا اور جیب میں ڈال لیا۔۔۲۴۷

اس خاتون نے اس خط کے ضمن میں مزید وضاحت نہیں کی۔کہ کیا یہی تحریر آنس کا آخری خط تھا۔یا وہ خط

آخری تھا۔ جو آنس نے اپنے گھر میں بقول عارف بلے لکھا تھا۔ بہر حال صورت حال کچھ بھی ہو۔ ان عوامل سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ آنس نے جس مستقل مزاجی کے ساتھ خودکشی کا ارادہ کیا تھا۔ اس فیصلے کو ترک کرنے کی شاید دوسری سوچ ان کے اندر پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

بقول ان کے والد فخر الدین بلے

> جس دن یہ سانحہ پیش آیا۔ میں اسلام آباد میں تھا۔ اور آنس کی والدہ کراچی گئی ہوئی تھی۔ گھر پر اس کی چھوٹی بہن اور دو بھائی عارف اور ظفر تھے۔ جن کے ساتھ وہ رات گئے تک ہنستا بولتا رہا۔ اگلے دن وہ گھر سے خوش وخرم گیا۔ اور خون میں ڈوبا ہوا آیا ۔ ۲۴۸

مجموعی طور پر آنس کی خودکشی کے محرکات میں ان کی فطری ذہانت اور تخلیقی شعری صلاحیت کے باعث حیات بعد موت کے لئے تجسس موجود ہے۔ اس تجسس میں شدت کا پہلو از خود ایک روحانی اضطراری کیفیت کو جنم دیتا ہے۔ اور دوسرا آنس کا عہد شباب جو اپنے اندر شدت جذبات رکھتا ہے۔ جذبات کا بے روک بہاؤ، جہاں دلیل سے زیادہ جذبہ سب کچھ کر گزرنے کا موجب بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آنس کی خودکشی کے فوری نوعیت کے اسباب و محرکات کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس کے حوالے میں آنس کا رومانوی مزاج، عشق کا ناکام و نا آسودہ تجربہ، گھر والوں کے ساتھ نفسیاتی و اخلاقی نوعیت کے کچھ مسائل اور دفتری معاملات میں سرکاری رقم کا خرد برد شامل ہے۔ جس میں دوران تفتیش آنس کو بھی شامل کیا گیا۔ یہ تمام محرکات یقیناً ایسی نوعیت کے ہیں جو آنس کی خودکشی کا محرک بنے اور بن سکتے ہیں۔ اور کئی ادیبوں نے اس نوعیت کے محرکات یا اس سے ملتے جلتے پس منظر میں خودکشیاں کی ہیں۔ لیکن جہاں تک آنس کی شاعری میں ان کے ایک مخصوص مزاج اور خواہش مرگ پر مبنی رویے کا تعلق ہے۔ اس کی اپنی جگہ بہت اہمیت ہے۔ کیونکہ میں نے آنس کی خودکشی کے ضمن میں جن فوری نوعیت کے محرکات کا ذکر کیا ہے۔ وہ ہنگامی وقتی اور فوری نوعیت کے محرکات سے پہلے ہی اپنا ایک مخصوص مزاج بنا چکی تھی۔ جس میں اس بات کا ایک واضح یقین ملتا ہے۔ کہ آنس اپنے شباب کے انتہائی شدت سے بھرپور زمانے میں ہی بڑی پختہ فکر، سنجیدہ نظری اور موت کے اسرار تک پہنچنے کی طلب رکھتے تھے۔ لہذا آنس کی شاعری کا یہ مخصوص رنگ اور مزاج آنس کی خودکشی کے محرکات میں بنیادی اور نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔

ثروت حسین (۱۹۴۹ء۔۱۹۹۶ء):

ثروت حسین کے والدین کا تعلق بدایوں سے تھا۔ ۱۹۴۷ء میں یہ خاندان پاکستان آ گیا۔ اور کراچی میں
رہائش پذیر ہوا۔ ان کے والد M.E.S میں اوورسیئر تھے۔ ثروت حسین تین بہنیں اور تین بھائی ہیں۔ ثروت حسین، سے
ایک بھائی اور ایک بہن بڑی ہیں ثروت کے چار بچے ہیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ ثروت حسین نے میٹرک کا امتحان
گورنمنٹ بوائز سیکنڈری سکول ملیر کینٹ کراچی سے ۱۹۶۶ء میں پاس کیا۔ ایم اے اردو کا امتحان جامعہ کراچی سے
۱۹۷۳ء میں پاس کیا۔

ثروت نے ملازمت کا آغاز این ڈی وی پی پروگرام کے تحت بحیثیت لیکچرار جامعہ ملیہ کالج سے کیا۔ پبلک
سروس کمیشن سے سلیکشن ۱۹۷۹ء میں ہوئی۔ ثروت حسین کی شاعری ان کے مشاہدے اور تجربے پر مبنی واردات ہے۔ جس
میں تجرباتی سطح کا رنگ زیادہ گہرا ہے۔ جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے۔ انہوں نے درس وتدریس سے عملی زندگی کا آغاز
کیا ثروت حسین کالج میں پڑھاتے تھے۔ اردو کے استاد تھے۔ جب کراچی سے تبادلہ لاڑکانہ ہوا۔ سات آٹھ سال لاڑکانہ
میں رہے۔ اس دوران دوستوں اور اپنے مخصوص حلقۂ احباب سے دوری رہی۔ جس کی انکی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب
ہوئے ۱۹۸۸ء کے حیدرآباد آئے۔ سائیکی ہو چکے تھے۔ اور اسی طرح کے دیگر مسائل ان کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ اسی
دوران ڈاکٹر حسن منظر کے زیر علاج بھی رہے۔ ثروت اس ضمن میں ادویات کا استعمال کر رہے تھے۔ پہلی خودکشی کی کوشش
انہوں نے حیدرآباد میں کی۔ جبکہ وہ زیر علاج بھی تھے۔ اس کے لئے انہوں نے ٹرین کے نیچے اپنی ٹانگیں دے دیں تھیں
۔اس سے انہیں عمر بھر کی معذوری ملی۔ یہ ۱۹۹۳ء کی بات ہے۔ تین سال کے بعد کراچی آنا ہوا۔ یہاں ڈگری کالج میں
پڑھاتے تھے۔ خودکشی کی پہلی کوشش میں چونکہ ٹانگیں ضائع ہو گئی تھیں۔ لہذا چھڑی Stick کے بغیر نہیں چل سکتے تھے۔ اور
جس دن ثروت نے خودکشی کی۔ اس دن وہ بقول شوکت عابد ''بالکل نارمل State of mind میں تھے۔ کوئی ایسی مخصوص
یا چونکا دینے والی صورتِ حال نظر نہ آتی تھی۔ جو ان کی خودکشی کے حوالے سے قابلِ ذکر ہو''۔ ۲۴۹

ثروت حسین ایک حساس انسان اور فطری شاعر تھے۔ ان کی فطرت کے یہ دونوں بنیادی جوہر جہاں ان کے
تخلیقی عمل میں معاون ہوئے۔ وہاں انہی اوصاف نے انہیں سماج کے منفی رویوں سے متصادم کیے رکھا۔ ثروت حسین کی خود
کشی کے محرکات میں بنیادی محرک ان کے اندر پائی جانے ولی فطری ذہانت اور سچائی ہے۔ جس نے انہیں حد درجہ حساس بنا
دیا تھا۔ وہ لوگوں کے ظاہری اور نامناسب رویوں کے شاکی تھے۔ اس لئے کہ وہ اپنے کردار میں ان مادی اور ظاہری

آلائشوں سے بے نیاز تھے۔اس حوالے سے جہاں تک ثروت حسین کی فطرت اوران کے مخصوص کردار کا تعلق ہے۔تو اس ضمن میں ثروت کے بھائی شوکت عابد کا کہنا ہے۔

ابتداء ہی سے اس کے اندر ایک بچے کی روح موجود تھی۔سر سے پیر تک شاعر تھے۔ان میں شہری زندگی کی چالاکیاں کم تھیں ۔چھوٹی چھوٹی باتوں پر کڑھتے ۔ان کے لئے چھوٹے مسئلے بڑے ہوتے تھے۔اور بڑے مسئلے چھوٹے۔دوستیاں ہمیشہ Purity کے حوالے سے کرتے تھے۔اس میں ان کے سامنے کوئی تخصیص نہ ہوتی۔کہ کوئی چائے والا ہے۔یا ویٹر ہے۔ان کے نزدیک انسانی قدروں کی اہمیت تھی۔ایڈجسٹ منٹ ان کے نزدیک بڑا مسئلہ تھا۔ ماحول میں ، معاشرے میں کیسے اور کیونکر رہا جائے۔یہ سوچ انہیں دامن گیر رہتی تھی۔ ۔۲۵۰

جہاں تک ان کی فطری ذہانت کا تعلق ہے۔وہ دو سطحوں پر کام کر رہی تھی۔ایک طرف ان کی تخلیقی صلاحتیں اپنے فطری رنگ میں ابھر رہی تھیں ۔دوسری طرف ان کے اندر کی Purity انہیں اپنے ماحول میں ایڈجسٹ ہونے میں رکاوٹ تھی۔

بقول صابر وسیم

وہ ایک جینئس شاعر تو تھا ہی مگر اس میں بچوں جیسی سچی معصومیت بھی تھی۔جسے نظر انداز کرنا کسی کے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔اس کی معصومیت ایک سچے شاعر کی معصومیت تھی۔
۔۔وہ دنیاداری سے دور تھا۔بلکہ وہ اس دنیا کا تھا ہی نہیں ۔۔۲۵۱

معاشرے، ماحول اور اجتماعی رویوں کے ساتھ ایڈجسٹ منٹ انسان اور خصوصاً فنکار کے لئے ایک بڑا سوال اور مسئلہ ہوتا ہے۔فنکار چونکہ حد درجہ حساس ہوتا ہے۔اس وجہ سے بھی ایڈجسٹ منٹ کا مسئلہ مزید پیچیدگیوں کا شکار ہوتا جاتا ہے۔ جہاں تک ماحول سے، افراد سے، سماج سے ثروت کی ایڈجسٹ منٹ کا سوال ہے۔اس ضمن میں کچھ مسائل تو ثروت کے ذاتی نوعیت اور ذاتی مراسم کے حوالے سے تھے۔لیکن کچھ مسائل ایسے بھی تھے۔جن کی نوعیت سرکاری تھی۔ان مسائل میں ثروت کو بروقت ملازمت کا نہ ملنا، اور پھر ملازمت کے حوالے سے ایسے حالات کا سامنا کرنا، جن سے ثروت کا مزاج مطابقت نہ رکھتا تھا۔اور اس سے ثروت کے اندر کے تخلیقی اور ذہین انسان کی بے توقیری ہوئی۔اور ایک حساس فنکار کے جذبات شدت کے ساتھ مجروح ہوئے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر اجمل نیازی لکھتے ہیں۔

کتنے شرم کا مقام ہے۔کہ ثروت حسین کو این ڈی وی پی سکیم کے تحت لیکچر رشپ ملی۔یہ رضا کارانہ انداز کی سکیم تھی۔جس میں تنخواہ کی بجائے وظیفہ ملتا تھا۔جب ثروت کنفرم ہوئے۔تو انہیں سرحد کے ایک دور دراز قصبے میں بھیج دیا گیا۔یہاں ثروت حسین بہت ویران ہو گیا۔اکلاپا انکا دوست تھا۔لیکن قید تنہائی ایک مختلف آزار ہے۔ثروت کا کہنا تھا۔کہ مکالمہ ہی نہیں ہوتا۔اس عالم میں اپنے آپ سے بھی مکالمہ نہیں ہوتا۔یہ تخلیقی جانکی انہونی بن کر بندے پر ٹوٹ پڑتی ہے۔۔۲۵۲

چھوٹے چھوٹے لوگ تھے اور چھوٹی چھوٹی خواہشیں
سو میں ان کے درمیان ایک داستان بنتا گیا

قندیل مہ و مہر کا افلاک پہ ہونا
کچھ اس سے زیادہ ہے میرا خاک پہ ہونا

لیکن یقیناً فنکار اور سماج کے اس تصادم میں ٹوٹ پھوٹ کا سارا عمل فنکار کے اندر ہی رونما ہوتا ہے۔ یہی کچھ ثروت حسین کے ساتھ بھی ہوا۔ انکا شعورِ ذات اور احساس نفس سماج کے منفی رویوں کے باعث ایک تنگی اور گھٹن کے ماحول سے الجھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ثروت اسی ضمن میں ۲۰ نومبر ،۱۹۸۲ء کو محمد سلیم الرحمٰن کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> موجودہ ملازمت ایک قید کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ گھر سے دوری نے بہت سے مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ بیشتر وقت انہی مسائل کا سامنا کرتے گزرتا ہے۔ ظاہر ہے محکمے کو اس سے کیا غرض۔۔۔ یہ باروزگاری تو اپنا جال کستی جاتی ہے۔۔۲۵۳

سماج کے منفی رویوں کو پالنے پوسنے والے نہیں جانتے کہ ان کے ہاتھوں جو فنکار آزار پا رہا ہے۔ وہ اندر سے اپنی ذات میں کتنا مکمل کتنا غنی اور شعور و آگہی کی کس بلند سطح پر اپنی دنیا بسائے بیٹھا ہے۔ فنکار جب اپنی ذات اور سماج میں مطابقت پیدا نہیں کر سکتا۔ تو اسکا نقصان خود فنکار کی ذات اٹھاتی ہے۔ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل نہ صرف جنم لیتا ہے۔ بلکہ اس ٹوٹ پھوٹ کے عمل میں تیزی اور شدت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ثروت حسین اسی مسئلہ کی پیچیدگیوں کا شکار ہوئے۔ کچھ اپنی زندگی کے حوالے سے اور کچھ سرکاری اور دفتری امور میں انہیں ایسے عوامل کا سامنا تھا۔ اس ضمن میں ثروت حسین کی لاڑکانہ پوسٹنگ بھی قابل ذکر ہے۔ جہاں وہ اپنے مخصوص ادبی ماحول، احباب اور قریبی ساتھیوں سے تقریباً سات آٹھ سال دور رہے۔ اس ضمن میں یہ بات درست ہے کہ ہر بات اور ہر صورتِ حال میں منفی اور مثبت پہلو ہوتے ہیں۔ مثبت پہلو اس حوالے سے یہ تھا۔ کہ اتنا عرصہ زندگی کے ہنگاموں سے دور انہیں اپنی ذات میں اترنے، اسے کھنگالنے اور اپنے سے ہمکلام ہونے کا زیادہ موقع ملا۔ جس کے باعث ان کے اندر کے شاعر کی تخلیقی صلاحیتیں خوب نکھر کر سامنے آئیں۔ وہاں ان کے آس پاس زندگی کے ہنگامے کم کم تھے۔ لیکن منفی اثرات اس طرح سامنے آئے۔ کہ ان کے اندر ایک خاص قسم کی ٹوٹ پھوٹ اور نفسیاتی الجھنوں نے جنم لیا۔

بقول صابر وسیم

> اس کی پوسٹنگ لاڑکانہ کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے میں ہوگئی۔ وہ لاڑکانہ چلا گیا۔ اس کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ اسے شاعری کے سوا کچھ یاد ہی نہ رہا۔ شاعری میں تو وہ پہلے ہی ڈوبا ہوا تھا۔ مگر اب وہ ایسا ڈوبا۔ کہ اسکا وجود ہی باقی نہ رہا۔ صرف شاعری ہی شاعری باقی رہ گئی۔ اس نے بہترین شاعری لاڑکانہ کے قیام کے عرصے میں ہی تخلیق کی۔ اس نے وہاں بہترین شاعری تو تخلیق کی۔ مگر اس کے اعصاب بدترین ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے۔ اس کے چہرے کی معصومیت اپنی جگہ برقرار تھی۔ مگر اب اس کی آنکھوں میں وحشت کی ایک لہر بھی نظر آنے لگی تھی۔ اس کی

باتوں سے یہ گمان ہوتا کہ وہ بہت سی نامعلوم اور پوشیدہ حقیقتوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے لگا ہے۔ نجانے اس نے کیا دیکھا۔ کہ ایک ڈر اس کے اندر نظر آتا تھا۔ ایک ایسا ڈر جو اسے اندر سے خوف زدہ رکھتا تھا۔ وہ تو بس یہ کہتا کہ صابر وسیم مجھے یہ ظہور ہوا ہے۔۔۔۔ ۲۵۴

موت سے متعلق یہ غور وفکر کا مادہ ہی تھا۔ کہ ثروت کی شاعری میں موت سے بے خوفی نظر آتی ہے۔ جو انہیں رفتہ رفتہ موت سے قریب تر کرتی جاتی ہے۔ کھلی آنکھوں کے ساتھ زندگی کے جن پوشیدہ حقائق کو دیکھنے کا سوال ہے۔ ان میں ایک بڑا حوالہ موت کی حقیقت سے ہم آہنگ ہونا اور قبل از وقت اس کی سچائی کا ظہور اور ادراک ہے۔ جو ثروت حسین کو ہوا۔ لیکن سچائی کے ادراک کا ابتدائی لرزہ جلد ہی ان کے اندر موت سے ہم آہنگی کی ایک سازگار فضا کے سائے میں آ گیا۔ اب موت اور موت سے متعلق محسوسات کسی ڈر اور خوف کی آماجگاہ نہیں تھے۔ بلکہ موت سے رومانس کی ایک فضا ہموار ہوگئی۔ ثروت حسین کی خودکشی کے محرکات میں ان عوامل کا پس منظر بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ثروت کی شاعری میں بھی ان عوامل کی نشاندہی بڑی بھرپور اور واضح دکھائی دیتی ہے۔ اور اس میں خاص طور پر غور وفکر کا وہ مادہ قابل ذکر ہے۔ جو موت سے متعلق پوشیدہ حقائق کی جانب ہماری راہنمائی کرتا ہے۔

میں درختوں سے مخاطب ہوں خدائے عزوجل
جو زمین پر سر اٹھانے کے لئے موجود ہیں

جامنی رنگ کا شعلہ کوئی لہراتا ہے
ہم تو اس آگ کو دیکھیں گے ٹھہر کے لوگو

یہی مٹی جو کنارے پہ نظر آتی ہے
اور ہو جاتی ہے پانی میں اتر کے لوگو

چاند، آفاق، شجر دیکھنے والے کیلئے ہیں
سبھی چیزیں ہیں مگر دیکھنے والے کیلئے ہیں

بقول شوکت عابد

موت سے انکا دوستی کا تعلق تھا۔ خوف کا نہ تھا۔ موت ان کو Fasinate کر رہی تھی۔ وہ چیزوں کو آئیڈیلائز کرتے تھے۔ اور Break ہو جاتے تھے۔ موت ان کے سامنے محبوبہ کے روپ میں تھی۔۔ ۲۵۵

موت کے حوالے سے یہ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ ادیبوں اور فنکاروں میں غور وفکر کا مادہ انتہاپسندی اور شدت احساس کے باعث بہت حد تک انہیں ایب نارمل بنا دیتا ہے۔ جس سے ان کی سوچ کے افق نہ صرف بدلنے لگتے ہیں۔ بلکہ وہ اکثر حالت "موجود" سے "ناموجود" کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ سفر اور یہ کیفیت اگرچہ ان کے اندر ہی اندر رونما ہوتی ہے۔ لیکن اکثر اس کے کچھ نہ کچھ آثار اس کے ظاہری وجود پر بھی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ثروت حسین کے ضمن

میں یہ بات ان کے اکثر قریبی دوستوں نے محسوس کی۔ صابر وسیم کا کہنا ہے۔
۔۔۔وہ نارمل ہونے لگا تھا۔ مگر وہ مکمل صحت یاب کبھی نہیں ہوا۔ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔
اس لئے کہ وہ شاعر تھا۔ مصنوعی نہیں، اصلی شاعر تھا۔ وہ سب کچھ ان کہا کہنا چاہتا تھا۔
اَن سُنا سُنانا چاہتا تھا۔ اور اَن دیکھا دکھانا چاہتے تھے۔۔۔ایسی تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والا بھلا صحت مندی کے اس دنیاوی معیار پر کیسے پورا اترتا۔ وہ اِس دنیا کے لئے ہمیشہ ابنارمل ہی رہا۔۔۔کبھی کبھی وہ وحشت کو اپنا دوست بنا کر رکھتے تھے۔۔۔آخر اس اضطراب کو کیا کہا جائے۔ جو پارے کی طرح ثروت کی رگوں میں دوڑتا تھا۔۔۔اپنے لوگوں میں رہ کر بھی اس کی روح اکیلی تھی۔ اُس پر اور اُس کی شاعری پر اِس دنیا کے سارے رنگ اور سارے بھید منکشف ہو چکے تھے۔ وہ بھیدوں کو دریافت کرنے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔ شاید اسی لیے وہ زندگی کی حدوں کو توڑ کر آگے جانے کی تدبیریں کرنے لگا تھا۔ شاید اس کے لئے یہاں سے زیادہ بھید بھرے رنگ وہاں موجود تھے۔ ۲۵۶

ثروت کے لئے اِن بھید بھرے رنگوں تک پہنچنا یقیناً اپنے داخل کا سفر اختیار کرنا تھا۔ لیکن اس داخلی سفر کے اضطراب اور بے چینی کا بظاہر اُن کی شخصیت پر کوئی خاص اثر دکھائی نہ دیتا تھا۔ شاید اس کی وجہ سے یہ بھی ہو۔ کہ قدرت نظری طور پر ذہین انسانوں سے اسی طرح اہم کام لیتی ہو۔ ڈاکٹر الیاس عشقی کا کہنا ہے ''ثروت حسین ذہنی طور پر نارمل نہ تھے۔ مگر ایسے ہی افراد نے بڑے بڑے کام کیے ہیں۔۔۔ثروت حسین موت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے''۔ ۲۵۷

موت سے بے خوف ہونا، اسے کوئی اہمیت نہ دینا، اُس کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہنا یقیناً ایک نارمل شخص کا رویہ نہیں ہوتا۔ ثروت حسین اس لحاظ سے واقعی نارمل نہیں تھے۔ اور داخلی سفر، جس پر وہ دبے قدموں چل رہے تھے۔ وہ حقیقی معنوں میں اب اسی دنیا میں ہی زندہ تھے۔ مادی زندگی کی خواہش ان کے اندر دم توڑ چکی تھی۔ مادی زندگی کی بے معنویت کو محسوس کرتے ہوئے وہ موت کی حیاتِ ابدی کے طلبگار تھے۔ بقول احمد ہمیش ''وہ تو بہت پہلے اپنے اندر مر چکا تھا۔ اس کے ہاں زندگی کے معنی ختم ہو چکے تھے۔ اور وہ ایسی موت کو آئیڈیلائز کرتا تھا''۔ ۲۵۸

خودکشی سے پہلے خودکشی کی کوششیں اور ایک کوشش میں اپنی ٹانگوں سے معذور ہو کر بھی وہ خواہش مرگ کے حصارے باہر نہ آ سکے۔ اس دنیا کو چھوڑنے کا خیال اور کسی نئے سفر پر روانہ ہونے کی جو خواہش ان کی شاعری میں ملتی ہے۔ وہ در حقیقت اس سفر کا ہی ایک استعارہ ہے۔ یہ وہ سفر ہے۔ جسے مادہ سے روح، خارج سے داخل، فنا سے بقا، موجود سے ناموجود اور مکاں سے لامکاں کی تلاش کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اور اس ضمن میں ایک اور بات جو اہم ہے۔ وہ ذہنی اور روحانی طور پر اس نئے سفر پر جانے کے لئے خود کو تیار کر چکے تھے۔

کوئی نشان سرِ دیوار و بام اپنا نہیں
کسی نگر کسی بن میں قیام اپنا نہیں

ثروت حسین موت کے لئے اپنے اندر بے حد کشش محسوس کرتے تھے۔ جب خودکشی کی پہلی کوشش میں ٹرین سے ان کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئیں۔ تو بقول احمد ہمیش ''انگلینڈ سے اس کے جوتے بن کر آ گئے تھے۔ میں انکو ہسپتال

دیکھنے کیلئے گیا۔ تو مجھے کہنے لگے۔ میں موت کو بوسہ دینا چاہتا تھا''۔۲۵۹ چنانچہ خودکشی کی دوسری کوشش سے صاف ظاہر ہوا۔ کہ ثروت حسین تلاش موت کی بجائے حصول موت کے لئے سرگرداں تھے۔

گھائل پنچھی تیرے کنج میں آن گرا ہے
اس پنچھی کا دوسرا پھیرا پھر نہیں ہو گا

اور اسی طرح ثروت کا یہ شعر بھی کچھ اسی طرح کی صورتِ حال کا عکاس ہے۔

بھر جائیں گے جب زخم تو آؤں گا دوبارہ
میں ہار گیا جنگ مگر دل نہیں ہارا

ان اشعار میں دکھائی دیتا ہے۔ کہ طائرِ نفس اپنے مادی جال سے نکلنے کے لئے پر تولے بیٹھا ہے۔

اک گیت میرے پاس ہوا سے پرانا ہے
اے بادلو، مجھے تو بہت دور جانا ہے

ہم چل دیئے اور دوست ہمارا نہیں آیا
کشتی کے تعاقب میں کنارا نہیں آیا

خواب اچھے نہیں اس عمر میں گھر کے لوگو
یہی دن رات تو ہوتے ہیں سفر کے لوگو

جب آئے سفر سے تو رہِ عشق میں ثروت
وہ دشت وہ بستی وہ منارا نہیں آیا

یہاں یہ بات بھی اہم ہے۔ کہ منزلِ آخر یا حقیقی گھر تک پہنچنے سے قبل وہ سفر کی تمام صعوبتیں، جو ان کے نزدیک لذت کا درجہ رکھتی تھیں اٹھانا چاہتے ہیں۔ یہ خواہش مرگ کے ساتھ ساتھ لذتِ مرگ کی کیفیت بھی ہے۔ جس سے وہ درجہ بہ درجہ لحمہ بہ لحمہ سرور پانا چاہتے ہیں۔ اسی کے باعث ہی انہیں حیاتِ ابدی کا سکون میسر آ سکتا ہے۔

اپنے اپنے گھر جا کر سکھ کی نیند سو جائیں
تو نہیں خسارے میں، میں نہیں خسارے میں

ثروت حسین کی اس حوالے سے شاعری کا مزاج موڈ اور لہجہ مکمل طور پر ایک یقینی اور نتیجہ خیز صورتِ حال کا حامل ہے۔ جس میں تشکیک کی گنجائش نہیں رہتی۔

لوٹ کر کوئی جہاں سے نہیں آتا ثروت
انہی راہوں پہ کسی وقت نکل کے دیکھیں گے

ورق زیست پہ لکھیں گے کہانی اپنی
نظمِ ہستی کو کسی روز بدل دیکھیں گے

ثروت حسین کے یہاں خواہش مرگ جب وصال مرگ بنی۔ تو ثروت کی عمر چالیس سال سے قدرے متجاوز تھی۔ لیکن اس حوالے سے ثروت کے ذہن اور سوچ میں جو ابتدائی تغیر اور تبدیلی کا سوال ہے۔ ان کی شاعری میں پچیس برس کی عمر کا ایک خاص حوالہ ملتا ہے۔

میں نے خود کو جمع کیا پچیس برس میں
یہ ساماں تو مجھ سے یکجا پھر نہیں ہو گا

گویا زندگی کی بے معنویت اور اس کے اسرار، اسوقت ان پر منکشف ہوئے۔ جب عہد شباب تھا۔ اس لحاظ سے ثروت کے یہاں خواہش مرگ ایک باقاعدہ اور بتدریج ارتقاء سے گزرتی نظر آتی ہے۔ محض لمحہ بھر کا فیصلہ نہیں جو خودکشی پر منتج ہوا۔

میں اپنی جلا وطنی کے پچیس برس
پنکھڑیوں اور تیتریوں کے ساتھ رہا

اس زندگی سے اس زندگی، اس منظر سے اس منظر اور اس دیوار سے اس دیوار تک پہنچنے کا سحر رفتہ رفتہ ثروت کے حواس پر طاری ہوتا رہا۔

میں راکھ ہو گیا طاؤس رنگ کو چھوکر
عجیب رقص تھا دیوار پیش پا سے ادھر

بالآخر موجود زندگی کے رنگوں پر اس زندگی کے رنگ غلبہ پا گئے۔ جو نظروں سے اوجھل تھی۔

ثروت تم اپنے لوگوں سے یوں ملتے ہو
جیسے ان لوگوں سے ملنا پھر نہیں ہو گا

ثروت کو یقین ہو گیا تھا کہ ان کی کتاب زیست کا ورق الٹا چاہتا ہے۔ اور یہ بھی کہ یہ ورق انہوں نے خود ہی پلٹنا ہے۔ کیسے اور کب؟۔ وہ اس کے لئے ذہنی طور پر تیار تھے۔ اسی وجہ سے اقدام خودکشی بھی ٹرین کے حوالے سے ہوا۔ اور خودکشی کا عمل بھی۔ اس عمل میں ٹرین، خودکشی اور موت تینوں کے ساتھ رومانس کا عنصر موجود ہے۔

بقول شوکت عابد

> ثروت حسین اور آنس معین دونوں کے گھر کے باہر ریلوے سٹیشن تھا۔ دونوں کی خودکشی کا وقت دوپہر ۱۱ بجے سے ۱۲ بجے کے درمیان کا ہے۔ ٹرین میں، اس کی آواز میں ایک رومانس ہے۔ اس کے ساتھ انتظار، سفر اور زمین کا ایک بڑا توانا حوالہ وابستہ ہے۔ ثروت تو زمین کو بھی محبوبہ کہتے تھے۔ کہیں جانا ہو تو کہتے کہ زمین پر سفر کرتا ہوا جاؤں گا۔ ٹرین کے سفر میں بھی زمین کے ساتھ رابطہ قائم رہتا ہے۔ اکثر ثروت سٹیشن پر جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ ۲۶۰

ٹرین کی کوک، سنسان راہوں پر ان کی گم ہوتی ہوئی آواز، سفر در سفر اس کے گھومتے ہوئے پہیے، اس کے سٹیشن پر بکھرا ہوا انتظار، جدائی کی کیفیت کئی حوالوں سے ثروت کے یہاں رومانس، ہجر اور اس دنیا سے اس دنیا کے سفر کا استعارہ

۔بن گئے۔

بقول فاطمہ حسن

۔۔۔یہ کیسی خواہش مرگ تھی۔ جو بار بار ایک ہی رخ پر لے گئی۔۔۔پاؤں تو وہ پہلے ہی اس ریل سے کٹوا چکا تھا۔اسکا انجن اسے اپنی طرف کھینچتا تھا۔۔۔خواہش مرگ اتنی گہرائی میں چھپی ہوئی تھی۔جس کی جھلک پاس رہنے والوں کو بھی نظر نہیں آئی۔۔۔موت سے اسے رومانس تھا۔ اس کی روح میں جھانک کر کس نے دیکھا تھا۔۔۔۲۶۱

کچھ ایسی ہی بات ڈاکٹر آصف فرخی نے کہی ہے۔

بقول ڈاکٹر آصف فرخی ''ثروت نے اپنی ایک نظم میں ریل کے انجن کے ماتھے پر سینکڑوں سورج کا ذکر کیا ہے۔مجھے لگتا ہے کہ آج وہ سینکڑوں سورج ٹوٹ گئے ہیں۔''۔۲۶۲ ثروت حسین کے یہاں ٹرین کا جو خصوصی حوالہ ملتا ہے۔وہ حوالہ ثروت حسین کی موت سے ہمکنار ہونے کے بعد بہت بامعنی اور جامع دکھائی دیتا ہے۔موت سے جلد از جلد ہمکنار ہونے کے لئے خودکشی سے متعلق ثروت حسین کی ذہنی منصوبہ بندی کا احساس اس حوالے سے بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے سارا شگفتہ کی موت پر نوحہ لکھا۔سارا نے بھی ٹرین کے نیچے آ کر خودکشی کی تھی۔اس نوحے میں ثروت کے اپنے دلی محسوسات بھی پوری طرح نمایاں ہیں۔

نظم ''خودکشی کا فرشتہ'' میں ثروت لکھتے ہیں۔

نوحہ۔

سارا شگفتہ کے واسطے
انجن کے ماتھے کا سورج ایک بدن کے

لاکھوں ٹکڑے ہر ٹکڑے
میں اک سیارہ سیارے کے دل میں سارا یہیں بن جارا
ہاتھوں میں
لے کر انگارہ، مٹی کے سینے میں اترا، بیج میں سویا، پھول میں
جاگا
بن بیلے میں گونج رہا تھا۔سائیں مرنا کا اک تارا

خودکشی کا عمل کہیں کسی فرشتے کی صدائے بازگشت نظر آتی ہے۔جو کسی مقدس فریضے کی انجام دہی میں معاون ہے۔

گلیوں سے گزر جاؤں

اس پار سدھارے
کاندھے پہ دھرے ساز

یہاں زندگی اپنی جمالیاتی نگاہ کے مدھر سروں کے ساتھ منزل آخر کی جانب محوِخرام ہے۔

بدن کا بوجھ لیے روح کا عذاب لیے
کدھر کو جاؤں طبیعت کا اضطراب لیے

روح اور بدن کی کش مکش اپنی تمام تر حیرتوں کو بالآخر سمیٹ رہی ہے۔

آئینوں کے درمیان سے گزرا
حیرت کدہ جہاں سے گزرا

ثروت حسین اپنی تلاش کے جس سفر پر نکلے تھے۔کوئی اسرار ان کے پیشِ نظر نہ تھا۔اسرار اور خوفزدگی کے مرحلے تو منزلِ اولین میں انسان کو درپیش ہوتے ہیں۔جبکہ ثروت ان مرحلوں سے گزر کر تیقن کے ڈیرے پر پہنچ چکے تھے۔خارجی زندگی اور اس کی گہما گہمی اب واقعی ان کے سامنے بے معنی تھی۔اپنی ذات کے مادی خول کو اتار پھینکنے کیلئے وہ خودکشی کے اولین ناکام تجربے کے بعد اس لذتِ ناتمام کا آخری اور بھرپور تجربہ کرنا چاہتے تھے۔اور اس کے لئے واحد اور یقینی راستہ ان کے سامنے خودکشی کا تھا۔اور اس ضمن میں وہ نہ صرف اپنی ذات بلکہ سماج کی طرف سے بھی بے خوف تھے۔

ثروت کے لئے اکثر کہا جاتا ہے۔کہ وہ داخلی طور پر نہایت سادہ طبیعت کے مالک تھے۔اس حوالے سے ثروت میں جس ظاہری معصومیت کی بات کی جاتی ہے۔وہ ان کی فطرت کا خاص جوہر تھا۔یہی معصومیت اور سچائی انہیں نیچرسے قریب تر کرتی تھی۔اسی کے باعث ان کے غور وفکر کا سرچشمہ پھوٹا۔بقول شوکت عابد

ثروت حسین اندر سے صوفی تھے۔نیچر انہیں بہت فیسی نیٹ کرتی تھی۔کوئی معاشی مسئلہ نہ تھا۔گریڈ ۱۸ میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔سچائی اور اس کے تعلق کے متلاشی رہتے تھے۔کچھ اس قسم کی ٹوٹ پھوٹ ان کے اندر جاری وساری تھی۔-۲۶۳

ثروت حسین کی ذات میں جن صوفیانہ عناصر کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ اسی قدر ہیں جن کی نشاندہی اس سے پہلے بھی کچھ ناقدین کی آراء کے حوالے سے کی جا چکی ہے۔یا جن کی عکاسی خود ثروت کی شاعری سے بھی ہوتی ہے۔اس حوالے سے یہ درست ہے کہ ثروت سچائی کے متلاشی، معصوم اور ہمدردانہ فطرت کے مالک تھے۔اپنی ذات کے اندر جھانکنے اور کائنات کے اسرار میں الجھنے کی جو کیفیات ثروت کی شخصیت اور فن میں پائی جاتی ہیں۔وہی ثروت کے اندر کے صوفی کی نشاندہی کرتی ہیں۔

بقول شوکت عابد

ثروت حسین کے اندر ایک خاص صوفیانہ مزاج تھا۔جس کی شدت کبھی کبھی دیکھنے میں آتی تھی۔ایسے میں وہ اکثر نمازیں پڑھتے تھے۔ان کی بہت سی نظمیں اور غزلیں ایسی ہیں جن کی ابتداء میں نمازوں کے اوقاتِ کار کا حوالہ موجود ہے۔-۲۶۴

اس ضمن میں قمر جمیل کا کہنا ہے۔

وہ اکثر مجھ سے ملنے آتے تھے۔اور کبھی کبھار رات کو بھی میرے پاس ہی ٹھہر جاتے

تھے۔ ایک رات وہ میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ کہ تقریباً دو ڈھائی بجے اچانک میری آنکھ کھلی۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ ثروت حسین جانماز پر کھڑے ہیں۔ اور پھر سجدوں پر سجدے کرنے لگے۔ میں نے کہا ثروت یہ کیا کر رہے ہو؟ قمر بھائی نماز پڑھ رہا ہوں۔ میں سمجھ گیا۔ کہ ثروت کا کام زیادہ بگڑ چکا ہے۔ اور وہ نارمل نہیں رہا۔ ۔۲۶۵

ان عوامل کا یقیناً ثروت کی خودکشی کا محرکات میں بڑا عمل دخل ہے۔ لیکن جو بات شوکت عابد نے ثروت کے معاشی مسائل کے حوالے سے کی ہے۔ اس میں جزوی طور پر اختلاف کا پہلو موجود ہے۔ یہ درست ہے۔ کہ ثروت خودکشی کے وقت گریڈ ۱۸ میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ لیکن ابتدائی زمانے کی معاشی مشکلات نے انہیں توڑ دیا تھا۔ اسی حوالے سے محمد سلیم الرحمٰن کے نام ثروت ۱۵ ستمبر، ۱۹۸۱ء اپنے خط میں لکھتے ہیں "کبھی کبھی معاشی پریشانیوں کا ریلا اتنا شدید ہوتا ہے کہ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔" ۔۲۶۶ ایسی مشکلات نے ان کی خودکشی کے ضمن میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

موت کے درندے میں اک کشش تو ہے ثروت
لوگ کچھ بھی کہتے ہوں خودکشی کے بارے میں

ادیبوں کی نازک مزاجیاں سماج کے ایسے ہی محاذوں پر پسپائی کا راستہ اختیار کرتی ہیں۔ یہ ثروت کے اندر کی دنیا تھی۔ جبکہ وہ ان مخصوص حالات اور اپنی بعض نفسیاتی الجھنوں کے باوجود خوش باش دکھائی دیتے تھے۔ بقول افتخار عارف "ثروت بہت اچھا اور نفیس انسان تھا۔ نرم مزاج تھا۔ اکثر خواشگوار موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔" ۔۲۶۷ ثروت حسین کی خودکشی کے محرکات میں ایک محرک، جس کی نشاندہی دورانِ تحقیق ان کے اکثر احباب نے کی۔ وہ یہ کہ ثروت اپنی نجی زندگی میں کوئی زیادہ مطمئن شخص نہ تھے۔ اگرچہ انہیں اپنے گھر اور بچوں سے بہت محبت تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسا غیر اطمینان بخش رویہ بھی چل رہا تھا۔ جس نے ثروت کو داخلی طور پر نا آسودگی سے ہمکنار کر رکھا تھا۔ گو بظاہر وہ خوش باش نظر آتے تھے۔ بقول کشور ناہید

ثروت کو میں نے خودکشی سے کچھ عرصہ قبل دیکھا تھا۔ بہت مطمئن اور خوش باش لگ رہا تھا۔ اسوقت وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ثروت خودکشی کے لئے کوئی ارادہ یا ذہنی منصوبہ بندی اختیار کیے ہوئے ہے۔ ۔۲۶۸

محمد سلیم الرحمٰن کے نام ۲۹ مارچ، ۱۹۹۰ء کو ثروت لکھتے ہیں۔

مجھ پر نروس بریک ڈاؤن کے کئی حملے ہوئے۔ وہ تو کہیے کہ دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹر حسن منظر اس شہر میں موجود ہیں۔ اب آرام ہے نیند کے لئے گولیاں لینی پڑتی ہیں۔ چالیسویں برس میں قدم رکھنے کے بعد وقت گزرتے چلے جانے کا احساس دکھ دیتا ہے۔ ۔۲۶۹

یہ بھی ادیبوں کے ساتھ ایک مسئلہ رہا ہے۔ وقت کا گزرنا، عمر کا ڈھلنا، زندگی کی شام کی جانب پیش رفت اہل قلم کے اندر پہلے سے موجود ذہنی مسائل اور الجھنوں کو مزید تقویت دینے کا باعث بنتی ہے۔ بظاہر وہ اکثر اسکا اظہار نہیں کر پاتے۔ لیکن اندر ہی اندر ایک تصادم کی کیفیت جاری رہتی ہے۔

ثروت کے حوالے سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک حساس ادیب نے اپنے اندر کی بے سکونی کو اپنے خارجی رویے سے دور رکھا ہوا تھا۔ لیکن ان کے اندر اور باہر کی یہ کش مکش بالآخر اُن کی اعصابی اور نفسیاتی الجھنوں کی صورت میں نہ صرف ظاہر ہوئی۔ بلکہ ان کے لئے ایک مرض کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ اس ضمن میں ثروت کو ماہر نفسیات کے پاس بغرضِ علاج لے جایا جاتا رہا۔ لیکن مکمل افاقے کی صورت پیدا نہ ہو سکی۔

بقول صابر وسیم

> رفتہ رفتہ ثروت کی اعصابی شکستگی بڑھتی گئی۔ شوکت عابد کسی سائیکاٹرسٹ یا نیوروفزیشن سے چیک اپ کروانے اسے کراچی لے گئے۔ انہی دنوں کوشش کر کے اسے لاڑکانہ سے حیدرآباد، ڈسٹرکٹ کے ایک کالج میں تبادلہ بھی کروایا گیا۔ اب وہ حیدرآباد میں رہنے لگا۔ اسکا علاج بھی یہیں معروف افسانہ نگار حسن منظر صاحب کے پاس شروع ہو گیا۔ جو شہر کے مشہور سائیکاٹرسٹ اور نیوروفزیشن بھی ہیں۔ مگر یہ علاج بھی مستقل جاری نہ رہ سکا۔ بہر حال ان دنوں مسلسل علاج اور کڑی دیکھ بھال کی وجہ سے وہ نارمل ہونے لگا تھا۔ مگر مکمل صحت یاب وہ کبھی بھی نہیں ہوا۔ ۲۷۰

ثروت کے احباب کے علاوہ اکثر و بیشتر ادیبوں نے بھی اس بات کا خصوصی حوالہ دیا ہے کہ ثروت نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھے۔ گو ان کی شخصیت بظاہر بہت پر سکون اور خوشگوار دکھائی دیتی تھی۔ اسی حوالے سے بقول افتخار عارف "میں اس ضمن میں کوئی واضح بات نہیں کر سکتا۔ البتہ سننے میں آیا ہے کہ ان کے ساتھ کچھ نفسیاتی مسائل چل رہے تھے۔" ۲۷۱ گویا ثروت کی شخصیت کا داخل اور خارج نفسیاتی مسائل کی متصادم لہروں کی زد میں تھا۔ لیکن بظاہر اس کے اثرات واضح نہ تھے۔

بقول پروفیسر احمد جاوید

> ثروت سے میری دو مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ یہاں پنڈی آیا ہوا تھا۔ شاید ستر کی دہائی کا آخر تھا۔ سادہ سا آدمی تھا۔ لباس بھی پنجاب کا سا تھا۔ کرتا شلوار، ڈھیلا ڈھالا۔ سادہ گفتگو کرتا تھا، ادیب تھا۔ لیکن حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ اس نے ادب پر مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ مزاج خوشگوار تھا۔ زندگی سے بھرپور لگتا تھا۔ اور پہلی ملاقات سے ہی وہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا تھا۔ البتہ مجھے یہ ضرور محسوس ہوا۔ کہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی نفسیاتی مسئلہ اور ذہنی الجھن ضرور موجود تھی۔ ۲۷۲

ثروت حسین کی خودکشی کا ایک اہم محرک ان کی عشق میں ناکامی ہے۔ ان کی زندگی کا یہ پہلا عشق پروین شاکر کے ساتھ تھا۔ دونوں یونیورسٹی میں اکٹھے ایم اے کے طالب علم تھے۔ پروین انگریزی کی، جبکہ ثروت حسین اردو ادب کے طالب علم تھے۔ دونوں شاعر تھے۔ کالج کے مشاعروں میں دونوں کی شرکت لازم ہوتی تھی۔ ثروت جو فطری طور پر شاعرانہ خوبیوں کے مالک ذہین انسان تھے۔ اکثر پروین کے اشعار کی درستی کرتے۔ ان کی نوک پلک سنوارتے تھے۔ اس ضمن میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ ثروت ابتداء میں پروین شاکر کو شعر لکھ کر بھی دیتے تھے۔ ان کا یہ شاعرانہ اور ادبی تعلق دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آیا۔ لیکن پروین شاکر رفتہ رفتہ ثروت حسین کو نظر انداز کرنے لگیں۔ جبکہ ثروت اس

جذباتی تعلق میں بہت سنجیدہ ہو چکے تھے۔ بقول زاہد حسین بھٹی

پروین شاکر سے عشق نے ثروت حسین کے دل میں ایک عجیب بے کلی پیدا کر دی ۔۔۔ یہ دونوں محبت کے معاملے میں یکساں جذبات رکھتے تھے ۔۔۔ پروین شاکر سے ثروت حسین کا عشق زیادہ عرصہ نہیں چل سکا۔ ثروت حسین کے دوستوں کا کہنا ہے۔ کہ پروین شاکر ایک چالاک لڑکی تھی۔ وہ ثروت حسین کی احمقانہ سادگی سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ ثروت حسین کا لا ابالی پن اور کمزوریاں اسکے سامنے تھیں۔ چنانچہ جلد ہی اس نے ثروت حسین سے پہلوتہی اختیار کرنا شروع کر دی۔ ثروت حسین جنھوں نے اپنی اس اولین محبت کے بارے میں بہت سی خوش فہمیاں پال رکھی تھیں ۔۔۔ جب ان پر یہ اصل حال کھلا۔ تو وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے۔ ۲۷۳

ثروت حسین کے بھائی شوکت عابد پروین اور ثروت کے اس جذباتی تعلق کے حوالے سے ثروت کی اولین داخلی کیفیت کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''ان کا کیف دیدنی تھا۔ وہ ہر وقت ایک عالم مدہوشی کی حالت میں رہتے۔ جیسے انہوں نے تیز نشہ پی لیا ہو۔'' ۲۷۴ ڈاکٹر اجمل نیازی نے پروین شاکر اور ثروت حسین کے عشق کے معاملے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔

پروین شاکر کی بے وفائی سے ثروت حسین جیسے حساس دل شاعر کے اندر ایک شدید ٹوٹ پھوٹ کا عمل رونما ہوا۔ جسے ہم اسکی خودکشی کے محرکات سے خارج نہیں کر سکتے۔ اور پھر ثروت کے اندر اس لحاظ سے بھی ایک دکھ کی کیفیت پیدا ہوئی۔ کہ پروین جو اس سے ابتداء میں اپنی شاعری میں مدد لیتی تھی۔ آج کیونکر اس میدان میں اس سے آگے نکل گئی۔ ۲۷۵

پروین شاکر کی بے وفائی ثروت حسین کے لئے زندگی سے بیزاری اور بددلی کی انتہائی اہم وجہ بنی۔ وہ شاعر تھے۔ حساس اور دردمند دل رکھتے تھے۔ کسی اور سے تو انتقام نہ لے سکے۔ لیکن اپنی ہی ذات اور زندگی کو انتقام کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ثروت ردعمل کے طور پر کئی نفسیاتی، ذہنی اور اخلاقی بے راہ رویوں کا شکار ہو گئے۔ بقول زاہد حسین بھٹی۔

پروین شاکر سے عشق کی ناکامی کے بعد ثروت ہر طرح کی بے راہ رویوں کا شکار ہوتے چلے گئے۔ اور ان کے ذہنی توازن میں بگاڑ کے آثار پیدا ہونے لگے۔ جن سے وہ عمر بھر نجات حاصل نہ کر سکے۔ ۲۷۶

ان تمام اسباب و محرکات کے باوصف ثروت نے ٹرین کی آواز پر لبیک کہا۔ پلیٹ فارم پر بکھرا ہوا انتظار، ٹرین کی تنہا اداس کوک اور اسکی پٹڑیوں کے حدِ نظر دور دور بکھرے ہوئے راستوں کی طویل مسافتیں ایک نکتے پر مرکوز ہو گئیں۔ اور اس نکتے میں ثروت کے اندر کا انتہائی مضطرب ادیب، متجسس صوفی اور اپنے شخصی حوالے میں غیر مطمئن شخص ہمیشہ کے لئے ضم ہو گیا۔ اخبارات نے سرخیاں لگائیں، سرزمینِ ادب پھر ایک ادیب کی خودساختہ ہلاکت پر اشکبار ہوئی۔ لیکن خودکشی کے اس حیرت زدہ کر دینے والے سانحے کے پیچھے اگر پس منظر پر نظر دوڑائیں۔ تو ثروت کے قدموں کے نشانات جس

راستے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان کی فکر، جس سمت محو پرواز ہے اوران کی شاعری کا جو انداز ہے۔ یہ تمام تر حوالہ جواز فراہم کرتا ہے۔ کہ ثروت ذات اور سماج کے بعض مخصوص رویوں کے باعث طوقِ حیات کو اتار پھینکنے پر نہ صرف آمادہ تھے۔ بلکہ اس کے لئے انتہائی مضطرب اور بے چین تھے۔ ثروت کی ایک نظم جو انہوں نے یکم اکتوبر ۱۹۹۳ء میں لکھی۔اور کراچی کے "The Times" میں ۱۱۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔اس نظم میں بھی اس بات کی واضح نشاندہی ملتی ہے کہ ثروت کی زندگی جو ایک ناآسودہ حال درخت کی مانند تھی کسی لمحے کٹنے کو ہے۔اوراس نظم کے لکھنے سے فوراً پہلے ثروت کا پہلا اقدام خود کشی رونما ہو چکا تھا۔لہذا اخبار نے اس نظم کو شائع کرتے ہوئے مندرجہ ذیل تجزیاتی سطور رقم کیں۔

Cut the tree that ... young poet Sarwat Hussain met a near tragic accident while climbing a train on his way from Hyderabad to Nawab Shah in which he Suffered Physical injuries that finally resulted in amputating his toes and fingers of both feet. He is crippled and will have to now use special shoes for the rest of his life..-۲۷۷

جبکہ ان سطور کے ساتھ ثروت کی جو نظم شائع ہوئی۔وہ یہ تھی

کاٹ دو اس پیڑ کو۔۔۔

کاٹ دو اس پیڑ کو\
جس کے سائے میں کوئی ماندہ مسافر\
ایک پل سویا نہیں\
کاٹ دو اس پیڑ کو\
جس کے سائے میں کوئی عاشق\
کسی دن ٹوٹ کے رویا نہیں۔۲۷۸

اس نظم کا متن، خیال لہجہ اپنے تمام تر پس منظر کے ساتھ نشاندہی کرتا ہے۔ کہ ثروت اپنی زندگی کے جس درخت کو پہلی کوشش میں مکمل طور پر کاٹنے میں ناکام رہے۔وہ دوبارہ اسے مکمل طور پر کاٹنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔لہذا وہ جلد ہی پھر اس کوشش میں کامیاب ہو گئے۔

حوالہ جات

۱۔ ناصر بشیر، گمشدہ افسانہ نگار شمس آغا کی کہانی، القمر انٹر پرائزز، رحمان مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور، اشاعت، جولائی، ۱۹۹۵، ص، ۱۳
۲۔ ایضاً ص، ۳۶
۳۔ ایضاً ص، ۱۵
۴۔ ایضاً ص، ۲۳
۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر شام کی منڈیر سے، مکتبہ جدید پریس، لاہور، دسمبر، ۱۹۸۶، ص، ۵۴، ۵۵
۶۔ ایضاً ص، ۵۶
۷۔ ایضاً ص، ۵۵، ۵۶
۸۔ ایضاً ص، ۵۸
۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر دوسال شمس آغا کے ساتھ، ماہنامہ اوراق، سالنامہ جنوری، فروری، ۱۹۹۶، دفتر اوراق، سرور روڈ، لاہور چھاؤنی ، ص، ۲۸
۱۰۔ شمس آغا، افسانہ سُراب، بحوالہ ڈاکٹر وزیر آغا، شمس آغا کے افسانے، مشمولہ ماہنامہ اوراق، ص، ۳۵
۱۱۔ شمس آغا، شکست، بحوالہ وزیر آغا ڈاکٹر، ماہنامہ، اوراق، ص، ۳۷
۱۲۔ دیار محبوب میں ایک دن، بحوالہ وزیر آغا، ڈاکٹر ماہنامہ اوراق، ص، ۳۵
۱۳۔ بحوالہ ناصر بشیر، گمشدہ افسانہ نگار شمس آغا کی کہانی، ص، ۲۴
۱۴۔ مرزا ادیب، (مرتب) اندھیرے کے جگنو، جنگ پبلشرز، اشاعت اول، جنوری، ۱۹۹۲، ص، ۲۸
۱۵۔ صلاح الدین احمد، مولانا اندھیرے کے جگنو، ص، ۱۲
۱۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر شمس آغا کے افسانے، ماہنامہ، اوراق، ص، ۳۵
۱۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر شام کی منڈیر سے، ص، ۵۸
۱۸۔ ایضاً ص، ۵۸
۱۹۔ ایضاً
۲۰۔ بحوالہ گمشدہ افسانہ نگار، شمس آغا کی کہانی، ص، ۴۱

۲۱- وزیر آغا، ڈاکٹر شام کی منڈیر سے، ص، ۵۹
۲۲- ایضاً، ص، ۶۰
۲۳- ایضاً، ص، ۶۸
۲۴- ایضاً، ص، ۶۰
۲۵- ایضاً
۲۶- وزیر آغا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۵ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۲۷- وزیر آغا، ڈاکٹر دو سال شمس آغا کے ساتھ، اوراق، ص، ۲۲
۲۸- ایضاً، ص، ۲۲
۲۹- بحوالہ ناصر بشیر، گمشدہ افسانہ نگار، شمس آغا کی کہانی، ص، ۵۰
۳۰- ایضاً، ص، ۵۰
۳۱- ایضاً، ص، ۴۹
۳۲- شمس آغا، دیارِ محبوب میں ایک دن، مشمولہ اندھیرے کے جگنو، (مرتب) مرزا ادیب، جنگ پبلشرز، اشاعت اول، جنوری ۱۹۹۲،
۳۳- مرزا ادیب، (مرتب) اندھیرے کے جگنو، ص، ۳۰
۳۴- صلاح الدین، مولانا ایضاً، ص، ۱۳
۳۵- وزیر آغا، ڈاکٹر بحوالہ ناصر بشیر، شمس آغا کی کہانی، ص، ۴۲
۳۶- وزیر آغا، ڈاکٹر راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۳۷- سیدہ پروین، شکیب جلالی (شخصیت وفن) مقالہ برائے ایم اے اردو، ۱۹۸۰ از کریا یونیورسٹی، ملتان ص، ۱۲، (غیر مطبوعہ)
۳۸- امتیاز کلثوم شکیب جلالی، مقالہ برائے ایم اے اردو اونیٹل کالج لاہور، ۱۹۷۷ء ص، ۲۰ (غیر مطبوعہ)
۳۹- پرویز بزمی، (شکیب جلالی) روزنامہ نوائے وقت، لاہور، راولپنڈی، ۵ دسمبر، ۱۹۷۶ء
۴۰- غلام جیلانی اصغر، شکیب جلالی، اوراق، جنوری، ۱۹۶۷ء، ص، ۴۳
۴۱- محدثہ خاتون، راقمہ سے ملاقات، دسمبر ۲۷، ۲۰۰۵، کراچی
۴۲- بحوالہ تحقیقی مقالہ شکیب جلالی، (شخصیت وفن) از سیدہ پروین برائے ایم اے، اردو، (غیر مطبوعہ) بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۸۰، ص، ۱۲
۴۳- اقدس رضوی، راقمہ سے ملاقات، دسمبر ۲۷، ۲۰۰۵، کراچی
۴۴- وزیر آغا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۷ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۴۵- بحوالہ تحقیقی مقالہ از سیدہ پروین شکیب جلالی (شخصیت وفن) بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی ملتان، ص، ۳۵
۴۶- عارف بلے، (شاعر آنس معین کے بھائی ہیں) راقمہ سے ملاقات، ۲۳ دسمبر، ۲۰۰۵، ملتان
۴۷- محدثہ خاتون، اہلیہ شکیب جلالی، راقمہ سے ملاقات، ۲۷ دسمبر ۲۰۰۵، کراچی
۴۸- انوار احمد، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، بمقام بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی، ۲۳ دسمبر ۲۰۰۵، ملتان
۴۹- کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۵۰- احمد ندیم قاسمی، راقمہ سے ملاقات، ۱۶ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۵۱- محدثہ خاتون، راقمہ سے ملاقات، ۲۷ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۵۲- محدثہ خاتون، راقمہ سے ملاقات، ۲۷ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی

۵۳۔ بحوالہ تحقیقی مقالہ،شکیب جلالی،شخصیت وفن،ازسیدہ پروین،بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی،ملتان،۱۹۸۰ (غیر مطبوعہ)
۵۴۔ محدشہ خاتون، راقمہ سے ملاقات، ۲۷دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۵۵۔ ایضاً
۵۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۵جون، ۲۰۰۵، لاہور
۵۷۔ اقدس رضوری، راقمہ سے ملاقات، ۲۷دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۵۸۔ ایضاً
۵۹۔ توصیف تبسم، پروفیسر راقمہ سے گفتگو، ۲۷مارچ، ۲۰۰۵، اسلام آباد
۶۰۔ محدشہ خاتون، راقمہ سے ملاقات ۲۷دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۶۱۔ ایضاً
۶۲۔ شکیب جلالی، تحقیقی مقالہ از امتیاز کلثوم یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۷۷، ص، ۱۶، (غ۔م)
۶۳۔ بحوالہ تحقیقی مقالہ، ازسیدہ پروین، ص، ۳۶
۶۴۔ پرویز بزمی، شکیب جلالی، نوائے وقت، لاہور، راولپنڈی، ۵دسمبر، ۱۹۷۶ء
۶۵۔ سیدہ پروین، شکیب جلالی، (شخصیت وفن) بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۸۰، ص، ۳۲
۶۶۔ اقدس رضوی، راقمہ سے ملاقات، ۲۷دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۶۷۔ سیدہ پروین، شکیب جلالی، (شخصیت وفن) بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان ۱۹۸۰، ص، ۳۱، ۳۲، اسلام آباد
۶۸۔ رشید امجد، ڈاکٹر راقمہ سے گفتگو، بمقام نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ۲۸فروری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۶۹۔ احمد ندیم قاسمی، راقمہ سے ملاقات، ۱۶جون، ۲۰۰۵، لاہور
۷۰۔ اسد جعفری، بحوالہ تحقیقی مقالہ، شکیب جلالی (شخصیت وفن) ازسیدہ پروین، بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان، ۱۹۸۰، ص، ۲۹
۷۱۔ محدشہ خاتون، راقمہ سے گفتگو، ۲۷دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۷۲۔ ضیاالحسن، (مرتب) گمشدہ ستارہ، اظہار سنز، اردو بازار، لاہور، نومبر ۲۰۰۶، ص، ۱۱
۷۳۔ محسن عباس، راقمہ سے ملاقات، ۷جون، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۷۴۔ شبیر شاہد خط بنام والد، بحوالہ، گمشدہ ستارہ، (مرتب) ضیاالحسن، اظہار سنز، اردو بازار، لاہور، نومبر ۲۰۰۲، ص، ۱۲۲
۷۵۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۷۶۔ ایضاً ص، ۱۱
۷۷۔ ایضاً ص، ۱۷، ۱۸
۷۸۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۵جولائی، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۷۹۔ ضیاالحسن، (مرتب) گمشدہ ستارہ، اظہار سنز، اردو بازار، لاہور، نومبر ۲۰۰۲، ص، ۱۳، ۱۴
۸۰۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۱جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۸۱۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۲جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۸۲۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۵جولائی، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۸۳۔ تبسم کاشمیری، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۹جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۸۴۔ وحید قریشی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۰جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۸۵۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۲جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۸۶۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۵ جولائی، ۲۰۰۶، اسلام آباد

۸۷۔ ضیاالحسن، (مرتب) گمشدہ ستارہ، (شبیر شاہد کی نظم ونثر کا مجموعہ)، ص، ۱۷، ۱۸

۸۸۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۱ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۸۹۔ محسن عباس، متعلم پی ایچ ڈی، راقمہ سے ملاقات، ۷ جون ۲۰۰۶، اسلام آباد

۹۰۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۹۱۔ محسن عباس، متعلم پی ایچ ڈی، راقمہ سے ملاقات، ۷ جون، ۲۰۰۶، اسلام آباد

۹۲۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۱ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۹۳۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۲ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۹۴۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر راقم سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۹۵۔ شبیر شاہد، خط بنام والد، بحوالہ گمشدہ ستارہ، مرتبہ ضیاالحسن، ص، ۱۲۳

۹۶۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۹۷۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۱ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۹۸۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۲ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۹۹۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر راقم سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۱۰۰۔ ضیاالحسن، پروفیسر (مرتب) گمشدہ ستارہ، ص، ۴۳

۱۰۱۔ شبیر شاہد، خط بنام والد، بحوالہ گمشدہ ستارہ، (مرتب) ضیاء الحسن، ص، ۴۴

۱۰۲۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۵ جولائی، ۲۰۰۶، اسلام آباد

۱۰۳۔ شبیر شاہد، خط بنام والد، ۲۸ نومبر، ۱۹۷۳، لاہور، مشمولہ، گمشدہ ستارہ، (مرتب) ضیاء الحسن، ص، ۱۲۵

۱۰۴۔ ضیاالحسن، (مرتب)، گمشدہ ستارہ، ص، ۱۳

۱۰۵۔ ساراشگفتہ، ایک تھی سارا، شاعرہ ساراشگفتہ کا زندگی نامہ، (مرتب)، امریتا پریتم، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ، لاہور، ۱۹۹۴، ص، ۱۳۰

۱۰۶۔ ایضاً، ص، ۹۰

۱۰۷۔ ایضاً، ص، ۱۷

۱۰۸۔ ایضاً

۱۰۹۔ ایضاً، ص، ۳۱، ۳۰

۱۱۰۔ عذرا عباس، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری، ۲۰۰۶، کراچی

۱۱۱۔ افضال احمد سید، راقمہ سے ملاقات، ۲۷ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی

۱۱۲۔ عذرا عباس، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری، ۲۰۰۶، کراچی

۱۱۳۔ افضال احمد سید، راقمہ سے ملاقات، ۲۷ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی

۱۱۴۔ ایضاً، ۲۷ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی

۱۱۵۔ ساراشگفتہ، ایک تھی سارا، (مرتب) امریتا پریتم، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ لاہور، ۱۹۹۴ء، ص، ۱۳۰

۱۱۶۔ شوکت عابد (شاعر ثروت حسین کے حقیقی بھائی) راقمہ سے ملاقات، ۲۷ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی

۱۱۷۔ عذرا عباس، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری، ۲۰۰۶، کراچی

۱۱۸۔ شوکت عابد، راقمہ سے ملاقات، ۲۷ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی

۱۱۹۔ سارا شگفتہ، ایک تھی سارا، (مرتب) امریتا پریتم، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ لاہور، ص، ۳۶۹،
۱۲۰۔ ایضاً ص، ۴۱
۱۲۱۔ عذرا عباس، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری، ۲۰۰۶، کراچی
۱۲۲۔ سارا شگفتہ، ایک تھی سارا، (مرتب) امریتا پریتم، ص، ۳۶۹، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ لاہور، ۱۹۹۴، ص ۴۰
۱۲۳۔ ایضاً ص، ۴۲
۱۲۴۔ افضال سید، راقمہ سے ملاقات، ۲۷ دسمبر ۲۰۰۵، کراچی
۱۲۵۔ سارا شگفتہ، ایک تھی سارا، (مرتب) امریتا پریتم، ص، ۸۴
۱۲۶۔ ایضاً ص، ۸۵
۱۲۷۔ ایضاً ص، ۷۰
۱۲۸۔ ایضاً ص، ۵۷
۱۲۹۔ ایضاً ص، ۵۸
۱۳۰۔ ایضاً ص، ۱۳۳،
۱۳۱۔ ایضاً ص، ۶۹
۱۳۲۔ عذرا عباس، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری، ۲۰۰۶، کراچی
۱۳۳۔ کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۳۴۔ عذرا عباس، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری، ۲۰۰۶، کراچی
۱۳۵۔ ایضاً
۱۳۶۔ سارا شگفتہ، ایک تھی سارا، (مرتب)، امریتا پریتم، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ لاہور، ص، ۴۷
۱۳۷۔ ایضاً ص، ۵۵
۱۳۸۔ ایضاً ص، ۸۲، ۸۱
۱۳۹۔ ایضاً ص، ۸۲، ۸۱
۱۴۰۔ ایضاً ص، ۱۳۱
۱۴۱۔ کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۴۲۔ شوکت عابد، راقمہ سے ملاقات، ۲۷ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۱۴۳۔ گوہر سلطانہ عظمی، ''مردہ آنکھیں زندہ ہاتھ'' (مرتب) احمد سلیم، نگارشات، لاہور، میاں چیمبرز، ۳ ٹیمپل روڈ، لاہور ۱۹۸۹، ص، ۶، ۷
۱۴۴۔ افتخار عارف، راقمہ سے ملاقات
۱۴۵۔ ایضاً
۱۴۶۔ سارا شگفتہ، ایک تھی سارہ، (مرتب) امریتا پریتم، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ لاہور، ص، ۱۹۹۴، ص، ۷
۱۴۷۔ ایضاً ص، ۱۶۴
۱۴۸۔ عذرا عباس، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری ۲۰۰۶، کراچی
۱۴۹۔ کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات، اسلام آباد
۱۵۰۔ ایضاً
۱۵۱۔ کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات اسلام آباد، ۱۴ جنوری ۲۰۰۶

۱۵۲۔ سارا شگفتہ، ایک تھی سارا، (مرتب) امرتا پریتم، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ لاہور، ۱۹۹۴، ص ۵۴
۱۵۳۔ عذرا عباس، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری ۲۰۰۶، کراچی
۱۵۴۔ کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۵۵۔ افتخار عارف، راقمہ سے ملاقات، اسلام آباد، ۱۶ جنوری ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۵۶۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۵ جولائی ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۵۷۔ شوکت عابد، راقمہ سے ملاقات، ۲۷ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۱۵۸۔ سارا شگفتہ، ایک تھی سارا، مرتب امرتا پریتم، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ، لاہور، ص، ۱۶۵
۱۵۹۔ ایضاً، ص، ۱۶۱
۱۶۰۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے گفتگو، بمقام، نیوول یونیورسٹی، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۶۱۔ کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۶۲۔ عذرا عباس، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری، ۲۰۰۶، کراچی
۱۶۳۔ سارا شگفتہ، ایک تھی سارا، (مرتب) امرتا پریتم، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ، لاہور، ص، ۱۶
۱۶۴۔ ایضاً، ص، ۴۶
۱۶۵۔ رشید احمد، ڈاکٹر راقمہ سے گفتگو، بمقام، نیوول یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶
۱۶۶۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۶۷۔ عذرا عباس، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری، ۲۰۰۶، کراچی
۱۶۸۔ کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات
۱۶۹۔ سارا شگفتہ، ایک تھی سارا، (مرتب) امرتا پریتم، ص، ۶۱
۱۷۰۔ کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات
۱۷۱۔ سارا شگفتہ، ایک تھی سارا، (مرتب)، امرتا پریتم، ص، ۱۹
۱۷۲۔ ایضاً، ص، ۲۲
۱۷۳۔ ایضاً، ص، ۳۸
۱۷۴۔ ایضاً، ص، ۴۶
۱۷۵۔ ایضاً، ص، ۸۸
۱۷۶۔ ایضاً
۱۷۷۔ عذرا عباس، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری، ۲۰۰۶، کراچی
۱۷۸۔ گوہر سلطانہ عظمی، مردہ آنکھیں، زندہ ہاتھ، (مرتب) احمد سلیم، نگارشات، لاہور، میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ، لاہور ۱۹۸۹، ص، ۸۰
۱۷۹۔ سارا شگفتہ، ایک تھی سارا، (مرتب)، امرتا پریتم، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ، لاہور، ص، ۴۴
۱۸۰۔ ایضاً
۱۸۱۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۸۲۔ افتخار عارف، راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری ۲۰۰۵، اسلام آباد
۱۸۳۔ گوہر سلطانہ عظمی، مردہ آنکھیں، زندہ ہاتھ، سارا شگفتہ کی یادیں، باتیں، نظمیں اور خط، (مرتب) احمد سلیم، نگارشات لاہور،

میاں چیمبرز، ۳ ٹیمپل روڈ، لاہور، ۱۹۸۹، ص ۶

۱۸۴۔ سارا شگفتہ، ایک تھی سارا، (مرتب) امریتا پریتم، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ، لاہور، ص ۵۳
۱۸۵۔ ایضاً ص، ۹۳
۱۸۶۔ ایضاً ص، ۱۳۲
۱۸۷۔ ایضاً ص، ۱۳۵
۱۸۸۔ ایضاً ص، ۸۲
۱۸۹۔ ایضاً ص، ۲۰
۱۹۰۔ ایضاً ص، ۴۴
۱۹۱۔ ایضاً ص، ۸۸
۱۹۲۔ ایضاً ص، ۱۳۱
۱۹۳۔ ایضاً ص، ۱۳۲
۱۹۴۔ ایضاً ص، ۱۳۴
۱۹۵۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۹۶۔ سارا شگفتہ، ایک تھی سارا، (مرتب) امریتا پریتم، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ، لاہور، ص ۵۴
۱۹۷۔ ایضاً ص، ۱۳۸
۱۹۸۔ ایضاً ص، ۳
۱۹۹۔ سارا شگفتہ، مردہ آنکھیں، زندہ ہاتھ، سارا شگفتہ کی یادیں، باتیں، نظمیں اور خط، (مرتب) احمد سلیم، نگارشات لاہور، میاں چیمبرز، ۳ ٹیمپل روڈ، لاہور، ۱۹۸۹، ص ۵۵
۲۰۰۔ سارا شگفتہ، ایک تھی سارا، (مرتب)، امریتا پریتم، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ، لاہور، ص ۲۳
۲۰۱۔ ایضاً ص، ۶۱
۲۰۲۔ ایضاً ص، ۵۴
۲۰۳۔ ایضاً ص، ۷۰
۲۰۴۔ ایضاً ص، ۱۶۲
۲۰۵۔ ایضاً ص، ۱۱۸
۲۰۶۔ ایضاً ص، ۱۷۰
۲۰۷۔ ایضاً ص، ۱۷۴
۲۰۸۔ شوکت عابد، راقمہ سے ملاقات، ۲۷ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۲۰۹۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۱۰۔ گوہر سلطانہ عظمی، مردہ آنکھیں، زندہ ہاتھ، (مرتب) احمد سلیم، نگارشات، میاں چیمبرز، ۳ ٹیمپل روڈ، لاہور ۱۹۸۹، ص، ۷
۲۱۱۔ عذرا عباس، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری ۲۰۰۶، کراچی
۲۱۲۔ شوکت عابد، راقمہ سے ملاقات، ۲۷ جنوری ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۱۳۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۱۴۔ کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶، اسلام آباد

۲۱۵۔ ایضاً
۲۱۶۔ عارف بلے (آنس معین کے حقیقی بھائی) سے راقمہ کی گفتگو، ۲۳ دسمبر، ۲۰۰۵، ملتان
۲۱۷۔ بحوالہ غم زدہ باپ کا ایک خط، مشمولہ اوراق، خاص نمبر، مدیر وزیر آغا، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص، ۱۹۸
۲۱۸۔ بحوالہ مضمون، ''اندر کا آنس'' روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ملتان، ۳۰ مارچ، ۱۹۸۶ء
۲۱۹۔ انور سدید، ڈاکٹر غزل کا جواں مرگ شاعر، آنس معین، اوراق، خاص نمبر، مدیر وزیر آغا، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص، ۲۰۳
۲۲۰۔ فخر الدین بلے، بحوالہ غم زدہ باپ کا ایک خط مشمولہ اوراق، خاص نمبر، مدیر وزیر آغا، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص، ۱۹۸
۲۲۱۔ ایضاً، ص، ۱۹۸
۲۲۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر راقمہ کی ملاقات، ۱۶ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۲۲۳۔ فخر الدین بلے، غم زدہ باپ کا ایک خط، مشمولہ، اوراق، مدیر وزیر آغا، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص، ۱۹۸
۲۲۴۔ وحید قریشی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۰ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۲۲۵۔ انور جمال، روح کی منجدھار کا شناور، اوراق، ص، ۲۰۹
۲۲۶۔ وحید قریشی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۰ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۲۲۷۔ آنس معین کا آخری خط، اوراق، خاص نمبر، مدیر ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبہ جدید پریس لاہور، ۱۹۸۶ء، ص، ۱۹۷
۲۲۸۔ ایضاً
۲۲۹۔ ایضاً
۲۳۰۔ عارف بلے، راقمہ سے ملاقات، ۲۳ دسمبر، ۲۰۰۵، ملتان
۲۳۱۔ فخر الدین بلے، اوراق، خاص نمبر، مدیر ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبہ جدید پریس لاہور، ۱۹۸۶ء، ص، ۱۹۸
۲۳۲۔ صلاح الدین درویش، تحقیقی مقالہ، ملتان کے تین جواں مرگ شاعر، بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان، ۸۶، ۱۹۸۷ء، ص، ۸۷
۲۳۳۔ ایضاً، ص، ۸۸
۲۳۴۔ ایضاً
۲۳۵۔ عارف بلے، راقمہ سے ملاقات، ملتان، ۲۳ دسمبر، ۲۰۰۵، ملتان
۲۳۶۔ صلاح الدین درویش، ملتان کے تین جوانمرگ شاعر، بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان ۸۶، ۱۹۸۷
۲۳۷۔ ایضاً، ص، ۹۰
۲۳۸۔ فخر الدین بلے، بحوالہ غم زدہ باپ کا ایک خط، مشمولہ، اوراق، مدیر وزیر آغا، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص، ۱۹۸
۲۳۹۔ آنس معین کا آخری خط، مشمولہ اوراق، خاص نمبر، مدیر ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبہ جدید پریس لاہور، ۱۹۸۶ء،
۲۴۰۔ صلاح الدین درویش، ملتان کے تین جوانمرگ شاعر، ص، ۹۱
۲۴۱۔ شوکت عابد، راقمہ سے ملاقات، ۲۸ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۲۴۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر راقمہ سے گفتگو، بمقام بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی، ۲۳ دسمبر، ۲۰۰۶، ملتان
۲۴۳۔ صلاح الدین درویش، ملتان کے تین جوانمرگ شاعر، ص، ۹۰
۲۴۴۔ وحید قریشی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۰ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۲۴۵۔ عارف بلے، راقمہ سے گفتگو، ۲۴ دسمبر، ۲۰۰۵، ملتان
۲۴۶۔ ایضاً

۲۴۷۔ صلاح الدین درویش، ملتان کے تین جوانمرگ شاعر، ص، ۸۹
۲۴۸۔ بحوالہ ستم زدہ باپ کا ایک خط، مطبوعہ، اوراق، خاص نمبر، مدیر وزیر آغا، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۸۶ء ص، ۱۹۸
۲۴۹۔ شوکت عابد، راقمہ سے ملاقات، ۲۷ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۲۵۰۔ ایضاً
۲۵۱۔ صابر وسیم، روزنامہ نوائے وقت، کراچی، ادبی ایڈیشن، ۲ دسمبر، ۱۹۹۶
۲۵۲۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر بحوالہ کاندھے پہ دھرے ساز، از زاہد حسین بھٹی، غالب نما، ایف اے/۱۰ وحدت کالونی لاہور، الحسن پبلی کیشنز، ۲۵۳ ایف، رحمان پورہ، لاہور، اکتوبر، ۱۹۹۸، ص، ۷۷
۲۵۳۔ بحوالہ ''مکالمہ کراچی''، کتابی سلسلہ: ۸، ترتیب مبین مرزا، اکادمی بازیافت، فیڈرل بی ایریا، کراچی، جون، ۲۰۰۲، ص، ۴۶۴
۲۵۴۔ صابر وسیم، روزنامہ نوائے وقت، کراچی، ادبی ایڈیشن، ۲ دسمبر، ۱۹۹۶
۲۵۵۔ شوکت عابد، راقمہ سے ملاقات، ۲۷ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۲۵۶۔ صابر وسیم، روزنامہ نوائے وقت، کراچی، ص، ادب، ۲ دسمبر ۱۹۹۶
۲۵۷۔ الیاس عشقی، ڈاکٹر بحوالہ کاندھے پہ دھرے ساز، از زاہد حسین بھٹی، (ثروت حسین شخصیت اور فن) غالب نما، ایف اے/10 وحدت کالونی، لاہور، الحسن پبلیکیشنز، رحمان پورہ، لاہور، ۱۹۹۸، ص، ۲۰۲
۲۵۸۔ احمد ہمیش، روزنامہ پبلک، کراچی، ۱۰ ستمبر ۱۹۹۶
۲۵۹۔ احمد ہمیش، بحوالہ ''کاندھے پہ دھرے ساز''، از زاہد حسین بھٹی، ص، ۴۸
۲۶۰۔ شوکت عابد، راقمہ سے ملاقات
۲۶۱۔ فاطمہ حسن، مضمون، روزنامہ نوائے وقت، کراچی، ۲۱ اکتوبر، ۱۹۹۶
۲۶۲۔ آصف فرخی، ڈاکٹر روزنامہ پبلک ایوننگ، کراچی، ۱۰ ستمبر، ۱۹۹۶
۲۶۳۔ شوکت عابد، راقمہ سے ملاقات
۲۶۴۔ ایضاً، راقمہ سے ملاقات
۲۶۵۔ قمر جمیل، بحوالہ کاندھے پہ دھرے ساز، از زاہد حسین بھٹی، ص، ۱۰۴
۲۶۶۔ بحوالہ ''مکالمہ کراچی''، کتابی سلسلہ: ۸، ترتیب، مبین مرزا، اکادمی ادبیات، فیڈرل بی ایریا، کراچی، جون، ۲۰۰۲، ص، ۴۶۳
۲۶۷۔ افتخار عارف، راقمہ سے ملاقات، ۲۶ فروری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۶۸۔ کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات، ۱۶ فروری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۶۹۔ بحوالہ ''مکالمہ کراچی''، کتابی سلسلہ: ۸، ترتیب، مبین مرزا، اکادمی ادبیات، فیڈرل بی ایریا، کراچی، جون، ۲۰۰۲، ص، ۴۶۳
۲۷۰۔ صابر وسیم، روزنامہ نوائے وقت، کراچی، ص، ادب، ۲ دسمبر، ۱۹۹۶
۲۷۱۔ افتخار عارف، راقمہ سے ملاقات، ۲۶ فروری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۷۲۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۲ اگست، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۷۳۔ زاہد حسین بھٹی، بحوالہ کاندھے پہ دھرے ساز، ص، ۳۲، ۳۳
۲۷۴۔ شوکت عابد، بحوالہ کاندھے پہ دھرے ساز، از زاہد حسین بھٹی، ص، ۳۶
۲۷۵۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۲۷۶۔ زاہد حسین بھٹی، کاندھے پہ دھرے ساز، ص، ۳۸
۲۷۷۔ The times of Karachi, Thursday, October 14, 1993
۲۷۸۔ Ibid

باب چہارم

اردو کے وہ ادیب،

جنہوں نے خودکشی تو نہیں کی۔ لیکن خودکشی کی راہ پر چلے

میراجی (محمد ثناءاللہ): ۱۹۱۲ء۔۱۹۴۹

میراجی کا تعلق کشمیریوں کے ڈار گوت خاندان کے ساتھ تھا۔ ان کے والد ریلوے انجینئر تھے۔ مختلف شہروں میں تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ اس حوالے سے میراجی کو مختلف علاقوں میں گھومنے پھرنے کا اتفاق رہا۔ بظاہر میراجی کا جو حلیہ تھا۔ اسے کوئی بھی شخص نارمل انسان کا حلیہ نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ ایک بہروپ تھا۔ جو میراجی نے خود اختیار کر رکھا تھا۔

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی

> لمبے لمبے بال، بڑی بڑی مونچھیں، گلے میں ایک سو ایک موٹے دانوں کی دو گز لمبی مالا۔ شیروانی، جس کی کہنیاں ہمیشہ پھٹی ہوتی تھیں۔ اوپر نیچے بیک وقت تین پتلونیں۔ اوپر کی جب میلی ہوگئی۔ تو نیچے کی اوپر۔ اور اوپر کی نیچے بدل جاتی۔ شیروانی کی دونوں جیبوں میں بہت کچھ ہوتا تھا۔۔۔ ایک پائپ، کاغذ میں پائپ کا دیسی تمباکو، پان کی ڈبیا، ہومیو پیتھک دوائیں، کاغذوں اور بیاضوں کا پلندہ۔۔۔[۱]

اس بہروپ کے پیچھے درحقیقت میراجی کا ایک مخصوص ذہنی و فکری پس منظر ہے۔ جسکی وہ تسکین چاہتے تھے۔ لیکن جس ثابت قدمی کے باعث انہوں نے یہ بہروپ قائم رکھا۔ اس حوالے سے روپ اور بہروپ میں فرق کرنا آسان نہیں۔

میراجی نے پہلے پہل اپنا تخلص سامری رکھا تھا۔ بعد میں مستقل طور پر میراجی اختیار کیا، موسیقی سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ میراجی کے یہ ہنر ان کی فطری تخلیقی صلاحیتوں کے مظہر ہیں۔ جن میں سے بعض ہنر بعد میں انہیں ایک اچھے فنکار کے طور پر بھی ایک منفرد پہچان عطا کرتے ہیں۔

میراجی اردو شعر ادب میں اپنے وقت کا ایک بڑا نام ہے۔ وہ مطالعہ کے از حد شوقین تھے۔ انکی شاعری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ غمِ عشق کے باعث شاعری کی ابتداء کی تھی۔ اکثر میراجی پنجاب لائبریری میں دیکھے جاتے۔ رسالے، کتابیں، اخباریں بغل میں دبائے وہ ان دنوں صفائی پسند بھی دکھائی دیتے تھے۔ لباس صاف ستھرا ہوتا۔ وہ نہ صرف خود لکھنے لکھانے کے شوقین تھے۔ بلکہ اپنے وقت کے علمی و ادبی رجحانات کا خاصا شعور رکھتے تھے۔ لکھنا لکھانا محض ان کا شوق ہی نہیں تھا۔ بلکہ ان کا ذریعہ معاش بھی تھا۔ میراجی مولانا صلاح الدین کی ادبی دنیا میں ۳۰ روپے ماہوار پر ملازم ہوئے۔ ان تیس روپوں میں سے پندرہ روپے اپنی والدہ کو دیتے جو میراجی کا خاص خیال رکھتی تھیں۔

لاہور میں میرا جی کے ایک اچھے نقاد کی حیثیت سے اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے۔ لارنس گارڈن جا کر دوستوں سے علمی وادبی مباحث کرتے۔ تبادلۂ خیالات ہوتا۔ ایک دوسرے کی ادبی کاوشوں پر ہلکی پھلکی رائے زنی ہوتی۔ بعد میں ادبی دنیا کی ملازمت ترک کرنے کے بعد وہ آل انڈیا ریڈیو لاہور میں ملازم ہو گئے۔ یہاں کچھ وقت گزارا۔ چونکہ طبیعت میں کسی ایک مقام پر ٹھہراؤ کا مادہ نہ تھا۔ چنانچہ اڑھائی سو روپے میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہو گئے۔ لیکن دوران ملازمت لاہور اور دہلی آنا جانا لگا رہا۔ بمبئی میں بھی قیام پذیر رہے۔ شہروں شہروں گھومنا میرا جی کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ جہاں سے جب طبیعت مانی۔ چل دیئے۔

میرا جی حلقہ اربابِ ذوق کے بانی تھے۔ اور حلقے کی علمی وادبی سرگرمیوں کے روح رواں تھے غزلوں، نظموں اور دیگر ادب پاروں پر تنقیدی سرگرمیاں ان کے مزنگ والے گھر میں منعقد ہوتی تھیں۔ حلقے کو متعارف کروانے اور اس کے حوالے سے ایک منفرد اور متوازن تنقیدی روش کو آغاز دینے میں میرا جی کا اہم کردار ہے۔ خارجی زندگی کا رد و بدل انسان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اور خصوصاً ادیب اپنی حساس فطرت کے باعث ان خارجی تغیرات سے زیادہ اثر قبول کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے۔ میرا جی کی پیدائش اور وفات تک کا زمانہ دنیا کی دو عالمگیر جنگوں کا زمانہ تھا۔ اجتماعی زندگی افراط وتفریط کا شکار تھی۔ سیاسی انتشار نے لامحدود سطح پر عدم تحفظ کی فضا پیدا کر دی تھی۔ سارے کا سارا ذہنی، فکری سفر بے سمت، منزل کے نشانات معدوم ہو جاتے ہیں گویا اسوقت قدیم اور جدید کا تصادم عروج پر تھا۔ میرا جی کا تعلق اسی سماج اور اسی نسل کے ساتھ تھا۔ جہاں غیر محسوساتی طور پر ایک بغاوت کا رجحان اندر ہی اندر ذہنوں میں پنپ رہا تھا۔ بقول جمیل جالبی

> مارکس، فرائیڈ اور آئن سٹائن کے نظریات نے نئے معاشی، انسان، ذہنی اور سائنسی علوم کے امکانات وا کر دیئے۔ برصغیر بھی اس بدلے ہوئے تناظر سے متاثر ہوا۔ اور یہاں بھی صورتِ حال تیزی سے بدلنے لگی۔ افلاس، مایوسی، بے روزگاری اور بے یقینی نے نوجوان نسل کو گھیر لیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے مستقبل گم ہو گیا ہے۔ میرا جی اسی نوجوان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔۔۔ میرا جی نے لکھا۔ ''مستقبل سے میرا تعلق بے نام سا ہے۔ میں صرف دو زمانوں کا انسان ہوں۔ ماضی اور حال۔ یہی دو دائرے مجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔ اور میری عملی زندگی بھی انہی کی پابند ہے۔''۔[۲]

میرا جی کی یہ سوچ بلا شبہ ان کی ذہنی وفکری پس منظر کی آئینہ دار ہے۔ وہ ذہنی وفکری پس منظر جس سے میرا جی کی شخصیت متشکل ہوئی۔ یہ ماحول یہ سیاسی اور سماجی انتشار پورے اجتماعی ذہن کی اس بے سمتی کی نشاندہی کرتا ہے۔ جب فرد کے سامنے سے منزلیں گم ہو رہی ہیں ماضی گمشدہ زمانے کی کہانی، حال غیر محفوظ اور مستقبل بے یقینی کی دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرا جی اس پس منظر میں اپنے عہد کی ناراض اور بے یقین ہوتی ہوئی نسل کے فرد ہیں۔ اسی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسی بے یقینی نے انہیں جم کر کوئی کام نہ کرنے دیا۔ میرا جی نے میٹرک کا امتحان تین مرتبہ دیا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ پڑھائی سے دل پوری طرح اچاٹ ہو چکا تھا۔ کوئی واضح نصب العین ان کے سامنے نہ تھا۔ حالانکہ وہ فطری طور پر ذہین انسان تھے۔ لیکن طبیعت کی لاپرواہی آڑے رہی۔ تمام گھر والے ان کی تعلیم سے اب مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن تعلیمی سطح کی اس مایوسی نے میرا جی کے اندر موجود دیگر تخلیقی، علمی وادبی صلاحیتوں کو غیر فعال نہ ہونے دیا۔ البتہ طبیعت کی لاپرواہی اور ان کی

فطرت نے انہیں کسی کام کو مکمل طور پر سرانجام دینے سے باز رکھا مثلاً ہومیو پیتھک کرنی چاہی۔ اس میں بھی میراجی کامیاب نہ ہو سکے۔ شاید کسی کام کے آغاز کے ساتھ ہی ان کا اس سے اکتا جانا ہے۔ اور وہ کسی نئی مہم جوئی کا آغاز کر دیتے تھے۔ یہی چیز ان کی بے یقین فطرت اور ان کے ذہنی انتشار کی آئینہ دار ہے۔ اور یہ اپنے عہد کا وہ پریشان حال فنکار ہے۔ جو پیدائشی طور پر گوناں گوں تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ لیکن بدقسمتی یہ کہ کچھ مخصوص فطرت کے ہاتھوں انہوں نے خود کو تباہ کیا۔ اور اس ضمن میں انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ خود کو کس کس طرح سے ضائع کیا جائے۔ اور پھر اپنی موت تک وہ شدت کے ساتھ خود کو ضائع کرنے کے راستے پر گامزن رہے۔

میراجی جس طرح کسی ایک کام کو دل جمعی کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے۔ اسی متلون مزاجی نے انہیں کسی ایک شہر میں سکون کیساتھ زندگی نہیں گزارنے دی۔ ہمہ وقت وہ حالت سفر میں رہتے تھے۔ ملازمت، کاروبار اور زندگی کے مشاغل ہر لمحہ بدلتے رہے تھے۔ ماسوائے ان کی فطرت کے وہ مخصوص خدوخال جنہوں نے میراجی کو تعمیر کی بجائے اپنی ذات کی تخریب کاری پر آمادہ رکھا۔ میراجی کی پریشان خیالی کا ایک نمایاں پہلو ان کی فطرت کی ناآسودگی ہے۔ یہ ناآسودگی کئی حوالوں سے تھی۔ داخلی زندگی کی محرومیاں، زندگی کے خارجی عوامل سے عدم مفاہمت اور شہر در شہر کی مسافرت میں ماضی کے گم شدہ اوراق، عزیز واقارب کی یادیں اور احباب کی محفلیں سب اس ناآسودگی کا نمایاں حوالہ تھیں۔ بقول الطاف گوہر "گھر کی محبت، لاہور کی یاد، دوستوں سے دوری، زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی ناکامی کا شدید احساس یہ سب انہیں گھیرے ہوئے تھا"۔[۳]

اپنی نظم "مجھے گھر یاد آتا ہے۔" میں وہ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں

حیات مختصر سب کی بہی جاتی ہے اور میں بھی
ہر اک کو دیکھتا ہوں مسکرایا ہے کہ ہنستا ہے
کوئی ہنستا نظر آئے کوئی روتا نظر آئے
میں سب کو دیکھتا ہوں، دیکھ کر خاموش رہتا ہوں، مجھے ساحل نہیں ملتا

زندگی کی اس ناآسودگی نے میراجی کو ہر گام پر بے چین رکھا۔ وہ سفر در سفر کی حالت میں رہتے ہوئے بھی اپنے مخصوص مزاج اور طرزِ فکر کے دائرے سے باہر نہ آ سکے۔ اکثر میراجی کے لئے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ اپنی چند ضروری اشیاء کا تھیلا کاندھے پر لادے نظر آتے تھے۔ جسکا بوجھ اٹھائے اٹھائے ان کے کندھے شل ہو رہے تھے۔ ایک فنکار اس بوجھ تلے مر رہا تھا۔ دہلی، لاہور اور بمبئی ان کی مسافرت کے اہم شہر تھے۔ ان جگہوں میں ان کی ناکام زندگی ماری ماری پھر رہی تھی۔ ذریعہ معاش در بدر تھا۔ ایک بار پھر دہلی چھوڑ کر بمبئی چلے گئے۔ وہاں منٹو نے ان کے لئے فلمستان میں ملازمت کی کوشش کی جو نہ مل سکی۔ اور نوبت فاقوں تک جا پہنچی۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> دہلی سے بمبئی پہنچ کر جو تجربات ہوئے۔ ابھی آپکو ان کا ہلکا سا اندازہ بھی نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ دو دو تین تین دن بھوکے رہنے کے تجربات حاصل کرنے کے بعد۔۔۔ ایک ترجمے کا کام ملا تھا۔ دسمبر کے وسط میں وہ بھی ختم ہو گیا۔ اور روٹی کا سہارا جاتا رہا۔[۴]

میراجی کا یہ خط ان کی کسی جز وقتی پریشانی یا معاشی بدحالی کا مظہر نہیں۔ بلکہ ان کی یہ کیفیت ان کی مختصر اور مکمل

زندگی کی ترجمان ہے۔ یہ وہ کیفیت اور صورتِ حال ہے۔ جس سے وہ تمام عمر باہر نہ آ سکے۔ یہ ایک فنکار کی زندگی کا بڑا المیہ کہ ان مشکلات کے ہاتھوں اُن کا فن بھی اونے پونے داموں بکتا رہا۔ مثلاً دہلی جانے سے پہلے میرا جی نے اپنی کتاب ''میرا جی کے گیت'' مکتبہ اردو کو ۵۰ روپے میں فروخت کر دی۔

یہ تمام عوامل اور زندگی کی ستم ظریفی رفتہ رفتہ میرا جی کو اس راستے پر دھکیلتی چلی گئی۔ جہاں نہ صرف ان کے احباب کو بلکہ خود میرا جی کو اپنی موت یقینی نظر آتی تھی۔ لیکن موت کی طرف جانے والے اس خود ساختہ راستے پر چلنے سے نہ تو ان کے احباب ان کو بچا سکے۔ اور نہ میرا جی نے خود اس راستے کو ترک کیا اور انجام کار وقت سے بہت پہلے موت کا گرویدہ موت سے ہمکنار ہوا۔ وہ موت جسے ہم خود کشی کا دوسرا نام دے سکتے ہیں۔

نظم ''عدم کا خلا'' میں لکھتے ہیں۔

حیات رفتہ ، حیات آئندہ سے ملے گی یہ کون جانے
ہوا کے جھونکے ادھر جو آئیں تو ان سے کہنا
ہر جگہ دام ، دوریوں کا بچھا ہوا ہے

کہتے ہیں کہ میرا جی کو کثرتِ مے نوشی اور بے راہ روی کی زندگی نے مار ڈالا۔ ایک انٹیلیکچول اپنے وقت کا نامور لکھاری اور فطری تخلیقی صلاحیتوں کا مالک فنکار انتہائی کس پرسی میں اپنے ہی ہاتھوں موت کا شکار ہو گیا۔ کیونکہ جس طرزِ زندگی کو میرا جی نے اختیار کر رکھا تھا۔ وہ مکمل طور پر انکا خود انتخاب کردہ راستہ تھا۔ انہوں نے ہر وہ کام کیا۔ جس نے اس کی صحت کو گھن کی طرح چاٹ ڈالا۔ انہوں نے ہر وہ طریقہ کار اپنایا جو زندگی کی بجائے انہیں موت کی طرف کھینچ لے گیا۔ میرا جی نے کچھ اپنے مخصوص طرزِ زندگی اور کچھ زندگی کے نامساعد حالات کے ہاتھوں شدت کے ساتھ خود کو تباہ کیا۔ اس غیر فطری اور قبل از وقت موت کو جسے ہم خود کشی کا دوسرا نام دے سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر مندرجہ ذیل اسباب و محرکات اہمیت کے حامل ہیں۔ جن کے ہاتھوں میرا جی وقت سے بہت پہلے داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔

میرا جی کی زندگی کا سب سے اہم ترین واقعہ میرا جی کے ناکام عشق کا ہے۔ ادیبوں کے یہاں اور خصوصاً وہ ادیب جنہوں نے خود کشی کی یا اقدام خود کشی کرتے رہے۔ ان کے محرکات میں ایک اہم محرک عشق کی ناآسودہ حالی کے ہاتھوں تمام زندگی روگ لگا کر جیئے۔ چونکہ ادیب کی حساس فطرت ایک عام شخص کی نسبت جذباتی جنگ میں ہار کو اکثر زندگی ہارنے کے طور پر لے لیتی ہے۔ لہٰذا میرا جی کی حسرت و یاس پر مبنی زندگی میں ہم ان کے ناکام عشق کی داستان کو کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بقول کمال مصطفےٰ

> میرا جی کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ عشق کا ہے۔ وہ ناکام عشق جو انہوں نے میرا سین سے کیا تھا۔ دور سے دیکھا کیے بات کرنے کی کوشش کی۔ کوئی جواب نہ ملا، اور یہ اسی آگ میں پگھلتے رہے۔ وہ عشق اسقدر تند و تیز تھا۔ کہ اس کی ناکامی نے بھی میرا جی کی شخصیت کو متضاد سانچوں میں ڈھال دیا۔ ایک طرف تو وہ اپنی ذات میں کھو گئے۔ نرگسیت کی حد تک۔ وہ اپنی ہی ذات میں مقید ہو گئے۔ اور دوسری طرف اپنی ناکامی کا بدلہ یوں لیا۔ کہ روایتی اور اخلاقی قدروں کو توڑا۔ اور ان کیخلاف بغاوت کی۔ اور اس طرح وہ خود تشفی اور تن آسانی میں مبتلا ہو گئے۔ ۵

اس ناکام عشق نے میراجی کو سب کچھ دیا۔ ایک طرف بحیثیت شاعر وہ عشق، حسن اور ایک آوارہ خرام زندگی کا نوحہ گر بن گئے۔ تو دوسری طرف، تنہائی، خودتشفی، حسرت ویاس کا نوحہ بنکر وہ عملی زندگی سے کٹتے چلے گئے۔ اس محبت کے جذبے میں اتنی شدت، اتنی تپش، اتنی خودسپردگی، اتنی بے خودی کہ سب کچھ دھماکے کے ساتھ اڑ گیا۔ شاید یہی وہ ایسا لمحہ تھا۔ جس نے ان کی آئیندہ زندگی کے مخصوص راستے اور مخصوص سمتوں کا تعین کر دیا۔

میراجی نے عشق کیا۔ یہ عشق ان معنوں میں کوئی روائیتی عشق نہ تھا۔ جیسا کہ عاشق کسی وقتی جذبے اور کیفیت کے ہاتھوں مجبور ہو جائے بلکہ یہ عشق میراجی کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ ان کی نیند آرام، خواب، زندگی حتیٰ کہ میراجی کی موت اسی عشق کی ناکامی اور ناآسودہ حالی کے ہاتھوں ہوئی۔ میراجی عشق کے شیرے میں گلے گلے لتھڑ گئے۔ شہر در شہر بستی در بستی ایک روگ لیے لیے پھرے۔ لیکن دردمند دل کا یہ روگ انہیں نہ بخش سکا۔ یہ عشق میرا سین کے لئے تھا۔ وہ لڑکی ،جس کے حسن نے میراجی سے دنیا بھی چھین لی۔ اور دین بھی۔ مزے کی بات یہ کہ میراجی اس لڑکی کے نام پر ثناءاللہ سے میراجی بن گئے۔ خیالوں میں بھی اسکا دم بھرا۔ لیکن میرا سین ان کی طرف راغب نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ میراجی اس کے لئے راہب بن گئے۔ وہ راہب جو اپنی تمام تر تشنہ زندگی میں اس کے نام کا دم بھرتا رہا۔ مگر میرا سین انہیں نہ مل سکی۔ یہ تصوراتی عشق تھا۔ عورت سے زیادہ عورت کے تصور کی پوجا کرنا۔ جس میں نہ وصال ممکن تھا۔ اور نہ ایسا ہو سکا۔ لیکن ہجر کی اگن میں میراجی جل مرے۔

رات گئے جب آئے سویرا
دیکھتے دیکھتے اٹھے گا ڈیرا
بڑھے یونہی من کا بنجارا پہنچے سجن کے دھام

میرا سین ایک خوبصورت، ذہین بنگالی لڑکی تھی۔ جو حصول تعلیم کی غرض سے لاہور آئی ہوئی تھی۔ اور ایف سی کالج لاہور کی سٹوڈنٹ تھی۔ میراجی کشمیری تھے۔ لیکن بنگالی لڑکی میرا سین سے عشق کر کے اپنی کشمیری قومیت بھی چھوڑی۔ لیکن جدائی شاید مقدر تھی۔ لہذا جوگی بن گئے۔ گلے میں جینو ڈالی۔ اور پھر اس عشق کا دائمی داغ لگائے گلی گلی بھٹکتے رہے۔ گویا عشق نے میراجی کا نسب و مذہب سب کچھ بدل ڈالا۔

میرا سین پڑھائی، اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ کالج کی تمام تر سرگرمیوں کی روح رواں تھی۔ میراجی اکثر بنگالی بلڈنگ کا رخ کرتے۔ جہاں ''کبھی وہ بجلی کے کھمبے کے پاس اور کبھی سڑک پار کھڑے ہو کر انتظار کرتے۔ اور دیکھتے رہتے۔ کہ کب وہ بنگالن گھر سے نکل کر نیلے گنبد کے پاس ایف سی کالج جاتی ہے۔ جہاں اس نے داخلہ لیا ہوا تھا''۔[6] میرا سین کے لئے یہ انتظار میراجی کی تمام زندگی پر محیط ہو گیا۔ یہ ایک ایسا نکتہ تھا۔ جہاں سے میراجی کی تمام تر سوچ کا آغاز ہوا۔ اور دنیا گول ہے کے مصداق گھوم پھر کر اسی نکتے پر اختتام ہوتا تھا۔ میرا سین کے لئے میراجی کا حال یہ تھا کہ اس عشق کے ہاتھوں میٹرک پاس نہ کر سکے۔ اور میرا سین ان کی بے پناہ چاہت کے باوجود ان کی طرف مائل نہ تھی۔ اس ناکام عشق نے انہیں بحیثیت شاعر اور ادیب بے پناہ تخلیقی قوت عطا کی۔ لیکن اپنی عملی زندگی میں وہ اپنی ذات اور معاملات زندگی سے بے نیاز ہوتے چلے گئے۔

۔۔۔اس نے اس بت کافر کیلئے اسلام ترک کر دیا تھا۔ بجائے تہلیل و آذان و قرآن کے اسے شوالوں کے گھنٹوں، سنکھ اور بھجن سننے میں زیادہ دلچسپی تھی۔۔۔ میرا سین اسے

سجدہ کرنے کو کہتی۔ تو وہ اس کے سامنے سربسجود ہو جاتا۔ ۔۷

حتیٰ کہ میرا سین کے عشق میں میراجی کی حالت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز وہ اپنے ایک دوست کے پاس مصری شاہ لاہور گئے۔ تو ''ان کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کیونکہ اس نے شراب پی کر میرا سین کا نام لیتے ہوئے رو رو کر اپنا سر دیوار سے اتنا پھوڑا۔ کہ زخم ہو گئے تھے۔'' ۔۸ ایک طرف تو میراجی ادیب تھے۔ بے پناہ حساس اور جذباتی فطرت کے مالک۔ اور دوسرا یہ کہ میرا سین سے عشق کے وقت میراجی عمر کے اس حصے میں تھے۔ جسے عہد شباب کہتے ہیں۔ عمر کا انتہائی نازک ترین دور۔ انسانی جذبوں میں بے پناہ شدت کا زمانہ میرا سین سے عشق کے وقت میراجی کی عمر ۲۲۔۲۳ سال کے لگ بھگ تھی۔ عمر کے اس حصے کی چوٹ اگر درد اور خلوص کے ساتھ سہی جائے۔ تو اس محاورے کے مصداق کہ ''سانپ کا ڈسا پانی نہیں مانگتا''۔ میراجی اسی خلوص اور درد کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ناکام عشق ان کی زندگی کو ناکام بنا گیا۔ ''وہ صبح صبح جمنا کے کنارے سورج پوجا بھی کرتے تھے۔ وہ گویا دین کے قابل بھی نہ رہے۔ عشق میراجی کے لئے آذان، سجدہ، ازل، ابد سب کچھ تھا۔ اس طرح میرا سین سے اپنی محبت قائم کی ہوئی تھی۔'' ۔۹

ادھر میرا سین جس نے ایم اے انگریزی امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں جونیئر لیکچرر کی جگہ مل گئی۔ اور اسکا خاندان لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ اور میراجی کے اس ناتمام و تشنہ عشق کی کہانی میں شہر اور زمانے حائل ہو گئے۔ اس طرح میراجی ایک خیالی پرستش اور آہوں کی نذر ہوتے چلے گئے۔ یہ تمام شواہد بتاتے ہیں۔ کہ میراجی کی زندگی کو تکلیف دہ سے اذیت ناک حد تک پہنچانے اور خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کو ایک طرح سے ختم کرنے میں اس ناکام عشق کی داستان بنیادی اور اولین محرک بنی۔

میراجی کی مخصوص طرزِ زندگی، جس میں وہ کسی بھی لمحہ موت سے دور نہیں رہے۔ اس کے محرکات میں ایک اور اہم محرک ان کی شدید جذباتیت ہے۔ ان کی جذباتی فطرت ان کے مزاج کے کئی اور مخصوص زاویہ ہائے فکر پر اس شدت کے ساتھ طاری ہوئی۔ کہ پھر وہ اس میدان میں انتہا پسندی کی طرف راغب ہوتے چلے گئے۔ جس کے باعث اپنی صحت اور زندگی کی تمام تر احتیاط کو انہوں نے نظر انداز کر دیا۔ مثلاً میراجی کی فطرت میں جو حسن پرستی تھی۔ اس نے میراجی کو میرا سین کے بعد کئی اور حسین چہروں کا گرویدہ بنایا۔ مگر بدقسمتی آڑے رہی۔ یہ عشق اور حسن کا کھیل منڈھے نہ چڑھ سکا۔ اس ضمن میں دو اور لڑکیوں کی طرف میراجی بیک وقت راغب ہوئے۔ ''میراجی کی صحت پر ان لڑکیوں کے عشق کا کافی برا اثر ہوا۔ وہ اور زیادہ شراب پینے لگے۔'' ۔۱۰

میراجی کے اندر حسن پرستی کے عنصر نے اُن کی جذباتی شدت پسندی کے ساتھ ملکر ان کی زندگی میں جنسی بے راہ روی اور غیر اخلاقی رویوں کے پنپنے میں بھی مدد دی۔ اسطرح رفتہ رفتہ میراجی کی شخصیت میں ایسے عوامل جڑ پکڑنے لگے۔ جنہوں نے انہیں بعد میں تیزی کے ساتھ ایک نارمل زندگی سے کاٹ کر بہت حد تک ایک غیر فطری طرزِ زندگی کا عادی بنا دیا۔ اور اسی حوالے سے ان کے کئی نفسیاتی مسائل ابھرنے لگے۔

میراجی میں حسن پرستی عہد طفلی سے موجود تھی۔ جب چھوٹے تھے۔ تو ان کی کوشش ہوتی تھی۔ کہ ڈیسک پر خوش رو اور چھب دار لڑکے ''احمد بشیر'' کے ساتھ بیٹھے۔'' ۔۱۱ یہ مسائل نہ صرف ذہنی اور نفسیاتی تھے۔ بلکہ ان کے باعث میراجی کی تمام تر شخصیت اور زندگی عجوبہ روزگار بن گئی۔ نہ دن اپنے رہے، نہ راتیں۔ نہ کھانے کا ہوش، نہ پینے کا خیال۔ اور پیسے کے لئے مزدور تمندر ہے۔ کتابوں کا، مسودوں کا گروی رکھنا، قرض لینا اور بازار حسن چلے جانا۔ اُن کی زندگی کا خاصا بن گیا تھا۔

ان کی تمام تر زندگی، نشست و برخاست، رہن سہن انتہائی بے ترتیبی سے عبارت تھا۔ نفسیاتی و ذہنی مسائل جوں جوں بڑھتے گئے۔ کثرتِ مے نوشی بھی فزوں تر ہوتی گئی۔ اس مے نوشی کی عادت نے ان کے رہے سہے حواس بھی ختم کر دیئے۔ ہر وقت مدہوشی کا عالم طاری رہتا۔ اور بے خودی کی حالت میں وہ اپنی ذات اور زندگی کے سود و زیاں سے بھی فراغت پاتے گئے۔ اخلاقی اور جنسی بے راہ روی کا سبب ہی تھا۔ کہ میرا جی نے تمام عمر شادی نہیں کی۔ حسن کی دید میں وہ بہر حال سرگرم عمل رہے۔ اس دید ہی سے ان کی جمال پرست نگاہ کو تقویت مل جاتی تھی۔ زندگی کے اس طرح کے مشاغل نہ تو تعمیری تھے۔ اور نہ ان کے حوالے سے میرا جی کی با قاعدہ زندگی کی کسی سمت کا واضح تعین کیا جا سکتا ہے۔ ''میرا جی تیسرے درجے کا دو آنے کا ٹکٹ خرید کر فلمیں دیکھا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں بازارِ حسن جانا بری بات تھی۔ مگر پھر بھی ایک دوست کے ساتھ وہاں جایا کرتا تھا۔''۔[۱۲] فطری اور نارمل زندگی سے کٹتے ہوئے بعض ادیبوں کی بے قاعدہ زندگی میں جہاں کثرتِ شراب نوشی نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ وہاں بازارِ حسن سے متعلق ان کے مشاغل اور دلچسپیوں نے بھی ان کیلئے لاتعداد ذہنی و نفسیاتی الجھنیں پیدا کیں۔ اور بالآخر ان الجھنوں سے فرار کیلئے وہ رفتہ رفتہ بلا نوش بنتے گئے۔ میرا جی کی غیر فطری طرزِ زندگی اور انہیں قبل از وقت موت سے ہمکنار کرنے میں کثرتِ مے نوشی کا بڑا ہاتھ ہے۔

> جب لاہور میں انہیں تیس روپے ملتے۔ تب بھی وہ پیتے تھے۔ اور جب دلی آئے۔ اور پانچ گنا تنخواہ ملی۔ تو اور زیادہ پینے لگے۔ پھر ہر وقت پینے لگے۔ سوڈا یا پانی ملانے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ یونہی بوتل سے منہ لگا کر غٹا غٹ چڑھا جاتے تھے۔۔۔ اس شراب نے میرا جی کو تباہ کر دیا۔ اور ان میں وہ تمام خرابیاں آتی گئیں ۔ ادھر تنخواہ ملی۔ ادھر قرض خواہوں اور شراب میں ختم۔ پھر ایک ایک سے ادھار مانگا جا رہا ہے۔ میرا جی کے قدر دانوں نے انہیں سنبھالنے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ نہیں مانے اور گرتے ہی چلے گئے۔ ۔[۱۳]

حقیقت یہ ہے کہ کثرتِ مے نوشی نہ صرف ملکی بلکہ بڑے بڑے غیر ملکی ادیبوں کے راستے میں بھی بڑے ادب کی تخلیق میں مانع رہی۔ اس کے باعث نہ صرف ادب کے اعلیٰ فن پاروں کی تخلیق میں وہ فعال نہ رہ سکے۔ بلکہ وقت سے پہلے قیدِ حیات سے آزاد ہو گئے۔ اس کے باعث وہ مقروض بھی ہوتے رہے۔ ان کی عزتِ نفس پائمال ہوئی۔ وہ کوڑی کوڑی کے محتاج ہو کر بالآخر سسک سسک کر مرے۔ یہ وہ فرشتۂ اجل تھا۔ جو انہیں آہستہ آہستہ موت کے راستے کی طرف لے گیا۔ یقیناً یہ ادب کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ میرا جی کی کیفیت بھی اس صورتِ حال سے مختلف نہ تھی۔ بقول خان فضل الرحمٰن

> ایک تو اس کی آمدنی قلیل تھی۔ دوسرے بنگالی بلڈنگ، ایف سی کالج اور جن راستوں سے میرا سین گزرا کرتی تھی۔ اس کی ژولیدگی بڑھاتے رہتے تھے۔ وہ غم غلط کرنے کے لئے شراب پیا کرتا تھا۔ اچھی شراب تو اسے کہاں میسر تھی۔ وہ ٹھرے پر ہی گزارہ کرتا تھا۔ ۔[۱۴]

میرا جی کو شراب لے ڈوبی۔ ابتداء میں تو غمِ عشق کے بہلاوے میں شراب کا آغاز کیا، مگر منہ سے لگی ہوئی یہ کافر شئے نہ چھٹ سکی۔ دین اور دنیا چھٹ گئے۔ عزت وقار سب کچھ ہاتھ سے جاتا رہا۔ دھن دولت کا ہونا تو کجا۔ ہاتھ میں کچھ نہ

کچھ آتا ہو روپیہ سب اس کی نذر ہوتا چلا گیا۔ جو کچھ غم روزگار نے دیا۔ وہ غم شراب کی نذر ہو گیا۔ میراجی کی زندگی کی وہ تباہ حالی جو آخر کار ان کی موت پر منتج ہوئی۔ اُس کی بنیادیں کثرتِ مے نوشی پر ہی اٹھائی گئی تھی۔ بقول شاہد احمد دہلوی ''میراجی کو زیادہ جاننے والوں میں بعض یہ بھی کہتے تھے۔ کہ اس نے خود نشے میں اپنے آپکو مارا ہے۔۔۔''۔۱۵

لے پیالہ تھام لے،
اس میں باقی ہے ابھی کچھ زہر غم
جس کو پی کر میں بھی اپنی زندگی سے بھاگتا
پھرتا رہا

نظم ''فنا''

باغ کوئی نہ تھا کوئی صحرا نہ تھا، کچھ نہ تھا
ایک ساگر ہی ساگر جدھر دیکھیے، موجزن، موجزن، آگے
بڑھتا ہوا
کوئی ساحل نہ تھا۔ کوئی منزل نہ تھی، سوچئے آگے بڑھ کر وہ
رکتا کہاں
کوئی ساگر نہیں، باغ۔ صحرا نہیں، کوئی پربت
نہیں
آہ! کچھ بھی نہیں

نظم ''بہاؤ''

ایک سانس آتا ہے جاتا ہے یوں
گھسٹتے ہوئے رینگتے رینگتے
ہر امید جاگی مگر مٹ گئی
گھسٹتے ہوئے رینگتے رینگتے

میراجی نے حقیقتاً اس حوالے سے خود کو مارا ہے۔ کیونکہ وہ شراب اور نشے کے اسقدر عادی ہو چکے تھے۔ کہ اس کے ہاتھوں نہ صرف ان کے معاملاتِ زندگی بگڑ رہے تھے۔ بلکہ بعض اوقات اپنی انا، خودداری اور عزتِ نفس بھی انہیں طاق پر رکھنا پڑتی تھی۔ اکثر اوقات شراب کے گھونٹ دو گھونٹ کے لئے انہیں دوست احباب کے دروازے پر رکنا پڑتا تھا۔ اب نشہ ان کی ضرورت ہی نہیں۔ بلکہ ان کی زندگی بن چکا تھا۔ وہ جیسے اس نشے کے لئے ہی زندہ تھے۔ بعض اوقات شراب نہ ملتی تو جس قسم کا نشہ بھی مل جاتا۔ میراجی اس سے دریغ نہ کرتے۔ ''میراجی کو بھنگ پینے کا لٹکا تھا۔''۔۱۶

نشہ میراجی کو اس سٹیج پر لے آیا تھا۔ جہاں نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود میراجی کو بھی اپنی موت قریب نظر آتی تھی۔ مگر نشہ کی طلب تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ اسی صورتِ حال اور نشے نے ادیبوں کو بے چارگی اور بے بسی کی موت مارا ہے۔

نظم ''زندگی کے پھندے میں''

چلتا جا!

ہاں ہاں، میں بھی چلتا ہوں
زندگی کے پھندے میں

زندگی کش مکش ، حاصل و نا حاصل ہے
ماسوا اسکے ہر اک نقشِ جہاں باطل ہے

جیسے ہوتی آئی ہے ویسے بسر ہو جائے گی
زندگی اب مختصر سے مختصر ہو جائے گی

میراجی اس کیفیت سے پوری طرح دوچار تھے۔ منٹو لکھتے ہیں۔

بے ہوش پڑا ہے۔ اور مانگے جارہا ہے۔ اپنی اس طلب کا دائرہ بنالیتا ہے۔ اور بھول جاتا ہے کہ یہ کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ اور اسے کہاں ختم ہونا تھا۔ مجھے اس کی شراب نوشی کے اس پہلو کا علم نہیں تھا۔ لیکن ایک دن اسکا بھی تجربہ ہوگیا۔ جس کو یاد کر کے میرا دل آج بھی افسردہ ہو جاتا ہے۔ ۱۷

یہ رائے میراجی کے لئے منٹو نے دی ہے۔ جو خود بلانوش تھے۔ لیکن میراجی کی بلانوشی میں جو شدت اور تندی تھی۔ یہاں اسکی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ جس کے باعث میراجی اکثر و بیشتر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے تھے۔ اور ایک جنونی کیفیت میں نارمل دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ان حرکات و سکنات کے باعث اس حالت میں کوئی بھی انہیں ذی ہوش نہیں کہہ سکتا تھا۔ شراب اور نشے کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ایک ادیب اب اس مرحلے پر پہنچ گیا تھا۔ جہاں وہ تیزی کے ساتھ فطری طرزِ حیات سے کٹ رہے تھے۔ محمود نظامی لکھتے ہیں۔

میراجی بہت زیادہ شراب پی کر گھر آئے تھے۔ انہوں نے پہلے تو آتے ہی ان آہنی گولوں سے جنہیں وہ ہر وقت ساتھ رکھتے تھے۔ کھڑکیوں کے تمام شیشے توڑ ڈالے۔ پھر کھڑکی میں کھڑے ہو کر راہ گیروں پر آواز کسے۔ بعد میں ہر شخص کو صلواتیں سنائیں۔ اور آخر میں غسل خانے کا فلش توڑ دیا۔ ۱۸

یہ صورتِ حال میراجی کی انتہائی ذہنی اور نفسیاتی گھٹن کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ وقت سے بہت پہلے مرنے ہی کی ایک کیفیت ہے۔ وہ اپنے اندر کی گھٹن اور باغیانہ کیفیت کو نشے کے سپرد کر رہے تھے۔ اور نشے کی شدت انہیں پاگل اور جنونی بنا رہی تھی۔ یہ اپنی ذات سے انتقام کی ایک صورت تھی۔ میراجی سماج سے فرسٹیٹڈ تھے۔ اور خود کو ختم کرنے کے درپہ تھے۔ وہ آگ جو انہیں پہلے پہل نشہ دیتی تھی۔ اب خالص آگ کے روپ میں ان کی روح جلا رہی تھی۔ ''شراب میں پانی یا سوڈا ملانا، وہ شراب کو نجس کرنے کے برابر سمجھتے تھے۔ چنانچہ رگوں کو چیر چیر کر دوڑنے والی آگ نے ان کا جسم اندر سے کھانا شروع کر دیا۔ اور وہ اسی کے ہو گئے''۔ ۱۹

نظم ''زندگی ختم ہوئی''

چھین لی، چھین ہی لی یاس نے راحتِ دل
کی
کس طرح لوٹ کے اب آئے گی حالت
پہلی
تیرہ و تار ہے، تاریک ہے رات
زندگی ختم ہوئی

نظم ''انجام''

۔۔۔زمانہ ایک بے پایاں سمندر ہے
اور اس میں کس قدر بے کار آنسو ہیں۔۔۔
مجھے گریہ سنائی دے رہا ہے

میرا جی کی بلانوشی اذیت ناک حد تک ان کی زندگی کو زہر کی طرح چاٹ رہی تھی۔ وہ نہ صرف اس کو پی کر اپنی زندگی ختم کر رہے تھے۔ بلکہ اسکا نہ ملنا بھی ان کے لئے لمحہ لمحہ کا عذاب تھا۔ جیب خالی تھی۔ اور نشے کا حصول ان کے لئے مشکل ترین ہو رہا تھا۔ ایک ادیب جس کی سوچ معاشرے کے لئے زندگی بخش کہلاتی ہے۔ خود گویا شراب کی دہلیز پر لمحہ بھر کی زندگی کے لئے بھکاری بن گئے تھے۔ ۱۴ اپریل ۱۹۴۶ء کو الطاف گوہر کے نام میرا جی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں ۔''اسوقت دماغ سخت پریشان ہے۔ اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ تازہ ترین پریشانی یہ ہے کہ آج سے دیسی شراب کی قیمت میں مزید اضافے کا اعلان ہو گیا ہے۔''۔۲۰

میرا جی کی شراب نوشی اور دیگر منشیات لینے کی عادت اب اس مرحلے سے بہت آگے اور دور تک نکل گئی تھی۔ جہاں سے واپسی کا نہ سوچا جا سکتا ہے۔ اور نہ صحت اور زندگی کو بچانے کی فکر کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اب شراب ان کے حواس چھین رہی تھی۔ ایک ادیب کی سوچ، اس کی فکر زنگ آلود ہو چکی تھی۔ وہ مکمل طور پر ایک ذہنی اور نفسیاتی مریض بن چکے تھے۔ اب انہیں زندگی کی طلب نہیں تھی۔ بلکہ نشہ اور صرف نشہ کا حصول انکی منزل آخر تھی۔ اس کے لئے قرض لینا، دوستوں کی لعن طعن سننا، اپنی عزتِ نفس بیچنا، بے چارگی خریدنا۔ وہ واقعی اب ایک نارمل صورتِ حال میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ یہ سب کو معلوم تھا کہ میرا جی حرکتیں بہت عجیب و غریب کرتے تھے۔ اس میں ایک حرکت یا عادت یہ تھی۔ کہ وہ اپنے پاس لوہے کے تین گولے ہمیشہ رکھتے تھے۔ یہ تین گولے اسی طرح ان کے ساتھ نظر آتے تھے۔ جیسے کہ بدن کے اوپر کپڑے انسان کی ضرورت ہوتے ہیں۔ یہ میرا جی کی شخصیت کی مضحکہ خیزی تھی یا پراسراریت؟ لیکن یہ بات درست تھی کہ ''میرا جی کو اس بات سے بہت تسکین ہوتی تھی۔ کہ لوگ انہیں پراسرار سمجھیں۔''۔۲۱

یہ پراسراریت اور مضحکہ خیزی دونوں میرا جی کے نشے کی عادت میں اس طرح گھل مل گئی تھیں۔ کہ وہ واقعی عام لوگوں سے فرق دکھائی دیتے تھے۔ ان کی ذات میں اصل کیا تھا۔ اور نقل کیا؟ روپ کیا تھا اور بہروپ کیا؟۔ دونوں میں فرق روا نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ ''میرا جی خود بھی نقلی اور اصلی کا امتیاز قائم نہ رکھ سکا۔''۔۲۲ گویا شراب کی زیادتی نے میرا جی کی ذات ان کے وجود اور ان کے اندر کے بڑے لکھاری کو کھا لیا۔ ان کی زندگی اور مقدر کی ہار ایک طرف اور نشے کی زیادتی

دوسری طرف ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اگر شراب نوشی اس بلا کی نہ ہوتی۔ تو میراجی زندگی کی مشکلات کا حوصلہ مندی کے ساتھ سامنا کر جاتے۔ شراب نے انہیں ایک طرف مقروض کیا۔ عزتِ نفس چھینی، بے چارگی اور تنہائی کی زندگی دی۔ اخلاقی قدروں سے باغی بنایا۔ اور دوسری طرف ان سے صحت اور جینے کا حوصلہ چھین لیا۔ اور یہ تمام دھارے ملکر میرا جی کو موت کی نیند سلا گئے۔

میراجی اپنے وقت کے سچے اور ذہین ادیب تھے۔ ان کی بے وقت موت کے محرکات میں ایک محرک یہ بھی ہے کہ سچے فنکار کے حساس دل و دماغ اور دردمندی کے جذبے کو ذرا سی ٹھیس بھی لگ جائے۔ تو اس کی ٹوٹ پھوٹ کی تمام تر کرچیاں اس کی ذات کے اندر ہی بکھرنے لگتی ہیں۔ زخم اندر ہی اندر رستا رہتا ہے۔ میراجی کے اندر کا فنکار نہ تو اپنی زندگی کی محرومیوں کا دکھ سہہ سکا۔ اور نہ سماج ایک فنکار کو دکھ بھری زندگی سے بچانے کیلئے آگے بڑھا۔ یہ وہ المیہ ہے جو ہر دور کے فنکار کو کسی نہ کسی طور پر سہنا پڑتا ہے۔ یہی عوامل بعض اوقات ادیبوں میں خودکشی کے محرکات بن جاتے ہیں۔ اور انہی حالات میں اکثر ادیب خود کو اذیت پسندی کا عادی بنا کر اپنے ہی وجود کی قید میں خود کو دم گھونٹ گھونٹ کر مار دیتے ہیں۔ میراجی انہی ادیبوں میں سے ایک تھے۔ بقول حسن عسکری۔ ''یہ خون آلود چہرہ بیسویں صدی کے فنکار کا چہرہ ہے۔'' ۔۲۳

میراجی کے اندر ایک سچے فنکار کا دل دھڑک رہا تھا۔ میرا سین کے عشق میں اپنی ناکامی کی دہلیز پر سودائی بنکر وہ تارک الانبیا ہو گئے۔ پھر انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ کون ان کے لئے کیا کہتا ہے۔ انہیں کس نام سے پکارا جاتا ہے۔ تمام زندگی مسافرت میں کاٹ دی۔ کہیں پر بھی وہ اپنے کسی جذبے میں نہ تو خام نکلا۔ اور نہ بناوٹ کا لبادہ اوڑھا۔ وہ جیسے تھے۔ ویسے ہی نظر آتے تھے۔ یہ ان کے اندر کا خلوص تھا۔ جس نے جب میراجی کو اندر سے توڑا۔ تو وہ باہر سے بھی ٹوٹ گئے ''میراجی نے شاعری کی بڑے خلوص کے ساتھ، شراب پی بڑے خلوص کے ساتھ بھنگ پی، وہ بھی بڑے خلوص کے ساتھ''۔ ۲۴

میراجی نے ناقابل برداشت صورتِ حال میں آخر خود کو ہی اذیت دینے کیلئے تختۂ مشق بنایا۔ فطری ذہین ادیبوں کا ایک اضافی مسئلہ اسوقت اور بڑھ جاتا ہے۔ جب اس کی ذہانت زندگی کے مشاہدے اور تجربے کے ساتھ ملکر ان کے وسیع مطالعہ میں گھل مل جاتی ہے۔ یہ مطالعہ، یہ علم ''باخبری'' کی ایسی بھٹی تیار کرتا ہے۔ جس میں اس ادیب کی اپنی ذات اپنے لیے ہی ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔

شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں۔

> میراجی کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ سنا ہے کہ دیال سنگھ لاہور کی لائبریری وہ چاٹ چکے تھے۔۔۔ نثر کی کتابوں میں الف لیلی کے عاشق تھے اردو صحیح بولتے تھے۔ اور صحیح لکھتے تھے۔ غلطی کی پچ کبھی نہ کرتے تھے۔ عروض سے خوب واقف تھے۔ اور جملہ اصناف شعر پر حاوی۔ ۲۵

بحیثیت ادیب اور شاعر وہ اپنی فطری تخلیقی صلاحیتوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ لیکن سماج کا جور و یہ تھا۔ اُس کے باعث وہ اپنے ماحول اور معاشرے میں ''مس فٹ'' ہو گئے تھے۔ انہوں نے جو بہروپ اختیار کر رکھا تھا۔ وہ کسی قسم کے عاشق اور سودائی کا بہروپ نہیں تھا۔ بلکہ اُن کے اندر وہ فنکار موجود تھا جو فطری ذہانت کے ساتھ ساتھ علمی وسعت اور

شعروادب کا شعور رکھتا تھا۔ اس شعور و آگہی نے میراجی کو مزید حساس اور غور و فکر کا عادی بنایا۔ وہ ایک بے ضرر انسان تھے۔ اپنے دکھوں کی صلیب پر اپنے ہی وجود کو الٹ پلٹ کر لٹکاتے رہے۔

نظم ''اذیت زندگی ہے۔''

اس دھرتی پر جیون کا درد ادھورا نقشہ ہے
پر ہستی کے ساون کا موسم درد سے آتا ہے

نظم ''زندگی''

لمحے جب کھو جائیں گے
ہم پھر کیا ہو جائیں گے
اس کی فکر نہیں مجھ کو
جو بھی ہے وہ یہیں مجھ کو
بہت دکھائی دیتا ہے
باقی جو ہے سپنا ہے

تمام تجربے انہوں نے اپنی ہی ذات پر کیے یہی خود کا ضائع کرنے کا عمل تھا۔ جو رفتہ رفتہ تیز تر ہوتا گیا۔ وہ جس سچ کے متلاشی تھے۔ وہ سچ انہیں کہیں نہ مل سکا۔ جبکہ وہ خود ایک دردمند فنکار تھے۔ ''میراجی کی صداقت اور محبت سب کے لئے تھی۔ خاک کے ذرے سے مہر و ماہ تک وہ شہود کی کائنات کے سارے مناظر سے لیکر غیب تک کا احاطہ کرتی تھی۔''۔۲۶ فکر و نظر کی یہ ذہانت اور سچائی ان کے فن میں بھی موجود ان کی شاعری اپنے ماحول سے عدم مطابقت اور سماج سے ناراضگی کی آئینہ دار ہے۔ وہ زندگی کے وجود کے اندر اور اس کے پس پردہ ان آفاقی صداقتوں کے بھی متلاشی تھے جو انسان کے پردہ افکار پر جلد اور آسانی کے ساتھ آشکار ہو سکتیں۔

میراجی کی خود کو اذیت دینے کی فطرت جو بعد میں ان کی قبل از وقت موت کی آئینہ دار بنی۔ سماج کے ناروا سلوک کے ہاتھوں ایک (genius) کی موت ہے۔ خان فضل الرحمٰن لکھتے ہیں۔

> شیکسپیئر نے اپنے ایک ڈرامے (As you like it) میں دنیا کے دکھوں کی بابت ایک کردار سے یہ الفاظ ادا کرائے ہیں۔ وہ یہ دنیا کتنی کانٹوں بھری ہے۔ تو یہی حال اُردو کے اس (genius) کا بھی ہوا تھا۔ ۲۷

میراجی کی زندگی کا ایک المیہ تو یہ تھا کہ ماحول کو میراجی اور میراجی کو ماحول راس نہ آیا۔ وہ زندگی کے جس خول میں چن دیئے گئے تھے۔ وہ اس خول کے اندر ہی سسک سسک کر دم توڑ گئے۔ پہلے پہل سماج کے منفی رویوں نے انہیں زندگی سے موت کی طرف دھکیلا۔ پھر انہوں نے اس عمل کو اپنے ہاتھوں تیز تر کر دیا۔ پھر سماج کی بچی کچی شرم نے انہیں اس صورت حال سے روکنا بھی چاہا۔ تو وہ انکار و اقرار کی تمام منزلیں پاؤں تلے روندتے چلے گئے۔ کسی نے اگر ایک ضرب لگائی تو میراجی نے کئی ضربیں خود کو اپنے ہاتھوں سے لگائیں۔ وہ فقیروں کے بھیس میں ''تماشائے اہل کرم'' دیکھ رہے تھے۔ اب وہ اس مرحلے پر تھے۔ جہاں ان کی انا کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔ کہ کوئی انہیں گزند پہنچائے جائے۔ ان کی خود اذیتیں خود

انحصاری اور خودداری پر مبنی تھی۔ بقول احمد بشیر

میراجی ایک بھٹکا ہوا راہی تھا۔ عمر بھر وہ اپنی انا کی داخلی اوگھٹ گھائیوں میں سنگلاخ پگڈنڈیوں کی خاک چھانتا رہا۔ اس کی کوئی منزل نہ تھی۔ اس کو صرف چلتے رہنے سے کام تھا۔۔۔ ایک دن وہ ایک سونی پگڈنڈی پر گر کے مرگیا۔۔۔ اس کی زندگی اس کی اپنی انا سے اسقدر لدی ہوئی تھی۔ کہ کسی کی شرکت کی گنجائش نہ رہی تھی۔ ۔۲۸

نظم ''ترکِ تعلق''

اس جہاں۔ میں نہ کبھی لوٹ کے میں آؤں گا
غیر آباد جزیروں میں چلا جاؤں گا

نظم ''الم پرست''

غم سے دور ہوئی گمنامی
غم سے حاصل عمر دوامی
غم سے کام ہوئے سب ایسے
بن گئے انسان بھی رب جیسے
کیوں مرنے سے پہلے مرنا
غم سے کیا ڈرنا، کیوں ڈرنا

میراجی اب خود کو خود مارنے کے درپہ تھے۔ اور مار رہے تھے۔ وہ اپنا نقصان اپنے ہاتھوں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی سماعت بھی خود تھے۔ اور اپنی شنید بھی خود۔ وہ دوسروں کے لئے اجنبی تھے۔ اور دوسرے ان کے لئے اجنبی۔ ۱۷ جنوری ۱۹۴۳ء کو میراجی دہلی سے الطاف گوہر کے نام اپنے ایک خط میں ایسی ہی کیفیت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ''وہ میراجی جسے تم جانتے ہو۔ اب اپنے دل کی گہرائی میں دب کر رہ گیا ہے۔ ۔۲۹

میراجی کے خط کی یہ سطور مکمل طور پر ان کے اس داخلی کرب کو ظاہر کرتی ہیں۔ جو پورے طور سے ان کی ذات پر چھا چکا تھا۔ اور جس کے باعث میراجی زندگی سے رفتہ رفتہ دور ہوتے چلے گئے۔

نظم ''افتاد''

اب آخر دم پر ہے ڈوبا، کشتی ڈوبی، کشتی ڈوبی
اب اس دنیا کے ساگر کی ہر موج نگل جائے گی مجھے
اور گمنامی کی دیوی اپنی ساڑھی لپٹائے گی مجھے

میراجی کی تکلیف دہ صورتِ حال اور موت کی رغبت پر مبنی زندگی کا ایک محرک یہ بھی ہے۔ کہ میراجی مذہب و اخلاق کی اقدار سے نہ صرف دور تھے۔ بلکہ ان کی زندگی اس سے قطعی طور پر بیگانہ اور بے نیاز تھی۔ مذہب و اخلاق کا دائرہ کار جو انسان کے اندر ایمان و ایقان کو جنم دیتا ہے۔ اور پھر اس کی مقناطیسیت سے وہ تمام زندگی جڑا رہتا ہے۔ زندگی

کے بے یقین اور ناکام مراحل پر ان سے جس طرح تقویت پاتا ہے۔ میراجی کی بے راہ روی اور آزاد خیالی نے ان راستوں کو اپنے لیے منتخب نہ کیا۔ بلکہ بحیثیت مسلمان وہ نام کے بھی مسلمان نہ تھے۔ ''وہ تو صبح صبح سورج پوجا تک کرنے لگا تھا۔۔اس نے ہندو فقیروں جیسے کپڑے پہننے شروع کر دیئے تھے۔''۔۳۰ ایک طرف میرا سین کے عشق نے اور دوسری طرف بے راہ روی کی زندگی نے ان سے نام کی مسلمانیت بھی چھین لی تھی۔ اکثر ناقدین کی متفقہ رائے ہے۔ کہ انہوں نے مورتی پوجا بھی شروع کر دی تھی۔ جمنا کے کنارے میرا سین کی تصویر درخت پر لگائے سجدے پر سجدہ کرتے تھے۔ وہ ہندو دیو مالا کا کثرت سے مطالعہ کرتے تھے۔ دیگر مذاہب اور خصوصاً ہندو مذہب کے میراجی پر گہرے اثرات تھے۔ ''میراجی ہندو مت کی طرف تو مائل تھا ہی۔ اسے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر لے جاتے ہوئے پرنام کا دستور بہت پسند تھا۔''۔۳۱ مذہب سے دوری کا عنصر میراجی کو اپنی ذات سے، زندگی سے اور زندگی کی داخلی قدروں سے بے یقین کرتا چلا گیا۔ اسی کے باعث ان کے ڈگمگاتے قدم تمام عمر بے سمت رہے۔ اور اخلاقی برائیوں کو وہ نارمل زندگی کا حصہ سمجھ کر اپناتے چلے گئے۔ اگر مذہب سے میراجی کی دوری کا یہ عالم نہ ہوتا۔ تو ان کی زندگی اتنی بے یقین اور بے سمت نہ ہوتی۔ وہ زندگی سے اس طرح نا امید اور مایوس نہ ہوتے کہ خود کو تباہ کرنا ہی انکا مطمع نظر ٹھہرتا۔

نظم ''خدا''

میں تجھے جان گیا روحِ ابد
تو تصور کی تمازت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور میرے دل کی حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور میرے دل میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

نظم ''دکھ کا دارو''

آسمانوں پر خدا بھی مر گیا
اور زمین پر مر گیا شیطان بھی
چھا گئی ہے زندگی پر ریل پیل
جس سے الجھن بن گئی ہر ایک شئے

شاہد احمد دہلوی اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

> مذہب سے میراجی کو کوئی واسطہ نہیں تھا۔۔۔ بس مسلمان اس لئے تھے کہ ایک مسلمان کے گھر پیدا ہو گئے تھے۔ جو شخص اخلاقی ضابطوں کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتا۔ وہ بھلا مذہبی قید و بند کو کیسے گوارا کر لیتا۔ میراجی کے دل اور دماغ دنوں ہی کافر تھے۔ ۳۲۔

مذہب انسان کی زندگی میں ایک ایسی مرکزی اور مقناطیسی قوت ہے۔ جو زندگی کے تمام داخلی و خارجی معاملات اور روحانی و دنیاوی اقدار میں توازن قائم رکھتی ہے۔ اس کی عدم موجودگی سے انسان کی زندگی میں جو انتشار اور بے ربطگی جنم لیتی ہے۔ میراجی مکمل طور پر اسکا شکار ہوئے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ میراجی کو جلد از جلد موت سے ہمکنار کرنے میں اس

محرک کا بھی بہت عمل دخل ہے۔

میرا جی کی زندگی میں داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر جو ہنگامہ خیزی تھی۔ ماحول میں جو بے چینی اور غیر مستحکم فضا تھی۔ یہ بھی ان کی شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ میں ایک ایسا محرک ثابت ہوئی۔ جس نے پھر انہیں سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ اور زندگی سے کٹتے ہوئے وہ رفتہ رفتہ خواہش مرگ کا شکار ہوتے چلے گئے۔ انفرادی ذہن اجتماعی ذہن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اسی طرح اجتماعی ذہن کی مجموعی صورتِ حال سے بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ کہ فرد کی داخلی اور ذہنی دنیا کا عالم کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ میرا جی کا دور ہنگاموں اور توڑ پھوڑ کا دور تھا۔ ایک بغاوت اور احتجاج کی فضا چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ یہ صورت حال ملکی اور عالمی دونوں سطحوں پر فرد کو درپیش تھی۔ اس کے اثرات ادب پر بھی شدت سے اثر انداز ہو گئے تھے۔ لباس میں بغاوت، طرزِ عمل میں بغاوت، سماج کے روائیتی قوانین سے بغاوت۔ یہ بغاوت روائیتی فن سے بھی بغاوت ہے۔ دراصل اس نسل کا سفر تنہا، کٹھن اور منزل سامنے نہ تھی۔ تجسس، تلاش اور نارسائی کا ایک خاص ماحول اس نسل کو درپیش تھا۔ میرا جی اپنی شاعری/نظموں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''میری نظر میں یہ نظمیں اپنی ہستی کا عریاں اظہار ہیں پرستش کیا ہے۔ یہ موجودہ دور کے انسان کی ہستی ہے۔ تنہا، پریشان، آرزومند، کرب و درد میں مبتلا۔۔۔''۔[۳۳] اجتماعی زندگی میں ایسی صورتِ حال جب جنم لے لے۔ تو یہ ہنگامے برسوں پرانی تہذیبی اقدار کو درہم برہم نہیں کرتے۔ بلکہ انسانی ذہن کی برسوں پرانی ذہنی اور فکری دنیا کو بھی اتھل پتھل کر دیتے ہیں۔ میرا جی ایسی ہی نسل کے نمائندہ تھے۔

> میرا جی کے اس سفر میں مشکلات۔۔۔ اور آرزوئیں تھیں۔ مشکلات جھیلیں مگر منزل پر نہ پہنچ سکے۔۔۔ ناکامی خود انہوں نے اپنے لیے عبارت کی تھی۔ اور حسرت و یاس کی آخری سٹیج میں تو وہ خود ایذائیت سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔[۳۴]

حسرت و یاس کی آخری منزل اس وقت فرد کو درپیش ہوتی ہے۔ جب وہ ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کو مایوسی کی آماجگاہ سمجھنے لگے کیونکہ ان تینوں زمانوں کے ساتھ انسان کی ذہنی و فکری دنیا وابستہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اجتماعی زندگی کی ہنگامہ خیزی، ٹوٹ پھوٹ ان تینوں دنیاؤں کو متاثر کرتی ہے۔ ماضی حاضر اور غائب دونوں سطحوں پر انسانی ذہن کو مفلوج کرتا ہے۔ حال اپنے وجود سے پریشان خیالی کو ہوا دیتا ہے۔ اور مستقبل دور کسی ویرانے میں گم ہوتا ہوا ایک خوش کن خواب بن جاتا ہے۔ بے سمتی کے اس ماحول میں زندگی نہ صرف پریشان حال ہوتی ہے۔ بلکہ بغاوت، احتجاج اور توڑ پھوڑ کے عناصر جنم لینے لگتے ہیں۔ لیکن میرا جی چونکہ ایک فطری ذہین ادیب تھے۔ وہ اس بغاوت اور توڑ پھوڑ کے اندر ایک مثبت اور تعمیری سوچ کے حامل بھی تھے۔

بقول ڈاکٹر جمیل جالبی

> میرا جی نے جو کچھ کیا۔ وہ شعوری تھا۔ نظامِ حیات و کائنات پر تفکر ان کے پیش نظر تھا۔ وہ زندگی کی بے معنویت کو ظاہر کر کے دنیا کو تبدیل کرنے کا احساس دلانا چاہتے تھے۔ وہ اس شعور کو جوان کے اندر تھا۔ معاشرے کا حصہ بنا دینا چاہتے تھے۔[۳۵]

چنانچہ اس ماحول میں میرا جی کا طرزِ عمل اور طرزِ فکر اس لحاظ سے معنویت کی حامل نظر آتی ہے کہ بحیثیت ادیب وہ جس سماجی ٹوٹ پھوٹ کو اپنی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ویسی ہی ٹوٹ پھوٹ بظاہر میرا جی کی شخصیت میں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن میرا جی کا داخل جس معنویت کا حامل تھا۔ اور وہ اجتماعی زندگی کے افق کو جن مثبت زاویہ ہائے حیات سے منسلک

کرنا چاہتے تھے۔ صورتِ حال اس کے برعکس تھی۔ اور نتیجہ یہ نکلا۔ کہ وہ سماج میں جس صورتِ گرتعمیر کے خواہاں تھے۔ وہ تو ہاتھ نہ آسکی۔ اور ان کے اندر کے دردمند، مخلص اور حساس لکھاری نے خود کو لحہ لحہ کی اذیت سے دوچار کر کے بالآخر موت کو خوش آمدید کہا۔ اس دوران انہوں نے جو زندگی بسر کی۔ وہ بڑی کسمپرسی اور اذیت ناک کیفیت کی حامل تھی۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو میراجی اپنے ایک دوست عبداللطیف کو خط میں لکھتے ہیں۔

> میں دہلی چھوڑ کر بمبئی کے گردونواح میں براجمان ہوں۔ پہلے دفتر کی سیڑھیوں پر سوتا تھا۔ اب فرش پر براجمان ہوں۔۔۔ خود کو کبھی معمولی اور کبھی پہنچا ہوا فقیر تصور کرتا ہوں۔ اور دنیا شاید مجھے بھکاری سمجھتی ہے۔ سچ ہے۔ کہ سماج کے فرائض جس طرح دنیا سمجھتی ہے۔۔۔ پورے نہیں کیے۔ لیکن میں نے اپنی جسمانی زندگی سے زیادہ جس قدر ذہنی زندگی بسر کی ہے۔ اسکا لحاظ کیسے ہوگا۔۔۔ ہر عزیز ترین چیز کے نام پر کہتا ہوں۔ کہ یہ احساس کمتری نہیں۔ یہ وہی جزوئیات بینی ہے۔ جس نے میرے احساسات و خیالات کا تو تعین کیا۔ لیکن جو میرے واقعات روزمرہ کے، دنیا کی نظر میں نفیس نہ بن سکے۔ میں دنوں مہینوں بلکہ بعض دفعہ ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ سال تک نہیں نہایا کرتا۔ دنیا کو یہ بات بری معلوم ہوتی ہے۔۔۔ میرے کپڑے اکثر میلے دکھائی دیتے ہیں۔ میں جانتا ہوں۔۔۔ مگر یہ بات سوچنے کے باوجود ابتک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کہ اس تمام صورتِ حال، اس سماج، اس مقام حیات و کائنات کا مقصد کیا ہے۔ زیادہ تر لوگ مجھے خود غرض دکھائی دیتے ہیں۔[۳۶]

نظم ''ایک منظر''

۔۔۔سنگار جال مایا کا ، اس نے کس سے نبھائی
مورکھ ! چھوڑ نادانی کی باتیں ، کیسی دھن یہ سمائی
پھیل رہی ہے سیاہی، رستہ بھول نہ جائے راہی

نظم ''میں ڈرتا ہوں مسرت سے''

میں ڈرتا ہوں مسرت سے
کہیں یہ میری ہستی کو
پریشان کائناتی نغمہ مبہم میں الجھادے
کہیں یہ میری ہستی کو بنادے خواب کی صورت

میراجی کی فطرت، اور مخصوص طرزِ زندگی کی کچھ مماثلیں مغرب کے اہل قلم کے ساتھ بھی دکھائی دیتی ہیں۔ جنہیں ہم میراجی پر مغربی مصنفین کے اثرات کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ میراجی کا ان مغربی مصنفین سے مرعوب ہونا، جن میں یہ مماثلیں موجود تھیں۔ کوئی بے معنی بات نہیں۔ کیونکہ میراجی نے ان کا تذکرہ اور انتخاب بالخصوص اپنی کتاب ''مشرق و

مغرب کے نغمے'' میں کیا ہے۔ ان مماثلتوں میں میراجی اور ان مغربی مصنفین میں جو قدر مشترک دکھائی دیتی ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ ادب کے بڑے ناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ میراجی کی طرح ان تمام مصنفین کے یہاں عورت، شراب، نشہ، افلاس، بے راہ روی، جنس، قرض لینا، زندگی سے کسی قدر مایوس اور تنہا ہو جانا۔ اور اس کے علاوہ یہ بات بھی اہم ہے کہ ان میں سے اکثر کی موت کثرتِ مے نوشی کے باعث ہوئی۔ اور وہ خود کو جانتے بوجھتے موت کی طرف دھکیلتے چلے گئے۔ اور بعض نے اسی عالم میں خودکشی کر لی۔

میراجی نے ''مشرق و مغرب کے نغمے'' میں جتنے شعراء اور ادیبوں کو موضوع بنایا ہے۔ کم و بیش ان سب کے ساتھ میراجی کی فطرت کا کوئی نہ کوئی پہلو ملتا جلتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا اس ضمن میں کہنا ہے۔

> میراجی کی تخلیقی ذہن کی تشکیل کے دور میں انہوں نے اپنے پسندیدہ اور بڑے شعراء کی وہ سب حرکات و سکنات جو انہیں اچھی لگیں۔ اختیار کر لیں۔ اور اپنی زندگی کے روپ کو بہروپ بنا لیا۔ اسطرح انہوں نے متضاد عناصر کو اپنی ذات میں جمع کیا۔ اور اس جمع آوری سے اپنے خارجی وجود کو آباد کر لیا۔ بودلیر، ایڈگر الن پو، ہائنے، لارنس، میلارمے اور چنڈی داس وغیرہ سے ثناءاللہ ثانی ڈار نے میراجی کو تخلیق کیا۔ اور پھر ساری عمر اپنے تخلیق کیے ہوئے میراجی کے روپ بہروپ میں وہ ایسی زندگی بسر کرتے رہے۔ جیسی کہ انہوں نے کی۔ ۔۳۷

میراجی نے ''مشرق و مغرب کے نغمے'' میں جتنے شعراء اور ادباء کو پیش کیا۔ ان سب کا زمانہ بھی میراجی کے عہد کی طرح کسی نہ کسی سیاسی و سماجی انقلاب اور انتشار کا زمانہ تھا۔ اور اگر مجموعی طور پر ان سب کی عادات و اطوار کا جائزہ لیا جائے۔ تو یوں لگتا ہے۔ کہ میراجی کی شخصیت پر ان سب کا پرتو ہے۔ مثلاً امریکی شاعر والٹ وٹمن کے لئے میراجی لکھتے ہیں۔

> وٹمن کو شدید احساساتِ محبت کا ایک تجربہ ہوا۔ اور صورتِ حالات کی مجبوری سے اسے اپنی محبوبہ سے جدا ہونا پڑا۔ اور اس مجبوری کو وٹمن نے اپنی زندگی کا الم ناک افسانہ کہا ہے۔ وٹمن نے تمام عمر شادی نہیں کی۔ اور اس کی وجہ بھی یہی افسانوی ناکامی قرار دی جا سکتی ہے۔ ۔۳۸

اس طرح وٹمن کے تصورِ موت کے لئے میراجی کا کہنا ہے۔ ''موت کا موضوع بھی وٹمن کا ایک عام خیال ہے۔ کیونکہ وہ موت کو بنفسہ شاندار اور انسانیت کی تکمیل نیز ایک نئی زندگی کی ابتداء تصور کرتا ہے۔'' ۔۳۹ انگلستان کے شاعر ڈی۔ ایچ لارنس کے لئے میراجی لکھتے ہیں۔ ''جنس کے معاملے میں اسکا انہاک حقیقتاً زندگی کے مسئلے میں انہاک تھا۔'' ۔۴۰ میراجی نے امریکی ادیب اور شاعر ایڈگر ایلن پو کی زندگی اور شخصیت و کردار سے متعلق جو نقشہ کھینچا ہے۔ وہ تمام کا تمام جیسے میراجی کی ذاتی زندگی کا عکس ہے۔ اس کی عادات و اطوار، پسند و ناپسند، جنسی بے راہ روی، کثرتِ مے نوشی اور اسی طرح کی دیگر جنسی و اخلاقی بے راہ روی جیسے میراجی کی ذات کا ہی تذکرہ ہے۔ اور اسی عالم تنہائی اور کثرتِ مے نوشی میں جس طرح اس سودائی کی ہسپتال میں موت واقع ہوتی ہے۔ یہ میراجی کی حیات ناآسودہ کا ایک ورق دکھائی دیتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی میراجی کی رائے کو [illegible]

میرا جی نے ایڈگر الن پو کے لئے لکھا تھا۔کوئی اسے شرابی کہتا ہے۔کوئی اعصابی مریض ،کوئی اذیت پرست اور کوئی جنسی لحاظ سے ناکارہ ثابت کرتا ہے۔۔۔اسوقت جب میرا جی نے یہ الفاظ کہے ۔تو وہ نارمل سے انسان تھے۔لیکن جب ان تصورات کو انہوں نے اپنا کر زندگی کے روپ کو بہروپ بنایا۔تو آج ہم بھی ان کے بارے میں یہی کہہ رہے ہیں۔[۴۱]

میرا جی کی اپنی زندگی میں شراب نوشی اور دیگر منشیات جو گل کھلا رہی تھیں۔اور جس طرح وہ عجیب وغریب حرکات وسکنات کرنے لگے تھے۔ایسی ہی بات وہ ایڈگر ایلن پو کے لئے لکھتے ہیں۔مثلاً ''جب کبھی اس پر یاس اور اندیشوں کا دورہ پڑتا۔اور اسے بہلانے کے لئے وہ شراب کا سہارا لیتا۔تو اس نشے کی حالت میں اس سے عجیب وغریب حرکات سرزد ہوتیں۔''۔[۴۲] میرا جی نے تمام عمر عورت کے تصور کی پوجا کی اسی طرح میرا جی نے لکھا ہے۔کہ ''ایڈگر ایلن پو عورت کی بجائے عورت کے تصور کی پوجا کرتا تھا۔'' اور یہ درست ہے کہ میرا جی نے بھی عورت کے تصور سے عشق کیا۔ فرانس کے شاعر چارلس بودلیر کے لئے میرا جی نے کھل کر اظہار خیال کیا۔اس کی شخصیت ، کردار، عادات اور روزمرہ معاملات زندگی کا جائزہ جس طرح میرا جی نے لیا ہے۔اس کی مکمل چھاپ خود میرا جی کی زندگی پر دکھائی دیتی ہے۔

بودلیر کے لئے میرا جی لکھتے ہیں۔

۔۔۔جس طرح بودلیر کی زندگی سماج کے لئے ایک علیحدہ اور خلوت کی چھپی چھپی سی بات تھی۔اسی طرح اس کی موت ہوئی۔اس نے تمام لوگوں کی نگاہوں سے دور زندگی بسر کی۔اور لوگوں کی نگاہوں سے دور ہی وہ مرگیا۔اور اپنے گناہوں کا اعتراف بھی علی الاعلان کرتا رہا۔۔۔ وہ جذبات پرست تھا۔ ایک نفس پرور ،قحبہ خانوں کا ایک راہب۔[۴۳]

بودلیر کی طرح میرا جی بھی تنہا رہے۔لوگوں کی نظروں سے دور اور سماج سے کٹے ہوئے گویا زندگی گزرگئی۔میرا جی اسی کی طرح شدت جذبات کے اسیر اور حسن پرست تھے۔اور بودلیر کی طرح ہی میرا جی کی زندگی بھی ایک کھلی کتاب کی مانند تھی۔

سترہ سال کی عمر میں بودلیر نے گھریلو زندگی اور اپنے جذبات کی کش مکش سے تنگ آ کر آوارہ گردی شروع کر دی۔ یہ زمانہ اُس کی آزادانہ اور اندھا دھند زندگی کا زمانہ تھا۔۔اس نے جی بھر کر عیش کیے۔اور ناپاکی کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔۔۔اپنی متواتر لغزشوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔مختلف عورتوں سے ہنگامی تعلقات میں بے اخلاقی ہی اسکا مطمحِ نظر تھی۔۔۔[۴۴]

اسی طرح میرا جی بھی تمام عمر گھر در سے بے نیاز بھٹکتے رہے۔سفر در سفر منزل کوئی نہیں تھی۔آوارہ گردی کا چکر پاؤں کو رکنے نہ دیتا تھا۔اخلاقی بے راہ روی کو درجہٗ انتہا تک اختیار کیے رکھا۔مذہب طاق پر دھرے کا دھرارہ گیا۔اور موت تک میرا جی اسی لغزشِ پاء کے اسیر رہے۔کچھ ایسی ہی صورتِ حال کے لئے میرا جی بودلیر کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہیں۔

کبھی کبھی مجھے تین دن تک بستر ہی میں لیٹے رہنا پڑتا ہے۔کیونکہ میرے پاس دھلے

ہوئے کپڑے پہننے کو نہیں ہوتے۔ یا کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔۔۔افسوس عقل وہوش سے بیگانہ ہونے کے لئے بھی روپے ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پچھلی دفعہ جب آپ نے مجھے مہربانی سے پندرہ فرانک بھیجے تھے۔ تو میں نے دوروز سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ دو روز۔ یعنی اڑتالیس گھنٹے۔۔۔۔[۴۵]

ان ادیبوں کے اس طرح کے تمام حالات وواقعات کا تذکرہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ میراجی نے ان غیر ملکی ادیبوں کی زندگی، شخصیت وکردار کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور شعوری طور پر نہ سہی، لیکن غیر شعوری طور پر ان سب کے اثرات میراجی نے قبول کیے۔ ''مشرق ومغرب کے نغمے'' میں میراجی نے سیفو کی شخصیت اور اس کے حالات زندگی بھی قلمبند کیے ہیں۔ یہ یونانی شاعرہ تھی۔ ایک غیر معمولی شخصیت، خوبصورتی، نزاکت اور ذہانت میں اپنی مثال آپ تھی۔ سیفو کے ضمن میں یہ حوالہ قابل ذکر ہے۔ کہ اس نے محبت میں ناکامی اور اسی نوع کی دیگر وجوہ کی بنا پر خودکشی کر لی تھی۔ اس کے بارے میں میراجی لکھتے ہیں۔

افلاطون اسے سروش غیبی کہتا ہے۔ سقراط حسن مجسم کہتا ہے۔ اور اس کے کلام کو عیسائیت کے ابتدائی تنگ نظر اور تنگ خیال حامیوں نے مخرب اخلاق سمجھ کر ضائع کر دیا۔۔۔ وہ پچپن سال کی تھی۔ کہ ۵۵۷ء ق۔م میں اس نے خودکشی کر لی۔[۴۶]

سیفو ایک مالدار اور یونان کے اعلیٰ ترین طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے حسن کا شہرہ تمام شہر میں پھیلا ہوا تھا۔ زندگی کے آخری دنوں میں وہ شدید مایوسی اور تنہائی کا شکار ہو گئی تھیں۔ کئی غیر اخلاقی عوامل اس کی روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔ میراجی نے ان عوامل اور پھر اس کی خودکشی کے ضمن میں ایک ناکام عشق کی طاقت دکھائی ہے۔ زندگی کی تمام ترعیش وعشرت ایک طرف، لیکن عشق کی ناکامی نے سیفو کو بالآخر اپنی زندگی تک ختم کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔

اس زمانے میں مٹی لین میں ایک نوجوان ملاح رہتا تھا۔ جسکا نام فاؤن تھا۔۔۔ سیفو کے عشق کی شدت نے نوجوان ملاح کو شاعرہ کی طرف مائل کر لیا۔۔۔ فاؤن کی بے وفائی کے صدمے نے اس کی شکل وصورت میں تباہ کن تبدیلی پیدا کر دی۔۔۔ وہ جان گئی۔ کہ اب اس کے لئے مسرت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس ناامیدی اور یاس کی تاریکی میں اس نے ایک دم مرنے کی ٹھان لی۔ ایک چٹان پر سیر کرتے ہوئے اس نے دوڑ کر چھلانگ لگا دی۔ اور نیچے گہرائی میں موجزن سمندر کی موجوں نے اس کے جسم کو اپنی آغوش میں لے لیا۔[۴۷]

ناکام عشق کی جو داستان سیفو کے ساتھ وابستہ ہے۔ میراجی بھی اسی عشق کی ناکامی کا شکار ہوئے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ انہوں نے سیفو کی طرح فوری طور پر خودکشی نہیں کی۔ بلکہ رفتہ رفتہ خودکشی کا ذائقہ چکھا۔ اور اس کا نتیجہ تھا۔ کہ وقت سے بہت پہلے کئی جسمانی عوارض اور ذہنی تکالیف انہیں درپیش ہو گئیں۔ میراجی کی یہ کیفیت ہائنے سے بہت مماثلت رکھتی ہے۔ جس کیلئے میراجی لکھتے ہیں۔

ہائنے بھی زندگی میں تنہائی، پریشانی اور بیماری کی انتہائی اذیت اٹھا کر مرا۔۔۔ پچاس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنی آدھی بینائی کھو چکا تھا۔ چل پھر نہ سکتا تھا۔۔ اس

کی قوتِ شامہ اور قوتِ ذائقہ ناکارہ ہو چکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر فالج گر چکا تھا۔۔۔
ہائنے کے دل میں عورت کی بے وفائی کا نقش اتنا گہرا تھا کہ اس کے کلام میں ہر جگہ ابھر آتا ہے۔ ۴۸

''مشرق و مغرب کے نغمے'' میں میرا جی نے جتنے ادیبوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان سے میرا جی کی کوئی نہ کوئی مشابہت ضرور ہے۔ ان مماثلتوں میں جہاں ناکامی عشق، نشہ، شراب، حسن پرستی، شدید جذباتیت کا عالم، جنس، نفسیاتی و ذہنی مسائل اخلاقی بے راہ روی جیسے مسائل نظر آتے ہیں۔ وہاں ان سب میں میرا جی کی طرح ایک اور مماثلت جو خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان تمام ادباء اور شعراء میں سے اکثر میرا جی کی طرح اپنی طبعی عمر کو نہ پہنچ سکے۔ اور تقریباً پچاس برس سے پہلے پہلے ہی وہ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اور زیادہ تر پچاس برس سے بہت کم عمر پا سکے۔
مثلاً ایملی برونٹے کے لئے میرا جی کا کہنا ہے۔ ''۔۔۔ تیس سال کی عمر میں انگلستان کی نحیف و نزار، ملال انگیز شاعرہ مر گئی۔۔۔''۔ ۴۹ میرا جی اور مغرب کے مندرجہ بالا لکھاریوں میں سیرت و کردار کی جن داخلی اور خارجی مماثلتوں کا تذکرہ ہوا ہے۔ ان سے یہ بات سامنے آتی ہے۔ کہ میرا جی نے شعوری اور غیر شعوری دونوں طرح سے ایسے مصنفین پر لکھا۔ جن کے اثرات خود میرا جی نے بالواسطہ اور بلاواسطہ قبول کیے۔ اس میں میرا جی کے وسیع مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کا اثر قبول کرنا بھی ایک گلیمر کا درجہ رکھتا تھا۔ چنانچہ اس حوالے سے ادب میں مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات در آئے۔ اور جہاں تک میرا جی کا تعلق ہے۔ ایک تو ان کے لئے اپنے مزاج اور زندگی میں ٹھہراؤ نہ تھا۔ دوسرے انہوں نے ادیبوں کے اثرات قبول کرنے کے ساتھ ساتھ بہت حد تک اپنی ظاہری ہیئت بھی ایسی بنالی۔ جیسی بعض مغربی ادیبوں کی تھی۔ حتیٰ کہ ان کا طرز زندگی بھی تمام کا تمام انہی کے انداز میں ڈھلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میرا جی کی موت پر بعض مغربی ادیبوں کی موت کا سا گمان ہوتا ہے۔ میرا جی خاص طور پر ایسا لٹریچر پڑھنے لگ گئے تھے۔ جس میں موت اور تلاش موت کی سنسنی پائی جاتی ہے۔ اور اس ضمن میں کئی اور معلومات بھی میرا جی کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ بقول اخلاق احمد دہلوی

میرا جی نے پھر اعلان کیا۔ صاحب میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ میرا موڈ یکا یک خودکشی کا ہو گیا ہے۔۔۔ درحقیقت میں آج کل یورپ کے قتل کے مقدمات کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ میرے پاس سینکڑوں ایسے اشخاص کی تصویریں جمع ہیں۔ جنہوں نے بڑے پراسرار طریقے سے قتل کئے۔۔۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ میں دنیا میں اپنے سوا کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔۔۔ ۵۰

میرا جی کے یہ الفاظ خودکشی کے اس ارادے کو ضرور ظاہر کرتے ہیں۔ جو ان کے اندر پنپ رہا تھا۔ میرا جی نے خودکشی نہیں کی۔ لیکن خودکشی کی نیت ہی سے وہ تمام زندگی خود کو بدترین طریقے سے ضائع کرتے رہے۔ ان کے مزاج میں سنسنی خیزی کا جو عنصر پایا جاتا تھا۔ اس نے تمام عمر میرا جی کو پراسرار شخصیت بنائے رکھا۔ ان کے اکثر معاملات زندگی بھی اسی پراسراریت کے حامل تھے۔ احمد بشیر لکھتے ہیں۔

اس نے بوسیدہ اخبارات کا دفتر کھولا۔۔۔ کرائم اینڈ مسٹری کا ایک پرچہ نکالا اور اس کے مطالعہ میں غرق ہو گیا۔۔۔ میرا جی ہمیشہ سونے سے پہلے کرائم اینڈ مسٹری کے کچھ صفحے پڑھتا۔ کبھی کبھی گنگنانے لگتا۔ اور پھر یک لخت بالکونی پر خاموشی چھا جاتی۔۔۔ ۵۱

نظم ''ارتقاء''

یہ راستہ کب ہے؟ اک لحد ہے
لحد کے اندر تو اک جنازہ ہی بار پائے گا یہ بھی سوچو
تو کیا مشیت کے فیصلے سے ہٹے ہٹے رینگتے رہو گے
جنازے رکھے ہوئے ہیں ان کو اٹھاؤ، جاؤ
لحد کھلی ہے

میراجی کا یہ مخصوص طرزِ عمل ظاہر کرتا ہے۔ کہ وہ تیزی کے ساتھ اپنی ذات سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ وہ صرف خارجی ہی نہیں داخلی نوعیت کی تنہائی کا بھی شکار تھے۔ خود اپنے ہی وجود میں گم ہو جانا، ان پر ایک حیرت زدگی اور ہیبت کی کیفیت طاری رہتی تھی۔

بقول اخلاق احمد دہلوی ''قتل کے مقدموں کا مطالعہ، خودکشی کا ارادہ، کسی راگ سے کوئی خاص اثر لینا۔۔۔ میراجی کی شخصیت کی ایک ہیبت سی مجھ پر طاری ہو کر رہ گئی۔''۔۵۲ میراجی اپنی ذات سے خوفزدہ تھے۔ غیر محسوساتی طور پر موت انہیں چونکا دیا کرتی تھی۔ بقول احمد بشیر فسادات کی خبریں سنکر اسے سخت تکلیف ہوتی۔ شاید''۔۔۔ موت کا ڈر اس کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ اور قتلِ عام کا قصہ سن کر وہ محسوس کرتا۔ جیسے وہ خود قتل ہو جانے والا ہے۔''۔۵۳ میراجی اپنی زندگی سے بے یقین ہو چکے تھے۔ انکا وجود ہے بھی یا نہیں۔ انہیں خود خبر نہیں تھی۔ چونکہ طبیعت میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ لہذا زندگی کو ختم کرنے کا کبھی ارادہ کرتے۔ اور کبھی اس کی شدت میں کمی آ جاتی تھی۔ یہ صورتِ حال اکثر ان پر ایک دورے کی صورت میں طاری ہوتی۔ ''راشد صاحب کے ایران جانے کے بعد میراجی کی حالت بہت نازک ہو گئی۔ اور تقریباً روز ہی خودکشی کا موڈ ان پر سوار رہنے لگا۔''۔۵۴

کثرت مے نوشی نے پہلے ہی میراجی کے حواس معطل کر دیئے تھے۔ کئی نفسیاتی الجھنوں نے ذہنی اور جسمانی طور پر انہیں مفلوج کر رکھا تھا۔ اور اسی کے باعث جسم تیزی کے ساتھ مختلف نوع کی بیماریوں کا شکار ہو رہا تھا۔ ادویات کا استعمال جاری تھا۔ اور دوست احباب کی کوششوں میں بھی کمی نہ تھی۔ انہی کی مدد سے میراجی کا علاج ہو رہا تھا۔ لیکن نہ تو انہیں کوئی ایک مرض لاحق تھا۔ اور نہ ہی افاقہ کی کوئی صورت نظر آتی تھی۔ کثرتِ مے نوشی نے ان کے جسم کے تمام داخلی نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔ اور دوسرا یہ کہ میراجی خود تمام زندگی جس روگ اور عوارض کو اپنے اندر پال رہے تھے۔ اس سے نکلنا اور صحت مند ہونے کی کوشش ان کیلئے بے معنی تھی۔ یہ وہ مریض تھا۔ جس نے اپنے ایک مرض کو امراض میں بدلا۔ ان امراض کو پوری تندہی کے ساتھ نگہداشت کی۔ اور ان کو شدید سے شدید تر بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ دوسرے لوگ میراجی کی جس کیفیت کو ان کی تکلیف محسوس کرتے تھے۔ وہ میراجی کے لئے لطف اندوزی کا ایک بہانہ اور طریقہ تھا۔

> آخری دنوں میں جب وہ خیراتی ہسپتال میں پڑے دم توڑ رہے تھے۔ تو ایک پادری نے ان کے پاس آ کر پوچھا۔ آپ یہاں کب سے ہیں۔ میراجی نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ ازل سے۔۔۵۵

میراجی کی شدید بیماری کے ایام میں اگرچہ دوست احباب کی مدد سے میراجی کا علاج ہو رہا تھا۔ لیکن نہ تو مریض شفایابی چاہتا تھا۔ اور نہ میراجی کی صحت کی تباہ کن حالت میں سنبھلنے کی کوئی صورت باقی تھی۔ علاج کی صورت میں ایک سعی

لاحاصل جاری وساری تھی۔ایک تکلیف سے کئی تکالیف جنم لے رہی تھیں۔بقول اختر الایمان

> جب میرے پاس تھے۔تو اسہال کے ساتھ ساتھ نمونیہ کا بھی شکار ہو گئے۔ان کے جسم میں خون بننا بالکل بند ہو گیا۔۔۔میں نے ڈاکٹروں کے مشورے سے انہیں جگر کے ٹیکے دلوانے شروع کیے۔۔۔جگر کے ٹیکے ظاہر ہے۔علاج نہیں ایک سہارا تھے۔۔۔ ڈاکٹر گرودر نے ایک ماہر نفسیات کو بلوا کر ان کا ذہنی تجزیہ شروع کیا۔انہوں نے بہت سی باتیں بتانے سے انکار کر دیا۔۔۔ڈاکٹر گرودر کا خیال Psychotherapy Shock دینے کا تھا۔مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔۔۔ہم نے انہیں بچانے کی کوشش اٹھا نہ رکھی۔لیکن افسوس کہ خود انہوں نے ہمارا ساتھ نہ دیا۔-۵۶

گویا میرا جی نے جس طرح تمام زندگی اپنے مخصوص طرزِ عمل سے سماج کو ٹھکرا کر اس کا مضحکہ اڑایا۔اب وہ اس علاج کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔جو انہیں بچانے کے لئے کیا جا رہا تھا۔میرا جی کا جگر شراب کا بوجھ اور اسکی دی ہوئی اذیت نہ سہہ سکا تھا۔شراب کی کثرت نے دیگر کئی ادیبوں کی طرح میرا جی کا جگر بھی چھلنی کر دیا تھا۔اب علاج سے ایک زندگی بچانے کا سوال بے معنی تھا۔اور پھر یہ قدم پورے ہوئے بقول سعادت حسن منٹو''اچھا ہوا جو وہ جلدی مر گیا۔کیونکہ اس کی زندگی کے خرابے میں اور زیادہ خراب ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔''-۵۷

یہ الفاظ اردو کے اس ادیب نے میرا جی کے لئے کہے۔جو خود کثرتِ مے نوشی کی بھینٹ چڑھ کر وقت سے بہت پہلے خود کو ختم کر گیا تھا۔چنانچہ میرا جی کی پوری زندگی جو صرف ۳۷ برس پر محیط تھی۔کا اگر احاطہ کیا جائے۔تو ان کا گزرنے والا ایک ایک پل خودکشی پر مبنی موت ہی دکھائی دیتا ہے۔

سعادت حسن منٹو (۱۹۱۲ء۔۱۹۵۵):

نام سعادت حسن، خاندانی نسبت منٹو (کشمیری ال) قلمی نام سعادت حسن منٹو تھا۔ ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء ضلع لدھیانہ (پنجاب) میں ولادت ہوئی۔ والد کا نام غلام حسن تھا۔ والد صاحب کی دو شادیاں تھیں۔ سوتیلی والدہ کا نام جان مالی اور سگی ماں کا نام سردار بیگم تھا۔ سوتیلے بہن بھائیوں کی تعداد آٹھ تھی۔ جبکہ سگی ماں سے یہ چار اولادیں تھیں۔ سوتیلے رشتوں کا منٹو کے ساتھ رویہ کچھ زیادہ بہتر نہیں تھا۔ جبکہ منٹو کے اندر کا جو فطری ادیب تھا۔ جو ہمدردانہ روح تھی۔ وہ اس ناروا سلوک کا دکھ تو ضرور اٹھاتی رہی۔ لیکن دوسروں کے لئے سراپاء ہمدردی بنی۔

بقول ابو سعید قریشی ''سوتیلے بھائیوں، سوتیلی ماں اور سخت گیر باپ کی وجہ سے وہ ہمدردی جو انکو گھر میں نہیں ملی تھی۔ اِسکا انتقام لینے کی بجائے وہ دوسروں کے لئے سرتاپا ہمدردی بن گیا۔'' ۵۸۔ منٹو کی شادی اپریل ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ بیوی کا نام صفیہ بیگم تھا۔ منٹو کی اولاد میں ایک بیٹا عارف اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ بیٹا عارف ۱۹۴۱ میں تقریباً ایک سال کی عمر میں وفات پا گیا۔ جسکا منٹو کو شدید رنج تھا۔ برس ہا برس وہ اس غم کی شدت سے باہر نہیں آسکے۔ اکثر اپنے بیٹے کی باتیں اور اس کے چھوٹے چھوٹے قصے وہ اپنے دوست احباب سے بھی بیان کرتے۔ اور جب تک بیٹا زندہ رہا۔ منٹو کی اس کے ساتھ محبت کا یہ عالم تھا۔ کہ اس کے تمام کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ بیٹے کی موت کا دکھ زندگی کی ایک محرومی اور ہمیشہ رہنے والی کسک بنکر ان کے ساتھ رہا۔ بقول مسز ثریا ''بیٹے کی موت کے غم سے سعادت بھائی عرصہ تک سنبھل نہ سکے ---'' ۵۹۔

بیٹے کے علاوہ ان کی اولاد میں تین بیٹیاں ہیں۔ منٹو کی بیٹیوں کے نام نگہت، نزہت اور نصرت ہیں۔ تینوں آجکل لاہور میں مقیم ہیں۔ جہاں تک منٹو کی تعلیم کا تعلق ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ میٹرک تک وہ امرتسر کے مختلف سکولوں میں پڑھتے رہے۔ میٹرک ۱۹۳۱ء میں کیا۔ اور ایف اے ایم۔اے۔ او کالج امرتسر سے کیا۔ جو مکمل نہ ہوسکا۔ لیکن تعلیم نامکمل ہونے کے باوجود منٹو کے اندر کا جو فنکار تھا۔ اور جو اُن کی فطری صلاحیتیں تھیں۔ انہوں نے منٹو کی شخصیت کے ادبی پہلو کو ادھورا نہ رہنے دیا۔ اور نامساعد حالات کے باوجود انکے تخلیقی جوہر کھل کر سامنے آئے۔

ان کے افسانوں میں نیا قانون، ٹیڑھی کھیر، شغل، پہچان، خوشیا، بانجھ، موم بتی کے آنسو، ہتک، دس روپے وغیرہ ایسے افسانے ہیں۔ جن میں مختلف سماجی، سیاسی اور معاشی واخلاقی نوعیت کے موضوعات کو کمال مہارت سے سمویا گیا ہے۔ اپنی تمام طرح کی کہانیوں میں منٹو کی اپنی ذات ایک فریق بھی بنتی ہے۔ اور ایک کردار بھی۔ ان کی آنکھ جو کچھ دیکھ

رہی تھی۔ منٹو خود ان تمام حالات کو سہہ بھی رہے تھے۔
منٹو جینئس تھے۔ ماحول کو، سماج کو، معاشرتی رویوں کی سیاہی کو جب نہ دھو سکے۔ تو اپنے اندر ہی اندر سمٹنے لگے ۔تمام رشتے، تمام باتیں، داخل اور خارج کی جنگ ان کے اندر اتر گئی۔ خارج سے انکا رشتہ محض وقت گزاری اور دنیا داری کے لئے رہ گیا تھا۔ ماحول اور سماج سے ان کی ذہنی مطابقت کا فقدان رہا۔ اس پر طرہ یہ کہ سماج اور نام نہاد ادبی ٹھیکیداروں کی طعن و تشنیع کا نشانہ بنتے چلے گئے۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا۔ کہ شراب کی خودفراموشی ان کیلئے جائے پناہ بن گئی۔ اور جب اس کی خودلذتی اور خودفراموشی حد سے گزرنے لگی۔ تو انہیں خود کو اس کی بھینٹ چڑھانے میں لذت دوچند ہونے لگی۔ یہاں خود سے انتقام کی ایک صورت بھی پیدا ہوگئی۔ وہ خودفراموشی کی گمشدگی میں اترنے لگے۔ جہاں وہ نہ کسی کو دیکھ سکے۔ اور نہ کوئی ان تک پہنچ سکے۔ وہ جس سماج میں رہ رہے تھے۔ اسے جب گناہ و سزا کی سولی پر نہ لٹکا سکے۔ تو خود اس سولی پر لٹک گئے۔ بقول احمد ندیم قاسمی

> ۔۔۔ ان کی موت تک ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا۔ وہ چاہے ہمارے اہل قلم، چاہے ہمارے پبلشرز ہوں۔ چاہے ہماری حکومت ہو۔ انہوں نے اتنے بڑے فنکار کا ۔جن پر صدیوں تک ناز کریں گی ہماری آئندہ نسلیں کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ کہ وہ کن حالات سے گزر رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ منٹو نے روزانہ ایک کہانی لکھنی شروع کردی۔۔۔ پبلشرز کے ہاں وہ دس پندرہ روپے میں بیچ کر واپس آجاتے تھے۔ اس سے گھر کا خرچ بھی چلاتے تھے دوسرے اخراجات بھی چلاتے تھے۔ بچوں کی دوائیں بھی لیتے تھے۔ تو ان حالات میں وہ شخص اگر مر نہ جاتا تو اور کیا کرتا۔۔۔ ۶۰

یہیں سے ایک دانشور، ایک جینئس اور اہل قلم میں داخلی ٹوٹ پھوٹ کا سفر شروع ہوتا ہے۔ ایسا سفر جو بظاہر پرسکون، وحشت ناک حد تک پرسکون، لیکن اندر سے انتہائی اذیت ناک، نہ کوئی سوال نہ کوئی جواب۔ ایسے میں وہ جینئس، وہ صاحب قلم جانتا تھا۔ کہ اندرونی سطح پر ان کی اور سماج کے درمیان کہاں اور کیونکر عدم مفاہمت ہے۔ اپنے ایک خط میں وہ احمد ندیم قاسمی کو لکھتے ہیں۔

> میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ مجھے تھوڑا سا سکون بھی حاصل ہو۔ تو میں وہ بکھرے ہوئے خیالات جمع کرسکتا ہوں۔ جو برسات کے پتنگوں کی مانند اڑتے رہتے ہیں۔ مگر اگر اگر کرتے کسی روز مر جاؤں گا۔ اور آپ بھی یہ کہہ کر خاموش ہوجائیں گے "منٹو مرگیا" منٹو تو مرگیا، صحیح ہے۔۔۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ منٹو کے وہ کیا خیالات بھی مرجائیں گے جو اس کے دماغ میں محفوظ ہیں۔۔۔ منٹو منٹو کے لئے زندہ نہیں ہے ۔مگر اس سے کسی کو کیا؟ منٹو ہے کیا بلا۔ ۶۱

یہاں دکھ اور کرب کی وہ کیفیت بھی موجود ہے۔ جو اس وقت ایک تخلیقی ذہن کا کرب بن جاتی ہے۔ جب معاشرہ اسے سمجھنے اور اس کے افکار کی صداقت کا منکر ہو رہا ہو۔ جہاں سماج میں اسے وہ مقام نہ مل سکے۔ جسکے وہ حقیقت میں اہل تھے۔ اور اس کے برعکس مخالفت اور طنز و تشنیع کا انہیں سامنا کرنا پڑے اس تلخ رویے سے وہ پھر نہ صرف اپنی ہی ذات میں سمٹنے لگے۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں اپنی ہی ذات کو انتقام کی بھینٹ بھی چڑھا دیتے ہیں۔

۔۔۔میں دراصل آج کل اس جگہ پہنچا ہوا ہوں جہاں یقین اور انکار میں تمیز نہیں ہو سکتی۔۔۔ مجھے اطمینان نصیب نہیں ہے۔۔۔ مجھے اپنے آپ سے کبھی تسکین نہیں ہوتی۔۔۔کبھی کبھی خیال آتا ہے۔ کہ کیوں نہ اپنی زندگی کو بد پرہیزیوں کی نذر کر دوں ۔میں اپنی زندگی کا ۳/۴ حصہ بد پرہیزیوں کی نذر کر چکا ہوں۔۔۔اب تو یہ وقت آ گیا ہے۔ کہ پرہیز کا لفظ ہی میری ڈکشنری سے غائب ہو گیا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی اگر پرہیز میں گزاری جائے تو بھی قید ہے۔ اگر بد پرہیزیوں میں گزاری جائے۔تو بھی قید۔ کسی نہ کسی طرح ہمیں اس اونی جراب کے دھاگے کا ایک سرا پکڑ کر اسے ادھیڑتے جانا ہے۔اور بس ۔ میں اپنا کام آدھے سے زیادہ کر چکا ہوں۔ باقی آہستہ آہستہ کروں گا۔اس لیے کہ میں بہت جلد مرنا نہیں چاہتا۔۔۔میری زندگی ایک دیوار ہے۔ جسکا پلستر میں ناخنوں سے کھرچتا رہتا ہوں۔ ۶۲

یہاں ایک ادیب، ایک صاحب قلم اور ایک حساس دل و دماغ کے اندر ٹوٹ پھوٹ کے عمل کے واضح آثار دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں وہ خود اپنی ذات میں، اپنی زندگی کو دو دھاروں میں بسر کرتا نظر آتا ہے۔ وہ جینا چاہتا ہے۔ لیکن اسے وہ زندگی قبول نہیں جو سماج اسے عطا کر رہا ہے۔ لہذا ان متصادم سوچوں کا طوفان انہیں اندر ہی اندر ریزہ ریزہ کر رہا ہے۔ بظاہر وہ معاشرے کے اندر اور تمام رشتوں ناتوں کے درمیان زندہ ہیں۔ لیکن ایک اذیت پسندی، خود فراموشی کی کیفیت کا عالم انہیں ان سب سے کاٹ کر الگ بھی کر رہا ہے۔ اور چونکہ حساس ہیں انہیں اپنی انا، خودداری اور عزت نفس بھی عزیز ہے۔ اسی کے ہاتھوں منٹو بالخصوص اپنے آخری ایام میں چپ سادھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس چپ کی سولی پر ان کے اندر کا فنکار خود لٹک جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ میں گم ہونے کے لئے بلانوش بن گئے۔ اذیت، تکلیف اور شدت کی مے نوشی۔ وہ جو معاشرے کے غلط رویوں کے آگے نہ جھکے۔ لیکن اپنے اندر کے فنکار کے آگے جھک گئے۔ اتنا جھکے کہ زندگی سے موت کی دہلیز ان کی منتظر تھی۔ وہ انہیں گوارا ہوئی۔ لیکن سماج کے سامنے ٹوٹنا، جھکنا انہیں گوارا نہ تھا۔

بقول عصمت چغتائی ''منٹو کی خودداری رعونت کی حدوں کو پہنچی ہوئی تھی۔'' ۶۳ فنکار کی ٹوٹ پھوٹ اسی خودداری کی شدت کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ منٹو شراب پیتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ اپنی ذات کیلئے ظالمانہ حد تک شراب کا استعمال کیا جواز رکھتا ہے۔ جس میں انہوں نے خاموشی کے ساتھ اپنی موت کا سودا بھی کر لیا۔ معاشرہ بے خبر رہا۔ یا بے نیاز۔ سوال یہاں اٹھتا ہے۔ کیونکہ منٹو کے ہاں شراب، بے راہ روی کا وہ پس منظر فراہم نہیں کرتی۔ جن معنوں میں عموماً معاشرہ مراد لیتا ہے۔ شراب ان مخصوص حالات میں ان کی زندگی کا مرکز و محور بنی۔ اور وہ عام شرابیوں کی مخصوص کیفیات سے بھی الگ رہے۔

عصمت چغتائی لکھتی ہیں۔ ''مجھے یہ کبھی نہ معلوم ہو سکا۔ کہ منٹو پی کر بہکتا ہے۔ یا بہک کر پیتا ہے۔ میں نے اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ یا زبان میں لکنت نہ پائی۔'' ۶۴ اس ضمن میں مسز ثریا نصیر الدین نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔

سعادت بھائی کی شراب نوشی نے انہیں کبھی بھی بہکنے نہ دیا۔ اور نہ ہم نے ان کی زبان سے کوئی غیر اخلاقی بات سنی۔ بلکہ ایسی کیفیت میں وہ ضرورت سے زیادہ خاموش ہو

جاتے تھے۔ بظاہر پرسکون اور دوسروں کے لئے ہمہ تن گوش۔ اور ایسے عالم میں بھی وہ اکثر بے تحاشا لکھتے تھے۔ لکھنے کی یہ صورت اسوقت بھی جاری رہتی۔ جب سب کے درمیان ہوتے گھٹنے پر رکھ کر لکھتے۔ دوسروں کی باتوں کو سنتے۔ اور جواب بھی دیتے جاتے تھے۔ ۶۵

ان حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ منٹو کے اندر کا ادیب اسوقت بھی نہ تو سویا اور نہ اپنی ذات سے بے خبر ہوا۔ جب وہ دوسروں کی نظر میں مے خواری سے مدہوش ہوتا تھا۔ وہ شراب کی معاونت سے مدہوشی کے پردے میں اپنے اندر کا کرب چھپاتا تھا۔ لیکن اندر کا فنکار، اندر کا ادیب ضرورت سے زیادہ بیدار ہوتا تھا۔ بقول عارف عبدالمتین ''انکے اندر کا فنکار مشتعل ہو جاتا تھا۔ بے قرار ہو جاتا تھا۔ مضطرب ہو جاتا تھا''۔ ۶۶ یہ اندر کا فنکار ہی تھا۔ جو سماج کو بدلنے کا خواہش مند تھا۔ وہ چلمن کے اس پار وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جسے دیکھنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ اور اگر ہمت تھی۔ تو لب سلے ہوئے تھے۔ لیکن منٹو سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ محسوس کر رہے تھے۔ جو وہ کرنا چاہتے تھے۔ حالات ان کے موافق نہ تھے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے پاس ایک ایسا سوئچ بورڈ آ جائے۔ جس سے میں حسبِ خواہش روشنیاں پیدا کر سکوں۔ جس وقت چاہوں۔ گھپ اندھیرا کر دوں۔ اور جس وقت چاہوں۔ روشنی کا سیلاب بہا دوں۔ کیا ایسی چیز مل جائے گی۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ کچھ بھی ہو مجھے اطمینان نہیں ہے۔ میں کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوں۔ ہر شئے میں مجھے کمی محسوس ہوتی ہے۔ میں خود اپنے آپکو نامکمل سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے کبھی تسکین نہیں ہوتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جو کچھ میرے اندر ہے۔ وہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی بجائے کچھ اور ہی ہونا چاہیے۔ ۶۷

یہ سوچ ایک جینئس کی ہے۔ ایک صاحب تخلیق کی ہے۔ اس ذہن کی ہے۔ جو عام و عامی کی سطح سے ہٹ کر ہے۔ ایک ایسی شخصیت کی ہے۔ جسے ابتداء ہی سے ذاتی زندگی میں محرومیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر اس محرومی کا درد تمام زندگی دوسروں کے حوالے سے بھی شدت کے ساتھ محسوس کرتے رہے۔

ان کے والد منصف تھے۔ انہوں نے دو شادیاں کیں۔ سعادت کی والدہ ان کی دوسری بیوی تھیں۔ لیکن توجہ پہلی بیگم کی اولاد پر رہی۔ اور ان کی وفات کے بعد دوسری بیگم، بیٹے منٹو اور بیٹی ناصرہ کے لئے کچھ نہ بچا۔ منٹو کی تحریروں میں یہی کڑواہٹ ہے۔ جیسے قند کی گولیوں میں یکا یک کونین کا ٹکڑا آ جائے۔ یہ تلخی کتنی دیرپا تھی۔ اسکا اندازہ منٹو کی موت سے ہو سکتا ہے۔ معاشرہ آدمی کا دوسرا باپ ہوتا ہے۔ وہ بھی اس سے انصاف نہ کر سکا۔۔۔ کڑواہٹ کے احساس کو کند کرنے کیلئے اس نے اور کڑواہٹ اپنے اندر انڈیلی۔ بوتل کو منہ لگا لیا۔ ۶۸

گویا ذاتی اور اجتماعی دونوں طرح کی زندگی کے دھارے ایک حساس دل اور ایک مخلص ادیب کی سوچ کے لئے سازگار نہ تھے۔ بلکہ اذیت ناک حد تک ان کے لئے پریشان کن تھے۔ یہ الگ بات کہ ان کے اندر کا انسان دردمندی اور

خلوص کے ساتھ انسانی رشتوں اور روابط کو نبھاتا بھی رہا۔

بقول بیٹی نصرت جلال ''ابا جان کا اس کے باوجود سوتیلے بھائیوں کی اولادوں سے بہت اچھا برتاؤ رہا''۔۶۹
ان عوامل سے صاف عیاں ہے۔ کہ سماج کے ان متضاد رویوں سے ان کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل تیز تر ہوتا گیا۔ کہ جو کام وہ کر رہے تھے۔ وہ نہ تو اسکے منکر تھے۔ اور نہ اسے چھپاتے تھے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر بلانوش بن گئے تھے۔ ایک ایسی ضد کا اختیار کرنا جو بالآخر ہٹ دھرمی پر منتج ہو۔ اب شراب ان کے لئے سماج سے بغاوت بھی تھی۔ اور انتقام بھی تھا۔ جو ایک ڈھال بھی تھی۔ اور طوفانی موجوں میں وہ پتوار کا کام بھی دے رہی تھی۔ انہیں زندگی اور صحت کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اب وہ جس کشتی کے سوار تھے۔ اسے وہ تمام طوفانوں سے ہمکنار کرنے کے درپہ تھے۔

> دو سال سے وہ بے تحاشا پی رہے تھے۔ ہر وقت مدہوش۔ جگر چھلنی۔ ۱۹۵۳ء کے آخر آخر میں مرتے مرتے بچے۔ یہ کوئی معجزہ تھا۔ اور بتایا کہ موت بہت قریب ہے۔ لیکن اس نے پھر بوتل کو منہ لگالیا۔ گلاس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس کی تھکی ہوئی روح کو سبو سے ساغر تک فاصلہ بھی بہت نظر آیا۔ اپنے اور ابدیت کے درمیان وہ بلور کا پردہ بھی برداشت نہ کر سکی۔ رہگزارِ زیست کا تھکا ہوا راہی جس پر معاشرے نے قدم قدم پر سنگباری کی تھی۔ جلد از جلد اس منزل پر پہنچنا چاہتا تھا۔ جہاں درد کو لذت سنگ کے نام سے نہیں بلایا جاتا۔ جہاں چٹانیں نہیں ہوتیں۔ پتھروں کے سوداگر نہیں ہوتے۔ ۷۰۔

اب ایک فنکار کی زندگی میں وہ مرحلے آتے ہیں۔ جب وہ اذیت پسندی سے زیادہ اذیت پرست بن جاتا ہے۔ اپنی روح کو ہر ہر پہلو سے گھاؤ لگانا۔ اپنے اندر کے فنکار کو خود ضربیں پہنچانا۔ دنیا، دنیاداری، نصیحت، طعن و تشنیع، ہمدردی، خلوص سب کو بالائے طاق رکھ دینا منٹو کا شیوہ بن گیا تھا۔ یہ ایک تخلیق کار کی معاشرے سے شدید ناراضگی تھی۔ وہ جو سب میں رہتا تھا۔ وہ جو ایک انقلابی سوچ رکھتا تھا۔ انقلاب کی صلیب پر کب کا مصلوب ہو چکا تھا، دنیا نے اس کی پرواہ نہ کی۔ تو وہ اپنی زندگی اور ذات سے بے پرواہ ہو گیا تھا۔ اب وہ صرف اور صرف موت کا طلبگار تھا۔ اسکا منتظر یہاں بات بلانوشی ہی کی نہ تھی۔ بلکہ جس بے رحمی اور ظالمانہ طریقے سے وہ اسکا استعمال کر رہے تھے۔ وہ رویہ اور اپنی ذات سے اسطرح کا سلوک قابل توجہ تھا۔ انسان کے ہر عمل کے پیچھے اسکا ذہن، سوچ، نقطۂ نظر اور ارادہ ہی غور طلب ہے۔ منٹو کی بلا نوشی کے پیچھے ان کا ارادہ کسی سے ڈھکا چھپا نہ تھا۔ دوست، احباب بخوبی جانتے تھے۔ کہ وہ اب کس راستے کے مسافر ہیں۔ بقول جی ایم اثر

> جہاں تک ان کی بلانوشی کا تعلق ہے۔۔۔ بات یہ ہے کہ میں چاہتا تھا۔ کہ جس انداز سے جس طریقے سے وہ خودکشی کی طرف مائل ہیں۔ حالانکہ وہ سمجھتے تھے۔ کہ یہ خودکشی ہے۔ کھاتے کچھ نہیں تھے۔ ان کی خوراک میں آپکو بتادوں۔ ڈبل روٹی کے پتلے سے سلائس کا گودا۔ اور روزانہ یہی خوراک میسر آتی تھی انکو۔ ایک نمک دان میں نمک چائے کی پیالی کے ساتھ جو پرچ کہلاتی ہے۔ اس میں شوربہ، ایک آلو کا ٹکڑا اور ایک چھوٹی سی بوٹی۔ گودا ایک سلائس کا نکال کر وہ شوربے میں بھگونے کو ڈال دیتے تھے۔ آلو

کھالیتے تھے۔ بوٹی نہیں کھاتے تھے۔۔۔اور یہ کہ وہ اپنے آپکو ختم کررہے تھے۔۔۔
۷۱۔

خودکشی کے حوالے سے ہلاک کردینے والی بلانوشی کے پس پردہ وہ اقتصادی اور معاشی عوامل بھی خاص توجہ کے حامل ہیں۔ جنہوں نے منٹو کو زندگی میں اور بالخصوص آخری ایام میں انتہائی پریشان کن صورتِ حال سے دوچار کیا۔ یہ صورتِ حال ایسی تھی۔ جو رفتہ رفتہ بد سے بدترین ہوتی چلی گئی۔ تخلیق کار جب ان معاشی مسائل سے دوجار ہوتا ہے۔ تو اس میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل اور اُسکا تناسب عام وعامی کی نسبت زیادہ اور شدید ہوتا ہے۔ انا، خودداری اور حساس طبیعت قدم قدم پر آڑے آتی ہے۔ اُسکا حساس ذہن ایسے اور اس طرح کے مسائل کے لئے نہ تو کوئی جواز تلاش کرسکتا ہے۔ اور ان سے سمجھوتہ کرپاتا ہے۔ تخلیقی عمل کے پس پردہ جہاں اس کی شخصیت ٹوٹتی ہے۔ وہاں اسکا تخلیقی جوہر یا اسکا ہنر بھی شدید متاثر ہوتا ہے۔ کبھی تو اس ہنر کا خون ہوجاتا ہے۔ اور کبھی اسکا معیار شدید طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اور منٹو کے حوالے سے یہ بات اس لیے بھی قابل ذکر ہے۔ کہ منٹو نے آسائش وآسودگی کا وقت بھی دیکھا تھا۔ لیکن اس آسائش کے بعد جب معاشی تنگدستی ہوئی۔ تو حالات سے سمجھوتہ کرنے کا توازن بگڑ گیا۔ اور آخر آخر ایام میں تو انہیں رنج اور ملال کھائے جاتا تھا۔ کہ اہل خانہ کے ضروری اخراجات پورے کرنے کے بھی وہ اہل نہیں رہے۔ حتیٰ کہ بیوی بچوں کے لئے بوقتِ ضرورت علاج اور دوا کی فراہمی بھی مسئلہ بن جاتی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد منٹو کا اقتصادی اعتبار سے بدترین دور تھا۔ اور ایک لحاظ سے ان کی فنی بلندی اور ذہنی پختگی کا عروج تھا۔ افسوس ناک امر ہے۔ کہ اس زمانے میں اقتصادی پریشانیوں نے ان سے ایک دن میں تین سے چار افسانے لکھوائے۔ چند روپوں کی خاطر وہ گھٹیا رسائل میں بھی لکھتے تھے۔

بقول سید عابد علی عابد

> منٹو نے اپنے آپکو بہت سنبھالا۔ لیکن فارغ البالی اور آسودگی کے بعد ایکا ایکی معاشی بے اطمینانی میں مبتلا ہوجانے کے نتائج ظاہر ہوکر رہے۔ اور وہ منٹو جو کسی سے نہ ڈرا تھا۔۔۔خود اپنے آپ سے شکست کھا گیا۔ ڈاکٹروں نے اس سے کہا۔ شراب ترک کردو۔ ورنہ مرجاؤ گے۔۔۔ ۷۶۔

لیکن شاید اس نے مرنے کے لئے ہی شراب کا سہارا لیا تھا۔ کیونکہ انسانی رشتے اور سہارے اسکے لیے بے اعتبار تھے۔ بقول ابوسعید قریشی

> وہ سیڑھیوں اور سہاروں کا کبھی قائل نہ تھا۔ رحم کی التجا کرنے والوں سے اسے نفرت تھی۔ وہ زندگی بھر پتنگ اڑاتا رہا۔ اور اسی طرح کودتا رہا۔ ایسے میں وہ کئی بار لوگوں کے سروں پر آن گرا۔ لوگ بھنائے، جھلائے، گالیاں دیں۔۔۔لیکن منٹو نے کہا۔ مجھے بھی پتنگ اڑانے کا حق ہے۔ آسمان کی وسعتوں پر کسی کا اجارہ نہیں۔ جو مجھے گرانے کی کوشش کرے گا۔ میں اس کے سر پر کود جاؤں گا۔۔۔ ۷۳۔

اور یہ مرحلے بھی شاید عام عامی کی نسبت ادیب کی زندگی میں زیادہ آتے ہیں۔ جب وہ حساس پن کے باعث حالات سے سمجھوتہ کرنے میں اس حد تک عاری وبیگانہ ہوجاتا ہے۔ کہ پھر وہ شعور کی دنیا میں بھی نظر نہیں آتا۔ ایک پاگل پن کی کیفیت اور اذیت اسے درپیش ہوتی ہے۔ منٹو پر بھی یہ مرحلے آئے۔ انہیں پاگل خانے بھی بھیجا گیا۔ یہ صحیح معنوں میں

پاگل پن کی حالت ہے۔ یا بدترین اذیت سے دوچار ہونے کی مزید خواہش۔ یہ تجرباتی اور محسوساتی سطح صرف یہ لوگ خود ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ منٹو پر عجب خودفراموشی کی حالت تھی۔ اور دوست احباب کے لئے بالکل ایک نئی صورتِ حال۔

ایک ادبی جلسے کی صدارت کے حوالے سے ہاجرہ مسرور لکھتی ہیں۔

> لاہور آ کر میں نے کئی بار انہیں دور سے دیکھا۔ مختلف ادبی جلسوں میں وہ ہمیشہ اتنے زرد نظر آتے۔ کہ بے ساختہ ان کی زندگی کی دعا کرنی پڑتی۔۔۔ میں نے بہت سے لوگوں سے سن رکھا تھا۔ کہ منٹو صاحب اپنے فن پر کسی قسم کی تنقید نہیں سن سکتے۔ اور وہاں تنقید ہی ہو رہی تھی۔ مگر مجھے دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی۔ کہ منٹو صاحب تنقید پر تنقید کے دوران میں ایک لفظ تک نہ بولے۔ وہ میز پر کہنیاں رکھے اپنے زرد چہرے کو ہاتھوں میں لیے بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے پر بڑی اذیت تھی۔ اور ہر بولنے والے کی طرف ان کی بے چین آنکھیں یوں جھپٹتیں۔ جیسے کچھ پانا چاہتی ہوں۔ لیکن جب بات ختم ہوتی۔ تو یوں ہٹتیں۔ جیسے وہاں اپنے مطلب کی بات نہ پائی ہو۔ ۔[۷۴]

پھر وہ حقیقتاً پاگل خانے بھجوائے گئے۔ کیونکہ اب نارمل زندگی میں ان کا رویہ اور طرزِ عمل دوسروں کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ حد سے بڑھی ہوئی نازک مزاجی اور حساس فطرت شاید اس طرح اپنے حوصلے اور صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ آزماتی ہے۔ یا پھر وہ ''فقیروں کے بھیس'' میں ''تماشائے اہلِ کرم'' کا تجسس رکھتے ہیں۔ صورت کچھ بھی ہو۔ اب خارجی حالات کی چیرہ دستیاں انہیں ایک نارمل زندگی گزارنے کے ناقابل بنا رہی تھیں۔

بقول عصمت چغتائی

> ۔۔۔ پھر پتہ چلا۔ منٹو پر مقدمہ چلا۔ اور جیل ہو گئی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج نہ کیا۔۔۔ نہ جلسے ہوئے۔ نہ ریزولیشن پاس ہوئے۔ پھر معلوم ہوا۔ کہ دماغ چل نکلا۔ اور پاگل خانے میں یار دوست پہنچا آئے ہیں۔۔۔ ۔[۷۵]

ان ناقابل برداشت حالات و واقعات نے منٹو کو حقیقی معنوں میں دنیا اور دنیاداری سے بے نیاز و عاری کر دیا ۔ بقول ابوسعید قریشی

> مئی ۵۳ء میں کراچی سے پشاور آتے وقت میں اس سے ملنے گیا۔ تو لحظہ بھر کے لئے مجھے بھی نہ پہچان سکا۔۔۔ اس کی آنکھوں سے پتہ چل رہا تھا۔ کہ وہ سویا نہیں ہے۔ میں ٹھٹھک گیا۔ اتنے میں اس کی بہن نے کہا۔ سعادت، سعید آیا ہے۔ اسکا چہرہ چمک اٹھا۔۔۔ میری نظریں گلاس پر گڑ گئیں۔ وہ سمجھ گیا۔ میں کیا سوچ رہا ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے یار، سب ٹھیک ہے۔ بکواس مت کر۔ اس کی پھٹی پھٹی گلابی آنکھیں گلہ کر رہی تھیں ۔ کہ تو بھی ناصح بن گیا۔ ۔[۷۶]

یہاں منٹو اپنی دنیا کے خود مالک و مختار تھے۔ اس اختیار کے سارے جواز ان کے اپنے پاس تھے۔ بلانوشی میں وہ خودغرض ہی نہیں۔ بلکہ بے رحم بن گئے تھے۔ انہیں کوئی دیکھے، کوئی روکے۔ یہ اختیار انہوں نے زندگی بھر نہ تو کسی کو دیا۔ اور نہ دینے پر آمادہ تھے۔ بقول احمد ندیم قاسمی

پھر ایک روز میں نے اسے وہیں پشاور میں بہت زیادہ شراب پینے سے روکا۔ تو وہ تنگ آ کر بولا۔ یہ میرا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ اور تم میرے دوست ضرور ہو۔ مگر میں نے تمہیں اپنے ضمیر کی مسجد کا امام مقرر نہیں کیا۔ ۔۷۷

احمد ندیم قاسمی اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں۔ ''تب میں نے بھی ہتھیار ڈال دیے تھے۔ شاید میں بزدل بن گیا تھا۔ اسکا آج بھی مجھے افسوس ہے۔'' ۷۸ ایسا نہیں ہے۔ کہ جب کوئی فنکار، ادیب ان مخصوص حالات و کیفیات میں ماحول سے، سماج سے کٹ رہا ہو۔ حتیٰ کہ اپنی زندگی ہی سے منہ موڑنا شروع کر دے۔ تو اس کے گرد و نواح اور دوست احباب کو اسکا احساس نہیں ہوتا۔ احساس ہوتا ہے۔ لیکن یہ احساس اتنا قوی، اتنا شدید نہیں ہوتا۔ جتنی اہمیت، جتنی شدت وقت کے ساتھ ساتھ اس میں آتی جاتی ہے۔ وقت کی نگاہ کئی پہلوؤں سے اسکا تجزیہ کرتی ہے۔ منٹو کا تخلیقی ذہن جتنی شدت اور جس سرعت کے ساتھ ضائع ہوا۔ انہی عوامل کے پیشِ نظر وہ دانستاً زندگی کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ گئے۔ وہ انسانی رویوں کے ساتھ ساتھ انسانی رشتوں سے بھی بے اعتبار ہو گئے تھے۔ ہاجرہ مسرور لکھتی ہیں۔

ان کی حالت بہت خراب تھی۔ بے حد زرد اور دبلے ہو رہے تھے۔ صفیہ کے قریب بیٹھے بیٹھے مجھے ادیب منٹو کی بجائے صرف صفیہ کے شوہر سعادت حسن کا خیال آنے لگا۔ صفیہ ان کی صحت کے بارے میں سخت فکر مند تھیں۔ اور بڑی مایوس تھیں۔ ۔۷۹

ان حالات میں ایک فنکار کو داخل اور خارج کے نامساعد حالات تیزی کے ساتھ منتشر کرتے جاتے ہیں۔ وہ نہ تو صحت اور زندگی کو خاطر میں لاتا ہے۔ اور نہ اسے کسی کی اٹھی ہوئی انگلی کی فکر دامنگیر ہوتی ہے۔ یہاں ایک اختلافی نقطۂ نظر بھی سامنے آتا ہے۔ بعض کے خیال میں منٹو کی بلانوشی سے بظاہر گھریلو حالات جس طرح کربناک ہو رہے تھے۔ اہل خانہ کا رویہ بھی تلخ و ترش ہو گیا۔ کیونکہ منٹو اب بے باکی کی حد تک خود کو ختم کرنے کے درپہ تھے۔

بقول جی ایم اثر

اصل بات تو گھریلو زندگی تھی۔۔۔ گھر میں کوئی خوشی کا سامان نہیں تھا۔۔۔ بادہ کشی ہی ایک وجہ نہیں ہو سکتی۔ جو کش مکش وہ محسوس کرتے تھے۔ جو زندگی ان کی تھی۔ اور جس درجے کے وہ فنکار تھے۔ میرا خیال ہے یہ جرعۂ تلخ ان کے لئے ایک پناہ تھی۔ ۔۸۰

یہ رائے اپنی جگہ بجا گھریلو زندگی میں مختلف رشتوں کا یہ رویہ کسی حد تک درست بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہ بات بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ کہ ان نارمل رویوں کے درمیان ایک Genius رہ رہا تھا۔ جو اپنی بات میں، اپنی سوچ، اپنے رویے میں نارمل نہ تھا۔ یہیں سے متصادم ماحول کی گرہ پڑتی ہے۔ بیوی کا رشتہ تمام رشتوں میں زیادہ نازک، زیادہ حساس، زیادہ قریب اور زیادہ متاثر ہونے والا ہوتا ہے۔ بقول جی ایم اثر ''ان کا جو رشتہ ازدواج تھا۔ تکلیف دہ تھا۔۔۔ گھر پر جھگڑا ہوتا تھا۔ کہ میری زندگی کے اس عذاب کو آپ دور نہیں کرنا چاہتے۔ یہ ان کی اہلیہ فرماتی ہیں۔۔۔'' ۔۸۱ منٹو کی صداقت، صاف گوئی اور راست بازی کا شدت پسند اور انتہا پسند طریقہ کار گھر کی پرسکون فضا کو اتھل پتھل کر رہا تھا۔ ممکن ہے کہ ان حالات میں وقتی اور اضطرابی طور پر منٹو کو ایسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ جی ایم اثر کا اس ضمن میں کہنا ہے ''اتنے میں ایک بزرگ خاتون کی آواز سنائی دی۔ جو غالباً ان کی ساس تھیں۔ بہت غصے میں کہہ رہی تھیں۔ یہ زندہ کیوں ہے۔ مر کیوں نہیں جاتا؟ منٹو نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔'' ۔۸۲

بقول ڈاکٹر وحید قریشی

> منٹو کو ساری عمر ان کے خاندان نے Own نہیں کیا۔ شاید اسلئے بھی یہ کہا جاتا ہے کہ منٹو کی والدہ ایک طوائف تھی۔ اگر چہ اس بات کو منٹو کا خاندان نہیں مانتا۔ لیکن اس کے علاوہ یہ بات درست ہے۔ کہ منٹو نے اپنی ذات کے ردّ کیے جانے کی شدید اذیت اٹھائی۔ ۸۳۔

یہاں اس صورتِ حال کو بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ نارمل انسان دنیا کی باتوں اور ان کی اٹھتی ہوئی انگلیوں کا شدید سامنا نہیں کر پاتا۔ جبکہ جینئس کے لئے یہ کچھ بے معنی ہو جاتا ہے۔ بس ٹوٹ پھوٹ کا عمل یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ منٹو کی بیٹی مسز نصرت جلال جو اگر چہ اسوقت کمسن تھیں۔ لیکن انہوں نے محسوساتی سطح پر کچھ ایسی ہی یادوں کو دہرایا "گھر میں ایک عجیب طرح کی چپ اور اداسی پیدا ہو گئی تھی۔" ۸۴۔ یہ انسانوں کے نارمل رویے ہیں۔ جبکہ حقیقت میں منٹو اپنے اہل خانہ سے بہت قریب، ان کے غمگسار اور رشتے نبھانے والے شخص تھے۔ ان رشتوں سے انہیں محبت مل رہی تھی۔ اور انہیں وہ محبت اور توجہ دے بھی رہے تھے۔ مسز ثریا اس ضمن میں کہتی ہیں۔

> سعادت بھائی انتہائی ہمدرد، بچوں کو پیار کرنے والے اور دوسروں کی ضرورتوں کا خیال رکھنے والے انسان تھے۔ گھر کے ہر فرد اور خصوصاً بیوی (صفیہ آپا) کے ساتھ گھر کے کاموں میں معاون اور تمام معاملات زندگی میں تعاون کرتے تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں تک کا خیال رکھتے۔ ۸۵۔

جبکہ احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں۔

> میں سمجھتا ہوں کہ منٹو کی جو بیگم تھیں۔ صفیہ۔ اگر صفیہ نہ ہوتیں۔ ان کی زندگی میں، تو منٹو پاکستان آنے کے تین چار مہینے بعد ختم ہو جاتا۔ یہ صفیہ تھیں۔ اور ان کی شخصیت تھی کہ انہوں نے منٹو کو سہارا دیے رکھا۔ ۸۶۔

یہ تمام صورتِ حال بتاتی ہے۔ کہ حساس ادیب جب خود کو ختم کرنے کے درپہ ہوتا ہے۔ تو اس کے پیچھے کئی خانگی اور سماجی محرکات ہوتے ہیں۔ اور پھر ایک ضرب کاری ان محرکات میں سے کسی ایک کے حصے میں آتی ہے۔ لیکن جب درد حد سے بڑھ جائے۔ تو ہر محرک ضرب کاری بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو ان مسلسل تکلیف دہ عوامل اور اذیت ناک مشکلات سے اب اس حد پر پہنچ گئے تھے۔ جہاں ہر ضرب، ضرب کاری بن رہی تھی۔ داخلی زندگی کی نا آسودگیاں، اذیت ناک خارجی ماحول اب نا قابل برداشت تھا۔ بحثیت ادیب وہ ادب کی عدالت میں مقدمے بھگت رہا تھا۔ ہار کیا ہوتی ہے۔ اور جیت کسے کہتے ہیں وہ ادیب ان کیفیات ومحسوسات سے آزاد ہو گیا تھا۔

اس حوالے سے غلام عباس لکھتے ہیں۔

> وہ مقدمہ بازی ہی نہیں ادب سے بھی بلکہ زندگی سے بھی اکتا گیا تھا۔ وہ گھریلو بندھنوں، سماج کے رکھ رکھاؤ اور عام دنیوی علائق سے بیگانہ سا ہو گیا تھا۔ گراوٹ کا یہ وہ درجہ ہے کہ کمزور انسان خودکشی کر لیا کرتے ہیں۔ مگر منٹو کا رہا سہا دم خم آڑے آ گیا۔ اس نے خودکشی نہیں کی۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اپنے آپکو ایک ایسے راستے پر

راگ رُت، خواہشِ مرگ اور تنہا پھول
ڈالدیا۔ جو انجام کار خودکشی ہی کا مترادف بنا۔ ۸۷ـ
منٹو کی موت خودکشی ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس میں کئی حوالے، کئی پہلو جواز فراہم کرتے ہیں۔ وہ اپنی صحت، سلامتی اور زندگی سب کے درپے تھے۔ بقول احمد راہی ''منٹو کی موت کو آپ خودکشی ہی کہیں گے، کیونکہ وہ تو خود اسی راہ پر چل رہے تھے۔ جو قبر کی طرف جاتی ہے۔'' ۸۸ـ
اس ضمن میں اثر صاحب لکھتے ہیں ''۔۔۔ اور یہ کہ وہ اپنے آپکو ختم کر رہے تھے۔'' ۸۹ـ یہ طریقہ کار خود اپنے آپ کو ختم کرنا تھا۔ سماج کے سنگین رویوں کو ختم کرنا تھا۔ یا اپنی زندگی کے خاتمے سے سماج کو انتقام کی سولی پر لٹکانا تھا۔ غلام عباس لکھتے ہیں۔

۔۔۔ جو عمر بھر بہت بلندی پر تار پر چلنے کا خوف ناک کھیل دکھاتے دکھاتے تھک چکا ہو۔ اور ہر لمحے اس کے گر پڑنے کا اندیشہ ہو۔۔۔ سب جانتے تھے۔ کہ وہ قضا سے کھیل رہا ہے۔ اور یہ کھیل عنقریب ختم ہوا چاہتا ہے۔۔۔ وہ اس کھیل سے اکتا گیا تھا۔ اور چاہتا تھا۔ کہ جلد سے جلد اس سے مخلصی پا جائے۔۔۔ ۹۰ـ

منٹو فیملی سے ملاقات کے دوران جب اس موضوع پر بات ہوئی۔ کہ کیا وہ منٹو کی موت کو خودکشی کہیں گے۔؟ جواباً اہل خانہ کے چہروں پر فرداً فرداً اطمینان، تذبذب اور بے اطمینانی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ اقرار اور انکار کے ساتھ سوالیہ نگاہیں تھیں۔
مسز جلال کے بقول

نہیں۔ خودکشی ان معنوں میں نہیں۔ کہ وہ زندگی سے بیزار تھے۔ یا زندگی سے متعلق منفی نقطہ نظر رکھتے تھے۔ ایسا بالکل نہ تھا۔ خوش طبع، خوش گفتار اور زندگی سے بھرپور تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جوں جوں انسانی رویوں کے قول و فعل کے تضاد، سماج کی منافقت اور سوسائٹی کے نام نہاد شرفاء کا پول کھلتا چلا گیا۔ وہ تلخ ہوتے گئے۔ اور اکثر ان حوالوں سے بہت نکتہ چین جوشیلے اور کبھی انتہائی بیزار ہو جاتے تھے۔ کہ ایسا کیوں ہے۔ کسی کا دکھ، تکلیف دیکھنا، ان کے بس سے باہر تھا۔ اور پھر وہ وقت بھی دیکھا۔ کہ سعادت بھائی خاموش مگر اندر ہی اندر گھلنے لگے۔ اور پینے کی شدت میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ جتنا منع کیا جاتا۔ اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ پیتے۔ جیسے وہ کسی انتقام پر اتر آئے ہوں۔ اپنی صحت اور زندگی کے پیچھے جیسے وہ ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے۔ ۹۱ـ

اکثر ایک فنکار، حساس دل اور ادیب کی ٹوٹ پھوٹ درحقیقت انہی حوالوں اور انہی سطور پر ہوتی ہے۔ منٹو کا رویہ اس ضمن میں بغاوت کا تھا۔ احتجاج کا تھا۔ جلنے اور کڑھنے کا تھا۔ رفتہ رفتہ نامساعد حالات اور خارجی ماحول کی عدمِ مطابقت نے انہیں بظاہر خاموش لیکن اندر سے وہ انتقامی سطح عطا کردی۔ کہ انتقام کی بھینٹ پھر اپنی ذات ہی ٹھہری۔ اپنی ذات کو نقصان پہنچانا، اس سے بے نیاز ہو جانا۔ اسے زیادہ سے زیادہ تکلیف اور اذیت سے دوچار رکھنا ان کا مطمع نظر بن گیا تھا۔ شراب انہیں قتل کر رہی ہے۔ وہ جانتے تھے۔ وہ جلد ختم ہو جائے گا۔ انہیں بخوبی علم تھا۔ یہ

احتجاج اور اذیت کو محسوس کرنے کی انتہا تھی۔ اس طرح وہ خود کو اذیت نہیں دے رہے تھے۔ بلکہ اس سماج اور سماج کے منفی رویوں کو قتل کر رہے تھے۔ اور پھر سماج جس طرح انہیں نفرت اور تنقید کا نشانہ بنا رہا تھا۔ وہ اسی راستے اور اسی کیفیت کو قطرہ قطرہ بسر کر رہے تھے۔ جب سماج کی چال ان کے مخالف تھی۔ تو پھر انہوں نے بھی دانستہ اس کے مخالف چال چلی اور چلتے چلے گئے۔ اور ایسا اس لیے تھا کہ وہ ریاکار نہ تھے۔ یہ ان کے اندر کی ناراضگی تھی۔ غصہ تھا۔ جو انہیں سنبھلنے نہ دے رہا تھا بقول حامد جلال ''معلوم نہیں وہ اپنے آپ سے ناراض تھے۔ یا شراب سے۔ جوان کی قبل از وقت موت کی ذمہ دار تھی۔ ''۹۲۔

منٹو کا مخصوص مزاج، ان کی مخصوص عادات اور خاص طور پر ان کے آخری ایام کی جو کیفیت اور صورتِ حال تھی۔ جو بالآخر ان کی موت پر منتج ہوئی۔ کوئی دوسرا اس کی وضاحت اور تجزیہ نہیں کر سکتا۔ حامد جلال کے مطابق منٹو ماموں کی آخری دنوں میں دو خواہشیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ان کے ساتھ سٹیڈیم میں کرکٹ میچ دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ اور دوسری خواہش جو شدید ترین تھی۔ وہ اخبار کی ایک خبر پر افسانہ لکھنے کی تمنا تھی۔ جس میں گجرات کی ایک بے یار و مددگار عورت کی موت کا ذکر تھا۔ جو سڑک کے کنارے برہنہ حالت میں پائی گئی تھی۔ اخباری اطلاع کے مطابق اس عورت اور اس کی ننھی منی بچی کو بس کے اڈے سے اغواء کر کے نصف درجن کے قریب ہوس پرستوں نے تذلیل کا نشانہ بنایا۔ کڑکڑاتی سردی، بغیر لباس دونوں ظالموں کے چنگل سے بچ کر بھاگیں اور بقول حامد جلال

> دونوں ماں بیٹی نے منجمند کر دینے والی سردی میں دم توڑ دیا۔ اس المیہ سے منٹو ماموں بے حد متاثر تھے۔ اسی روز گجرات سے شام کچھ لوگ ان کے پاس آئے تھے۔ اور انہوں نے حادثہ کی مزید تفصیلات بتائی تھیں۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اس کے بعد منٹو ماموں نے معمول سے زیادہ شراب پی لی ہوگی۔ جو ان کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ ۹۳۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ واقعہ منٹو کی موت سے ایک روز پہلے کا ہے۔ اس واقعہ کی صداقت اور منٹو کے حوالے سے اس کی اہمیت کا واضح ذکر فتح محمد ملک نے بھی کیا۔

> اس واقعہ کی منٹو نے شدید تکلیف محسوس کی۔ ان کے اندر انسانی ہمدردی کا جو پہلو تھا۔ اسے شدید گھاؤ لگتا ہے۔ کہ وہ اس واقعہ کو انتہائی مؤثر اور وسیع پیمانے پر ملکی سطح پر لانا چاہتے تھے۔ بلکہ میں کہوں گا کہ منٹو کے اس آخری یوم میں یہ واقعہ ان کے لئے انتہائی شدید نوعیت کا تھا۔ ۹۴۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ادیب جو تمام زندگی اسی پلیٹ فارم پر اسی طبقے کے حقوق اور ان کی ہمدردی کی جنگ لڑتا رہا۔ انہی کے صدمے نے بالآخر اس کی زندگی کی بساط الٹ کر رکھ دی۔ اور جہاں جہاں سماج اس تصادم میں آڑے آیا۔ وہ خود فراموشی میں سمٹنے لگے۔ یہ خود فراموشی ان کی صحت اور زندگی کے لئے کیا پیغام لا رہی تھی۔ وہ اس سے بے نیاز تھے۔ بلکہ بے خوف ہو چکے تھے۔ اس خود فراموشی سے انہیں کم از کم وہ وقتی سکون ضرور مل جاتا تھا۔ جسے برداشت کرنے میں ان کے اعصاب شل ہو رہے تھے۔ یوں رفتہ رفتہ حصول مقصد کی جنگ، شراب نوشی کی کثرت، اور سماج اور تخلیق کار میں عدم مفاہمت ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔ اس طرح سے کہ ان تینوں عوامل نے بظاہر اس بے وقت موت کی ذمہ داری غیر

محسوساتی طور پر تھوڑی تھوڑی بانٹ لی۔

موت کے روز منٹو کی گھر دیر سے واپسی ہوئی۔ خون کی قے ہوئی۔ حامد جلال کا چھ سالہ بیٹا جو وہاں موجود تھا۔ منٹو نے یہ کہہ کر اسے تسلی کرائی۔ کہ یہ پان کی پیک ہے۔ اور خاموش رہنے کو کہا۔ یہ گھر والوں سے پردہ داری تھی۔ کیونکہ اب ہر فرد شراب چھوڑنے کو کہہ رہا تھا۔ لیکن رات کے پچھلے پہر مزید قے اور درد کی شدت نے گھر میں افراتفری پھیلا دی۔ سب کا رونا دھونا دیکھ کر منٹو نے انہیں خاموش رہنے کو کہا۔ کسی کے گمان میں بھی نہ تھا۔ اور نہ خود منٹو کو یقین تھا۔ کہ یہ ان کا دم آخر ہے۔ ڈاکٹر کے انجکشن لگانے پر بھی حالت نہ سنبھلی۔ نبض ڈوبتی چلی گئی۔ مسلسل خون کی قے سے خون بہت ضائع ہو گیا۔ ڈاکٹر کی ہسپتال لے جانے کی ہدایت پر بھی منٹو ہسپتال جانے پر راضی نہ تھے۔ منہ رضائی میں ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ وہ صورت تھی۔ کہ ایک حساس ادیب کب کا اس معاشرے کو ٹھکرا چکا تھا۔ جس نے اس کی تخلیقی سطح کے لیے زندہ رہنے کے تمام دروازے بند کر دیئے تھے۔ اب وہ اسی معاشرے کو ٹھکرانے کا عملی اظہار کر رہا تھا۔ بقول حامد جلالی

> منٹو کا یہ اصلی روپ تھا۔ جس شخص کی زندگی کا کوئی گوشہ آج تک دنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہا تھا۔ وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔ کہ لوگ اسے مرتا ہوا دیکھیں۔ منٹو ماموں مجسم غیظ و غضب بنے ہوئے تھے۔۔۔ ۔۹۵

یہ غیظ و غضب کسی فرد واحد کے لئے نہ تھا۔ بلکہ تمام منفی سماجی رویوں کے لئے تھا۔ انسانی دکھوں کیلئے تھا۔ ایک تخلیق کار کی ناقدری کیلئے تھا۔ سچ کی سزا بھگتنے کے لئے تھا۔ حساس دل کی قدم قدم پر مجروح ہوتی ہوئی انا کے لیے تھا۔ اس ادیب کی بے وقت اور شعوری موت کے لئے تھا۔ جس کی جانب سے سب بے نیاز رہے۔ وہ اب بھی الکوحل مانگ رہا تھا۔ سب سے چھپنے کے لئے، سب کی نگاہوں سے بچنے کیلئے ایک لمحاتی سکون کی خاطر، وہ سکون جو عارضی طور پر اس کے لئے پناہ گاہ بن جاتا تھا۔ اس ذہر کی تلچھٹ کا ذرہ ذرہ قطرہ قطرہ اپنے اندر اتارنے کے لئے، جس نے حیات کی تلخیوں میں اسے موت کی تلاش کا راستہ دکھایا تھا۔ وہ راستہ وہ سفر اب دم آخر پر تھا۔ تو وہ بھلا اس کی رفاقت کیسے ترک کر سکتا تھا۔ ''مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے۔ اتنی سردی شاید قبر میں بھی نہیں لگے گی۔۔۔ میرے کوٹ کی جیب میں ساڑھے تین روپے پڑے ہیں۔ ان میں کچھ اور پیسے ملا کر تھوڑی سی وہسکی منگا دو۔''۔۹۶

یہ درحقیقت وہسکی کی طلب نہ تھی۔ اس موت کی طلب تھی جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھے اپنی موت کے تابوت پر آخری کیل ٹھوکنے کی آرزو تھی۔ جو محض چند قدم کے فاصلے پر ان کی منتظر تھی۔ وہ یہ چند قدم جلد از جلد چلنا چاہتے تھے۔ لمحہ بھر کی تاخیر بھی انہیں اب گوارا نہ تھی۔ وہ شراب کی طلب میں اب بھی نڈر تھے بے خوف تھے۔ اس سماج کی دہلیز پر بیٹھ کر مانگ رہے تھے۔ پی رہے تھے۔ جس کی ریاکاری نے انہیں جینے نہ دیا۔ جسے معاشرہ چھپاتا ہے جسکا پردہ پوش بنتا ہے جس سے بظاہر نفرت مگر حقیقت میں اسکا کاروبار کرتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ ڈنکے کی چوٹ پر کرتے رہے تھے۔ وہی کچھ اب بھی کر رہے تھے۔

> درد اور شدید تشنجی دورے کے باعث وہ کانپ اٹھے۔ منٹو ماموں کی آنکھوں مین اسوقت بھی اپنے لیے رحم کا کوئی شائبہ موجود نہ تھا۔ انہیں معلوم تھا۔ کہ ان کا وقت آ پہنچا ہے۔ لیکن ایک بار بھی اور ایک لمحے کے لئے بھی انہوں نے اپنے اوپر جذباتیت طاری نہیں ہونے دی۔ انہوں نے اپنے بچوں یا کسی اور کو اپنے پاس نہیں بلایا وہ نگاہ

واپس یا وصیت کے کبھی قائل نہ تھے۔ ان جیسی شخصیتوں کے لئے زندگی اور موت کے درمیان حدِ فاصل بہت ہی مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے۔ اور یہی ہونا بھی چاہیے۔ کیونکہ ان کی زندگی اور روح تو پہلے ہی ان کے جسم سے ان کی کتابوں میں منتقل ہو چکی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچ کر انہیں غیر فانی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔۔۔ ۔۹۷

یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے۔ جو ایک مخلص فنکار اور ادیب کی زندگی میں آتا ہے۔ اس کی تخلیقی سطح محض شہرت، ناموری اور دولت کے حصول کی خاطر متحرک نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ صرف انسانی قدروں کی بقاء کے لئے جیتا ہے۔ انہی کی خاطر ماحول سے متصادم رہتا ہے۔ اس تصادم میں یا تو ماحول کو مغلوب کر لیتا ہے۔ یا اس کے سامنے ہتھیار نہ ڈالتے ہوئے اپنی انا اور اصولوں کی صلیب پر مصلوب ہو جاتا ہے۔ موت ان کے لئے نہ تو ظاہری زندگی کا اختتام ہوتی ہے۔ اور نہ کوئی خوفزدہ کرنے والی شے۔ بلکہ یہاں موت ان کے لئے ریاکاری سے پاک ایک دنیا، ایک حیات ابدی اور ایک جائے سکون کی متبادل بن جاتی ہے۔ اسی لیے وہ اتنی سرعت کے ساتھ اس کی جانب گامزن رہتے ہیں۔ منٹو کی شراب طلبی کا یہاں یہی پس منظر اور حوالہ دکھائی دیتا ہے۔ بقول حامد جلال

بسترِ مرگ پر منٹو ماموں نے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہ مانگی۔ انہیں بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا۔ کہ شراب ان کی جانی دشمن ہے۔ اور وہ اسے موت کا ہم معنی سمجھنے لگے تھے۔ ۔۔انہیں شکست سے سخت نفرت تھی۔ خواہ وہ موت کے ہاتھوں ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ موت سے تنہائی میں آنکھیں چار کرنا چاہتے تھے۔ جہاں کوئی انہیں مرتا نہ دیکھ سکے۔۔۔ ۔۹۸

منٹو نے تمام زندگی جس ریاکاری کے خلاف جنگ کی۔ اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کی زیست کے یہ آخری لمحے اب گواہ بن جاتے ہیں۔ کہ منٹو ریاکار نہ تھا۔ وہ تن اور من کا اجلا انسان تھا۔ ریاکاری سے ماحول، معاشرہ اور تمام سماجی پس منظر جس گھٹن کا شکار ہو جاتا ہے۔ منٹو نے اسی گھٹن سے بغاوت کی۔ وہ محض سچ کے مبلغ نہ تھے۔ اور نہ کوئی اخلاقی گراوٹ ان کی بادہ نوشی کا سبب تھی۔ لیکن وہ فریب اور جھوٹ کا بھی اصل چہرہ دیکھنا چاہتے تھے۔ ''اسکا ظاہر باطن ایک تھا۔ وہ بڑا صاف شفاف آدمی تھا۔ اس اجلی چاندنی کی طرح جو کمرے کی مشرقی کھڑکیوں کے پاس بچھی رہتی تھی۔'' ۔۹۹

یہیں پر ایک حساس اور مخلص ادیب کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ اپنی انتہا کو پہنچتی ہے۔ وہ سچ اور جھوٹ کے حصے بخرے کر دیتا ہے۔ سچ کو تمام آلودگیوں سے نکال باہر لاتا ہے۔ لیکن اس کی قیمت اسے اپنی زندگی کے عوض چکانا ہوتی ہے۔ ''۔۔۔ان کی موت کے وقت صرف ایک پہلو ڈرامائی تھا۔ یعنی شراب طلب کرنے کا منظر۔۔۔ انہوں نے بوتل کو بڑی عجیب اور آسودہ نگاہوں سے دیکھا۔'' ۔۱۰۰

یہ آسودگی، آسودگی کے معنوں میں نہ تھی۔ مزید اذیت ناکی کے حصول کی طرف پیش قدمی تھی۔ اب وہ اس چراغ کی مانند تھے۔ جس نے خود کو تیز ہواؤں کے دوش پر رکھ دیا تھا۔ اور اس کے بجھنے کا نہ تو کوئی ملال تھا۔ اور نہ شکوہ شکایت۔ وہ اپنی ہر ہر چنگاری کو خود جلا جلا کر بھسم کر بیٹھے تھے۔ رہی سہی راکھ کو کرید کرید کر دیکھ رہے تھے۔ کہ کہیں بھولے سے کوئی چنگاری اس میں پوشیدہ نہ رہ گئی ہو۔

علاؤالدین کلیم (۱۹۲۰۔۱۹۶۵)

علاؤالدین کلیم اردو کے ممتاز شاعر اور گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔علاؤالدین ان کا نام اور کلیم تخلص کرتے تھے۔علاؤالدین ۱۹۲۰ء میں امرتسر میں ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔۱۹۳۶ء میں میٹرک کر کے امرتسر کالج سے مزید تعلیم حاصل کی۔جبکہ انگریزی میں ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۴۳ء میں کیا۔

قیام پاکستان کے بعد انہوں نے محکمہ بحالیات میں ملازمت اختیار کی۔ملازمت کے دوران کچھ عرصہ اندرونِ سندھ میں گزارا۔علاؤالدین کلیم ریڈیو پاکستان سے بھی وابستہ رہے۔کچھ عرصہ محکمہ تعلیم کی ملازمت میں رہے۔۱۹۵۳ء میں ایمرسن کالج ملتان میں بحیثیت لیکچرار ان کی تعیناتی ہوئی۔اسی ضمن میں پھر لاہور تبادلہ ہوا۔پہلے گورنمنٹ کالج گلبرگ اور پھر ۶ جون ۱۹۵۹ء کو گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبۂ انگریزی سے وابستہ ہوئے۔

علاؤالدین کلیم ۲۶ اپریل ۱۹۶۵ء کو اپنے گھر جو گارڈن ٹاؤن لاہور میں واقع تھا۔مردہ پائے گئے۔یا دوسرے معنوں میں یہ کہ انہوں نے وفات پائی۔علاؤالدین کلیم کی موت کے بارے میں ڈاکٹر زکریا لکھتے ہیں۔

> وہ ۲۶ اپریل ۱۹۶۵ء کی ایک دوپہر تھی۔ میں انارکلی سے گزر رہا تھا۔ اتنے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک پروفیسر پاس سے گزرتے ہوئے رکے اور مجھ سے یوں مخاطب ہوئے۔ ''تمہیں معلوم ہو گیا ہے۔؟'' میں اچانک سنجیدہ ہو گیا۔۔۔علاؤالدین کلیم کا انتقال ہو گیا ہے۔۔۔کثرت شراب نوشی سے جگر پھٹ گیا۔۔۔[۱۰۱]

علاؤالدین کلیم کی وجہ مرگ بظاہر کثرت مے نوشی دکھائی دیتی ہے۔کثرت مے نوشی نے اکثر ادیبوں کی زندگی کا قلع قمع کر دیا۔یوں تو شراب نوشی کم و بیش ہر تخلیق کار کی زندگی میں دخیل رہی ہے۔لیکن اسکا بکثرت استعمال ادیبوں کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔اور کلیم کے ضمن میں یہ صورتِ حال اس لیے افسوسناک اور تکلیف دہ ہے کہ انہوں نے دل گرفتگی اور تنہائی کے جان لیوا عذاب کو جھیلتے ہوئے تن تنہا شراب نوشی کے سہارے خود کو مار ڈالا۔یوں لگتا ہے۔کہ علاؤالدین کلیم کے پاس سوائے ناامیدی کوئی اور چارہ نہ تھا۔لہذا خود کو کمرے میں قید کر کے شراب نوشی کے ہاتھوں اپنا حوصلہ آزمانے لگے۔اس ضمن میں جب راقمہ نے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا سے گفتگو کی۔تو انہوں نے کہا۔''کلیم کمرے میں بند ہو کر تین چار روز مسلسل شراب پیتے رہے۔اور جگر پھٹ گیا۔۔۔''[۱۰۲] یہ ایک ادیب کا زندگی کے ہاتھوں انتہائی پشیمانی اور سماج کو ٹھکرا دینے کا رویہ نظر آتا ہے۔جو زندگی جیسی انمول شے کو ہار گیا۔اسکا احساس خود کلیم کو بھی تھا۔

زندگی اس قدر گرا نما یا
اور یوں رائیگاں چلی جائے

فنکار اور سماج جب باہم متصادم ہوتے ہیں۔ تو نقصان صرف تخلیق کار کا ہوتا ہے۔ کلیم بھی بالآخر اس عظیم نقصان سے ہمکنار ہوئے۔ کہ خود اپنی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ لیکن اس اقدام خودکشی کے پیچھے کلیم کی ناہموار زندگی کا ایک تسلسل نظر آتا ہے۔ ان کی خاموشی، لوگوں سے راہ ورسم کم کم رکھنا، محفلوں سے اکثر دور رہنا۔ یہ تمام صورتِ حال اس حقیقت کی غماز ہے۔ کہ کلیم جو اپنی زندگی میں تنہا تھے۔ محض ظاہر داری کی خاطر بھی دوستوں کے خواہشمند نہ تھے۔ ماسوائے ان لوگوں کے جو کلیم کے مزاج شناس تھے۔

بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ''ناواقف لوگوں کے سامنے عموماً خاموش رہتے تھے۔ مگر احباب کی محفلوں میں بعض اوقات کھل کر گفتگو کرتے تھے''۔۱۰۳ لیکن یوں لگتا ہے کہ کبھی کبھار اپنے ہم مزاج دوستوں کی محفل بھی کلیم کے لیے محض وقت گزاری کا ایک بہانہ تھی۔ ورنہ کلیم کو سمجھنے والا، ان کے اندر کی تنہائی کا اصل ساتھی شاید ان میں سے کوئی بھی نہ تھا۔

کہیں کم نصیبی نے پیچھا نہ چھوڑا
کئی بھیس بدلے کئی روپ دھارے

جن ادیبوں نے خود کو شراب نوشی کے ہاتھوں دانستہ ختم کیا۔ وہاں شراب نوشی نسبتاً اپنی وجوہ کیلئے دیگر کئی مسائل اور زندگی کی پیچیدگیوں کی غماز ہوتی ہے۔ کلیم بھی انہی پیچیدگیوں سے گزر رہے تھے۔ وہ لوگوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے۔ ان کے قریب آنے پر بھی خود کو ان سے دور کر لیتے۔ ویسے بھی وہ بہت خشک مزاج لگتے تھے۔ پروفیسر مرزا منور نے ایک مرتبہ ان کے گھر کا پتہ پوچھا۔ تو بقول ڈاکٹر زکریا ''کلیم نے انتہائی خشک لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ آیئے۔ مگر خیال رہے کہ میں پانچ بجے گھر پہنچتا ہوں۔ اور چھ بجے کے بعد کسی سے نہیں ملتا۔''۔۱۰۴

کلیم کی فطرت کا یہ پہلو گو بظاہر مردم بیزاری کی ایک صورت دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس مردم بیزاری کے پیچھے کلیم کی نا آسودہ زندگی کی جھلکیاں پوری طرح عیاں ہیں۔ وہ اپنی تنہا زندگی میں بالکل اکیلے ہو چکے تھے۔ رفتہ رفتہ اس اکیلے پن نے اس بات کی گنجائش کو ہی ختم کر دیا۔ کہ دوسروں کے ساتھ مل بیٹھنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اور گفت وشنید کی انسانی زندگی میں کیا اہمیت ہوتی ہے۔

بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ''روزمرہ زندگی میں بھی وہ کم ہی بات کرتے۔ اور وہ بھی کسی کسی کے ساتھ ایک دو جملے بولتے۔ لیکن بہت سوچ سمجھ کر۔''۔۱۰۵

کلیم دشت میں تنہا بھٹکتا پھرتا ہے
یہ بد نصیب کسی قافلے سے جا نہ ملا

کلیم کی شاعری تنہائی کے زہر سے بھری پڑی ہے۔ ایک ایسا انسان جو زندگی میں اپنی خواہشوں کی تکمیل تو کجا، ان کی تسکین کیلئے ترستا رہا۔

میرے صحرائے تمنا میں کوئی شاخ نہ پھول
میرے ویرانہ حسرت میں کہیں باغ نہ بن

کلیم نے جس طرح کی زندگی گزاری۔ اور جس کش مکش حیات سے گزاری۔ اسے انہوں نے پاؤں کی بیڑی

سے تعبیر کیا ہے۔

بے بسی سے پاؤں کی بیڑی کٹے گی کس طرح
کش مکش کرتے رہو اس کے سوا چارہ نہیں

وہ اپنی خلوت کے خود ساتھی تھے۔ کوئی ہمدرد، ساتھی، مونس گار۔ یہ تمام خانے ان کی زندگی میں خالی تھے۔

میری خلوت میں نہ ہمدرد نہ کوئی ہمراز
باغ کا لالہ یکتا ہے مرا سوز و گداز

اپنی ناآسودہ اور پریشان حال زندگی پر کلیم جب نظر ڈالتے ہیں۔ تو انہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تقدیر نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر رکھ دیئے تھے۔ کوئی لمحۂ سکون اور گوشۂ عافیت انہیں میسر نہ تھا۔ وہ اپنے وجود کو جبر کے شکنجے میں پھنسا پاتے ہیں۔

نارسائی پر وہی صیاد ہنستا ہے کلیم
جس نے اپنے ہاتھ سے باندھے ہیں میرے بال و پر

کلیم کی زندگی کا یہ حوالہ ایک نفسیاتی پہلو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ یعنی ایک نارمل انسان اپنے خیالات و محسوسات اور تبادلۂ خیالات کیلئے دوسرے انسانوں کی موجودگی کا طلبگار رہتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہوا۔ تو اس صورت میں وہ شخص اپنی ذات میں سمٹنے لگتا ہے۔ کلیم کا بھی اس حوالے سے مکالمہ اپنی ذات سے ہی تھا۔

سدا خاموش رہنا درد سہنا
کسی سے کچھ نہ سننا کچھ نہ کہنا
بلا سے ڈوب جائیں تیر جائیں
ہمیں دریا میں اپنی موج بہنا

ایسی صورتِ حال میں اگر کلیم انسانوں سے بیزار نہ ہوتے۔ تو کیا کرتے۔ یہی عوامل کلیم کی اس بے سکون زندگی کے عکاس بنتے ہیں۔ جو بالآخر کلیم کی خودکشی پر منتج ہوئے۔

بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا "اکثر جگہ کلیم اپنی شاعری میں ایک تنہا مردم بیزار اور بے سکون شخص نظر آتے ہیں"۔ ۱۰۶

اسی دھن میں ہزاروں ساز ٹوٹے
کوئی آسان ہے دل کی بات کہنا

کلیم کی ذات اور ان کی شاعری میں زندگی سے بیزاری کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ بلکہ اکثر تو یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ تنہائی کے لحات میں بھی زندگی کا کرب انہیں گھیرے ہوئے ہے۔ یہ ایک حساس اور دردمند ادیب کی زندگی کا نوحہ ہے۔

گوشۂ عافیت کے متوالو
زندگی سے کہیں نجات نہیں

کلیم کی شاعری میں خارج سے داخل میں اترنے کی جو صورتِ حال ہے۔ انسانوں سے خوف کھا کر ان سے دور

بیٹھنے کا جو پہلو ہے۔ یہ دراصل اس کیفیت کی ابتداء ہے۔ جس کی انتہا پر ادیبوں نے اکثر خودکشیاں کیں۔

ہمیں جنون ہے نہ وحشت کہ دور بیٹھے ہیں سب سے
یہ شوق گوشۂ خلوت برائے خود نگری ہے

اس طرح کلیم کے یہاں رفتہ رفتہ حیات و کائنات سے ہی بیزاری کی صورت پیدا ہونے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنے وجود کی حقیقت کو ماننے ہی سے منکر ہو جانا۔

کنج مسجد نہ سہی گوشۂ مے خانہ سہی
ہم کہیں اپنی حقیقت سے اماں چاہتے ہیں

زندگی سے بیزاری کی یہ کیفیت رفتہ رفتہ کلیم کی خواہش مرگ کو تقویت دیتی چلی گئی۔ شراب نوشی کی طرف کلیم کی شدید رغبت اور زندگی سے بیزاری کی کیفیت کے بارے سے اگرچہ ایک رائے موجود ہے۔ جسکا تذکرہ ڈاکٹر زکریا نے بھی بڑی وضاحت کے ساتھ کیا۔ اس کے علاوہ کلیم کی شاعری سے اسکا حوالہ بہت واضح نظر آتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کلیم کے ساتھ ان کے احباب نے ایسا رویہ کیونکر اختیار کیا۔ کہ کلیم نارمل شخص کی طرح زندگی گزارنے سے محروم ہو گئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس محرومی میں کلیم کا اپنا کتنا حصہ ہے؟ اور انکے احباب کا کیا کردار رہا ہے؟ اگرچہ اس ضمن میں کوئی زیادہ تفصیل نہیں ملتی لیکن ڈاکٹر زکریا کی یہ رائے کسی حد تک کلیم کی شخصیت کا وہ رخ سامنے لاتی ہے۔ جس سے خود کلیم کے کردار میں ایسے عوامل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جس نے ایک طرف کلیم کو تنہا پسندی عطا کی۔ بلکہ تنہا پسندی کا عادی بنایا۔ تو دوسری طرف کلیم کا ایک غیر فطری زندگی گزارنے کا رویہ انہیں موت سے قریب تر کرتا چلا گیا۔

بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

مجھے کلیم پر کبھی رحم آتا تھا۔ اور کبھی غصہ۔ ان کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ بالکل تنہا تھے۔ نہ کوئی سچا دوست، نہ گھر گرہستی۔ ماں باپ سمیت کسی سے ان کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ رفقائے کار کو بھی وہ قریب نہ آنے دیتے تھے۔ نوجوانوں کو انہوں نے قریب لانے کی کوشش کی۔ ان کے پسندیدہ مسائل پر گفتگو کی۔ ناؤ نوش کیا۔ دو چار نوجوان قریب آئے۔ ان میں سے ہر ایک سے کہا۔ کہ میں صاحب جائیداد ہوں۔ اور تمہیں متبنیٰ بنانا چاہتا ہوں۔ لیکن خدا جانے کیا ہوتا تھا۔ یہ نوجوان بھی کچھ عرصہ بعد کلیم سے برگشتہ ہو جاتے تھے۔ ۱۰۷

ڈاکٹر زکریا کی اس رائے میں علاؤالدین کلیم سے متعلق چند نکات سامنے آتے ہیں۔ جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ مثلاً ۴۰ برس کی عمر کو پہنچنے تک وہ ایک گھر گرستی کی زندگی سے بے نیاز تھے۔ عزیزوں سے تعلقات کا ناخوشگوار ہونا ممکن ہے۔ کہ ایک عام سی بات ہو۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ والدین نے کلیم کو خود سے دور کیوں کر دیا تھا۔ ڈاکٹر زکریا کی اس رائے میں نمایاں طور پر نہ سہی۔ لیکن درپردہ بہت سی باتیں کلیم کے اپنے کردار کے ایسے منفی عوامل کو سامنے لاتی ہیں۔ جنہوں نے کلیم کو خود اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ جہاں ان کی ذات کیلئے ایسے مسائل اور پریشانیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ جو بالآخر ان کی خودکشی پر منتج ہوئیں۔ مثلاً والدین اور عزیز و اقارب سے کلیم کے تعلقات کا خراب ہونا۔ خیر خواہوں کو کلیم کا قریب نہ آنے دینا۔ نوجوانوں سے راہ و رسم بڑھانا۔ جو نہ تو کلیم کے ہم عمر تھے۔ اور نہ ڈاکٹر زکریا کی اس

معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان سے ملنے والے نوجوان کسی علمی یا ادبی حیثیت کے مالک تھے۔ بلکہ اکثر ان کے ساتھ پینے پلانے کا شغل رکھتے تھے۔ اور پھر ان نوجوانوں میں سے ہر ایک کو کہنا کہ میں صاحب جائیداد ہوں۔ اور تمہیں جائیداد کا وارث بناؤں گا۔ اور پھر اتنی عنایت کے باوجود وہ نوجوان کیوں برگشتہ ہو جاتے تھے۔ اس کے در پردہ کلیم کے عزائم کیا تھے۔ یہ سوال اپنی جگہ بے حد قابل غور ہے۔ جبکہ صاحب جائیداد ہونے کی صورت میں اور تمام عزیزوں اور والدین کی موجودگی میں کلیم اپنا گھر بسا سکتے تھے اور ایک نارمل شخص کی طرح کلیم کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ جو کہ انہوں نے نہیں کیا۔ اور اسی کرب ومستی کے عالم میں انہوں نے آخر کار گھر میں بند ہو کر خودکشی کی نیت سے کثرت مے نوشی کا سہارا لیا۔ اور اس لمحے تک وہ شراب پیتے رہے۔ جب تک ان کی زندگی کا چراغ گل نہیں ہو گیا۔ یہ تمام صورتِ حال واضح طور پر نشاندہی کرتی ہے۔ کہ کلیم کے ساتھ ان کے کچھ نفسیاتی مسائل بھی تھے۔ کچھ ایسی نفسیاتی پیچیدگیاں ان کے ہمراہ تھیں۔ جنہوں نے کلیم کو ایک غیر فطری زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ اور انہی کے باعث کلیم اپنے ہاتھوں ضائع ہو گئے۔ اس کے علاوہ پینا پلانا از خود کئی غیر فطری رویوں کو جنم دیتا ہے۔ چنانچہ ان تمام عوامل اور شواہد کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ کہ کلیم کی خودکشی کا محرک نفسیاتی وذہنی پیچیدگی، غیر فطری حیات، کثرت مے نوشی اور ان کے ایسے غیر اخلاقی رویے تھے۔ جنہوں نے بالآخر سوائے خودکشی کے ان کے سامنے کوئی راستہ نہ رہنے دیا۔ اکثر ادیبوں نے ایسی ہی صورتِ حال میں جب خودکشی کی۔ تو ان کی موت بظاہر پراسرار اور ایک معمہ لگی۔ جبکہ کلیم کے ضمن میں تو یہ بات آسانی کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ کہ نہ صرف موت بلکہ انکا طرز حیات بھی پراسرار رہا۔

کلیم کی شاعری میں سفر کا استعارہ اکثر جگہ استعمال ہوا ہے۔ یہ استعارہ بھی اس بات کا غماز ہے۔ کہ کلیم ایک چل چلاؤ کی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ یہ چل چلاؤ اور سفر کی حالت محض مادی زندگی تک محدود نہیں تھی۔ بلکہ اس دنیا سے پرے کا سفر انہیں درپیش تھا۔ سفر کی حالت کلیم کی شاعری میں بے پناہ ہے۔ یہ کیفیت اسی طرح ہے۔ کہ جیسے ایک فطری ذہانت کا حامل ادیب یا فنکار اس کائنات کو اور مادی زندگی کو بے معنویت کے ساتھ دیکھتا ہے۔

چلتے چلتے سوچتا ہوں رات کے پچھلے پہر
میں اکیلا پاؤں میں چھالے، بیابان کا سفر

کلیم کی زندگی واقعی ایک بیابان کی مانند تھی۔ جس میں وہ تنہا حالتِ سفر میں تھے۔ اور سفر کی مشکلات ان کے پاؤں فگار کیے جا رہی تھیں۔ کلیم کی شاعری میں اس سفر کے دو حوالے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک وہ سفر جو عموماً ادیبوں اور صاحب علم کو درپیش رہا ہے۔ کہ یہ دنیا عارضی جگہ ہے۔ اور ایک مسافر کی طرح انسان کو اس سے گزر جانا ہے۔ اور دوسرا وہ سفر جو کلیم اپنے مخصوص طرزِ زندگی کے حوالے سے سمجھتے تھے۔ کہ ان کی زندگی اب اپنے خاتمے اور انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اور اس سفر سے واپسی کا اب امکان نہیں تھا۔

پلٹنا میری قسمت میں نہیں ہے
چلا ہوں سر بہ صحرا پھر نہ کہنا

سفر کی کیفیت کلیم کو اس لحاظ سے بے چین کیے ہوئے تھی۔ کہ جس طرح کے راستے پر وہ چل رہے تھے۔ انہیں اس سفر میں موت یقینی نظر آتی تھی۔ ایسے راستوں کی تاریکی انسان کے اندر سے امید اور یقین کا ہر دیا بجھا دیتی ہے۔ اور وہ سویرے کبھی طلوع نہیں ہوتے۔ جو عام حالات میں انسان کے اندر زندگی کی امید پیدا کرتے ہیں۔ یہ طرز احساس اس

بات کا غماز ہے۔ کہ کلیم اپنی زندگی سے پرامید نہیں تھے۔

ہو چکا رات کے اندھیرے میں
اب نہ ہوگی کبھی سحر سو جا

یہاں موت کے حصول اور موت کی طرف بڑھنے کی ایک فوری، یقینی اور شعوری صورتِ حال نظر آتی ہے۔ کلیم کی خودکشی کا ایک محرک یہ بھی تھا۔ کہ ایک فطری ذہین تخلیق کار کے اندر حیات و کائنات سے متعلق غور و فکر کا جو مادہ ہوتا ہے۔ وہ کلیم کے اندر بدر جہا تم موجود تھا۔ انتہائی غور و فکر کی یہ کیفیت بھی اکثر ادیبوں کو زندگی اور دنیا کی اس بے معنویت سے دو چار کر دیتی ہے۔ کہ پھر وہ تیزی کے ساتھ ایک نارمل زندگی سے کٹتے چلے جاتے ہیں۔ دنیا کی چاہت، زندگی کی کشش اور مادے کی محبت ان کے اندر سے ختم ہو جاتی ہے۔

بادباں بھی کھل گئے ہوا بھی چل پڑی
سامنے کوئی کنارا چاہیے جاؤں کدھر
رفتہ رفتہ آ گئے وہم و گماں کے پھیر میں
ورنہ ہم تھے اور سیدھی راہ قصہ مختصر

ایسی صورت میں کائنات کا اسرار اور مظاہر فطرت کے رموز ادیبوں کے قلب و نظر کو گھیر لیتے ہیں۔ انہیں کائنات کی رنگا رنگی اور اس کی جلوہ گری میں عام شخص کی طرح نظارے نظر نہیں آتے۔ بلکہ ان نظاروں کی خاموشیاں اور ان کے اسرار ان پر عیاں ہونے لگتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں انہیں ''اپنا ہونا'' اور ''نہ ہونا'' یقین عطا کرنے لگتا ہے۔ کلیم کی شاعری میں یہ عناصر بہت نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ کائنات یہاں زندہ رہنے کا ایک بہانہ نہیں بنتی۔ بلکہ راہ فرار کیلئے جواز فراہم کرتی ہے۔ کلیم کی یہ ذہنی کیفیت ان کے شاعرانہ قلب و نظر کو تفکر عطا کرتی ہے۔ کائنات کا وجود انہی فکر و نظر کو پہلے پہل غور و فکر کیلئے تحریک دیتا ہے۔ اور غور و فکر کا مادہ آگہی کا ایک مسلسل کرب بنکر ان کے اندر اتر جاتا ہے۔ شعور و آگہی کا ناآسودگی سے آسودگی تک اپنا ایک دکھ ہے۔ سوالات کے جھکڑ چلتے ہیں۔ صاحب بصیرت کبھی اس کیفیت میں اپنے اندر رہتا اور کبھی خود سے بھی جدا ہو جاتا ہے۔ علاؤالدین کلیم کی شاعری میں یہ صورتِ حال موجود ہے۔

ہم کر ہر معنیٔ پنہاں کو عیاں چاہتے ہیں
نوکِ خامہ کے لئے دل کی زباں چاہتے ہیں

اگلتی ہے زمین اپنا خزانہ
نمود گنج پنہاں دیکھتا جا
اسقدر زور بھرا ہے دل وحشی میں کلیم
اپنی چھاتی پہ کوئی سنگِ گراں چاہتے ہیں

غور و فکر کا مادہ اپنے ہمراہ تلاش و جستجو کا پہلو بھی لیکر آتا ہے۔ ایک ایسی شئے کی جستجو۔ ''جو ہے بھی'' اور ''نہیں بھی'' ہے۔ جہاں نہ آغاز کا پتہ اور نہ انجام کی خبر۔ بھٹکنا اور بھٹکتے چلے جانا۔ مسافتیں ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آتیں۔

میں تھکا ہارا مسافر تیرگی کی راہ کا
پوچھتا پھرتا ہوں رستہ تیری جلوہ گاہ کا

سچائی کی تلاش کا اپنا ایک سفر اور اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ منزل پر پہنچ کر بھی کامیابی اور حصولِ مقصد کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا۔

تیرگی ہی تیرگی تھی کعبہ و بت خانہ کیا
دونوں پردوں میں نہیں تھا جلوۂ جانانہ کیا؟

کلیم کو خود احساس تھا۔ کہ ان کا طرزِ احساس کائنات کی اس رنگارنگی اور بوقلمونی میں کس حد تک گھلا ملا ہوا تھا۔ یہ دید برائے دید کی کیفیت نہیں۔ بلکہ دید کا پہلو اپنے ہمراہ بصیرت و بصارت لیکر ابھرتا ہے۔

افق پہ مہرِ تاباں دیکھتا جا
میرے نغموں کا عنوان دیکھتا جا

کہیں چاندی کی لہروں کا سمندر
کہیں سونے کا طوفاں دیکھتا جا

یہ تمام شواہد بتاتے ہیں کہ کلیم میں ایک باشعور اور فطری ذہانت رکھنے والے ادیب کی روح کارفرما تھی۔ وہ کائنات اور مظاہرِ فطرت کو اس طرح قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ جیسا کہ وہ ہیں۔ بلکہ ان کے پیچھے اصل حقائق اور اسرار کو پانا انہیں مقصود تھا۔

گل کھلاتا ہے باغ میں کیا کیا
شاخ پہ پھول کا کھلا رہنا

علاؤالدین کلیم کی شاعری میں موت کا حوالہ، موت سے رومانس اور موت کی جستجو کرنے کی کیفیت بہت قوی ہے۔ خواہشِ مرگ کی شدت قدم قدم پر کلیم کا راستہ روکتی نظر آتی ہے۔ خواہشِ مرگ کی اس کیفیت میں ایک تسلسل نظر آتا ہے۔ یعنی خود کو اس دنیا میں پل دو پل کا مہمان سمجھنا، کاروبارِ ہستی کو بے معنی سمجھتے ہوئے اسے ترک کرنے کی خواہش کلیم کی شاعری میں ایسی راہیں ہموار کرتی دکھائی دیتی ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ کہ کلیم زندگی کی بجائے موت کے دلدادہ ہیں۔

بس گھڑی دو گھڑی کے مہماں ہیں
ہم سے اچھا نہیں خفا رہنا

غموں کے ہجوم میں کلیم کو اپنے احباب کی بے وفائیاں مزید تکلیف اور آزار پہنچاتی ہیں۔

کوئی چہرہ نہ دیکھو گے وفا کے نور سے روشن
پھرا ہے قافلہ شہرِ جفا میں کو بکو اپنا

اس صورت حال کے پیشِ نظر کلیم کے یہاں ایک ایسی شدتِ نظری پائی جاتی ہے۔ کہ وہ حیات و کائنات کے

تمام نظام میں خدا کی ہستی سے بھی بدگمان نظر آنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر زکریا کا کہنا ہے۔

> وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی نظامِ عدل موجود نہیں۔ استحصال، جبر، ناانصافی وغیرہ عام ہیں انسان ایک دوسرے کو دانستہ یا نادانستہ تکلیف میں مبتلا کرتے رہتے ہیں۔ راست گوئی انسان کی سرشت میں نہیں۔ دنیا کا کاروبار منافقت اور خوش آمد پر استوار ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ "یہ دنیا وہ دنیا" کہیں بھی ازالے کی توقع نہیں۔ دردہستی اور اذیت ذہنی کا مداوا نہیں۔ ۱۰۸

کلیم کا یہ طرزِ فکر جس کی یہاں نشاندہی ہوئی ہے۔ خودکشی کرنے والے اکثر ادیبوں کے یہاں کسی نہ کسی حوالے سے موجود رہا ہے۔ یعنی اس صورت میں ان ادیبوں نے خود کو ایک ایسے گنبد مینائی میں بند کرلیا۔ جہاں ان کی سوچ کے مطابق کوئی ان کے درد کو سمجھتا نہیں۔ اور نہ ان کی پکار کسی تک پہنچ پاتی ہے۔ اسی کیفیت نے ان میں مایوسی، ناامیدی اور زندگی سے بیزاری کے عناصر کو جنم دیا۔ اس حوالے سے شدتِ نظری اسوقت بہت بڑھ جاتی ہے۔ جب انہیں حالات کے سنورنے اور کہیں سے مدد آنے کے تمام امکانات مسدود دکھائی دیتے ہیں۔

رو کو خدا کے واسطے دریائے یاس کو
یہ اژدھا تو سارے جہاں کو نگل گیا

ناامیدی اور مایوسی یہاں محض ایک جزوقتی کیفیت کا نام نہیں۔ بلکہ اسے علاؤالدین کلیم نے "دریائے یاس" کا نام دیا ہے۔

چھن گیا آہ سے اثر سو جا
غم کے نشے میں ڈوب کر سوجا

"دریائے یاس" یہاں رفتہ رفتہ بےخودی کا نشہ عطا کرتا جاتا ہے۔

چڑھ گیا زہر خود فراموشی
چھا گئی نیند ، بے خبر سوجا
موت نے تیری زندگانی کا
کر دیا قصہ مختصر سو جا

کلیم کی خواہش مرگ سے خودکشی کے درمیان کا فاصلہ جذبات کی انتہائی تند وتیزی سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں انتہاؤں کا وہ ظہور نظر آتا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ کلیم کے سامنے زندگی سے سمجھوتے اور مفاہمت کی راہ مسدود ہو رہی ہے۔

نظر سے ظرفِ عالی کی توقع اٹھتی جاتی ہے
کلیم اس میکدے میں توڑ ہی ڈالوں سبو اپنا

ایسی صورت حال میں زندگی کا مختصر ترین ہو جانا، خودفراموشی کے نشے کی بات، توقع کا اٹھ جانا، اور ایک ایسی کیفیت نظر آتی ہے۔ جیسے نہ ختم ہونے والی نینداس کے حواس پر طاری ہو رہی ہے۔ ایسے میں سبو ٹوٹتے ہیں۔ اور میکدے سے بزم آرائی اختتام پذیر ہوتی ہے۔

زندگی اور زندگی کا عذاب

ساقیا لا پیالۂ مئے ناب

کلیم کی موت کثرت شراب نوشی سے ہوئی۔ لہذا کلیم کی شاعری میں شراب نوشی کا ایسا حوالہ بھی موجود ہے۔ جو زندگی کو سرمستی عطا نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی جو عذاب بن گئی ہے۔ اس سے چھٹکارا پانے کی ایک صورت بھی اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہاں شراب زندگی کے عذابوں میں گلابوں کا عرق شامل کرنے کا بہانہ دکھائی دیتی ہے۔ شراب کے نشے اور اس کی سرمستی و مدہوشی نے بڑے بڑے عالی دماغوں کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ کچھ لاشعوری طور پر اسکا نشانہ بنے۔ اور کچھ نے شعوری طور پر اسے دردِلا دوا کے لئے تریاق سمجھا۔ علاؤالدین کلیم انہی تخلیق کاروں میں شامل ہوتے ہیں۔

علاؤالدین کلیم کی خودکشی کا ایک اور محرک زمانے سے شاکی رہنا ہے۔ زمانے سے، سماج سے خفگی اور شکایت کا انداز یہاں ویسا ہی ہے۔ جیسے ادیبوں اور تخلیق کاروں کی اپنے عہد سے مفاہمت نہ ہوسکی۔ اس سے ان کے اندر کا حساس فنکار گویا چپ چاپ اپنی موت مرتا چلا گیا۔ کلیم کی شاعری کا ایک نمایاں حصہ اسی طرزِ احساس کا حامل ہے۔

کس قدر زہر ہے اس دیس کی مٹی میں کلیم
ناگ ہی ناگ پڑے پھرتے ہیں کالے کالے

زمانے سے شکایت کا انداز اپنے اندر انتہائی شدت کا غماز ہے۔ اپنے محسوسات کی عکاسی کے لئے کلیم نے جو الفاظ انتخاب کیے ہیں۔ انہی سے کلیم کی اندرونی شدتِ آزار کا علم ہوتا ہے۔

کلیم پاؤں کے زخموں کی بات کرتے ہو
دلوں میں خار چبھوئے ہوئے ہیں دنیا نے

حالات کا جبر ادیبوں کی خودکشی کا ایک بڑا محرک رہا ہے۔ کیونکہ نہ سہنے کی طاقت، نہ کچھ کہنے کی مجال ان کے پیشِ نظر تھی۔ چنانچہ یہی گھٹن خاموشی کے ساتھ ان ادیبوں کا کام تمام کر گئی۔

کیسے ہیں یہ اہل ستم نے اشارے
کوئی منہ نہ کھولے کوئی دم نہ مارے

کلیم کی شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو زندگی انہوں نے گزاری۔ وہ ایک فریب تھا۔ ادیب کی زندگی کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ جس نوعیت کا وہ دل و دماغ رکھتا ہے۔ اور جس طرزِ احساس کا وہ مالک ہے۔ اس طرح کی زندگی گزارنے کے امکانات اس کے سامنے مسدود ہو جائیں۔ اور وہ محض ایک دھوکے اور فریب کے ساتھ سماج کے ہم قدم رہے۔

ہر قدم پر فریب کھائے ہیں
یوں نہ جیتے تو مر گئے ہوتے

کلیم کی شاعری میں انہی عوامل نے اس خدائی کے وجود سے بھی انحراف کیا ہے۔ جسکی رحمت دعاؤں کی اثر و تاثیر میں گھل مل جاتی ہے۔ جہاں سے قبولیت کے در وا ہوتے ہیں۔ اور جہاں سے بخشش کی اذانیں سنائی دیتی ہیں۔ کلیم کی شاعری میں موجود ایسے ہی طرزِ احساس کے لئے ڈاکٹر زکریا نے کہا تھا۔ کہ ''کلیم کی شاعری میں عدل و انصاف پر مبنی اس خدائی کا وجود عنقا ہے۔ جو انسان کے دکھ کا مداوا کر سکے''۔

باب رحمت نہ کھلا مجھ پر دعاؤں سے کلیم
میری دنیا میں خداؤں کی خدائی ہے عبث

کلیم کی شاعری میں ایسی صورت حال کی نشاندہی موجود ہے۔ لیکن یہ بات کلی طور پر تو نہیں۔ لیکن جزوی طور پر درست کہی جاسکتی ہے۔ اسے ہم جزوقتی شدت احساس کا آزار کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اندر کی ٹوٹ پھوٹ تھک ہار کر کلیم کی فکر کو ازلی وابدی سچائی کے در پے لوٹاتی ہے۔ جہاں وہ اپنے اندر اطمینان قلب کی کیفیت پاتے ہیں۔ جہاں سے انہیں قادر مطلق کے وجود اور اس کے ہونے کی گواہی ملتی ہے۔

تیرگی بڑھنے لگی اٹھو دعا کا وقت ہے
آسمان سے خواہشِ نور و ضیا کا وقت ہے

داخل کا یہ یقین جزوقتی ہی سہی۔ انہیں قادر مطلق کے وجود کا احساس ضرور دلاتا ہے۔

میں کہ پایاب سے ٹھرایا ہوا پھرتا تھا
اس کی رحمت نے سمندر میں اتارا مجھ کو

یہ درست ہے کہ کلیم جس طرز کی زندگی گزار رہے تھے۔ اور انکا جو مخصوص طرزِ فکر تھا۔ اس میں روحانیت اور اخلاقی اقدار کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہاں روحانیت کا وجود اگر ملتا بھی ہے۔ تو اسطرح کہ جیسے کوئی تھک ہار کر بڑی تلاش و جستجو کے بعد کوئی روشنی کی معمولی سی کرن دیکھے، ورنہ کلیم کی شاعری میں اس طرح کے شواہد ملتے ہیں۔ جن کے پیش نظر ڈاکٹر محمد زکریا کا کہنا ہے۔ کہ

> علاؤالدین کلیم کی شاعری کا بنیادی خیال یہی ہے۔ کہ اس وسیع وعریض کائنات کے پیچھے کوئی تخلیقی قوت کارفرما نہیں ہے۔ کلیم کے نزدیک کائنات علت و معلول (Cause and effect) کا سلسلہ ہے۔ اس لیے انسانی زندگی ناہمواریوں سے پُر ہے۔ ۱۰۹

اس کی وجوہات میں ایک تو کلیم کی اپنی طرزِ فکر کا ہاتھ ہے۔ اور دوسری طرف کلیم کا انگریزی ادب پڑھنا اور پڑھانا اور اس کے حوالے سے مغربی مفکرین کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ جہاں مادیت کے زور نے روحانیت کا چراغ مدہم کر دیا تھا۔ اور مغربی فلسفہ کے بڑھتے ہوئے اثرات نے کائنات کے پس پردہ کسی تخلیقی قوت کی کارفرمائی کے جواز کو اہمیت نہیں دی۔ مغربی فلسفہ کے ان اثرات کا اگر کلیم کی فکر اور انکے مخصوص طرزِ حیات کے حوالے سے جائزہ لیں۔ تو کلیم کے یہاں ناامیدی، بے یقینی، مایوسی، تنہا پسندی اور انہی عوامل کے باعث تنہا پسندی میں ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کر دینا انہی اثرات کے باعث ممکن ہوا۔ اور یہ درست ہے کہ خودکشی کرنے والے بعض ادیبوں نے مغربی فلسفے کے انہی اثرات کے تحت خودکو ہر طرف سے مایوس اور تنہا پاتے ہوئے آخرکار خودکشی کے راستے اختیار کیے۔

مصطفیٰ زیدی (۱۹۳۰ـ۱۹۷۰) (حادثاتی موت۔ خودکشی یا قتل؟):

اردو کے نامور شاعر اور سرکاری ملازمت میں اعلیٰ عہدے پر فائز مصطفیٰ زیدی ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۰ کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان اسوقت اہم سیاسی اور فکری دور سے گزر رہا تھا۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی اور علم وفن کی دنیا میں ذہانت کی کمی نہ تھی۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ برصغیر پاک و ہند ایک نئی اور آزادانہ زندگی کی طرف پیش رفت کر رہا تھا۔ ترقی پسندانہ نظریات کا پھیلاؤ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ادب میں بھی جدید اور غیر ملکی نظریات دخیل ہو رہے تھے۔ مصطفیٰ زیدی ایک پڑھے لکھے گھرانے کے ذہین انسان تھے۔ ایسے سماج میں ان کی فکری اور علمی سطح کو پھلنے پھولنے کے بہتر مواقع میسر آئے۔

جہاں تک مصطفیٰ زیدی کے خاندانی پس منظر کا تعلق ہے۔ یہ تہذیب و شائستگی کا حامل علمی گھرانہ تھا۔ مصطفیٰ زیدی کے بھائی ارتضیٰ زیدی اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

> ہمارے والد سید لخت حسنین زیدی الہ آباد میں رہے۔ وہ ڈی۔ ایس۔ پی سی۔ آئی ڈی کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ ان کے آٹھ بیٹے تھے۔ ہم بھائی ہی تھے۔ بہن کوئی نہ تھی۔ ان بھائیوں کے نام ترتیب وار لکھ رہا ہوں۔ مرحوم احمد رضا صاحب، مرحوم حیدر رضا صاحب، امیر رضا صاحب، عابد رضا صاحب، مرحوم ناصر رضا صاحب، مرحوم مجتبیٰ حسنین، مصطفیٰ حسنین اور میں یعنی ارتضیٰ حسنین۔۔۔۔۱۱۰

مصطفیٰ زیدی کی شخصیت ایک مخصوص خاندانی پس منظر رکھتی ہے۔ ان کے والد کی سرکاری ملازمت اور انکا ایک باعزت اور بااختیار منصب اولاد کی تعلیم تربیت کے حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ دورانِ تحقیق مختلف ذرائع سے یہ بات سامنے آئی ہے۔ کہ زیدی صاحب کے والد صاحب نے اولاد کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ اور تمام اولاد نہ صرف تعلیمی میدان میں امتیازی حیثیت سے نمایاں رہی۔ بلکہ اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے بھی ان پر وا ہوتے چلے گئے۔ ابتدائی گھریلو ماحول کی یہ فضا اور نگہداشت اس بات کو تقویت دیتی ہے۔ کہ مصطفیٰ زیدی کی شخصیت ابتدا ہی سے ٹھوس، مثبت، تعلیمی و علمی بنیادوں پر استوار ہوئی۔ جس میں رفتہ رفتہ مصطفیٰ زیدی کی انفرادی ذہانت نے اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔ تربیت کے یہ ابتدائی نقوش یقیناً ایسی شخصیت کی نشاندہی کرتے ہیں جو گرم و سرد زمانہ میں بھرپور طریقے سے نہ صرف فعال رہتی ہے۔ بلکہ وہ وقت اور ماحول کے مخالف دھاروں کو بھی اپنے تابع لانے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ اور پھر مصطفیٰ

زیدی ایک ایسی شخصیت تھے۔ جو وقت اور ماحول کی مخصوص فضابندی میں سانس نہیں لیتے۔ ان کی فطری ذہانت اور تخلیقی سطح اس ضمن میں مانع رہی۔ وہ اظہار اور عملی زندگی کے نئے راستے اور جدید سمتیں اختیار کرتے ہیں۔

شاہد رضا جو مصطفیٰ زیدی کے بھتیجے ہیں۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

> میرے دادا سید لخت حسنین مجھے اپنا نواں بیٹا کہا کرتے تھے۔ دادا مرحوم پولیس میں تھے۔ اس لئے وہ کسی حد تک سخت گیر تھے۔ لیکن یہ سخت گیری اپنے آٹھ بیٹوں کی تربیت میں انہیں بہت کام آئی۔ سب نے ایم اے کیا۔ اور سب اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ چونکہ مصطفیٰ زیدی کی طبیعت مختلف تھی۔ ان کا رجحان ان کے ضابطہ حیات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے وہ ان سے بغاوت کرتے تھے۔ بعد میں یہ ان کی عادت بن گئی۔ کہ جس چیز کو منع کیا جاتا تھا۔ وہ اسی کو کرتے تھے۔ وہ کسی حالت میں بھی مصالحت نہیں کر سکتے تھے۔ ۔۱۱۱

مصطفیٰ زیدی خود اس ضمن میں لکھتے ہیں

> میں ذہنی طور پر کمیونسٹ، ملحد اور نہ جانے کیا کیا ہو گیا تھا۔ لیکن چونکہ کھانا گھر پر کھاتا تھا۔ اور تعلیم والد صاحب کے پیسے پر ہی ہوتی تھی۔ لہذا بہت گھٹتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں مجھ میں گھر چھوڑ دینے کی اخلاقی جرأت کبھی نہیں ہوئی۔ ۔۱۱۲

یہاں مصطفیٰ زیدی کی شخصیت کے دو بنیادی پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی شخصیت کو ابتدا ہی سے بہتر اور مثبت بنیادوں پر اٹھان ملی۔ جس نے بڑے پر اعتماد طریقے سے زیدی صاحب کی فطرت ذہانت کے ساتھ ملکر ایک ایسے منفرد شخصی کردار کو تشکیل دیا۔ جو ہر مقام پر منفرد، مختلف اور توانا دکھائی دیتا ہے۔ اور دوسرا مصطفیٰ زیدی کی فطری ذہانت، جواز خود ہر لحہ اپنی نمو چاہتی تھی۔ جو روایت کی پاسداری کی بجائے نئی روایات اور جدت پسندی کی تلاش میں تھی۔ شاہد رضا نے دوران ملاقات مصطفیٰ زیدی کی شخصیت و کردار کے ان بنیادی اور نمایاں اوصاف کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ

> ایسی شخصیت کے بارے میں کہنا کہ وہ زندگی کے کسی موڑ پر خودکشی کر لے گی۔ یا کر سکتی ہے۔ بعید از قیاس ہے۔ ان کے ساتھ میرا سب سے زیادہ وقت گزرا۔ میں ان سے عمر میں تقریباً تین سال چھوٹا تھا۔ ان کی پسند و ناپسند، عادات و اطوار، ان کی سرگرمیوں، دلچسپیوں کو نہ صرف میں نے بنفس نفیس دیکھا۔ بلکہ عملی طور پر ان کا شریک کار رہا۔ تعلیمی زمانہ بھی زیادہ تر ساتھ گزرا۔ وہ چچا سے زیادہ میرے دوست تھے۔ اور ہم ایک دوسرے کے ہم راز تھے۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ کہ مصطفیٰ زیدی زندگی سے بھرپور تھے۔ ۔۱۱۳

زندگی سے بھرپور ہونا ایک مثبت رویہ ہے۔ یہ رویہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ مصطفیٰ زیدی نے زندگی کے ہر پہلو کو نہ صرف مشاہداتی بلکہ تجرباتی سطح پر بسر کیا۔ سماجی زندگی معاشرتی، معاشی، اخلاقی و مذہبی پہلوؤں اور زاویہ ہائے نگاہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ کیونکہ کسی بھی شخصیت کی تعمیر میں یہ تمام پہلو فعال اور متحرک ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے جہاں تک مذہب و

کا تعلق ہے۔ مصطفٰی زیدی کی ابتدائی زندگی میں مذہب کی طرف بھی نمایاں رجحان کا پتہ ملتا ہے۔ مصطفٰی زیدی کے اخلاق بھائی ارتضیٰ زیدی لکھتے ہیں۔ ''بچپن میں مصطفٰی بھائی کو مذہب سے بے حد وابستگی تھی۔ نماز، روزے کے شدت سے پابند تھے۔ مذہبی کتابیں اور وظائف پڑھتے تھے۔ مجھے نماز کی طرف انہوں نے مائل کیا۔''۔۱۱۴

اس ضمن میں ان کی شاعری جو خصوصاً مذہب و اخلاق اور اہل بیعت کی ثناء میں لکھی گئی۔ اس سلسلے کا توانا حوالہ بنتی ہے۔ یہ ضرور کہ مصطفٰی زیدی کا مسلک شیعہ تھا۔ لیکن ان کا رنگ شاعری ان کی منفرد شخصیت کی طرح اپنی انفرادی پہچان رکھتا ہے۔ اس سے اس بات کا علم بھی ہوتا ہے کہ ان کا مسلک انکا عقیدہ، ان کے اندر ایمان وایقان کی پختگی کا مظہر تھا۔ اس سے ان کے کردار کی تعمیر ٹھوس بنیادوں پر استوار ہوتی نظر آتی ہے۔ جس میں ابتداء ہی سے انفرادی اور فطری ذہانت کا نقش نمایاں رہا۔

بقول واصل عثمانی ''ان کا شمار یونیورسٹی کے ذہین ترین طالب علموں میں ہوتا تھا''۔۱۱۵ اس ضمن میں احمد علی سید لکھتے ہیں ''وہ اپنے مطالعہ کے سہارے ''لا'' کی منزل تک پہنچ چکا تھا۔۔۔ وہ نہایت ذہین اور طباع شاعر تھا۔''۔۱۱۶ ایسی شخصیت کا ابتدائی تجزیہ پتہ دیتا ہے۔ کہ اس شخصیت کی بنیادوں میں کوئی شگاف ایسا نہیں۔ شکست وریخت کے کوئی آثار اس طور سے موجود نہیں۔ جو آگے چل کر مایوسی، ناامیدی یا خودکشی جیسے انتہائی اقدام پر منتج ہوں۔ تاوقتیکہ یہ حد سے بڑھتی ہوئی ذہانت بعد میں رفتہ رفتہ بے قاعدہ، بے ضابطہ اور بے سمت نہیں ہو جاتی۔ مصطفٰی زیدی کی غیر فطری موت جسے خودکشی کہیں یا قتل۔ اپنا ایک بنیادی محرک رکھتی ہے۔ اور وہ ہے۔ مصطفٰی زیدی کی اعلیٰ تعلیمی قابلیت، علمی صلاحیت اور ان کی مطالعاتی وسعت۔ یہ مطالعاتی وسعت نہ صرف ان کے کتابی علم پر معمور ہے۔ بلکہ وہ ابتداء ہی سے اپنے عہد کی علمی وادبی سرگرمیوں کے روح رواں رہے۔ تجربہ اور مشاہدہ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ خارجی علم کے حصول ان کی شخصیت کی داخلی جہت کو ایک مخصوص فکری پرداخت سے ہمکنار کیا۔ اور جہاں تک حصول تعلیم کا تعلق ہے۔ وہ اس میدان میں بہت نمایاں رہے۔ جس کی مجموعی صورت حال کچھ اس طرح سے ہے۔ کہ

مصطفٰی زیدی نے ماڈرن ہائی سکول الہ آباد سے ۱۹۴۶ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۸ میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔ فرسٹ ایئر میں وہ کالج میں اول آئے۔ جس پر انہیں سکالر شپ ملا۔ بی اے کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے چھٹی پوزیشن میں پاس کیا۔ ایم اے پریولیس کے بعد جب انہوں نے پاکستان ہجرت کی۔ تو گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے انگریزی کا امتحان پاس کیا۔ یہ ۱۹۵۲ کا زمانہ تھا۔ حصول تعلیم کے بعد وہ اسلامیہ کالج کراچی اور پشاور یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد رہے۔ ۱۹۵۴ء میں مصطفٰی زیدی نے سول سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

مصطفٰی زیدی کی شخصیت ان عوامل کا پتہ دیتی ہے۔ کہ انہوں نے اپنے وقت میں نہ صرف اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کی۔ بلکہ وہ اکثر اس میدان میں نمایاں اور ممتاز رہے۔ ایسی شخصیت اپنے ماحول سے متصادم بھی ہے۔ اور اس پر چھا جانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ اس میں مستقل مزاجی ہے۔ آگے بڑھنے کا دم خم ہے۔ اور وہ اپنے عہد کے تمام علمی وفکری سرچشموں سے فیض یاب ہونے کا سلیقہ رکھتی ہے۔ مصطفٰی زیدی کی شخصیت میں اس حوالے سے اپنی اہلیت کا احساس اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف خوداعتمادی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

سب سے بڑے بھائی مجتبیٰ کو ہر درجے میں فرسٹ کلاس ملنے کے علاوہ والی بال اور

کرکٹ میں بھی بہت سے انعام ملتے رہتے تھے۔ مجھے فرسٹ کلاس ملنے کے علاوہ
کچھ نہیں ملتا تھا۔۔۔مجتبیٰ صاحب سے جس دن میرا تاریخی جھگڑا ہوا تھا۔ اس دن انکو
اپنی ایک نظم اور مضمون پر یونیورسٹی میگزین میں سب سے نمایاں جگہ ملی تھی۔ جھگڑا اس
بات پر ہوا تھا۔ کہ یہ نظم اور مضمون میرے لکھے ہوئے تھے۔ ۔۱۱۷

فطری ذہانت اور مطالعاتی وسعت کا امتزاج زیدی کی شخصیت میں ایک ایسی توانائی کی جوت جگاتا ہے۔ جس سے ان کی انفرادیت سماجی وادبی دونوں حوالوں سے نکھرتی چلی جاتی ہے۔

جوش صاحب کو میں چوتھی اور پانچویں جماعت سے پڑھتا آرہا تھا۔۔۔ کالج میں ایک
دن پتہ چلا۔ کہ مجاز توکل سے الہ آباد آئے ہوئے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کم ازکم
فراق صاحب تو مجھے اطلاع بھیج دیتے۔۔۔ ۔۱۱۸

مصطفیٰ زیدی کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسی شخصیت زندگی میں عام و عامی کی طرح معمولی ضربوں سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہوتی۔ کیونکہ ابتدا ہی سے گرم و سرد زمانہ سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید محمد عقیل

جب میں آٹھویں جماعت میں پہنچا۔ تو تیغ نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ایک ہی
شہر میں رہنے کی وجہ سے ملاقات پہلے ہی سے تھی۔۔۔ اسوقت تک تیغ نے شاعری
شروع نہیں کی تھی۔ صرف مصطفیٰ حسنین کے نام سے جانے جاتے۔ لاابالی پن بات
بات پر بگڑ جانا، اور خفا ہو جانے کی کیفیت ان میں بچپن ہی سے تھی۔۔۔ اچانک ان
میں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ ایک دن دیکھا۔ کہ کھدر کا کرتا پہنے، ناخن اور بال
بڑھائے، سفید چپل (جسے قصداً کہیں کہیں سے پھاڑ دیا گیا تھا)۔۔۔ چلے آرہے ہیں
۔ پوچھا کہ بھئی کیا بات ہے۔ کہنے لگے، کچھ نہیں۔ میں اپنے کوڈی کلاس کر رہا ہوں۔
آجکل مارکسی لٹریچر کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ تم لوگ تو بورژوا ذہنیت والے، ان باتوں کو
نہیں سمجھ سکتے۔ ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کے لئے یہ تمام باتیں عجیب و غریب تھیں۔ یہ تما
م الفاظ غیر مانوس، مارکس، اینگلز کے نام تک سے واقف نہ تھے۔ بھلا ان کی فلاسفی
پڑھنے کا کیا سوال تھا۔ سب لوگ تیغ کے گرد جمع ہو گئے۔ کہ بھئی یہ سب کیا ہے
۔۔۔سمجھتے کہ مصطفیٰ واقعی کچھ بڑی گہری باتیں پڑھا کرتا ہے۔ ہم لوگ صرف کورس کی
کتابوں تک محدود تھے۔ یہ سعادت کہاں نصیب تھی۔ ۔۱۱۹

مصطفیٰ زیدی کے یہ تمام معمولات پتہ دیتے ہیں۔ کہ ان کی فطری ذہانت نے اپنے عہد کی فکری وادبی فضا میں جلا پائی۔ اور ان میں منفرد ہونے کا جو احساس کارفرما تھا۔ اسے بھی ایک واضح راستہ ملنے لگا تھا۔ اور اکثر ایسی اعلیٰ علمی وادبی صلاحیت اہل قلم کے اندر احساس ذات دوچند کرنے کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ بقول افتخار عارف

اس میں شک نہیں کہ مصطفیٰ زیدی انگریزی اور اردو ادب دونوں پر عبور رکھتے تھے۔
وہ صرف اردو کے نامور شاعر ہی نہیں۔ بلکہ انگریزی ادب کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔
زیدی کی انگریزی بہت عمدہ تھی۔ ۔۱۲۰

مصطفیٰ زیدی کا حلقہ احباب ان کی علم دوستی سے نہ صرف آگاہ تھا۔ بلکہ معترف بھی تھا۔ لطیف کاشمیری لکھتے ہیں۔

> مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد۔۔۔ شاید تفریحاً مری آیا ہوا تھا۔۔۔ اس نے لائبریری سے نظموں اور غزلوں کے کم وبیش بیس نئے پرانے مجموعے بیک وقت جاری کرائے تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ کھلنڈرا سا چاک وچوبند نوجوان جو وضع قطع میں اور اپنی مستعدی سے کسی ہاکی ٹیم کا کپتان معلوم ہوتا ہے۔ اتنی ڈھیر ساری کتابوں کو کیا کرے گا۔ میں نے ازراہِ تجسس پوچھا۔۔۔ اس کے متانت بھرے خوبصورت چہرے پر مسکراہٹ کی لو تھرتھرائی۔ اوہ، یہ تو میرا دو دن کا راشن ہے بھئی۔۔۔۔ ۱۲۱

مصطفیٰ زیدی کی علم دوستی کا اعتراف دورانِ تحقیق ان کے معاصرین اور حلقہ احباب میں ہر حوالے سے ہوا ہے۔ اس سے مصطفیٰ زیدی کی شخصیت کا یہ حوالہ بہت قوی محسوس ہوتا ہے۔ کہ وہ زندگی میں جس دلچسپی، مشغلے، مطالعے اور علمی وادبی سلسلے سے وابستہ ہوئے۔ اس میں مہارت پانا اور انتہائی سطح کی شدتِ نظری انکے پیشِ نظر رہی۔ بقول ارتضیٰ زیدی "جوش صاحب، اقبال اور غالب کا کلام انہیں ازبر تھا۔" ۔۱۲۲ اور جہاں تک شاعری اور مشاعروں میں ان کی عملی شرکت کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل لکھتے ہیں۔

> بی۔اے پاس کرتے کرتے کوئی مشاعرہ الہ آباد میں مکمل نہ سمجھا جاتا۔ جس میں تیغ صاحب شریک نہ ہوں۔ ایک خاص گھن گرج کے ساتھ جب وہ اپنی نظمیں پڑھتے۔ تو ایک سماں بندھ جاتا۔۔۔ ۔۱۲۳

شعری وادبی مشاغل کے علاوہ مصطفیٰ زیدی نے فوٹو گرافی اور دیگر کئی مشاغل میں بھی مہارت حاصل کی۔ انکی فطرت کا یہ رجحان بھی ان کی تخلیقی ذہانت اور اہلیت کی کئی گرہیں کھولتا دکھائی دیتا ہے۔

> دوسرا جنون چھوٹے ہوائی جہازوں کو اڑانے کا ہوا۔ پرائیویٹ پائلٹ لائسنس بڑی مشقت کے بعد ملا۔ لیکن ایک ایسا اتفاق ہوا۔ کہ اندھیرے میں ایک نامعلوم اور غیر محفوظ جگہ پر مجھے فورسڈ لینڈنگ کرنی پڑی۔ میں زندہ بچ گیا۔ لیکن تمام تر کوشش کے باوجود جہاز کو نقصان سے نہیں بچا سکا۔ جہاز مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز تھا۔ مجھے آج تک اسکا اتنا صدمہ ہے۔ کہ فلائنگ کلب والے تک جنکا یہ طیارہ تھا۔ اس صدمے کی گہرائی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ۔۱۲۴

اپنے مشاغل اور دلچسپیوں کی رنگارنگی کے بارے میں مصطفیٰ زیدی خود لکھتے ہیں۔

> میں نے شاعری کے علاوہ کئی روگ اور پالے۔ فوٹو گرافی شروع کی تو جنون کی حد تک۔ میرے سر پر دنیا کے ہزاروں شہروں کی دھوپ اور برف پڑی اور میں جلتی ہوئی یا ٹھٹھرتی ہوئی انگلیوں سے متحرک اور جامد کیمرہ چلاتا رہا۔ ۔۱۲۵

مصطفیٰ زیدی کی شخصیت کے یہ تمام پہلو اور ان سے متعلق ان کے احباب اور ناقدین کی آراء سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔ کہ زیدی واقعی زندگی سے بھرپور تھے۔ اور زندگی سے بھرپور بعض شخصیات کے اندر ایک اور پہلو بھی

موجود ہوتا ہے۔ کہ وہ واقعی زندگی کے ہر رخ کو برتنا، دیکھنا اور سہنا چاہتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر شاید یہ خیال ہوتا ہے کہ زندگی صرف ایک ہی بار ملتی ہے۔ اور اس ایک ہی بار ملنے والی زندگی کے پس پردہ سوچ بعض اوقات انسانی رویے میں انتہا پسندی اور شدتِ جذبات کے بے روک بہاؤ کو نہ صرف جنم دیتی ہے۔ بلکہ بے سمت بھی کر دیتی ہے۔ مصطفیٰ زیدی کی حادثاتی موت میں ان کی شخصیت کا یہ پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔

مصطفیٰ زیدی کی حادثاتی موت میں ان کی حساس طبیعت کو بڑا عمل دخل حاصل ہے۔ حساس ہر شخص ہوتا ہے۔ چاہے وہ ادبی ہو یا غیر ادبی۔ جب حد درجہ بڑھتی ہوئی ذہانت کو اپنی علمی اہلیت کا شعور ہو جائے۔ مصطفیٰ زیدی کے ضمن میں یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ کہ انہوں نے ناموافق حالات کو شدت سے محسوس کیا۔ حساس انسان اور وہ بھی اہل قلم، صاف گو ہوتا ہے۔ صاف گوئی سے سوچتا ہے۔ اور اس صاف گوئی میں سارے منظر دیکھنا چاہتا ہے۔ اور اس معیار پر وہ خارج سے تعلق استوار کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ لیکن صورتِ حال اس کے موافق نہیں ہوتی۔ لہذا ٹوٹ پھوٹ کا ایک عمل اس کے اندر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ٹوٹ پھوٹ مصطفیٰ زیدی کے یہاں دونوں سطح پر ہوئی۔ شعر و ادب کی دنیا۔ اور پھر سرکاری منصب۔ جہاں وہ کئی حوالوں سے رشک و حسد کی زد میں تھے۔ لطیف کاشمیری لکھتے ہیں۔

> اس کے اردگرد خود غرضی، نفس پرستی، منافقت، جھوٹ اور مکر کی عادی تہذیب، تصنع اور بناوٹ پر جان چھڑکنے والی کھوکھلی معاشرت رقص فرما تھی۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی خوش نوا بلبل ہو۔ جو وقت کے طوفانی ریلوں کے کارن نیم مردہ جسموں سے گوشت نوچنے والے کوؤں اور گدھوں کے غول میں پھنس گیا ہو۔ [۱۲۶]

اس صورت حال کے نہایت واضح اشارے ان کی شاعری میں اکثر بیشتر مقامات پر ملتے ہیں۔

ہم بات کریں تو کس سے کریں، بنیاد رکھیں تو کس پہ رکھیں
اے اہل ہنر کے عجزِ سخن، اے زندگیوں کی بے سببی

اس طرح ان کی ایک نظم ہے

زندگی آج تو کس طرف آ گئی
میں تیری راہ کس طرح روشن کروں
میری ویران آنکھوں میں آنسو نہیں
تیرے سازوں کی تحریک کے واسطے
مرے ہونٹوں پہ گیتوں کا جادو نہیں
رات سنسان ہے، راہ ویران ہے
کوئی نغمہ نہیں، کوئی خوشبو نہیں

یہ ایک ایسی زندگی کا منظر نامہ ہے۔ جس میں چاروں طرف تصادم کی کیفیت ہے۔

جنوں سے رسم نہ رکھوں تو جاں سلگتی ہے
طلب کا قرض اتاروں تو جسم جلتا ہے

جینئس اپنے عہد میں انکار و اقرار اور داخلی و خارجی سطح پر متصادم ماحول سے گزرتا اور اسکا شاکی رہتا ہے۔

مصطفیٰ زیدی کی زیادہ تر زندگی اسی سے عبارت رہی۔ جینئس ان حالات میں بظاہر ناموافق ماحول سے متصادم ہوتا ہے۔ لیکن اسکا سب سے زیادہ نقصان اور ٹوٹ پھوٹ کا عمل اس کے اپنے اندر رونما ہوتا ہے۔ یہ اس کے اندر کی جنگ ہوتی ہے۔ زمانہ اور حالات اس کے موافق نہیں ہوتے۔ وہ انہیں بدل نہیں سکتا۔ چنانچہ بعض غیر محسوساتی سطح پر پسپائی کا عمل بھی اس کے اندر ہی اندر جنم لیتا ہے۔ پسپائی کبھی کبھار صرف ناموافق ماحول ہی سے نہیں بلکہ زندگی کے حوالے سے بھی رونما ہوتی ہے۔ یہ حالات جینئس کو اپنے ذہن و تخیل اور خود ساختہ ضابطۂ حیات کے حوالے سے گزارنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ پھر اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ کہ دنیا اس کے حوالے سے کیا سوچتی اور کیا کہتی ہے۔ بلکہ اس کی اپنی سوچ اس کے مخصوص زاویہ نگاہ کے آئینے میں گردوپیش کے ماحول کا ارتعاش دیکھتی ہے۔ جہاں وہ ان جیسا نہیں ہوتا۔ جیسے سب ہوتے ہیں۔ وہ اس قرینے سے آزاد ہوتا ہے۔ یہ ہر دور کے جینئس کا المیہ بھی رہا۔ اور اس کی مخصوص فکری جہت بھی۔ مصطفیٰ زیدی کے حوالے سے یہ بات درست ہے۔ کہ وہ اس ضمن میں اپنے ماحول سے مطابقت نہیں کر پائے۔

> اپنی کم علیت بلکہ جہالت کے باوجود جس ملک میں رہتا ہوں۔ وہاں میں پڑھا لکھا سمجھا جاتا ہوں۔ اور جن لوگوں سے ملا جلا ہوں۔ ان میں سے میں نے اکثریت کو اپنے سے بھی زیادہ بے مایا پایا ہے۔۔۔ میں شاعری اور سرکاری ملازمت دونوں میں Misfit ہوں۔ جن لوگوں میں ملنے جلنے سے شاعر حلقۂ شعراء میں قابل قبول ہوتا ہے۔ ان کو کبھی ملا ہی نہیں۔ یا ملا تو رسماً۔ ۔۱۲۷

مجھکو محصور کیا ہے مری آگاہی نے
میں نہ آفاق کا پابند نہ دیواروں کا
میں نہ شبنم کا پرستار نہ انگاروں کا
خلاؤں کا طلبگار، نہ سیاروں کا

مصطفیٰ زیدی نے اکثر و بیشتر مواقع پر اس بات کا اظہار کیا۔ اور ان کے حلقۂ احباب نے بھی اس بات کی تصدیق کی۔ کہ وہ اکثر اس بات پر دل گرفتہ رہتے تھے۔ کہ ان کی شعری و ادبی صلاحیتوں کا اعتراف نہیں کیا گیا۔ وہ جس قابلیت اور صلاحیت کے حامل تھے۔ انہیں اتنی توقیر نہیں ملی۔ نامور ادیبوں کی طرح وہ اپنے عہد کے شاکی رہے۔ یہ شکایت محض اپنا خارجی حوالہ نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ زیدی کی حساس فطرت اس سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ ایک ایسی ٹوٹ پھوٹ جو ماحول سے، سماج سے ادیب کو بددل کر دے۔ ''دس پندرہ سال تک جھک مارنے کے بعد جب میں نے وزیر آغا کی نئی شاعری پر ایک دبیز کتاب دیکھی۔ جس میں چھوٹے سے چھوٹے شاعر کا ذکر تھا۔ لیکن میرا نام نہیں تھا۔ تو میرا دل ٹوٹ گیا''۔ ۱۲۸

مسز ارتضیٰ زیدی نے اس ضمن میں کہا کہ مصطفیٰ زیدی معاصرانہ چشمک کے ہاتھوں اکثر پریشان ہو جاتے تھے۔ حبیب جالب کی اس حوالے سے زیدی پر چوٹیں ہوتی تھیں۔ کہ یہ تو C.S.P افسر ہے۔ اسی طرح جب آدم جی ایوارڈ زیدی کی بجائے ادا جعفری کو ملا۔ تو زیدی آزردہ ہوئے۔ مسز ارتضیٰ زیدی نے مزید کہا کہ جب ایک نامور ادیب نے مرثیے کے حوالے سے کتاب لکھی اور اس کتاب کی فنی ضرورت کے پیشِ نظر مصطفیٰ زیدی کے مرثیہ کے حوالے سے کام انہیں فراہم بھی کیا گیا۔ لیکن جب کتاب چھپی۔ تو اس میں زیدی کا کوئی حوالہ موجود نہ تھا۔ جبکہ مرثیے کے ضمن میں مصطفیٰ

زیدی نے اعلیٰ پائے کے مرثیے لکھے ہیں۔ ان شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصطفیٰ زیدی ادبی حلقوں کی ناانصافیوں سے بہت پریشان تھے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ زمانے کا شاکی وہی ادیب ہوتا ہے جسے اپنی علمیت اور تخلیقی صلاحیتوں کا نہ صرف ادراک ہو۔ بلکہ اسے یہ بھی علم ہو۔ کہ اس نے اپنے عہد کی شعری وادبی روایت میں کتنا حصہ ڈالا اور دوسرے اندرون خانہ اسکا کتنا اعتراف بھی رکھتے ہیں۔ بقول لطیف کاشمیری

> اس نے عظیم شعراء کی روایت نبھاتے ہوئے تاریخ کے پرآشوب دور میں بھی حریت فکر کی قندیل روشن کیے رکھی۔ اور جب وطنِ عزیز کے میکدے میں ویرانی مسلط تھی۔ خم وساغر اداس پڑے تھے۔ لبوں پر خاموشی کی مہر لگی تھی۔ اور بہت سے اہل دانش کے قلم بک چکے تھے۔ اور بہت سے اہل قلم احتساب سے خائف تھے۔ زیدی واحد ایسا حریت پسند اور جرأت مند شاعر تھا۔ جس نے اس سنگین خاموشی کا طلسم توڑا تھا۔ ۔۱۲۹

مصطفیٰ زیدی کی بے باکی اور صاف گوئی ہر مقام پر بغاوت کا علم بلند کرتی ہے۔ یہ ان کے اندر کا ادیب تھا۔ جس نے ہر حال میں اپنے قلم کو معتبر بنائے رکھا۔

> ہم ہیں دوچار ادیب اور بھی ہوں گے زیدی
> جن کو تلوار کے سائے میں قلم یاد رہا

اور جب قلم کو اپنا اعتبار مل جاتا ہے۔ تو وہ فرسودہ رویات کے جال کو اتار پھینکتا ہے۔

> میں ایک سراب کی خواہش پہ پیچ آیا ہوں
> تمام بادہ و ساغر تمام تشنہ لبی

ایک ذہین اور اعلیٰ سطح کا تخلیق کار ایسے ہی مقامات پر ٹوٹتا ہے۔ زندگی سے اس کی بے زاری اور اپنی ذات میں سمٹنے کا عمل بے معنی اور بلا جواز نہیں ہوتا۔ زیدی کی حساس فطرت اپنی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے مخالفانہ طرزِ عمل کو بخوبی دیکھتی تھی۔ ان کے اندر کی ذہانت اور ان کے اندر چھپا ہوا بڑا فنکار اپنے ہونے کی گواہی مانگتا تھا۔ لیکن ان حالات میں اس گواہی کو قبولیت کا درجہ کون دیتا۔ چنانچہ زمانے سے شکایت مصطفیٰ زیدی کی فطرت میں ان کے فن میں اپنے ماحول سے ناراضگی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ جو رفتہ رفتہ بالواسطہ طور پر ان کی اچانک موت کا ایک محرک ثابت ہوئی۔

مصطفیٰ زیدی کی حادثاتی موت کے محرکات میں ان کی اعلیٰ سرکاری ملازمت، ملازمت کے مسائل اور اس منصب کی نزاکت بھی ایک اہم محرک کے طور پر ابھرتی ہے۔ حکومتی سطح پر صاحب اختیار لوگوں میں جہاں وہ ہردلعزیز سمجھے جاتے تھے۔ وہاں ان کے حاسدوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ مصطفیٰ زیدی اپنے عرصہ ملازمت میں جن جن سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ کہ انہوں نے اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے سیالکوٹ، ڈیرہ غازی خان اور مری میں اپنے فرائض ادا کیے۔ صوبائی ڈپٹی سیکرٹری تعلیمات کی حیثیت سے لاہور میں اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔ پھر ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے جہلم، نواب شاہ، خیر پور، ساہیوال اور لاہور میں تعینات کیے گئے۔ لاہور کی ملازمت کے دوران ہی انہیں تمغہ قائد اعظم ملا۔ ۱۹۶۸ء میں Muffield Foundation کی اسکالرشپ پر ٹریننگ کے لئے لندن چلے گئے۔ ۱۹۶۹ء میں سیاحت کرتے ہوئے وطن واپس لوٹے۔ اور سیکرٹری بنیادی جمہوریت کی حیثیت سے کام سنبھالا۔

آخری سرکاری عہدہ تھا۔ جس سے مصطفےٰ زیدی دسمبر میں معطل ہوئے۔ اور مئی کے مہینے میں برطرف کر دیئے گئے۔

جس زمانے میں زیدی ان اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ بیوروکریسی ہر ملکی فیصلے پر چھائی ہوئی تھی۔ مصطفےٰ زیدی اپنی فطری ذہانت اور علمی صلاحیت کے بل بوتے پر نہ صرف ان ذمہ داریوں کو بہ احسن نبھانے کے اہل تھے۔ بلکہ ان تمام فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے۔ لیکن بالواسطہ اور بلاواسطہ انہی سرکاری عہدوں کی نازک ذمہ داریاں اور ان ذمہ داریوں کی حساس نوعیت نے مصطفےٰ زیدی کی حادثاتی موت کے لئے رفتہ رفتہ زمین ہموار کرنا شروع کر دی۔ حتیٰ کہ جب ان کی وفات ہوئی۔ اسوقت انکا عہدہ ان کی موت کے حوالے سے جلی حروف اور نمایاں پس منظر میں سامنے آیا۔ اور اگر ہم سادہ اور عام فہم انداز میں ان کی اعلیٰ سرکاری ملازمت کے حوالے سے ان کی حادثاتی موت کے محرکات تلاش کریں تو مندرجہ ذیل عوامل سامنے آتے ہیں۔

اعلیٰ سرکاری ملازمت کے دوران مصطفےٰ زیدی کے اختیارات اور دائرہ کار کی وسعت ان کے معاصرین اور ان کے ہم منصبوں کے درمیان پیشہ وارانہ رقابت کا باعث بنی۔ دوستوں کی نسبت زیدی کے مخالفین کی تعداد زیادہ تھی۔ مصطفےٰ زیدی کے اختیارات اور ان کی کارکردگی میں افسران بالا کی بے جا مداخلت ایک افسر کیلئے ہی نہیں۔ بلکہ ایک ادیب اور حساس صاحبِ قلم کے لئے بھی مشکلات پیدا کر رہی تھی۔ بقول لطیف کاشمیری

> زیدی ایک افسر کی حیثیت سے بھی اپنی قابلیت اور لیاقت کا نقش دلوں پر بٹھا چکا تھا۔ اور اکثر افسر اسے رشک و حسد کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ ایک حاکم کی حیثیت سے اصول پرست اور سخت گیر مشہور تھا۔۔۔ وہ اپنے آپکو اوپری طبقے اور افسر شاہی کے ماحول میں Misfit سا تصور کرتا تھا۔ کیونکہ اس کی فطرت شاعرانہ اور مزاج باغیانہ تھا۔۔۔ ۱۳۰

سامری سانپ مری سمت بڑھے آتے ہیں
زورِ اعصائے کلیم و ید بیضا دے

یہاں ایک شاعر، ایک فنکار اپنے مخالف ماحول کے سامنے نبرد آزما ہونے کے لئے اپنے اندر کی کسی قوت کو بروئے کار لانا چاہتا ہے۔ لیکن ایک پورے نظام کو بدلنا اور پورے سسٹم کے سامنے فردِ واحد کا ڈٹ جانا بھلا کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔ اس میں پسپائی بہر طور فرد واحد ہی کی ہوتی ہے۔

مصطفےٰ زیدی اس ضمن میں خود لکھتے ہیں

> ایک ماتحت افسر اعلیٰ مجھے کئی ہزار روپے رشوت دینے آ گئے۔ میں نے ان کی اس جرأت کے بارے میں اگلے دن چیف سیکرٹری کو تحریری اطلاع دی۔ یہ افسر اعلیٰ اتنے بارسوخ تھے۔ اور صاحبانِ اقتدار میں ان کی زبردست رسائی تھی۔ کہ ان کا تو بال بھی بیکا نہ ہوا۔ اور میرا ایک ایک لمحہ عذاب بنا دیا گیا۔ کئی مہینوں ہر دن اور ہر رات مجھ پر اتنا ہراس اور خوف مسلط کیا جاتا رہا۔ کہ یہ ہر آدمی کی برداشت سے باہر ہے۔ میرا قصور صرف اتنا تھا۔ کہ میں نے حرام کے پیسے ٹھکرا دیئے تھے۔ ۱۳۱

یہاں ایک افسر اعلیٰ کے ضمیر سے زیادہ ایک حساس شاعر کا دلی کرب نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے

کہ اس طرح کے نشیب و فراز اور جذباتی صدمے مصطفیٰ زیدی کو دورانِ ملازمت کئی مرتبہ سامنا کرنا پڑے۔ یہاں تصادم کی ایک صورت بھی سامنے آتی ہے۔ اور وہ یہ ایک افسرِ اعلیٰ کا سماجی مقام اور ایک شاعر کے اندر کی دنیا۔ افسرِ اعلیٰ کا رتبہ، اس کے اختیارات، اس کے احکامات، اس کے ہم منصبوں کی ریشہ دوانیاں اور دوسری طرف ایک شاعر کے لطیف جذبات، نزاکتِ خیال اور اس کے اندر کا حساس عالم۔ بظاہر وجود ایک ہی تھا۔ لیکن اس وجود کے اندر اور باہر کی دنیا متلاطم موجوں کی زد میں تھی۔ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی

> مصطفیٰ زیدی کو رزق ایک انتظامی ملازمت سے مل رہا تھا۔ اور یہ عالم بہت ہی غلط تھا۔ یہ بھی احساس ہوا۔ کہ شاعر اور حساس طبیعت کو انتظامی ملازمت میں شیطان سے صلح کیے بغیر چلنا ناممکن ہے۔ شاعر یہ صلح نہیں کر سکتا۔ اور شیطان اسے ہلکان ہی نہیں کرتا۔ بلکہ مار بھی ڈالتا ہے۔ ۔۱۳۲

چنانچہ مصطفیٰ زیدی جب ۳۰۳ سرکاری افسروں کے ساتھ سرکاری ملازمت سے برطرف کیے گئے۔ تو ان کی عزتِ نفس کے لئے یہی ایک بہت بڑا صدمہ اور دھچکا تھا۔ اس ضمن میں مصطفیٰ زیدی کی بھابھی مسز ارتضیٰ زیدی نے دوران ملاقات بتایا۔ کہ ان دنوں جبکہ ان کی ملازمت ختم کر دی گئی تھی۔ زیدی گھر آئے۔ اسوقت میں اور مصطفیٰ زیدی کی والدہ گھر پر تھیں۔ زیدی تھوڑی دیر گھر پر رکے۔ جب جانے لگے۔ تو والدہ کی اسی ملازمت سے برطرفی کے موضوع پر زیدی چلتے چلتے رکے اور کہا۔ اور بقول مسز ارتضیٰ زیدی انہوں نے کہا ''عزت دار انسان کے لئے یہی بہت کچھ ہے۔ اس کے آگے اور کیا ہے۔ مجھے سولی پر لٹکا دیں گے۔ لٹکا دیں۔ مجھے پرواہ نہیں۔'' ۔۱۳۳ ان حالات سے علم ہوتا ہے کہ داخلی طور پر مصطفیٰ زیدی کس کرب اور شدید ٹوٹ پھوٹ سے ہمکنار تھے۔ بقول مسعود اشعر

> بٹی ہوئی اور ٹکڑے ٹکڑے شخصیت نے اس کے اندر جو طوفان بپا کر رکھا تھا۔ وہ اسے کہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ جب اسکا عہدہ اور عہدہ کے تقاضے اسکو پارہ پارہ کرتے۔ تو وہ اپنے آپکو مجتمع کرنے کیلئے ادب اور شعر کا سہارا لیتا۔ ۔۱۳۴

اس ضمن میں مسعود اشعر نے راقمہ کو دوران گفتگو بتایا کہ ''ملازمت سے برخاست ہونے پر مصطفیٰ زیدی بہت Disgrace ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے اس کے بعد خود کو سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔'' ۔۱۳۵ لیکن اس کے اندر اپنے عہد سے، ماحول سے، لوگوں سے، اصحاب با اختیار سے جو رنجش تھی۔ ناراضگی تھی۔ وہ کسی طور کم نہ ہوئی۔ ان نامساعد حالات کی زد میں اب صرف ایک ادیب تھا۔ اور اس کی حساس فطرت کی آزمائش۔ بقول واصل عثمانی ''وہ احتجاج کرتے رہے۔ اس سماج سے احتجاج۔۔۔ حیات سے احتجاج، دولت سے، احباب سے احتجاج، اور اسی جدوجہد اور کشمکش میں اپنی زندگی گزار دی۔۔۔'' ۔۱۳۶

دستار کیسے پھینک دوں ٹھوکر کے واسطے
مے خانہ کیسے چھوڑ دوں دفتر کے واسطے

کچھ میں ہی جانتا تھا جو مجھ پر گزر گئی

دنیا تو لطف لے گئی میرے واقعات میں
آگ لگ جائے جو گھر میں تو چلو جشن ہوا
اپنے معمول کی اس راکھ سے شعلے اچھے

مصطفیٰ زیدی کی حادثاتی موت کے محرکات میں ایک اور محرک بھی موجود ہے۔ اور وہ ہے مصطفیٰ زیدی کی خطر پسند فطرت۔ اس خطر پسندی کے پیچھے مصطفیٰ زیدی کی بے باکی اور جرأت مندی کا پہلو موجزن تھا۔ اس خطر پسندی نے انہیں نہ صرف ادبی حلقے اور سرکاری ملازمت کے مخصوص ماحول میں نڈر اور بے باک بنا دیا تھا۔ بلکہ عام معمولاتِ زندگی کے جائزے سے بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ زیدی زندگی کی ہر راہ پر خطروں سے کھیلنے میں لذت محسوس کرتے تھے۔ ''ایک بار ملتان سے ساہیوال جاتے ہوئے اس نے تیز گام کے ساتھ دوڑ لگا دی۔ اور پورے اسی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے اعلان کیا۔ کہ تیز گام ستر میل سے زیادہ کی رفتار سے جا رہی ہے۔''۔۱۳۷ یہ ایک ایسا رویہ ہے۔ جو ظاہر کرتا ہے۔ کہ مصطفیٰ زیدی زندگی کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر خطرات کو مول لیتے تھے۔ یہ رویہ انسان کے اندر ناموافق ماحول سے بغاوت کے جراثیم بھی پیدا کرتا ہے۔ اور اسی کے حوالے سے انسان زندگی کے ہر تجربے اور ہر معاملے میں موقع کی نزاکت کو دیکھے بغیر خطرات کی بھٹی میں کود جانے کی جرأت بھی پاتا ہے۔ ''اس کی تیز رفتاری بھی اپنے آپکو تباہ کرنے اور اپنی ذات کو نمایاں کرنے کا ایک حصہ تھی۔ اس نے کبھی ساٹھ ستر میل کی رفتار سے کم نہیں چلائی۔''۔۱۳۸

اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے۔ کہ مصطفیٰ زیدی کی فطرت میں انتہا درجہ کی جو جذباتی شدت پسندی تھی۔ وہ ان کی خطر پسند فطرت کے لیے بڑی معاون ثابت ہوئی۔ لہذا زیدی زندگی کے ہر گام پر احتیاط کا دامن چھوڑتے چلے گئے۔ احتیاط کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ خود اکثر نت نئے اور متنازع موضوعات و معاملات کو پھیلانے کی وجوہ بن جاتے تھے۔ ان کی خطر پسندی کا یہ انداز ایک طرف تو ان کی مخصوص فطرت کا حوالہ بنتا ہے۔ تو دوسری طرف اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ماحول اور سماج سے ناراض ادیب اپنے اندر ہی اندر کس طرح گم ہوتا، اور زمانے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ تب وہ ہر وہ بات سوچتا ہے۔ ہر وہ کام کرتا ہے۔ جس سے سماج کچھ سوچے، اس میں الجھے۔ اور خود اس کی ذات اپنے آپ میں مگن رہے۔ لیکن یہ درحقیقت ادیب کی ہی موت ہے۔ اسکا خود اپنی ہی ذات سے دشمنی کا ایک طریقہ کار ہے۔ اور اپنی ہی صلیب پر خود مصلوب ہونے کا عمل۔ زیدی بلاشبہ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار تھے۔ بقول مسعود اشعر

۔۔۔ وہ تو خود بھی اپنا دشمن تھا۔ اپنے آپکو تباہ کرنے اور اپنی تباہی پر دوسروں کو ہنستا دیکھ کر خود بھی خوش ہونے کا حوصلہ رکھتا تھا۔۔۔ جو افواہیں لوگ نہیں پھیلا سکتے تھے۔ وہ خود ہی پھیلاتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ اس طرح میں لوگوں کو Shock پہنچاتا ہوں ۔۔۔۱۳۹

مصطفیٰ زیدی کے اس مخصوص رویے اور خطر پسند فطرت نے رفتہ رفتہ اپنے لیے انتہائی غیر محتاط راستے کا انتخاب کیا۔ جسکا ایک بڑا واضح اور نمایاں حوالہ ان کی اچانک موت کے ساتھ وابستہ ہے۔

زمانہ بدستور ہنستا رہے گا، زمین حسب معمول جلتی رہے گی
اکیلے سفر کا اکیلا مسافر، اس انجام سے بے خبر بھی نہ تھا
شہر در شہر پھری میرے گناہوں کی بیاض

بعض نظروں پہ مرا سوزِ حکیمانہ کھلا

گویا خطرات میں الجھنا، کسی کو خاطر میں نہ لانا اور اپنے وجود کے اعتماد اور اس کی گواہی میں جینا زیدی کے ضمیر میں شامل تھا۔ انہیں اس میں ایک طرح سے لطف ملتا تھا۔ چنانچہ ان کی حادثاتی موت کا یہ بھی ایک محرک دکھائی دیتا ہے۔ مصطفیٰ زیدی کی موت کے محرکات میں ایک اہم ترین محرک ان کی جمال پسند فطرت بھی ہے۔ جمال پسندی کا عنصر کسی نہ کسی تناسب میں ہر شاعر اور ادیب کے یہاں موجود ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ادیب عام و عامی کی نسبت جہاں زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہاں اس کے جذبات کے نازک آبگینوں میں خوبصورت شئے سے والہانہ وابستگی کا پہلو بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اسکا تخلیقی عمل اس سے نمو پذیر رہتا ہے۔ اسی سے اسکا شعر و نغمہ، اسکا فن نکھرتا اور توانا ہوتا ہے۔

> شاعر ہونے کی حیثیت سے حسن و رعنائی سے قربِ خاطر تھا۔ کوئی پیارا، سہانا سا منظر ہو۔ یا کوئی اچھی خوبصورت شئے۔ اس کے دل میں ہل چل کی کیفیت، مفکرانہ سوز اور الہامی گداز کا روپ دھار کر اس کے شعروں کی صورت میں تخلیق حسن کا باعث بنتی تھی۔ ۔۱۴۰

لیکن مصطفیٰ زیدی کے یہاں اس حوالے سے جو صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے۔ کہ زیدی کی جمال پسندی نہ صرف جمال پرستی کی حدود تک پہنچ گئی تھی۔ بلکہ اکثر و پیشتر وہ اپنی حدود سے متجاوز کر گئی۔ ان کی شدید جذباتیت کے باعث حسن پرستی کا یہ عالم ہے کہ آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے۔

> وہ جس چیز کو پسند کرتا تھا۔ تو اسکو حاصل کرنے کے لئے بچوں کی طرح بے تاب ہو جاتا تھا۔ اور ضد کرتا تھا۔۔۔ کسی دوست کے پاس اچھی ڈائری دیکھی۔ اسے پسند آئی۔ تو وہ اس وقت تک بے چین رہتا تھا۔ جب تک کیلنڈر یا ڈائری اپنے قبضے میں نہ کر لے۔ ۔۱۴۱

یہ عالمِ شوق واضح طور پر پتہ دیتا ہے۔ کہ مصطفیٰ زیدی رومانوی ذہن کے حامل تھے۔ ہر خوبصورت شے کے ساتھ عشق، مناظرِ فطرت کے سحر میں غرقاب، شدید جذباتیت، آزادہ روی، سماج کی تمام حدود و قیود سے بغاوت، انفرادیت پسندی، اپنے خوابوں میں زندہ رہنا اور اپنی تراشیدہ دنیا کا باسی بننا انہیں راس آتا ہے۔

> دراصل وہ بچہ تھا۔ لاڈلا بچہ، اپنی ہٹ کا پکا۔ بچپن سے چاند کی طرف دیکھنے کی جو عادت پڑی۔ تو ہمیشہ ناممکن کو ممکن بنانے کی تگ و دو میں لگا رہا۔ یہ چاند آسمان پر کیوں چمک رہا ہے۔۔۔ یہ کتاب تمہارے پاس کیوں ہے۔ میری لائبریری میں کیوں نہیں ہے۔۔۔ اس کی سب سے بڑی پریشانی یہ تھی۔ کہ دنیا کی ساری خوبصورتی، رعنائی اس کے قبضے میں کیوں نہیں ہے۔ ۔۱۴۲

یہ مصطفیٰ زیدی کی انتہا پسندی تھی۔ جس نے انہیں کسی مرحلے پر مطمئن نہیں ہونے دیا۔ آگے ہی آگے بڑھتے جانا۔ نہ فکرِ فردا اور نہ غمِ دوش کا خیال ان کے پیشِ نظر تھا۔ ایک بے خوفی کا عالم ان کے ہمراہ تھا۔ یہ بے خوفی ان کے لئے انفرادیت کی حامل راہیں تلاش کرتی رہی۔

> وہ ہر کام میں، ہر بات میں انفرادیت چاہتا تھا۔ ایک انفرادیت جس سے وہ لوگوں کو

چونکا دے۔۔۔سب سے پہلا جو عشق کیا۔ وہ غیر مذہب کی لڑکی سے۔ اور بہت زمانے بعد جب شادی کی۔ تو وہ بھی غیر مذہب اور غیر ملکی لڑکی سے۔۔۔۔ ۱۴۳

مصطفٰے زیدی کی جمال پرست نگاہ، رومانوی ذہن اور ان کے شدید جذباتی پن نے ان کی زندگی میں حسیناؤں اور مہ جبینوں کے قصوں کی تازگی کو کبھی کم نہ ہونے دیا۔ وہ ان عشقیہ داستانوں کا عنوان تو بنتے رہے۔ لیکن کسی ایک کے ساتھ وہ سنجیدہ نہ ہوئے۔ البتہ یہ جذبہ انہیں اکثر اوقات شدید جذباتی دباؤ میں مبتلا کرنے کا باعث بنا۔ مسعود اشعر لکھتے ہیں۔

> یہ سن ۱۹۵۲ء کے آخر کا ذکر ہے۔ کہ وہ ان دنوں الہ آباد، ایک عشق کی پاداش میں لاہور بھیجا گیا تھا۔ اور ہم شیشے کے کھلونے کی طرح اس کی حفاظت کر رہے تھے۔۔۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے ہوک اٹھی، سروج۔ وہ ساری رات آنسوؤں سے تکیہ بھگوتا رہا۔۔۔ ۱۴۴

یہ زمانہ طالب علمی کا ابتدائی عشق تھا۔ بھرپور عہد شباب، جذبات کی شدت سے بھیگی ہوئی عمر۔ اور پھر یہ قصے، یہ عشقیہ معاملات رفتہ رفتہ ان کی زندگی کا اوڑھنا، بچھونا بن گئے۔ یہاں بھی صورتِ حال اسوقت عدم توازن کا شکار ہوئی۔ جب زیدی نے نہ صرف اپنے مزاج اور طرزِ زندگی کو ہی عشق و عاشقی کے مخصوص رنگ میں ڈھال دیا۔ بلکہ رفتہ رفتہ یہ انکا محبوب مشغلہ بن گیا۔ جو بہت بعد میں اسی مخصوص حوالے سے ان کی اچانک اور حادثاتی موت کا محرک بھی بنا۔ لیکن جہاں تک مصطفٰے زیدی کے ابتدائی عشق کے معاملے کا تعلق ہے۔ زیدی کے دوست، احباب اور ناقدین سبھی کا کہنا ہے۔ کہ اس عشقیہ واردات نے واقعی زیدی کی جذباتی زندگی میں ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ جس نے مدتوں انہیں بے خود اور مدہوش رکھا۔ بقول احمد علی سید

> سروج کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کے روپ میں اس کے شعور پر چھائی ہوئی تھی۔ سروج کے بارے میں ہم لوگ اس زمانے صرف اسقدر جانتے تھے۔ کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ جس کی تصویر زیدی اپنی بیاض کے کور میں چھپا کر رکھتا تھا۔ زیدی یہ تصویر کسی کو نہیں دکھاتا تھا۔ لیکن ایک دن مسعود اشعر نے یہ تصویر چپکے سے دیکھ لی تھی۔ پھر میں نے بھی یہ تصویر دیکھی۔ اور مسعود اشعر نے ڈرامائی انداز میں کہا۔
>
> "For such a beauty,
>
> Let Zaidi cry."
>
> اب مجھے یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ سروج محض ایک علامت تھی۔ فریبِ نظر کی علامت۔۔۔ ۱۴۵

یہ فریب نظر کیا تھا۔؟ یہ بنیادی طور پر مصطفٰے زیدی کی حسن پرست نگاہ تھی۔ جو ان کے شاعرانہ مزاج کی اصل روح تھی۔ حسن جہاں کہیں تھا۔ یہ نگاہ اس کی متلاشی تھی۔ اس میں توازن ٹھہراؤ اور اس سے متعلقہ معاملات میں سنجیدہ نظری اسوقت پیدا ہو سکتی تھی۔ جب بحیثیت انسان مصطفٰے زیدی کے اندر لاابالی پن اور شدید جذباتیت کا پہلو متقاضی حدود و قیود کا پابند ہوتا۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ نامساعد حالات کے دھارے اس طرح انکے شریکِ زندگی ہوئے۔ کہ بحیثیت ادیب ان کی حساس فطرت ادب کے حلقے میں اپنی ناقدری کا غم اندر ہی اندر کھانے لگی۔ اور پھر اعلیٰ سرکاری

منصب کی نزاکتیں اور اس کے مسائل نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ابھی وہ اپنے ہم منصبوں کی سازشوں کے شاکی تھے۔ کہ ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے۔ ان تمام عوامل نے مصطفیٰ زیدی کی زندگی میں ان گنت مسائل پیدا کیے ہوں یا نہ کیے ہوں۔ لیکن یہ ضرور ہوا۔ کہ ان کے اندر کا ادیب مر گیا۔ چونکہ شخصیت دبنگ تھی۔ اس لیے بظاہر وہ ٹوٹ پھوٹ دکھائی نہ دی۔ جوان حالات میں کسی عام و عامی کے حوالے سے دیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن خارجی عوامل کا یہ جبر یقینی طور پر ایک ادیب کی شخصیت کو داخلی طور پر توڑ پھوڑ گیا۔ یہ ایک جینئس کا، ایک شاعر کا اپنے عہد میں ذات و کائنات کے حوالے سے المیہ ہے۔ چنانچہ مصطفیٰ زیدی کی تخلیقی صلاحتیں مثبت سطح پر فعال ہونے سے زیادہ منفی سطح پر متحرک ہو گئیں۔ اور وہ عارضی طور پر ہی سہی۔ حسن کی ظاہری چکا چوند میں پناہ اور سکون ڈھونڈنے لگے۔

بقول مسعور اشعر ''عورتوں سے تعلقات رکھنے والی عادت مصطفیٰ زیدی کیلئے بے حد نقصان دہ ثابت ہوئی۔ یہ پہلوان کی موت کا اہم محرک ہے۔'' ۔۱۴۶ لطیف کاشمیری لکھتے ہیں'' ۔۔۔ظاہری جذب وکشش نے اس کے مزاج میں عاشقانہ رنگ کو ابھار کر اسے اپنی طلسمی آغوش میں دبوچ لیا تھا۔ وہ کیفے ہاؤسوں اور کلبوں کی نشاط انگیز زندگی کا عادی ہو چکا تھا۔'' ۔۱۴۷ ان اخلاقی کمزوریوں کے مزید جو نتائج بر آمد ہوئے انہی کا شاخسانہ تھا۔ کہ ''جنس'' مصطفیٰ زیدی کی زندگی کا مرکز و محور بن گئی۔ حتیٰ کہ ایک مکتبہ فکر کے نزدیک جنس کا حوالہ ہی ان کی حادثاتی موت کا بنیادی محرک ثابت ہوا۔ بقول افتخار عارف ''مصطفیٰ زیدی نے خودکشی کی اور اس میں جنس اور نفسیاتی حوالہ ہی اس کے ساتھ منسلک نظر آتا ہے۔ شہناز کے ساتھ ارادتاً پینا اور اکٹھے مرنے کی خواہش تھی۔'' ۔۱۴۸

جبکہ مشتاق احمد یوسفی نے دورانِ ملاقات اس ضمن میں کہا۔

> زیدی کی موت خودکشی سے واقع ہوئی ہے۔ اور اس کے بنیادی عوامل جنسی معاملات سے وابستہ ہیں۔ نشہ کئی طرح کا ہوتا ہے۔ اقتدار کا نشہ، اختیار کا نشہ، حسن کا نشہ، طاقت کا نشہ، علم کا نشہ اور اسی طرح جنس کا بھی اپنا نشہ ہے۔ زیدی میں یہ نشہ اس انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ جس نے بالآخر ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۴۹

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کہتے ہیں۔ ''مشفق خواجہ نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا۔ کہ مصطفیٰ زیدی اور شہناز گل دونوں نے ملکر خودکشی کا پروگرام بنایا تھا۔ اس اقدام میں شہناز تو بچ گئی۔ لیکن مصطفیٰ زیدی جان سے گزر گئے۔'' ۔۱۵۰ پروفیسر توصیف تبسم نے اس حوالے سے قدرے مختلف زاویۂ فکر سے بات کی۔ ''ممکن ہے کہ زیدی نے شعوری طور پر خودکشی نہ کی ہو۔ لیکن جنسی نوعیت کی جو دوا استعمال کی۔ اس کی مقدار میں زیادتی ان کی موت کا سبب بن گئی ہو'' ۔۱۵۱ ان تمام نقطہ ہائے نظر میں جنس کا حوالہ یقینی طور پر موجود ہے۔ جو مصطفیٰ زیدی کے حوالے سے نہ تو اس وقت کسی سے پوشیدہ تھا۔ نہ زیدی نے اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی۔ اور نہ آج کے ناقد کی نگاہ سے یہ پہلو اوجھل ہے۔ اور اس معاملے میں حدود سے تجاوز کرنے میں مصطفیٰ زیدی کی مخصوص فطرت جو شدید جذباتیت اور انتہا پسندی سے عبارت ہے۔ نمایاں نظر آتی ہے۔ اور یہ ایک افسوس ناک امر ہے۔ کہ اپنے عہد کے جینئس اور نامور ادیب کی موت کے محرکات میں ''جنسیات'' نے اہم کردار ادا کیا۔

یہاں موضوع بحث یہ بات نہیں کہ مصطفیٰ زیدی کی موت خودکشی تھی یا قتل۔ کیونکہ یہ براہ راست میرے مقالے کا موضوع نہیں۔ لیکن یہاں وہ محرکات ضرور اہمیت کے حامل ہیں۔ جنہوں نے ایک ادیب کی موت، جو حادثاتی طور پر واقع ہوئی۔ میں اہم کردار ادا کیا۔ مصطفیٰ زیدی کی موت اور اسکے پس منظر کے مطالعے اور تجزیے سے جو حقائق

سامنے آئے ہیں۔ان سے علم ہوتا ہے۔کہ زیدی کو جیسے اپنی غیر فطری موت کے وقوع پذیر ہونے کا کسی قدر کھٹکا، اندیشہ یا ایک انجانا سا وہم و خوف ضرور لاحق تھا۔وہ ان حالات کو لاشعوری طور پر خطرے کی بو کے طور پر محسوس کر رہے تھے۔یا یہ کہ جس ڈگر پر ان کی زندگی اور زندگی کی مخالف قوتوں کا دھارا بہہ رہا تھا۔وہ بخوبی سمجھتے تھے۔ کہ اسکا انجام کیا ہوسکتا ہے۔ایک عدم تحفظ کی فضا ان کے چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

بقول لطیف کاشمیری

> زیدی جس عہد میں سانس لے رہا تھا۔اس کی خونخواری کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔لیکن اسے شاید اس عہد کے مکر کی چالوں، پُر فریب اور پیچیدہ طریق انتقام کی خبر نہ تھی۔وہ سمجھتا تھا۔کہ اسے کسی بھی وقت ایتھنز کے بوڑھے فلسفی کی طرح سیدھے سبھاؤ زہر کا پیالہ تھما کر کہا جائے گا۔کہ یا تو اپنے افکار اور نظریات سے توبہ کرلو۔یا زہر پی لو۔اور وہ موخر الذکر شرط قبول کرلے گا۔ -۱۵۲

اس طرح کی کیفیت اور اس کے واضح اشارے مصطفےٰ زیدی کی شاعری میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔

شہر کے کوچہ و بازار میں سناٹا ہے
آج کیا سانحہ گزرا خبر تو لاؤ
ساری دنیا میں گھنی رات کا سناٹا ہے
صحنِ زنداں میں ملے صبح کے آثار مجھے

دیوانے کو تکتی ہیں تیرے شہر کی گلیاں
نکلا تو ادھر لوٹ کے بدنام نہ آیا

تمام شہر پہ آسیب سا مسلط ہے
کوئی چراغ جلاؤ، کوئی حدیث پڑھو

گویا ایک عدمِ تحفظ کی فضا ان کے چاروں طرف پھیل رہی تھی۔وہ اپنی ذات میں تنہا ہوگیا تھا۔موت کا احساس "اپنی زندگی کے "ختم ہونے" یا "ختم کر دیئے جانے" دونوں طرح کے احساسات ان کی شاعری میں موجود ہیں۔

اب جی حدودِ سود و زیاں سے گزر گیا
اچھا وہی رہا، جو جوانی میں مر گیا
زنجیر ماتمی ہے، تم ، اے عاقلانِ شہر
اب کس کو پوچھتے ہو ، دوانہ تو مرگیا
خود کو تاراج کرو، زندگیاں کم کر لو
جتنا چاہو دل شوریدہ کا ماتم کر لو

اس طرح کے محسوسات پتہ دیتے ہیں کہ مصطفےٰ زیدی اپنے آس پاس خطرے سے بھرپور فضا کو پوری طرح

محسوس کرر ہے تھے۔ جو بالآخران کی جوانمرگی کا عنوان بنی۔ اس ضمن میں مصطفیٰ زیدی کے قریبی دوستوں اور اہل خانہ کے حوالے سے جو بات سامنے آئی ہے۔ وہ یہ کہ خودکشی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور یہ کہ زیدی جلد از جلد جرمنی جانے کی مکمل تیاری کر چکے تھے۔ لہٰذا وہ قتل کیے گئے۔ مصطفیٰ زیدی کے قتل کیے جانے کے ضمن میں دو حوالے دیئے جاتے ہیں۔ اور ان دونوں حوالوں کی اپنی جگہ اہمیت ضرور ہے۔ ایک تو مصطفیٰ زیدی کی جمال پرست فطرت اور ان کی زندگی کے نشاطیہ رنگ۔ اسی حوالے سے شہناز گل نامی خاتون ان کی زندگی میں داخل ہوئی۔ جس کے ساتھ زیدی کا جذباتی تعلق ان کی موت کے وقت انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔ یہ خاتون نہ صرف خوبصورت تھی۔ بلکہ ملکی و غیر ملکی سطح پر سمگلنگ کے گروہ کی سرغنہ تھی۔

بقول شاہد رضا

> شہناز ٹیوٹا کاروں کی بزنس اور سمگلنگ کے دھندے سے منسلک تھی۔ اس کے شوہر کے کاروبار کی نوعیت بھی اس قسم کی تھی۔ بلکہ وہی شہناز کے ساتھ افسران بالا کے تعلقات قائم کروا کر اپنے بزنس کو چمکا رہا تھا۔ شہناز کے اس منظم گروہ میں کئی کال گرلز بھی اس حوالے سے شامل تھیں۔ سرکاری افسران کو اپنے چنگل میں پھانسنا اور اپنے ناجائز کاروبار کے لیے راستے ہموار کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ چونکہ مصطفیٰ زیدی جو اس وقت اعلیٰ سرکاری منصب پر فائز تھے۔ ان کے نرغے میں آ گئے۔ ۱۵۳

یہاں شہناز گل اور مصطفیٰ زیدی کے تعلقات میں سرکاری منصب کی اہمیت کے علاوہ زیدی کی حسن پرست فطرت بھی پوری طرح شریک ہے۔ بقول مسز فرحت زیدی ''مصطفیٰ اکثر کہتے تھے۔ وہ (شہناز گل) اتنی خوبصورت ہے۔ کہ تم لوگ اسے ایک نظر دیکھو۔ تو بس دیکھتے رہ جاؤ۔'' ۱۵۴

مصطفیٰ زیدی جس رات حادثاتی موت کا شکار ہوئے۔ شہناز گل مصطفیٰ زیدی کے فلیٹ میں نہ صرف موجود تھی۔ بلکہ اس حادثے اور ڈرامائی موت کا ایک کردار تھی۔ اور ایک عام رائے یہ ہے۔ کہ شہناز گل ہی اس قتل کا محرک ثابت ہوئی۔ اس حادثے اور تمام واردات میں شہناز گل نیم بے ہوشی کے عالم میں زندہ رہی۔ جبکہ مصطفیٰ زیدی کی موت واقع ہو گئی۔

بقول علامہ نصیر ترابی

> میں اس موقع پر وہی بیان دہراؤں گا۔ جو میں نے اس وقت کورٹ میں دیا تھا۔ اور وہ یہ کہ شہناز اور مصطفیٰ زیدی جائے حادثہ پر جس حالت میں پائے گئے۔ کہیں سے بھی جنسی معاملات کی نوعیت اس سے ثابت نہیں ہوتی۔ دونوں الگ الگ کمروں میں تھے۔ مصطفیٰ زیدی بیڈ روم میں مردہ حالت میں بستر پر پڑے تھے۔ جبکہ شہناز گل دوسرے کمرے یعنی ڈرائنگ روم میں نیم بے ہوش پڑی تھی۔ دونوں کے بدن پر پورے کپڑے تھے۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ کچن کا باہر کی طرف دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہناز کے ایماء پر کوئی نیت قتل سے گھر کے اندر داخل ہوا۔ اور پھر شہناز اور زیدی دونوں کو جو نشہ دیا گیا۔ یا بصورت دیگر دونوں نے خود لیا۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق اس نشہ کے استعمال کے اوقات کار کی نشاندہی دونوں کے حوالے سے مختلف تھی۔ مصطفیٰ زیدی کو اس نشے کی مدہوشی رات کے ابتدائی وقت میں

ہوئی۔ جبکہ شہناز قربِ سحر کے لگ بھگ نشہ کی کیفیت میں مبتلا ہوئی۔ ۔۱۵۵

ان حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصطفیٰ زیدی کے قتل میں شہناز شریک کار تھی۔ اس ضمن میں مصطفیٰ زیدی کے اہل خانہ سے بات ہوئی تو انکی بھابھی مسز ارتضیٰ زیدی نے کہا۔

مصطفیٰ کی جس طرح کی عادت تھی۔ جذباتی تعلق میں سنجیدہ ہو جاتے تھے۔ اس صورتِ حال میں شہناز کی ملی بھگت سے زیدی کو راستے سے ہٹا دیا گیا۔ کیونکہ شہناز تو بزنس پوائنٹ آف ویو سے ان کے جذبات میں شریک تھی۔ ۔۱۵۶

اس ضمن میں شاہد رضا نے کہا۔

میں ان دنوں کراچی میں تھا۔ شام کے وقت میں مصطفیٰ زیدی کے فلیٹ پر آیا۔ اور حسب معمول سوئمنگ کے لئے چلے گئے۔ یہ وہی دن تھا۔ جس رات زیدی قتل ہوئے۔ زیدی نے کہا۔ تم خود چلے جاؤ۔ اسوقت شہناز آئی ہوئی تھی۔ ۔۱۵۷

اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے شاہد رضا کا کہنا ہے۔ ''میں نے اسی شام شہناز گل کے شوہر کو مصطفیٰ زیدی کے گھر کے آس پاس دیکھا تھا''۔ ۱۵۸ اس تمام صورتِ حال کے پیشِ نظر دورانِ تحقیق مختلف ذرائع سے جو بات واضح طور پر سامنے آئی ہے۔ وہ یہ کہ زیدی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں خطرے سے بھرپور ایک مخصوص فضا میں گھر چکے تھے۔ مصطفیٰ زیدی کی بھابھی مسز فرحت ارتضیٰ اس ضمن میں کہتی ہیں۔

زیدی بھائیوں کے ایک مشترکہ دوست اشتیاق ان دنوں الہ آباد سے آئے ہوئے تھے۔ اشتیاق ہمارے گھر کے فرد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے کراچی سے ہمیں خط لکھا کہ مصطفیٰ کی فکر کرو۔ وہ خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ ۔۱۵۹

خطرات یقیناً اس نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ جن کے تحت بقول زیدی خاندان، انہیں جلد ہی بعد میں قتل کروا دیا گیا۔ صورتِ حال اس ضمن میں کچھ بھی ہو۔ لیکن یہ بات طے ہے۔ کہ اسوقت مصطفیٰ زیدی کی زندگی ایک پر خطر منصوبہ بندی کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی۔ جسکا اظہار ان کی شاعری میں بھی کسی نہ کسی حوالے سے ملتا ہے۔

میں ایسا سہم گیا تھا کہ میرا سایہ بھی
ڈرا رہا تھا مجھے دشتِ بے اماں کی طرح

مصطفیٰ زیدی کے بیشتر احباب کا کہنا ہے۔ کہ انہیں باقاعدہ منصوبے کے تحت قتل کروایا گیا۔

بقول شاہد عشقی

۱۳ ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو کے۔ڈی۔اے اسکیم نمبر ایک کے فلیٹ میں اس کی لاش اس طرح بکھری پڑی تھی۔ کہ ناک، چہرے اور بستر پر خون کے دھبے تھے۔ ٹیلی فون الٹا پڑا تھا۔ اور اس کا تار اس کے سینے پر تھا۔ اسے خودکشی کہیے یا قتل۔۔۔۔ ۱۶۰

مصطفیٰ زیدی کے قتل کیے جانے کے خیال کا ایک اور حوالہ جو قرینِ قیاس بھی ہے۔ وہ مصطفیٰ زیدی کا اعلیٰ سرکاری منصب پر فائز ہونا ہے۔ اس عہدے کے حوالے سے مصطفیٰ زیدی کے اختیارات، سرکاری افسر کی حیثیت سے ان

کی نڈر، دبنگ اور بے باک شخصیت اکثر حکومتی اور سرکاری حلقوں میں کھٹک رہی تھی۔ اسکا ایک حوالہ مصطفیٰ زیدی کا اس سرکاری عہدہ سے برطرف کیا جانا ہے۔ لہذا اس ضمن میں زیدی کے قتل کیے جانے کا اندیشہ رد نہیں کیا جاسکتا۔
بقول ڈاکٹر احسن فاروقی

مصطفیٰ زیدی کی موت کس طرح اور کس ذریعے سے ہوئی میں تو یہی کہوں گا۔ کہ انتظامی ملازمت نے انہیں مروا کر ہی چھوڑا۔ اور ان اعلیٰ امکانات کو آخر ختم ہی کر دیا جن کی طرف ان کی شاعری جا رہی تھی۔ ۔۱۶۱

اس ضمن میں ایک رویہ یہ بھی ہے۔ کہ شہناز کے چونکہ اسوقت کے حکمران سے بھی جذباتی روابط تھے۔ لہذا شہناز کے لئے زیدی کی بڑھتی ہوئی وارفتگی کے باعث انہیں درمیان سے ہٹانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں علامہ نصیر ترابی نے زیدی کی ایک نظم کا حوالہ دیا جسکا ایک مصرعہ انہوں نے اسی وقت سنایا۔

''اب میرا رقیب ہے صدرِ مملکت یارو''۔ ۱۶۲

گویا مصطفیٰ زیدی اپنے بارے میں ان دبی، گھٹی اور پوشیدہ سازشوں سے آگاہ تھے۔ جو سرکاری حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔ بہرحال ان تمام حالات کی ستم خیزی اور اسوقت کے حکمران طبقے نے قتل کے حوالے سے زیدی کی موت کے تمام امکانات پر پردہ ڈالا۔

مصطفیٰ زیدی نے شہناز گل کے حسن و جمال اور اس سے اپنی جذباتی وابستگی پر جو نظمیں لکھیں۔ وہ اس تمام صورتِ حال کو بہت واضح طور پر عیاں کرتی ہیں۔ یہاں خودکشی یا قتل کے حوالے سے ایک نتیجے پر پہنچنا چونکہ میرا موضوع نہیں۔ لیکن یقیناً ان دونوں طرح کی صورتِ حال اور محرکات سے بحث ان نکات اور عوامل کو ضرور سامنے لاتی ہے۔ جو ایک ادیب کی غیر فطری موت کا سبب بنے۔ کیونکہ ان دونوں صورتوں میں محرکات کم و بیش ایک سے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ایک ادیب نے خود ناسازگار حالات میں اپنی زندگی ختم کر لی یا سماج نے ایسے ناموافق حالات اور زاویے پیدا کیے۔ جن کے ہاتھوں وہ ڈرامائی انداز میں قتل کر دیئے گئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ قتل یا خودکشی دونوں طرح کے ممکنات مصطفیٰ زیدی کی حادثاتی موت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے۔ کہ مصطفیٰ زیدی نے خودکشی کی۔ تو اس ضمن میں مندرجہ ذیل عوامل اس بات کو تقویت دیتے ہیں۔

مصطفیٰ زیدی انتہائی جذباتی اور رومانوی مزاج رکھتے تھے۔ ان کی مختصر زندگی، ان کا عہد شباب کئی معاشقوں کی المناک داستانوں سے وابستہ ہے۔ عشق و عاشقی کے ان معاملات میں زیدی کئی مرتبہ خود فراموشی اور بے ہوشی کے مراحل سے گزرے۔ ان کی فطرت شاعرانہ تھی۔ اس نے ان کے اندر حد درجہ تندی و تیزی پیدا کر دی تھی۔ ان کی شدید جذباتی طبیعت ہر بات کا فوری اور شدید اثر لیتی تھی۔ شاہد رضا نے اس ضمن میں ایک واقعہ سنایا کہ مصطفیٰ زیدی جب لاہور میں تھے۔ تو انہوں نے مجھے لکھا کہ

اگر تم جلد لاہور میرے پاس نہ آئے۔ تو میں خودکشی کر لوں گا۔ ان کا انداز انتہائی جذباتی تھا۔ میں جب وہاں پہنچا۔ تو وہ بالکل ٹھیک تھے۔ ایسا انہوں نے مجھے جلد از جلد اپنے پاس بلوانے کے لئے لکھا تھا۔ ۔۱۶۳

اس سے مصطفیٰ زیدی کی مخصوص فطرت کا علم ہوتا ہے۔ کہ وہ بعض اوقات شدتِ جذبات میں اپنی جان سے

گزر جانے کی بات کرتے تھے۔ اسی حوالے سے مصطفیٰ زیدی ''کوہ ندا'' کے حرف آخر میں لکھتے ہیں۔

میرے ملک کے معاشرے میں اپنے جامد نظریے کے علاوہ کسی اور نظریے کو قبول کرنا تو کیا برداشت کرنے تک کا ظرف نہیں ہے۔ لہذا جب معاشرہ ایک فرد کو قبول نہ کرے۔ اور فرد اس معاشرے سے مصالحت پر آمادہ نہ ہو۔۔ تو خودکشی یا فرار کے سوا ایک چارہ اور رہ جاتا ہے۔ کہ قصائیوں کی چھریوں سے خود کو ذبح کرانے کے لئے ہر وقت تیار رہا جائے۔ ۱۶۴

یہاں ایک فنکار اپنے عہد کا نہ صرف شاکی دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ اس کے اندر کا اضطراب اور شدید کرب پوری طرح عیاں ہے۔ اور اس سے سماج اور فنکار کے درمیان عدم مفاہمت کی صورتِ حال کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن اس سے عملی طور پر ان کی خودکشی کرنے کی بات کو حتمی شکل نہیں دی جاسکتی۔ خودکشی کرنے کے اشارے اور خواہش مرگ ان کے اشعار میں بھی کہیں کہیں موجود ہے۔

ایک بزدل میرے سینے میں بڑی دیر سے ہے
جرأت خود کشی و قتل اعزا مدد دے

بوقتِ قتل بہت دور میرے سارے عزیز
صف آزما تھے نگہباں آسماں کی طرح

اب میرے قاتل کو چاہو
میرا قاتل ، مرہم مرہم، دریا دریا ، ساحل ساحل

خودکشی اور موت کے حوالے سے یہ اشعار شاعرانہ سوچ کا حصہ بھی ہوسکتے ہیں۔ البتہ خودکشی کے حوالے سے جو اشعار ملتے ہیں۔ ان میں جذباتیت کا پہلو ہے۔ جبکہ موت کے موضوع پر ان کے اشعار ایک شاعر کی ذہانت اور اس کی فکری جہت کو آشکار کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ موت خودکشی سے واقع ہوئی۔ تو بھی یہ نہ تو زندگی سے فرار تھا۔ نہ ہی مصطفیٰ زیدی قنوطی تھے۔ نہ ہی انکے کوئی معاشی مسائل تھے۔ بلکہ ان کی گھریلو اور ازدواجی زندگی بہت پرسکون اور مطمئن تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور تھے۔ بقول مسز فرحت ارتضیٰ زیدی ''مصطفیٰ بچوں میں بچہ بن جاتے تھے۔ ان کے ساتھ ہنستے کھیلتے، ان کی زبان اور مزاج سے بات کرتے۔ ان کے آنے سے پورے گھر میں جیسے زندگی دوڑ جاتی تھی۔'' ۱۶۵

مصطفیٰ زیدی کے اکثر احباب نے بھی اس ضمن میں یہ رائے دی۔ کہ وہ زندہ دل اور شوخ طبع تھے۔ محفل پر چھانے کا سلیقہ اور ہنر انہیں خوب آتا تھا۔ لہذا ایسا شخص زندگی سے فرار پانے، مایوسی اور ناامیدی کی راہیں کم ہی تلاش کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ چونکہ حساس طبع تھے۔ بلکہ بے حد حساس۔ جس سے اس بات کی گنجائش نکلتی ہے۔ کہ نامساعد حالات کی تلخیوں کو برداشت نہ کرسکنے کی صورت میں یہ سماج ہی ان کے لئے ناقابل قبول بن گیا ہو۔ کیونکہ حساس ادیب جب سماج کو اپنے جیسا نہیں پاتا۔ اپنی ناقدری کا غم نہیں سہہ پاتا۔ تو پھر اپنے مزاج کے مخالف ہر راستے کو وہ ترک کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ اور مصطفیٰ زیدی کے آخر آخر ایام یقینی طور پر ان کے لئے شدید ذہنی صدمے کا موجب بنے ہوئے تھے۔

جہاں تک کسی انسان کی زندگی میں جینز اور خاندانی وراثت کے حوالے سے خودکشی کے محرکات کا تعلق ہے۔ تو مصطفیٰ زیدی کے ساتھ ایسا کوئی حوالہ بظاہر دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن جب ان کے بھتیجے شاہد رضا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ تو

دورانِ گفتگو انہوں نے انکشاف کیا کہ

مصطفیٰ زیدی سے پہلے ان کے بڑے بھائی ناصر نے خودکشی کی تھی۔ اسوقت ناصر کی عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔ خودکشی کیوں کی۔ محرکات کوئی نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ خاندان کے بزرگوں کو اسکا بہتر علم اور معلومات ہوں۔ لیکن وہ سب ابتک اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ کیونکہ اب خاندان میں بزرگ میں ہی ہوں۔ اور میرے پاس اس سے زیادہ کوئی اور معلومات نہیں۔ ۱۶۶

شاہد رضا صاحب اسوقت ماشاءاللہ تہتر ۷۳ برس کے ہیں۔ ان سے جو گفتگو ناصر (مصطفیٰ زیدی کے بھائی) کے حوالے سے ہوئی۔ اس سے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ سولہ سترہ برس کی عمر میں تو سوائے جذباتی شدت پسندی یا کسی نفسیاتی و ذہنی عارضے کے خودکشی کے کوئی اور محرکات دکھائی نہیں دیتے۔ اور یہ جذباتیت اسی انتہا درجے کی دکھائی دیتی ہے۔ جو مصطفیٰ زیدی کی فطرت کا نمایاں پہلو تھی۔ لیکن بقول شاہد رضا یہ واقعہ اتنا پرانا ہو چکا ہے۔ کہ صحیح طور پر سن اور زمانے کا تعین نہیں ہو سکتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مصطفیٰ زیدی کے سن شعور تک پہنچنے سے پہلے کا ہے۔ جس کے اثرات براہ راست مصطفیٰ زیدی نے قبول نہیں کیے۔ لیکن جہاں تک جینز میں جذباتی ہیجان خیزی کا تعلق ہے۔ اسے مصطفیٰ زیدی کی حادثاتی موت کے حوالے سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مجموعی طور پر مصطفیٰ زیدی کی جوانمرگی اور ان کی غیر فطری موت کا محرک کچھ بھی ہو۔ وہ قتل کیے گئے۔ یا انہوں نے خودکشی کی۔ حتمی فیصلہ تک پہنچنا میرے مقالے کی بنیادی ضرورت نہیں۔ لیکن ان تمام عوامل سے دو طرح کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ مصطفیٰ زیدی کے قتل کیے جانے اور ان کے خودکشی کرنے کے امکانات برابر تناسب میں دکھائی دیتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ قتل اور خودکشی دونوں صورتوں میں محرکات کم و بیش ایک سے ہیں اہل قلم کی ایسی صورت پراسرار اموات اور اس کے محرکات خود ادیب کی ذات اور اس کے سماجی ماحول سے جنم لیتے ہیں۔ ادیبوں کی حساس طبیعت انہیں سماجی سطح پر Misfit رکھتی ہے۔ وہ سماج کے لئے اور سماج ان کیلئے ایک متصادم پلیٹ فارم کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ادیبوں کی اعلیٰ سطح کی ذہانت بھی اکثر اوقات انہیں ماحول سے کاٹنے لگتی ہے۔ کیونکہ یہ ذہانت اور اعلیٰ فکری سطح اپنی رفتار میں اجتماعی طرزِ عمل اور ان کے طرزِ احساس سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ وہ سماج کی ذہنی سطح سے آگے نکل جاتی ہے۔ ایسے میں ادیب اپنے لیے ایک الگ سے ضابطۂ حیات تخلیق کر لیتے ہیں۔ یہ ضابطہ حیات مثبت ہوتا ہے۔ یا منفی۔ یہ الگ سے بحث ہے۔ اس کے اندر اپنے ماحول کے حوالے سے غیر تسلی بخش فضا جنم لیتی ہے۔ اور بعض اوقات یہ صورتحال اہل قلم اور صاحبِ فکر کے اندر ایک پراسرار قوت کا ایسا نشہ بھر دیتی ہے۔ جس کے بل بوتے پر وہ خود کو ہر مقام پر ہر طرح کی مشکلات کے سامنے سیسہ پلائی دیوار سمجھنے لگتے ہیں۔ اور جب حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ تو ان کے اندر ٹوٹ پھوٹ اور زندگی سے پسپائی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے میں زندگی کی بے سمتی اور بے لطفی رفتہ رفتہ ان کے آس پاس دیواریں چننے لگتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں ان کے یہاں اکثر اخلاقی ضابطوں کا توازن بھی بگڑنے لگتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ زندگی سے پرے ان کے سامنے ایک اور دریچہ وا ہو جاتا ہے۔ جہاں سے وہ اپنے وجود اور موت کو آر پار دیکھ سکتے ہیں۔ اب اس آر پار کے منظر کو دیکھنے میں بالآخر خود موت تک پہنچیں۔ یا پہنچائے جائیں۔ بات تو بنیادی محرکات اور راستہ ہموار ہونے کی ہے۔ چنانچہ مصطفیٰ زیدی کی حادثاتی موت کے پس پردہ یہی عوامل کارفرما دکھائی دیتے ہیں۔

صغیر ملال:

صغیر ملال کا تعلق مری کے ایک گاؤں کروڑ سے ہے۔ وہ ایک معزز اور تعلیم یافتہ گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ صغیر ملال ۱۹۵۰ء میں کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ اپنے سات بہن بھائیوں میں صغیر چھٹے نمبر پر ہیں۔ لہذا سبھی بہن بھائیوں کا پیار اور شفقت صغیر کو میسر رہی۔ ان کے والد صاحب نہ صرف خود پڑھے لکھے تھے۔ بلکہ انہوں نے تمام اولاد کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ چنانچہ سب بہن بھائی نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انعامات و اعزازات حاصل کیے۔ آج صغیر ملال کے تقریباً تمام بہن بھائی کسی نہ کسی حوالے سے درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ اس کے علاوہ تمام بہن بھائیوں میں قدر مشترک بات یہ ہے۔ کہ وہ ادبی و علمی مشاغل سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن صغیر ملال نے ان تمام حوالوں سے اپنے تمام بہن بھائیوں پر سبقت حاصل کی۔ جہاں تک صغیر ملال کی تعلیمی زندگی کا تعلق ہے۔ وہ ۱۹۵۲ء میں کراچی گئے۔ آٹھویں جماعت تک کراچی میں تعلیم حاصل کی۔ پھر اسلام آباد آئے۔ میٹرک یہیں سے کیا۔ اس کے بعد اپنی بڑی بہن کے پاس کراچی چلے گئے۔ انہیں صغیر اولاد کی طرح عزیز تھے۔ ان کے پاس رہ کر صغیر نے ایم اے (انگریزی) تک تعلیم حاصل کی۔ وہ اردو کی نامور شاعرہ پروین شاکر کے کلاس فیلو تھے۔

صغیر ملال ہمہ صفت انسان تھے۔ بے پناہ خوبیوں کے مالک، اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل، رنگا رنگ مشاغل کے شوقین، وسیع المطالعہ، محنتی اور ان تھک طبیعت پائی تھی۔ ۴۱ برس کی عمر میں صغیر نے وفات پائی۔ صغیر کی اچانک وفات کے بارے میں دو آراء پائی جاتی ہیں۔ عمومی رائے جس میں صغیر کے اہل خانہ کی رائے بھی شامل ہے۔ وہ یہ کہ صغیر کو معمولی نزلہ بخار تھا۔ اور ڈاکٹر کے غلط انجکشن سے صغیر کی موت واقع ہوگئی۔ اور اس ضمن میں خصوصی رائے جس میں ادیب لوگ بھی شامل ہیں وہ یہ ہے کہ صغیر کو نیند آور ادویات لینے کی عادت تھی۔ اس رات اُنہوں نے ضرورت سے زیادہ ان ادویات کی مقدار لی۔ گویا اس رائے کے مطابق ان کی دانستہ کوشش تھی۔ جس کے باعث صغیر کی موت واقع ہوگئی۔ صغیر کی موت حادثاتی طور پر ہوئی۔ یا انہوں نے خودکشی کی۔ دونوں صورتوں میں کسی ممکنہ صورت حال تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ صغیر کی فطرت، ان کے مخصوص طرزِ فکر اور معاملات زندگی کے نمایاں پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے۔ کیونکہ ایک عام شخص کے مقابلے میں ادیب کسی نہ کسی حوالے سے اپنا مخصوص طرزِ حیات اور ضابطہ فکر رکھتا ہے۔ جو اس کے ہر قول و فعل پر نہ صرف اثر انداز ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے پس پردہ یہی عوامل لائق توجہ ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ تو صغیر ملال کے احباب اور مختلف ادیبوں سے تبادلۂ خیالات ہوا۔ کچھ صورتحال صغیر کی تحریروں اور شاعری سے عیاں تھی۔ اور اس سلسلے میں خصوصی نشست

صغیر ملال کے بڑے بھائی جمیل ملال سے ہوئی۔ جو اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں۔ اس طویل ملاقات میں صغیر ملال کے حوالے سے کئی عوامل زیر بحث آئے۔ جو صغیر کی موت سے متعلق کئی ممکنہ نتائج تک پہنچنے میں ہماری راہنمائی کرتے ہیں۔
جمیل صاحب نے گفتگو کا آغاز ہی اس جملے سے کیا۔ کہ صغیر کی فطرت میں بے پناہ تجسس تھا۔ اتنا تجسس، کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس حوالے سے انہوں نے کہا

> صغیر کی فطرت میں تجسس کا مادہ ایب نارمل حد تک تھا۔ میرا وہ چھوٹا بھائی تھا۔ میرے لیے وہ بچوں کی طرح تھا۔ میٹرک تک میرے ساتھ ہی سوتا تھا۔ وہ مجھ سے اور بڑی آپا سے بہت قریب تھا۔ ہم سے صغیر کی کوئی بات پوشیدہ نہ تھی۔ زندگی میں اتنا تجسس میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی سنا ہے۔ ہم بہن بھائیوں میں سے شاید ہی کسی کو والدین سے ڈانٹ ڈپٹ ہوئی ہو۔ لیکن صغیر کی نہ صرف ڈانٹ ڈپٹ ہوتی تھی۔ بلکہ اسی تجسس کے باعث اکثر اسے والد صاحب سرزنش کرتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ اسے اتنے تجسس میں پڑنے سے روکو۔ کہیں کوئی اپنا نقصان کر لے گا۔ والد صاحب اس پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ بلکہ میٹرک جو اس نے یہاں پنڈی سے کیا۔ والد صاحب کی اسی قسم کی ناراضگی کے باعث بڑی آپا نے اسے کراچی اپنے پاس بلوایا۔ کیونکہ وہ صغیر کے مزاج کو بخوبی سمجھتی تھیں۔ ۔[۱۶۷]

صغیر ملال کا تجسس نہ تو علم کی کوئی مخصوص شاخ تھی۔ اور نہ زندگی کا کوئی مخصوص پہلو۔ بلکہ تمام زندگی، زندگی کا ہر زاویہ، فطرت کا ہر روپ اور کائنات کی ہمہ جہتی ان کے لیے تجسس کی آماجگاہ تھی۔ ابتدا ہی سے انہیں جس کام سے منع کیا جاتا۔ وہ اس کام کو ضرور کرتے تھے۔ ہر شئے کی گہرائی اور گیرائی میں اتر کر اس کے اسرار و رموز سے آگاہ ہونا، اس کا ہر پہلو سے مطالعہ کرنا، اس پر غور و فکر کرنا، ان کی فطرت کا خاص جوہر تھا۔ صغیر ملال کی فطرت کا یہ پہلو درحقیقت ایک روایتی اور جانی پہچانی صورت حال سے اختلاف کی نوعیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس ضمن میں مرزا ادیب نے صغیر ملال کے حوالے سے ایک جامع اور معنوی تہہ داری پر مبنی بات کہی ہے۔

> صغیر ملال کے شعری مجموعے کا نام ''اختلاف'' ہے۔ اور جہاں تک میری شخصی رائے کا تعلق ہے۔ اختلاف کے لفظ کو اس کے یہاں ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے ذہن کے تجزیے کی کوشش اس کی تخلیقات کے توسط سے کی جائے۔ تو احساس ہوتا ہے۔ کہ یہ ایک تخلیقی جذبہ محرکہ کے طور پر اس کی سوچ کے پس منظر میں کارفرما ہے۔ ۔۔ جو کچھ دیکھا گیا ہے۔ سوچا گیا ہے۔ سمجھا گیا ہے۔ اس سے اختلاف ہے۔ ۔[۱۶۸]

اختلاف کی یہ صورتِ حال صغیر ملال کے مجموعی رویے سے وابستہ نظر آتی ہے۔ جس کے اثرات ان کی تمام زندگی پر محیط ہیں۔ صغیر ملال مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ تینوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ اکثر انسانوں اور شہروں سے دور دور فطرت کے خالص رنگوں اور اس کی خالص خوشبوؤں کے متلاشی رہتے۔ اسی حوالے سے جمیل ملال نے بتایا۔

> ہمارا گاؤں کروڑ ہے۔ صغیر نے اس گاؤں کے کلچر اور اس کی تہذیبی روایات کی تمام تاریخ چھان ماری۔ کن کن زمانوں میں کون کون سی قومیں آباد تھیں۔ کیا بولی بولتی

تھیں۔ ان کا رہن سہن کیا تھا۔ اور اس کے لئے اس نے نہ صرف تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا۔ بلکہ گاؤں کے قدیم ترین قبرستانوں میں گیا۔ تمام پرانی قبروں کے کتبے پڑھے۔ ان کی زبان دیکھی۔ اور کافی مطالعہ و مشاہدہ کے بعد مجھے بتایا کہ کروڑ گاؤں کا نام اصل میں کورو پانڈو کے تاریخی نام سے منسوب ہے۔ یہ نام مختصر ہو کر کروڑ کہلایا ہے۔ اور سینکڑوں برس قدیم قبروں کے کتبے بھی اسی قدیم قوم کے یہاں ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ۱۶۹

یہ عوامل ظاہر کرتے ہیں کہ صغیر کے یہاں تجسس کا مادہ اپنے کمال پر تھا۔ ان کی نگاہ بہت تیز، مشاہدہ عمیق اور تجربہ انہیں ہر لحہ اپنی جانب کھینچتا تھا۔ اور اس ضمن میں جو خاص بات سامنے آئی۔ کہ وہ مطالعہ، مشاہدہ اور تجربے کے لئے عموماً شہروں سے دور چلے جاتے تھے۔ تنہائی میں اپنے ساتھ بہت وقت گزارتے تھے۔ اور جس چیز یا صورتِ حال کا مشاہدہ کرتے تھے۔ پھر اس سے متعلقہ کتب کو ضرور پڑھتے تھے۔ وہ ہر علم کو مشاہدے کے بعد تجربے سے ضرور گزارتے تھے۔ اس حوالے سے صغیر کی بھابھی ثریا ملال نے کہا۔

صغیر ایک مرتبہ اپنے لکھنے لکھانے کے لئے کوئٹہ کے دور دراز پہاڑوں پر چلا گیا۔ وہاں تقریباً تین ماہ تک رہا۔ واپسی پر جہاں اس نے اپنے تجربات کی بہت سے باتیں بتائیں۔ وہاں یہ بھی کہا کہ وہاں غار میں، میں نے جو مکڑی دیکھی۔ اس کی سو آنکھیں تھیں۔ میں نے خود گنی ہیں۔ مجھے بہت حیرانی ہوئی۔ کیونکہ سائنس تو میرا مضمون ہے۔ لیکن صغیر کے لٹریری ذہن نے جو بات کہی۔ وہ میرے لیے بھی نئی تھی۔ ۱۷۰

جہاں تک انسان کی فطرت میں تجسس کے مادہ کا تعلق ہے۔ تو یہ ہر انسان کے اندر ایک مخصوص حد تک ہوتا ہے۔ اسکا ہونا اس لئے بھی ضروری ہے۔ کہ اس کے بغیر کاروانِ حیات کے تسلسل میں رخنہ پڑ سکتا ہے۔ لیکن صغیر ملال کے حوالے سے جو صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ اس سے علم ہوتا ہے۔ کہ صغیر کے ہاں تجسس کا مادہ نہ صرف حد سے بڑھا ہوا تھا۔ بلکہ پیدائشی اور فطری تھا۔ انہیں جس بات سے روکا جاتا۔ وہ اسے ضرور کرتے۔ بلکہ آخری حد تک کرتے تھے۔ ابتداء میں بڑوں سے سوالات کرتے اور پھر غیر مطمئن رہتے تھے۔ جوں جوں بڑے ہوتے گئے۔ ان کا مطالعہ اور فکری پختگی ان کے سوالات کا جواب بنتی چلی گئی۔ اور انہوں نے اپنی زندگی کو عملی طور پر ایسی مخصوص ڈگر پر ڈال دیا۔ جہاں وہ ہر شئے کو خارجی سطح سے زیادہ اس کی داخلی سطح کے حوالے سے جاننے اور محسوس کرنا چاہتے تھے۔ انکا تجسس تاریخی اور زمانی دونوں حوالوں سے تحرک تھا۔ صغیر کی شاعری میں یہ تجسس تلاش و جستجو کا دوسرا نام ہے۔

میں ڈھونڈوں گا اگر اسکا کوئی نشان دیکھوں
بلند ہوتا فضا میں کہیں دھواں دیکھوں

تجسس کا یہ عنصر صغیر کی فکر کو تحریک دیتا نظر آتا ہے۔ ان کی فکر زماں و مکاں کی بیکرانیوں سے ماوراء دکھائی دیتی ہے۔

عبث ہے سوچنا لاء انتہا کے بارے میں
نگاہیں کیوں نہ جھکالوں جو آسمان دیکھوں

ادیب کی سوچ میں تلاش و جستجو کے حوالے سے عالمِ صحرائی اور گنبدِ مینائی کے جو اسرار پوشیدہ ہوتے ہیں۔ صغیر کی شاعری میں اس کی عکاسی ملتی ہے۔

کبھی ڈراتی ، کبھی پرسکون رکھتی تھی
ملال دور سے آتی تھی جو صدا کوئی

صغیر کی فکری جہت اسی انکار و اقرار کے باعث ہی سوالات کے لامتناہی سلسلے سے دوچار ہے۔

کیوں ہر عروج کو یہاں آخر زوال ہے
سوچو اگر تو صرف یہی اک سوال ہے

اور پھر ان سوالات کے اندر ہی کسی ممکنہ صداقت کے آثار تک ان کی نگاہ جا پہنچتی ہے۔

ممکن ہے کائنات کے کہنہ نظام میں
جو انظام لگتا ہے وہ انتشار ہو

وہ اپنی متجسس فطرت کے باعث ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کے سفر پر غیر محسوساتی طور پر گامزن تھے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو زندگی اور تمام معاملاتِ زندگی میں اتنے عمیق مشاہدے کے ساتھ جی رہا ہو۔ اور ہر شئے کی کھوج اور اس کی تہہ میں اترنا چاہتا ہو۔ اور جو مختلف علوم کا مطالعہ انتہائی تواتر کے ساتھ کر رہا ہو۔ تو کیسے ممکن ہے کہ موت جو زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ وہ اس کے بارے میں غور و فکر سے بے نیاز رہے۔ اس کے لئے متجسس نہ ہو۔ اور یہ تجسس اسے بے چین نہ رکھتا ہو۔

صغیر کی شاعری میں زندگی کے آغاز و انجام سے متعلق جو اشارے ملتے ہیں وہ درحقیقت زندگی اور موت سے متعلق صغیر کا مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ ان کے نزدیک زندگی ابتدا سے انتہا تک مسلسل ارتقاء پذیری کی حالت میں ہے۔

پھر ابتداء کی طرف ہو گا انتہا کا رخ
ہم ایک دن یہاں شکلیں بدل رہے ہوں گے

زندگی صغیر کے نزدیک ایک حیرت کدہ ہے۔ جس میں انسان ایک خواب کی سی کیفیت میں ہے۔ وہ خواب جنکا طلسم بہت جلد ٹوٹ جاتا ہے۔ اور یہاں موت ایک ایسی حالت کا نام ہے۔ جس میں پرسکون نیند کی سی کیفیت ہے۔

میں خواب میں چلتا ہوا آیا ہوں تیرے پاس
اے دوست مجھے نیند سے بیدار نہ کرنا

اور کہیں ان حیرتوں میں زندگی اور موت مسائل و دلائل کے تناظر میں نظر آتی ہے۔

پیچیدہ سلسلے کو دو حصوں میں بانٹ کر
ایک کو عروج کہنا پڑا ایک کو زوال

صغیر کی شاعری میں ان کی یہ فکری جہت پتہ دیتی ہے۔ کہ صغیر میں حیات و کائنات کے بارے میں غور و فکر روائیتی سطح پر نہیں۔ بلکہ اسکا تعلق صغیر کی فطری ذہانت اور وسیع مطالعہ و مشاہدہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور جس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کا کہنا ہے۔

صغیر ملال اکثر میرے پاس آتا رہتا تھا۔ بلکہ اکثر اس کی میرے ساتھ علمی وادبی موضوعات پر بات بہت طویل بھی ہو جاتی تھی۔ وہ بہت پڑھتا تھا۔ اور اس مطالعہ کے ساتھ ساتھ اس کے اندر جو بات خاص تھی۔ وہ اسکا تجسس تھا۔ آخری آخری دنوں میں موت سے متعلق اسکا تجسس بہت بڑھ گیا تھا۔ اس سلسلہ میں اسکا یہی سوال ہوتا۔ کہ حیات بعد موت کیسی ہوگی۔ وہ کیا کیفیت ہوگی اور خدا ہے یا نہیں۔ اور جس روز اس کی وفات ہوئی۔ اس سے ایک روز قبل بھی وہ میرے پاس بیٹھ کر ایسی بہت سی باتیں اور سوالات کرتا رہا تھا۔ ۱۷۱

مشتاق احمد یوسفی کے حوالے سے جمیل ملال نے کہا۔

یوسفی صاحب نے جو کچھ کہا۔ وہ بالکل درست ہے۔ صغیر یوسفی صاحب سے بہت قریب تھا۔ اور اکثر ان کا ذکر کرتا تھا۔ کہ یوسفی صاحب فلاں معاملے میں یہ بات کہتے ہیں۔ ان کی فلاں کتاب میں یہ بات لکھی ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ صغیر آخری دنوں میں تصوف کا مطالعہ زیادہ کرنے لگا تھا۔ بلکہ اس ضمن میں مختلف مذاہب عالم کی کتابیں اس کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ موت کی حقیقت جاننے سے متعلق صغیر کا مطالعہ اور تجسس پہلے سے بہت بڑھ گیا تھا۔ ۱۷۲

اس تمام صورتِ حال سے اس بات کا علم ہوتا ہے۔ کہ صغیر ملال کی حد درجہ متجسس فطرت اور خصوصاً آخری دنوں میں تصوف کا گہرا مطالعہ اور موت کی حقیقت جاننے کیلئے ان کا ذوق وشوق کوئی بے معنی نہیں تھا۔ مطالعہ انسان کی ابتدائی فطری صلاحیتوں کو نہ صرف بڑھاتا بلکہ انہیں نکھارتا اور ہر لحہ جلا بخشتا ہے۔ اس سے انسان میں سنجیدہ نظری اور فکر کی پختگی پیدا ہوتی ہے۔ صدیوں پر مبنی انسانی تفکر کا جو سفر کتابوں کا دفینہ بن چکا ہوتا ہے۔ اسے مطالعہ کے باعث ہی نسلِ انسانی اپنی ذہنی وروحانی تربیت اور فطری استعداد کو نکھارنے کیلئے کام میں لاتی ہے۔ اسی کے باعث فکرِ انسانی ارتقاء پذیر رہتی ہے۔

جو ہنگاموں سے اپنے آشنا تھا
وہی تنہائیوں میں سوچتا تھا
جتنا کھلتا گیا اپنے ہاتھوں
آدمی اتنا پراسرار ہوا

انسان کی پراسراریت کا سوال ہی فکرِ انسانی کو متحرک اور فعال رکھتا ہے۔ اسی کے باعث ہی فطرت انسانی کی نئی نئی موشگافیوں کا علم ہوتا ہے۔ اس حوالے سے صغیر ملال کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بے انتہا پڑھتے تھے۔ ان کی گفتگو انتہائی خالص، ادبی اور علمی نوعیت کی ہوتی تھی۔ بقول جمیل ملال کے، صغیر اکثر کہتا تھا۔ کہ ''پڑھے بغیر عالم گفتگو نہیں کر سکتا۔ شاعر، شاعری نہیں کر سکتا۔ اور مفکر فکر سے عاری رہتا ہے۔'' ۱۷۳

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ صغیر کا موت کی حقیقت جاننے اور اس کی اصل سچائی تک پہنچنے کیلئے جو تجسس تھا۔ اس میں بڑا ہاتھ صغیر کے مطالعہ کی وسعت بھی ہے۔ وہ ہر بات اور زندگی کے ہر پہلو کو ہر زاویے سے دیکھتے۔ اور ہر شئے کی حقیقت کو سمجھنا ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ انہیں اس سے غرض نہ تھی۔ کہ کسی خاص موضوع سے متعلق ہی کتب پڑھتے۔

بلکہ ہر طرح کی کتب ان کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔اور آخری دنوں میں تصوف سے متعلق کتب سے ان کی دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی۔اور تصوف کے موضوع پر وہ بہت کچھ لکھ رہے تھے۔اسکی کچھ قسطیں اکیڈیمی آف لیٹرز نے شائع بھی کی تھیں۔یہ کام صغیر کی اچانک موت کے باعث پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔وہ انگریزی، اردو اور پنجابی تینوں زبانوں میں بیک وقت لکھتے تھے۔صغیر کی شخصیت کا یہ تمام حوالہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک جینئس تھے۔ پیدائشی اور خداداد صلاحیتوں کے مالک۔ان صلاحیتوں میں نکھار ان کی محنت و مطالعہ کے باعث پیدا ہوا۔بقول مشتاق احمد یوسفی ''جینئس پیدائشی ہوتا ہے۔لیکن محنت و مشقت سے اس کی فطری صلاحتیں نکھرتی ہیں۔''۔۱۷۴

یہ بات صغیر ملال پر لاگو آتی ہے۔اس ضمن میں جمیل ملال کا کہنا ہے۔

صغیر جینئس تھا۔ بلکہ ہماری تین پشتوں میں ایک جینئس پیدا ہوا ہے۔ایک میرے رشتے کے بزرگ، جن کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ایک میرے چچا۔جن کا نام مشتاق تھا۔گارڈن کالج میں پڑھتے تھے۔بہت اچھے لکھاری تھے۔جوانی ہی میں تقریباً تیس بتیس سال کی عمر میں انکا قتل ہو گیا تھا۔اور اب صغیر تھا۔جو بہت قابل، زندگی کے رنگا رنگ مشاغل میں مصروف عمل اور ہر حوالے سے نمبرون رہنا اسے مرغوب تھا۔اس کی موت بھی انتہائی اچانک ہوئی۔اکثر کہتا تھا۔کہ بڑے لوگ بہت سا کام کرتے ہیں۔اور جلدی مر جاتے ہیں۔ایک مرتبہ کسی بہت بڑی ادبی شخصیت نے اس کے لئے کہا تھا۔کہ صغیر جوان جسم پر بوڑھی آنکھیں رکھتا ہے۔۔۱۷۵

جمیل ملال کے مطابق جو کام کوئی نہیں کر سکتا۔یا کر سکنے کی ہمت پاتا تھا۔وہ صغیر کر گزرتے تھے۔اس ضمن میں صغیر کی حد درجہ ذہانت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ذہانت ایک تو قدرتی عطیہ ہے۔جو اپنے ساتھ غور و فکر کا مادہ لیکر آتی ہے۔صغیر کے حوالے سے اس قدرتی عطیہ کو جلا اس طور سے ملی۔کہ گھر کا ماحول خالصتاً علمی و ادبی تھا۔ہر ایک مطالعہ کا شوقین تھا۔اس طرح صغیر کے اندر مطالعہ کی عادت فزوں تر ہوگئی۔پڑھنا اور ہر وقت پڑھنا ان کا معمول بن گیا۔پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس علم کے حوالے سے مشاہدۂ حیات و کائنات زور پکڑتا گیا۔مہینوں مطالعہ میں غرقاب رہتے لکھتے اور اس طرح ان کی مختلف ذہنی و فکری صلاحیتیں تحرک و تحیر کے مراحل سے گزرتیں۔انسان کی فطری ذہانت کا جہاں تک سوال ہے۔اسے مسلسل مطالعہ اور غور و فکر کی پگڈنڈیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔اور مطالعہ کی دنیا جو درحقیقت ماضی کے حوالے سے بہترین اذہان اور اعلیٰ سوچوں کا سرچشمہ ہوتی ہے۔اسی حوالے سے نمو پذیر رہتی ہے۔سوالات و جوابات کا سلسلہ یہیں سے جنم لیتا ہے۔نظامِ کائنات میں قانون فطرت کے ہاتھوں انسان کا مادی جسم ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔لیکن ذہن انسانی کا گوشہ گوشہ اپنے ایک ایک لمحہ کی ریاضت و مشقت کو مطالعہ کی دنیا کے سپرد کر دیتا ہے۔فکرِ انسانی پھر یہیں سے ارتقاء پذیر ہو جاتی ہے۔لیکن اس ارتقاء پذیری کیلئے روایت کی پاسداری کرنے والوں سے زیادہ وہ سوچ کارآمد ہوتی ہے۔جسکا بیج اپنے تخلیقی جوہر سے پھوٹتا ہے۔صغیر کی شاعری میں مطالعہ، مشاہدہ اور غور و فکر کی تکون کا پس منظر اسی کے حوالے سے تشکیل پاتا ہے۔

جہاں پہنچنا ہے آغاز بھی وہیں سے ہوا
سفر سمجھتے ہیں اس کو سزا نہیں لکھتے
اکثر خود آگہی نے دکھایا ہے رات کو

انسان کے ہیں راستے تاروں کی نظر میں

صغیر کی شاعری میں خود آگہی کا جو در کھل گیا تھا۔ اس سے وہ موجود اور ناموجود، بود اور ''نابود'' کے آر پار دیکھ سکتے تھے۔

خود آگہی تو اپنی روایت کا علم ہے
کیوں چھوڑ دوں ملال پرانے مکان کو

یہ خود آگہی ہی ہے۔ کہ صغیر اپنی ہستی اور مکان کو چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کی کش مکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

آخری تجزیہ یہی ہے ملال
آدمی دائروں میں رہتا ہے

صغیر کے یہاں غور و فکر میں گہرائی اور پختگی یقیناً مسلسل مطالعہ سے تقویت پاتی ہے۔ بقول جمیل ملال ''پڑھنے کی عادت مجھ میں بھی ہے۔ لیکن صغیر اکثر مجھے کہتا۔ آپ پڑھتے نہیں ہیں۔ چند کتابیں اپنے آس پاس رکھ لیں۔ یہ پڑھنا، پڑھنا تو نہ ہوا''۔ ۱۸۷ اس ضمن میں جمیل ملال نے ایک واقعہ سنایا۔ صغیر ایک مرتبہ وادیٔ کوئٹہ کے کسی دور دراز پہاڑی مقام پر چلے گئے۔ وہاں تین ماہ تک رہے۔ ہر وقت مطالعہ کرنا اور لکھنا لکھانا ان کا معمول تھا۔ جس چھوٹے سے غار نما ہوٹل میں انکا قیام تھا۔ اسکا مالک حیران تھا۔ کہ اتنا لکھنا پڑھنا کسی عام انسان کے بس میں نہیں ہوسکتا۔ لیکن وہ اتنی سمجھ رکھتا تھا۔ کہ یہ کوئی صاحب علم ہیں۔ وہ صغیر کو ناشتے میں انڈا اور پراٹھا بلا قیمت مہیا کرنے لگا۔ اس خیال سے کہ عالموں کی خدمت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔ جمیل ملال سے صغیر کے ضمن میں جتنی گفتگو ہوئی۔ انہوں نے اس بات کا خصوصی طور پر ذکر کیا۔ کہ صغیر کو شہروں سے دور پہاڑوں، ویرانوں اور سنسان جگہوں پر جانے کا بہت شوق تھا۔ وہاں وہ بہت وقت گزراتے تھے۔ ایک ادیب، ایک مفکر اپنی ہستی اور اپنے وجود کی کھوج میں جس تنہائی میں تنہا ہوتا ہے۔ اور زندگی کی ہنگامہ خیزیوں سے دور فطرت کی خاموشیوں کا ہم راز ہوتا ہے۔ صغیر کے حوالے سے ان کی فطرت کا یہ پہلو بہت نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ان عوامل کی نشاندہی صغیر کی عملی زندگی کے علاوہ ان کی شاعری میں بھی موجود ہے۔

وہیں اب زندگی گزرے گی اپنی
جہاں کوئی پہاڑی سلسلہ ہے

صغیر کے یہاں خواہش مرگ کی جو چنگاری سلگ رہی تھی۔ یہی چنگاری انہیں ان صحراؤں کی خاموشی میں نظر نہ آنے والے افق کی جانب کھینچتی ہے۔

نکل گئے تھے جو صحرا میں اپنے اتنی دور
وہ لوگ کون سے سورج میں جل رہے ہوں گے

یہاں سورج میں جلنا ان حقیقتوں کا ادراک اور اعتراف ہے۔ جو بظاہر نگاہوں سے اوجھل لیکن انسانی بصیرت کے پردے میں وہ مسلسل ریاضت کے ضمیر میں لتھڑی ہوئی ہیں۔ صغیر ملال نے کچھ اسی حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے۔

> یاد رکھنے کی بات فقط یہ ہے۔ کہ عالمی ادب کی تمام سنجیدہ کتابیں انتہائی اداس، مایوس اور دل شکن تحریروں کی حامل ہیں۔ آسمانی صحیفوں کا بھی اصل موضوع محبت، موت اور

کہ انسانی آنکھ سات سمندروں کے پانی سے زیادہ آنسو بہا چکی ہے۔ فقط یہی ایک جملہ آدمی کو تمام عمر کے لئے اداس کر سکتا ہے۔۔۱۷۷

وقت ہے۔ گوتم بدھ کا کہنا تھا۔

صغیر کی فکر کی یہ نہج اس حوالے سے بہت کافی ہے۔ کہ وہ کیونکر بستیوں سے دور پہاڑوں پر مطالعہ کی غرض سے نکل جاتے تھے۔ درحقیقت ان کی سوچ کا افق حیات کے پردے میں ملفوف اس آہٹ کا قرب چاہتا تھا۔ جسے موت کہتے ہیں۔ وہ وہاں پڑھتے تھے۔ لکھتے تھے، غور وفکر کرتے تھے۔ اور پھر کئی مرتبہ تنہائی کے تجربات کا کچھ نہ کچھ ذکر بھی کرتے تھے۔ خاص طور پر پرانے قبرستانوں میں گھومنے پھرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس میں ایک تو انکا تجسس تھا۔ کہ یہ قبریں کتنی پرانی اور کس حسب ونسل کے ساتھ ان کا تعلق ہے۔ اور دوسرے موت کا تجسس انہیں وہاں لیے لیے گھومتا تھا۔

بقول جمیل ملال

یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ وہ شہروں سے دور دراز ویرانوں اور پہاڑوں پر جا کر کیوں رہنے اور خصوصاً پڑھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ ہمارا گاؤں کروڑ ہے۔ جہاں زندگی کی ہر سہولت موجود ہے۔ صغیر کو گاؤں بہت پسند تھا۔ لیکن گاؤں میں گھر کے اندر رہنا اسے اچھا نہ لگتا۔ کہتا تھا، کہ آپ نے اسے بھی شہر بنا ڈالا ہے۔ وہ اکثر اپنا کھانا باندھتا، کتابیں اٹھاتا۔ اور دور پہاڑوں پر چلا جاتا۔ جہاں پر آج تک ہمارے علم کے مطابق کوئی گیا نہیں۔ اور اس سے مجھے یاد آیا۔ کہ صغیر کو مہاتما بدھ بہت پسند تھا۔ اس نے مہاتما کے کئی مجسمے اپنے گھر کی زینت بنا رکھے تھے۔ ۔۱۷۸

مہاتما بدھ کو پسند کرنے کی ایک وجہ بظاہر بہت واضح نظر آتی ہے۔ کہ مہاتما کو بھی سچائی کی جب تلاش ہوئی۔ تو ویرانے اسکا مسکن بنے۔ زندگی کی گہما گہمی کو اس نے ترک کر دیا تھا۔ مہاتما کشف وگیان کے لئے اسوقت اپنے اندر اترا۔ جب زندگی کی گہما گہمی کا شور اس کے آس پاس سے کم ہو گیا۔ وہ حقیقتِ موت کو پانے کے لئے کئی تجربات ومشاہدات کے کرب سے گزرے۔ صغیر ملال کے یہاں یہ عبادت وریاضت نہ تو اس حوالے سے اپنا کوئی نام رکھتی ہے۔ اور نہ مقام۔ لیکن اس سے صغیر ملال کی ذہنی وروحانی سمت کا تعین ضرور ہو سکتا ہے۔

جو پہلا آدمی یہاں حیران ہو گیا
حیرت سے اپنی آخرش انسان ہو گیا

میرے شعور سے قائم ہے یہ جہاں ملال
یہ کائنات مجھے میرے ساتھ فانی لگے

اس ضمن میں صغیر کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں۔ ان سے یہ بات سامنے آئی۔ کہ صغیر دنیاداری اور مادہ پرستی سے بہت دور تھے۔ دولت، عیش وعشرت اور ناموری سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا۔ اس حوالے سے صغیر ملال کی بھابھی ثریا ملال نے ایک واقعہ سنایا کہ۔

میں نے ایک مرتبہ صغیر سے کہا۔ کہ تمام شعراء ٹی وی پر جا کر شعر سناتے ہیں۔ تم کیسے

شاعر ہو۔ٹی وی پر دکھائی نہیں دیتے۔وہ کہنے لگا۔کہ قرآن کو نہ تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔
اور نہ یہ فوری سمجھ آنے والی کتاب ہے۔اس کے لئے وقت چاہیے۔۔۱۷۹

یہ عوامل ظاہر کرتے ہیں۔کہ صغیر کو اپنی ذات اور فن دونوں میں انفرادیت محسوس ہوتی تھی۔وہ روایت سے ہٹ کر چلنا اور جینا چاہتے تھے۔اور دوسرے یہ کہ وہ واقعی ناموری اور شہرت کے متلاشی نہ تھے۔مادہ پرستی اور دنیاداری کا بیج اسی سے پھوٹتا ہے۔جو صغیر میں نہ تھا۔روپے اور دولت کی انہوں نے کبھی خواہش نہ کی۔جمیل ملال نے اس ضمن میں کہا۔

دوبئی میں ایک مرتبہ صغیر کو بہت اچھی ملازمت ملی۔وہ ایک ادارے میں ایڈمن آفیسر تھا۔بہت ڈالر پاؤنڈ کما رہا تھا۔لیکن اچانک ہم سب کے منع کرنے کے باوجود وہ ملازمت چھوڑ کر واپس آ گیا۔اور آنے سے پہلے اس نے مجھے جو خط لکھا۔اس میں لکھا تھا۔اگر کسی بادشاہ کو فقیر بنا دیا جائے۔تو اسے بہت تکلیف ہوتی ہے۔اسی طرح اگر فقیر کو بادشاہ بنا دیا جائے۔تو اسے بھی تکلیف دہ صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
۱۸۰۔

اسی حوالے سے جمیل ملال نے مزید بتایا کہ یہ ضرور ہے کہ جب صغیر کی شادی ہوئی۔تو اس میں پہلے کی نسبت تبدیلی آئی۔وہ زندگی کی مادی ضرورتوں اور سہولتوں کی طرف مائل ہونے لگے تھے۔لیکن اسے ایک وقتی تبدیلی کا نام دے سکتے ہیں۔کیونکہ صغیر بنیادی طور پر مادہ پرستی سے دور رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔اور اکثر کہتے۔کہ آجکل جسکو دیکھو۔پیسے اور پلاٹوں کی بات کرتا نظر آتا ہے۔

صغیر کی شخصیت کا ایک اور پہلو جو کئی حوالوں سے یہاں قابل ذکر ہے۔اور خصوصاً موت کے لئے ان کی متجسس فطرت کو اس سے بہت تقویت ملتی ہے۔وہ یہ کہ صغیر زندگی سے بھرپور تھے۔زندگی جو ایک سیلِ رواں ہے۔ایک واقعاتی اور حادثاتی تسلسل کا نام ہے۔اس کی منزلِ آخر موت ہے۔اگر ایک فرد زندگی سے بھرپور ہے۔تو کیسے ممکن ہے۔کہ اسکا یہ رویہ زندگی کے اختتام تک ایک دم سرد پڑ جائے۔بلکہ اختتام کے قریب تو اس کی متجسس فطرت اور زیادہ فعال اور متحرک ہو جاتی ہے۔شمع سرد ہونے سے پہلے جس طرح بھرپور اور تیز تر روشنی سے منور ہو جاتی ہے۔اور اگر یہ کہا جائے۔کہ زندگی کو موت سے الگ کر کے اگر قابل غور و فکر سمجھا جائے۔تو یہ انتہائی بے معنی سی بات لگتی ہے۔اور خاص طور پر اہل علم اور باشعور اذہان موت کو زندگی اور زندگی کو موت کے حوالے سے ہی لائق فکر سمجھتے ہیں۔

سفر حیات کا اشکال میں بیان کریں
تو زندگانی ہے لہو رنگ دائرہ کوئی

ہماری تیز نگاہوں سے دھند لپٹی ہے
دکھاؤ تم اگر آگے ہے راستہ کوئی

چنانچہ اس پس منظر میں صغیر ملال کا زندگی سے بھرپور ہونا خود ان کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے لاتا ہے۔دیکھنا یہ ہے۔کہ وہ کس حوالے سے زندگی سے بھرپور تھے۔صغیر ملال کی زندگی مختلف اقسام کے مشاغل سے عبارت ہے۔یہ مشاغل درحقیقت ان کی زندگی سے متعلق ذہنی و فکری اپروچ کا پتہ دیتے ہیں۔صغیر ملال مطالعہ کا حد درجہ شغف رکھتے تھے

۔بقول کشور ناہید

صغیر ملال بہت پڑھتا تھا۔ اکثر لاہور میں میں جب ''ماہِ نو'' کی ایڈیٹر تھی۔ وہ آتا تھا۔ مطالعہ کا شوقین تھا۔ اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کا بھی علم رکھتا تھا۔ اس نے دیگر زبانوں سے اردو زبان میں بہت اچھے اچھے تراجم بھی کیے ہیں۔ اس سے بات چیت کر کے پتہ چلتا تھا۔ کہ واقعی اسکا مطالعہ وسیع ہے۔ ۔۱۸۱

صغیر ملال کی حد درجہ مطالعہ کی عادت کا پس منظر ان کے تحریر کردہ ان چند جملوں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ جو انہوں نے کافکا کے لئے لکھے تھے۔

ہر ادیب کی طرح کافکا لکھنے سے سکون حاصل کرتا تھا۔ اسی لیے مضطرب کافکا دن رات لکھنا چاہتا تھا۔۔۔ وہ بے چین ہو کر دیوانہ وار تحریر سے تسکین حاصل کرتا۔ یہ مقدس بے چینی ہے۔ دنیا کی تمام بڑی کتابوں کے تمام بڑے جملے اسی کیفیت میں تخلیق ہوئے ہیں۔ کافکا کی تحریر بھی اپنی انتہا پر پہنچ کر الہامی محسوس ہوتی ہے۔۔۔ کافکا کو ڈوب کر پڑھنے والے بھی زندگی بھر کے لئے کافکا سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ ۔۱۸۲

صغیر ملال ہر طرح کے کھیل کھیلتے تھے۔ اور پھر ہر میدان میں امتیازی درجہ رکھنے کی تگ و دو میں رہتے۔ اور اس میں کامیاب بھی ہوتے تھے۔ بقول جمیل ملال

وہ انتہائی صحت مند تھا۔ میلوں تک پیدل چلتا۔ تمام جسمانی ورزشیں کرتا۔ پہاڑوں پر جانا، وہاں رہنا اسے انتہا درجے پسند تھا۔ تیراک اچھا تھا۔ اس کے مقابلے میں بھی اول انعام لیا۔ موسیقی کا شوق رکھتا تھا۔ میوزک سیکھا۔ اس میں انعام لیا۔ ٹی۔وی کے ڈرامے میں کام کیا۔ یہاں تک کہ پتنگ بازی کا بھی اسے شوق تھا۔ اور ایک مرتبہ یہاں تک تحقیق کی۔ کہ شہر کراچی میں کتنے اور کون کون سے نامی پتنگ باز ہیں۔ ۔۱۸۳

صغیر کی فطرت اور ان کی شخصیت کے یہ تمام عوامل ظاہر کرتے ہیں۔ کہ وہ زندگی کو بسر کرنے کا ایک مثبت اور صحت مند رویہ رکھتے تھے۔ ہر شئے کی جستجو کرنا، اس کو تحقیقی نگاہ سے دیکھنا، اس میں عملی طور پر شریک ہونا، بلکہ سب سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا ان کی فطرت کا خاصا تھا۔ لہٰذا موت کے موضوع پر ان کا غور و فکر کرنا اور اس کے لئے تجسس رکھنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ وہ موت سے ذہنی و فکری طور پر پوری طرح وابستہ تھے۔ اور ان کی یہ وابستگی مذہبی حوالے سے زیادہ بلکہ اس حوالے سے ہٹ کر کسی شئے کی حقیقت اور کیفیت تک پہنچنے کی سعی نظر آتی ہے۔ گویا موت کی حقیقت تک پہنچنا اور اسے محسوس کرنا صغیر ملال کے یہاں ایک تجرباتی نوعیت کا معاملہ دکھائی دیتا ہے۔ چونکہ وہ زندگی کو مشاہدے سے زیادہ تجرباتی سطح پر بسر کر رہے تھے۔ جو کچھ پڑھتے یا جس شئے کے علم سے آگاہی ہوتی، اس کے عملی تجربے سے ضرور گزرتے تھے۔ لہٰذا موت بھی ان کے سامنے ایک ایسی پوشیدہ حقیقت تھی۔ جس تک پہنچنے کا تجسس اور جس کے بارے میں مختلف طرح کے سوالات ان کے اندر زور پکڑ رہے تھے۔ سوال یہ نہیں۔ کہ وہ عملی طور پر کتنے صوفی تھے۔ یا تصوف عملی طور پر ان کی زندگی میں کتنا دخیل تھا۔ یا کہ وہ عملی زندگی میں کیا اتنے پرہیزگار تھے۔ جس کے حوالے سے ہم کسی کو سچا مسلمان اور مومن کہتے ہیں۔ بلکہ اصل صورتِ حال یہ ہے۔ کہ ان کے مطالعہ اور فطری ذہانت نے ان کے اندر ہر شئے کی حقیقت کو

سمجھنے اور اس کی اصل کو جاننے کا جو شعور پیدا کر دیا تھا۔ موت سے آگہی اور اس کے متعلق سوالات اسی سلسلے کی کڑی کہے جا سکتے ہیں۔

بقول جمیل ملال

وہ ان معنوں میں زیادہ مسلمان نہ تھا۔ جن معنوں میں ہم عام طور پر کسی کو نیک اور پرہیزگار کہتے ہیں۔ لیکن اس کے اندر موت کیلئے جو تجسس تھا۔ جو سوالات تھے۔ اور اس سلسلے میں اس میں جو بے چینی تھی۔ وہ یقیناً ایک عام اور نارمل انسان سے بہت زیادہ تھی۔ مرنے سے تقریباً چھ ماہ پہلے وہ یہاں سیٹلائٹ ٹاؤن میں بھانجی کی شادی کے سلسلے میں آیا تھا۔ اس کی تمام تر گفتگو کا محور موت کا موضوع تھا۔ درد کا یہ شعر بہت پڑھتا۔

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کدھر چلے۔۱۸۴

یہ عوامل ظاہر کرتے ہیں۔ کہ مطالعہ کی زیادتی اور بحیثیت ادیب ان کی فطری ذہانت نے زندگی اور اس سے متعلق مختلف سوالات کا جو سلسلہ ان کے اندر پیدا کر دیا تھا۔ وہ ہر شئے کی اصل حقیقت تک پہنچنے کے لئے بے تاب ہوتے۔ ادیبوں کے ہاں یہ رویہ جو اس انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔ یقیناً ایک نارمل انسان اس سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ اور پھر یہ اہل قلم ایسے ہی رویے کی انتہا پر نہ صرف زندگی گزارتے ہیں۔ بلکہ موت کے ساتھ ان کی ذہنی مطابقت اور متصادم رویہ بھی اسی حوالے سے تشکیل پاتا ہے۔

نتیجہ اخذ کیا کرتا میں اس سے
جواب اپنی سوال اپنی جگہ تھا
اترنا اپنی گہرائی میں آسان
سلامت لوٹ آنا معجزہ ہے

صغیر ملال کی اچانک حادثاتی موت کے محرکات کا جائزہ لیا جائے۔ تو ایک اور بات اس ضمن میں اہم ہے۔ اور وہ صغیر کا رومانوی مزاج ہے۔ جسمانی طور پر صغیر بہت صحت مند اور قد آور تھے۔ اپنے خوابوں کی تکمیل میں ہمہ وقت فعال اور محو۔ آس پاس کی فرسودہ روایات سے باغی۔ ذہنی، فکری اور جسمانی ہر حوالے سے وہ ایک حالتِ سفر میں تھے۔ وہ غیر محسوساتی طور پر ایک نئی اور انوکھی دنیا کی تلاش میں تھے۔ انہیں بے پناہ احساس ذات کے ساتھ اپنے ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی خواہش تھی۔ وہ جذباتی سطح پر عاشق مزاج بھی تھے پروین شاکر جوان کی ہم جماعت تھیں۔ دونوں میں باہمی پسند کا معاملہ تھا۔ بقول جمیل ملال ''وہ پروین شاکر کا کلاس فیلو تھا۔ اور اسکا پروین شاکر کے ساتھ جذباتی تعلق بھی تھا۔ پروین شاکر نے اس کے لئے شاید کوئی نظم بھی لکھی تھی۔ جسکا ذکر صغیر نے خود مجھ سے کیا تھا۔'' ۔۱۸۵

رومانوی ذہن کا خاصا یہ ہے کہ وہ اپنے آئیڈیلز کی تلاش میں رہتا ہے۔ آئیڈیلز کی خاطر ہی جیتا ہے۔ اور آئیڈیلز اگر ٹوٹ جائیں۔ تو وہ صدمہ سے باہر نہیں آ سکتا۔ ضروری نہیں۔ کہ وہ کسی مخصوص آئیڈیل کیلئے زندہ ہو۔ اور اسی کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ بلکہ ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ ہر شئے کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنا، ہر صورتِ حال کو اپنی

پسند کے مطابق ڈھالنا اور اپنے ہی زاویہ نگاہ سے ماحول اور اشیاء کا تجزیہ و مشاہدہ ان کے پیش نظر رہتا ہے۔ ان کا یہ رویہ زندگی کی مجموعی صورتِ حال سے وابستہ ہوتا ہے۔ وہ طویل منصوبہ بندی کی بجائے فوری اور شدید نوعیت کا طریقۂ کار اختیار کرتا ہے۔ اس حوالے سے اگر صغیر کی مجموعی زندگی کا جائزہ لیا جائے۔ تو ان کا موت تک کا سفر اسی فوری اور شدید نوعیت کی صورتِ حال سے منسلک نظر آتا ہے۔

صغیر کی فطرت کا ایک اور پہلو جو صغیر کے مخصوص مزاج اور مخصوص رویے کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ صغیر کا جارحانہ طرزِ عمل ہے۔ صغیر ملال کی بھابھی ثریا ملال، جو پیشے کے لحاظ سے سائنس دان ہیں، نے خصوصی طور پر اسکا ذکر کیا۔ اس ضمن میں انکا کہنا ہے۔ ''صغیر کے بارے میں ایک بات جو مجھے اکثر محسوس ہوئی۔ وہ یہ کہ صغیر بہت Aggressive تھا۔ وہ تقریباً ہر معاملے میں جارحانہ رویہ رکھتا تھا''۔[۱۸۶] اس حوالے سے یہ نکتہ اہم ہے کہ Aggressive انسان زندگی کے ہر معاملے میں آگے بڑھنے کا فوری اور شدید رویہ رکھتا ہے۔ وہ ہر صورتِ حال میں پیش قدمی کا انداز اختیار کرتا ہے۔ تجسس کا انداز بھی اسی سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔ ایسے انسان کے سامنے دو ہی باتیں ہوتی یا ہوسکتی ہیں۔ ''کیا ہے؟''۔ اور ''کیا نہیں ہے۔'' ''آغاز'' یا ''انجام''۔ ''ادھر'' یا پھر ''ادھر''۔ اسی سلسلے میں اس کے اندر انتہا پسندی کا عنصر بھی جنم لیتا ہے۔ اور اسکا رویہ اور طریقہ کار محض کسی مخصوص وقت یا کیفیت کے حوالے سے نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ رویہ اس کی تمام تر زندگی پر محیط ہوتا ہے۔ جہاں تک صغیر ملال کی اس فطرت کا تعلق ہے۔ یہ جارحانہ فطرت ایسے ہی پس منظر سے ابھرتی ہے۔

کیوں ایک حد سے آگے گئے تھے ملال تم
جب جانتے تھے حد سے گزرنا برا بھی ہے

یہاں سے واپسی ممکن ہے ایک لمحے میں
جہاں تلک ہمیں آتے ہوئے زمانے لگے

اس حوالے سے صغیر ملال کی کتاب ''بیسویں صدی کے شاہکار افسانے'' خاص اہمیت کی حامل ہے۔ وہ دنیا کے عظیم ادیبوں میں پائی جانے والی خواہش مرگ کی ٹوہ میں درحقیقت اپنی خواہش مرگ کی تسکین چاہتے تھے۔ اس کتاب کے ضمن سے یہ بات بآسانی کہی جاسکتی ہے۔ کہ صغیر نے عالمی ادب سے اولاً ایسے افسانوں کا خصوصی طور پر انتخاب کیا۔ جن کے خالق یا تو خواہش مرگ میں شدت کے ساتھ مبتلا تھے۔ یا اس شدید خواہش مرگ کے ہاتھوں انہوں نے خودکشی کرلی۔ صغیر ملال نے نہ صرف ایسے افسانوں کے تراجم کیے۔ جن کے کرداروں میں خودکشی کی خواہش اور اقدام خودکشی کی عملی صورت موجود تھی۔ بلکہ ان ادیبوں اور ان کے کرداروں سے متعلق صغیر نے جس زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالی۔ اس پس منظر میں صغیر کی اپنی خواہش مرگ شدت کے ساتھ کارفرما نظر آتی ہے۔

''بیسویں صدی کے شاہکار افسانے'' صغیر ملال کے تراجم اور تبصرے دونوں کا ایک مربوط اور نمایاں حوالہ ہیں۔ ٹالسٹائی، جیک لنڈن، الڈس ہکسلے، لارڈ ہرکولیس، جین پال سارتر، فرانز کافکا، بورجیس اور سلویا پلاتھ وغیرہ اس سلسلے کے اہم نام ہیں۔ صغیر ملال نے ان ادیبوں میں سے اکثر کو ایک طرف خودکشی کرنے کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ تو دوسری طرف حیات و کائنات سے متعلق ان کے غور و فکر پر مبنی فلسفیانہ نقطہ نظر پر تبصرہ کیا ہے۔ روس کے کہانی نویس ٹالسٹائی کے افسانے ''پیالہ'' کا ترجمہ و تبصرہ کرتے ہوئے صغیر ملال لکھتے ہیں۔

ٹالسٹائی نے ۵۷ برس کی عمر میں افسانہ "پیالہ" تخلیق کیا۔۔۔جواری، شرابی اور عورت باز ٹالسٹائی مایوسی کے بجائے سرشاری کے راستے حتمی سوالوں تک پہنچ گیا۔ ذہنی سکون کی خاطر ٹالسٹائی نے شہر کی لایعنی مصروفیات سے دور اپنی زمینوں پر زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔۔۔آدمی کو خودکشی کیوں نہیں کرنی چاہیے؟ ایک مدت تک وہ وجدانی حالت میں اس سوال پر غور کرتا رہا۔ اور جب زندگی کے مقابل خودکشی کے حق میں دلائل زیادہ جمع ہو گئے۔ تو وہ خوفزدہ ہو گیا۔ بندوق چھپادی۔ رسیاں، جنہیں دیکھ کر ڈھلکی گردن یاد آتی تھی۔ جلادیں۔ میں کیا کروں، میں کہاں جاؤں، کائنات دائمی اور لامحدود ہے۔ میں یہاں لمحے بھر کو چمکنے کے بعد بجھنے والا ہوں۔ اور اب میں کچھ کرلوں۔ اس طرف سے زمین کھود کر اُدھر نکل جاؤں۔ اس طرف سے کھود کر واپس اس طرف نکل جاؤں۔ اپنی موجودہ حالت میں نجات ممکن نہیں ہے۔ میرا یہ آغاز، انجام کہاں، کیوں اور کس کی مرضی سے طے کر دیا گیا ہے۔؟۔۱۸۷

صغیر ملال نے یہاں ٹالسٹائی کے حیات و کائنات سے متعلق جن نظریات کا ذکر کیا ہے۔ ادیبوں نے زیادہ تر اسی زاویہ نگاہ سے غور و فکر کی۔ کچھ تو اس غور و فکر کی بھٹی میں غلطاں رہے۔ اور کچھ اسی نظریاتی شدت کے باعث خودکشی کے راستے پر گامزن ہو گئے۔ صغیر ملال اس ضمن میں ٹالسٹائی کے بارے میں اسطور تبصرہ کرتے ہیں۔ "ٹالسٹائی کا معاملہ بہت دلچسپ ہے۔ وہ موت سے اتنا زیادہ ڈرتا تھا۔ کہ اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لئے خودکشی کے منصوبے بنایا کرتا تھا"۔۱۸۸ صغیر ملال نے بیسویں صدی کے جن نامور عالمی افسانہ نگاروں کے افسانوں کے تراجم اور تبصرے لکھے۔ ان میں ہیمنگ وے کا نام اس لیے قابل ذکر ہے۔ کہ ہیمنگ وے نے نہ صرف یہ کہ خودکشی کی تھی۔ بلکہ اس کے بعض کرداروں میں خودکشی کا رویہ موجود نظر آتا ہے۔ صغیر ملال نے اس کے ایسے ہی ایک کردار کو پیش کیا ہے۔ جو اس کے افسانے "روشن گاہ" سے لیا گیا ہے۔ "گذشتہ ہفتے اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ ایک ویٹر نے کہا"۔۱۸۹

صغیر ملال نے جن عالمی ادیبوں کے افسانے ترجمہ کیے۔ وہ صرف ترجمہ نہیں۔ بلکہ صغیر نے ان مصنفین کے نقطہ ہائے نظر کو اس طور سے پیش کیا ہے۔ کہ ایک طرف ان مصنفین کی مخصوص فطرت اور سوچ کا مخصوص دائرہ کار ایک پس منظر کے طور پر ان کہانیوں کے پیچھے موجود ہے۔ تو دوسری طرف صغیر ملال کی تجزیاتی نگاہ اس حوالے سے مزید ایک فکری عنصر کو جنم دیتی ہے۔ اس سے ایک طرف ان عالمی ادیبوں کے فکر و فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے تو دوسری طرف صغیر کی حیات و کائنات سے متعلق اپنی مخصوص سوچ کے کئی افق قاری کے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً صغیر ہکسلے کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر اس حوالے سے بیان کرتے ہیں۔

ہکسلے ان ادیبوں میں سے تھا۔ جو بلند بینوں کو لاحق دائمی فکرِ ترقی کے باعث بالآخر روحانیت کے بھنور Crisis of mysticism کا سامنا کرتے ہیں۔۔۔ تمام عظیم ادیبوں کی طرح ہکسلے بھی عمر بھر انسانی نفس کی پیچیدگیوں اور تہہ داریوں کا مشاہدہ کرتا رہا۔ وجود میں موجزن کائناتوں سے مسحور ہوتا رہا۔ روحانیت کے بھنور تک پہنچ جانے والے تمام لکھاریوں کی طرح ہکسلے بھی عصر حاضر کی تہذیب کو کھوکھلا، سطحی اور انسان

کے تنزل کی علامت سمجھتا تھا۔۔۔اس نے تحریر وتقریر کی تمام قوتوں کے ساتھ روحانی منزلوں کے حصول کے لئے نشہ آور کیمیائی عناصر کے استعمال کی حمایت شروع کر دی۔اور خود بھی ذہن کو کشادہ کرنے والے مرکبات استعمال کرنے لگا۔ Die, and become what your are الڈس ہکسلے صوفیوں کے اس لرزہ خیز قال کو اپنا ''حال'' بنا چکا تھا۔۱۹۰

ہکسلے کے بارے میں صغیر کے ان جملوں میں خود صغیر ملال کی اپنی سوچ کے افق اور ان کی مخصوص طرزِ زندگی کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔یعنی تلاشِ ذات کی ایک صورت، جو حیاتِ دائمی کے لئے جستجوئے مرگ کی شکل اختیار دکھائی دیتی ہے۔جہاں تک خودکشی کے حوالے سے کرداروں کے مخصوص رویے کا تعلق ہے۔الڈس ہکسلے کے افسانے ''ماریا'' میں ماریا کے کردار کے بارے میں ہکسلے اس کی ساری زندگی کے حوالے سے بالآخر اسکی انتہا اور موت کے بارے میں اسطور سے لکھتے ہیں۔

ماریا کا کردار پُرتعش زندگی گزارنے کے بعد اپنے اندر کے کھوکھلے پن کو پھر بھی آسودہ نہ کر سکا۔''گولی چلنے کی آواز سنکر وہ سب دوڑتے چلے آئے۔ماریا پلنگ پر منہ کے بل پڑی تھی۔پورا بستر خون سے سرخ ہو چکا تھا۔ڈاکٹر نے آکر تصدیق کی۔کہ وہ مر چکی ہے۔۱۹۱

اسی طرح صغیر ملال ہکسلے کے ایک اور افسانے کے کردار کی خود اذیتی سے لطف اندوز ہونے کی کیفیت جو بالآخر خودکشی پر منتج ہوئی بیان کرتے ہیں۔صغیر ملال ہکسلے کے جس افسانے کا تذکرہ کرتے ہیں۔اس افسانے کا کردار خود خواہش مرگ میں مبتلا ہو کر آخر کار خودکشی کرتا ہے۔اس افسانے کا آخری پیراگراف کچھ اس طرح سے ہے۔
۔۔۔اور سر جھکا کر غسل خانے میں چلا گیا۔جب اس نے ٹب میں پاؤں رکھا۔تو اس کے دائیں ہاتھ میں تیز دھار استرا تھا۔ٹب میں بیٹھ کر وہ اپنی بائیں کلائی آنکھوں کے قریب لایا۔کچھ دیر تک اپنی نبض کو غور سے دیکھتا رہا۔اور پھر یک لخت اس نے دائیں ہاتھ میں تھامے استرے سے اپنی کلائی کی رگیں کاٹ دیں۔کلائی سے ابلتا ہوا لہو ٹب کے پانی کو تیزی سے سرخ کرنے لگا۔وقفے وقفے سے وہ اپنے زخم کو مزید گہرا کرتا رہا۔غنودگی طاری ہونے سے پہلے وہ اپنی پوری زندگی کے بارے میں سوچ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد اسکا سر ڈھلک گیا۔۔۔۔۱۹۲

ہکسلے کے کچھ کردار خود اذیتی کے رجحان میں بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔یہ خود اذیتی درحقیقت خواہش مرگ ہی کا دوسرا نام ہے۔جو اکثر خودکشی پر منتج ہوتی ہے۔اور کبھی لحہ لحہ موت کی طرف پیش قدمی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔یہ موت سے لطف اندوزی کی ایک صورت ہے۔اس حوالے سے صغیر ملال کے ترجمہ شدہ افسانوں کے کچھ کردار نت نئے طریقوں سے موت کے لئے رغبت محسوس کرتے ہیں۔مثلاً جین پال سارتر کے افسانے ''دوام'' کا ایک کردار کہتا ہے۔''اس صورت میں شاید مجھے خود کو ہلاک کرنے کا بھی موقع نہ ملتا۔مگر وہ بالکل جلدی میں نہیں تھے۔وہ مجھے اطمینان سے مرنے کا موقع دے

رہے تھے۔''۔۱۹۳

سارتر کے یہاں انسانی وجود کی جو اہمیت ہے۔ خود انحصاری کا جو تصور ہے۔ اور حیات و کائنات سے متعلق فکر و فلسفہ کی جو صورت ہے۔ صغیر ملال ایک حوالے سے اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مثلاً سارتر کیلئے صغیر لکھتے ہیں۔ ''سارتر فلسفی کا دماغ اور شاعر کا دل رکھتا تھا۔۔۔ افلاطون اور نطشے کے بعد سارتر کی شخصیت بھی فلسفے اور ادب کے بلند امتزاج کی علامت بن گئی ہے۔''۔۱۹۴ اسی فکر و فلسفہ کے باعث سارتر خوب سمجھتا ہے۔ کہ موت اسکا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ کیونکہ موت وقتی طور پر صرف ایک وجود پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اگر موت کی یہ اثر اندازی ایک انسانی وجود کا خاتمہ ہے۔ تو بقول سارتر'' ۔۔۔ لیکن میں تو پوری نسلِ انسانی کے اندر موجود ہوں''۔۱۹۵

صغیر ملال کے ان ترجمہ شدہ اکثر افسانوں میں کسی نہ کسی حوالے سے موت کا موضوع ایک بنیادی اور نمایاں حیثیت اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ کہیں کہانی کے موضوع کے طور پر، کہیں کسی کردار کی خودکشی پر مبنی موت کے حوالے سے اور کہیں موت سے متعلق ان ادیبوں کے مختلف فکر و نظر کی رو سے۔ اور پھر صغیر ملال کا ان تمام عوامل کے حوالے سے تجزیہ کرنا صاف ظاہر ہے۔ کہ خود صغیر ملال کے اندر خواہش مرگ کیونکر تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ دوست احباب سے موت کے موضوع پر بلاتوقف سوالات و کلمات، کہ موت کیا چیز ہے؟ خدا ہے یا نہیں ہے۔ یا موت کے بعد کیا ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام صورتِ حال ظاہر کرتی ہے۔ کہ ان کے اندر نہ صرف زندگی کی حقیقت جاننے کی تمنا بڑھتی جا رہی تھی۔ بلکہ وہ خواہش مرگ میں بری طرح مبتلا تھے۔ اس موضوع پر ان کے تراجم سے از خود ایک فکری اور تخلیقی سطح ابھرنے لگتی ہے۔ کافکا کے ایک افسانے ''فرمان'' کے ترجمے میں صغیر ملال ایک کردار کے لئے لکھتے ہیں۔

> بفرضِ محال وہ کئی زمانوں کی جدوجہد کے بعد محل کے آخری دروازے سے باہر نکل بھی آیا۔ تو کیا ہوگا۔ اسکے قدموں کے سامنے دنیا کا دارلخلافہ اپنے ہی وجود کی پستیوں سے لبریز ٹھاٹھیں مار رہا ہوگا۔ اور اس مقام سے کوئی نہیں گزر سکتا۔ کبھی نہیں گزر سکتا۔۔۔۱۹۶

یہی ایک فلسفیانہ سوچ ہے۔ کہ زندگی در پردہ کیا ہے؟ موت کے بعد کیا ہوگا۔ اور پھر اس کے بعد۔ اور اس کے بعد۔ اسی طرح پردہ در پردہ، تہہ در تہہ اس سوچ کی گتھیاں الجھتی جاتی ہیں۔ دور حدِ نظر ابدیت۔ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ کنارا کوئی نہیں۔ صغیر ملال کے یہ تراجم اکثر و پیشتر ان کی اپنی سوچ کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ معلوم سے نامعلوم کا سفر کتنا سحر انگیز ہے۔ اپنی ذات میں کئی دیگر ذاتوں کا مشاہدہ۔ اپنا وجود اکائی بھی اور دوئی بھی۔ منزل پر پہنچ کر بھی پھر نیا سفر۔ سفر در سفر۔ صغیر ملال اس حوالے سے کافکا کے لئے لکھتے ہیں۔

> کافکا اپنے نظارے میں محو کہاں تک پہنچ گیا تھا۔ بحیثیت ادیب اس نے ایک غیر دریافت شدہ سمت میں سفر شروع کیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ سارتر کا پیش رو ہے۔ مگر سارتر نے گہرائی سے واپسی کا سیدھا راستہ اختیار کیا۔ جبکہ کافکا علامتوں سے لتھڑا ہوا واپس آیا۔۔۔ کوئی افسانہ نگار کافکا سے زیادہ قدرت کی ستم ظریفی سے آشنا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ آدمی پیدائش سے موت تک نہایت کڑی قید میں ہونے کے باوجود خود کو آزاد تصور کرتا ہے۔ اور جب فرد کو احساس ہوتا ہے۔ کہ وہ اب تک محض خود فریبی کے

سہارے زندہ رہا ہے۔ اسوقت تک انفرادی زندگی تقریباً گزر چکی ہوتی ہے۔ خود کو مختارِ کل سمجھنے والا انسان مجبورِ محض ہے۔ اور یہ اسکا مقدر ہے خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ ۱۹۷۔

صغیر ملال خود خواہش مرگ کے اسیر تھے۔ اور اس کی تلاش میں سرگرداں۔ لہذا اپنے ان تراجم میں ان کے اکثر فقرے اور جملے موت کی خواہش، موت سے خوف، موت کی تلاش اور موت کے لئے اضطراب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ صغیر ملال کے سامنے ان افسانوں کی صورت میں جتنی تصویریں بکھری ہوئی ہیں۔ ان تصویروں میں سے وہ اپنے مطلب کے مناظر اور اپنے مطلب کے رنگ چن کر الگ کر لیتے ہیں۔ اس لیے ان کی وضاحت میں قادرالکلام نظر آتے ہیں۔ مثلاً ''۔۔۔ مائیکل انجلو جو لاتعلقی کی اگلی منزلوں تک پہنچ گیا تھا۔ موت سے پیار کرنے لگا تھا۔۔''۔ ۱۹۸

اسی طرح اس ضمن میں وہ دیگر ادیبوں کے لئے اس طرح سے رقمطراز ہیں۔

کئی عہد ساز شخصیتیں ایسی ہیں۔ جن کی تمام زندگی موت کے خوف کے تلے بسر ہوئی۔ بابائے نفسیات سگمنڈ فرائیڈ کا کہنا تھا۔ کہ چالیس کی عمر کے بعد کوئی دن ایسا نہیں گزرا۔ جب میں موت کے تصور سے ہراساں نہیں ہوا۔۔۔ حقیقت فقط اتنی ہے۔ کہ تم بالآخر مر جاؤ گے۔۔۔ اردو ادب میں علامہ اقبال اور میر تقی میر ایسے شاعر ہیں۔ جنہیں ہم خوفِ مرگ کا اسیر کہہ سکتے ہیں۔ ۱۹۹۔

جین پال سارتر کیلئے صغیر ملال لکھتے ہیں ''جین پال سارترا اپنے ناول ''متلاہٹ'' میں قاری کو حیات و کائنات کی ہر چیز سے مایوس کرنے کے بعد ''تخلیق'' کا دلاسہ دیتا ہے۔''۔ ۲۰۰ ایک اور جگہ صغیر ملال موت کے موضوع کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''اضطراب اور لاتعلقی سے قطع نظر موت کا موضوع فی نفس بہت سنجیدہ ہے۔''۔ ۲۰۱ تصوف کے حوالے سے صغیر زمانے کی حقیقت اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔ ''علم تصوف میں بتایا جاتا ہے۔ کہ زمانے میں ہمہ وقت ''حشر و نشر'' کا سلسلہ جاری ہے۔''۔ ۲۰۲

تمام اہل فکر کی طرح صغیر ملال کے نزدیک موت زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اور سنجیدہ نظری پر مبنی سب سے بڑا سوال ہے۔ ''سنجیدہ عالمی ادب کا تقریباً نصف حصہ صرف موت کا نوحہ ہے۔ تمام فلسفی، تمام ادیب، پرتخیل، ذہن کے لوگ بالآخر وقت اور موت کے سوال پر ٹھٹک جاتے ہیں۔''۔ ۲۰۳

ارجنٹائن کے افسانہ نگار بورخیس کے قول کو صغیر ملال ان الفاظ میں ترجمہ کرتے ہیں۔ ''کائنات کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے اعمال کسی کی موت کے ساتھ ہی اپنے اختتام کو پہنچ کر تمہیں حیران کر دیتے ہیں۔''۔ ۲۰۴

اور حقیقت یہ ہے کہ صغیر بورخیس کے وسیع مطالعہ کا دل سے احترام و اعتراف کرتے ہیں۔ ''تعلیمات اور شاعری اور افسانوں اور فلسفوں کو ذہن میں سمیٹے اپنے شہر (بیونس آئرس) کی گلیوں میں فقیرانہ گھومتا تھا۔ اور قدم قدم پر حیات و کائنات کی تہہ داریوں سے الجھتا جاتا تھا۔''۔ ۲۰۵ صغیر ملال کا اپنا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ تمام علوم کے علاوہ علم تصوف سے متعلق ان کا مطالعہ و شغف بے پناہ تھا۔ لہذا علمی ذہانت روحانیت کے ساتھ فکرِ انسان کے اندر حیات و کائنات سے متعلق جو سوالات اٹھاتی ہے۔ صغیر ملال ان ادیبوں کے اندر انہی علمی و فکری گوشوں کو تلاش کرتے ہیں۔ لہذا امریکہ کے افسانہ نگار جیک لنڈن کے لیے صغیر لکھتے ہیں۔

جیک لنڈن اپنے زمانے کے امریکی ادب اور ادیبوں۔۔۔اور اپنے بعد آنے والے مشہور عالم ارنسٹ ہیمنگ وے سے بہت آگے تھا۔ جو اسی کی طرح موت کے بارے میں سوچتا تھا۔ مگر وہ لنڈن کی طرح حالتِ مرگ کا گہرا تجزیہ کرنے کے قابل نہ تھا۔۔۔جیک لنڈن کا مضبوط بدن اسے مہم جوئی میں بہت دور تک لے گیا۔۔۔یہی اس مہم جوئی کی خوبی ہے۔ جس نے چالیس برس کی عمر میں بے کسی کی موت سے بچنے کے لئے خودکشی کر لی تھی۔ ۔۲۰۶

صغیر ملال نے امریکی شاعرہ اور افسانہ نگار سلویا پلاتھ کے ایک افسانے کا ''خوابوں کی انجیل'' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ سلویا پلاتھ ایک خوبصورت، نوجوان اور ذہین افسانہ نگار شاعرہ تھی۔ تیس سال کی عمر میں اس نے خودکشی کر لی۔ اردو ادب کے دیگر کئی افسانہ نگاروں کے ہاں بھی سلویا پلاتھ کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ تذکرہ ایک طرف سلویا کی خودکشی پر مبنی جوانمرگی کا گلیمر ہے۔ تو دوسری طرف اسے ذہانت اور حسن کے امتزاج کے طور پر لیا گیا ہے۔ صغیر ملال سلویا کے لئے لکھتے ہیں۔

سلویا پلاتھ عجیب عورت تھی۔ تمام عمر خواہشِ مرگ میں مبتلا رہی۔ بالآخر تیسری کوشش میں تیس برس کی عمر میں خود کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گئی۔۔۔خوابوں کا جہان اسقدر نجی اور ذاتی ہوتا ہے۔ کہ ہم اکثر اپنے خواب خود سے بھی نہیں دہراتے۔ جب دوسرے درجے کے ادیب اپنے خواب تحریر کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ تو دراصل وہ جانتے ہی نہیں۔ کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مگر سلویا پلاتھ واقعی اپنے خواب بیان کرنے لگی تھی۔ نتیجتاً وہ خواب در خواب خالی ہوتی گئی۔ ذہن اور سینے کا خلا ایک حد سے بڑھ جائے۔ تو بیرونی فضا کے دباؤ سے وجود کا انہدام لازمی ہے۔ اسی لیے ایک دن سلویا نے تندور میں سر ڈالکر اپنے اس دماغ سے نجات حاصل کی۔ جس پر خوابوں کے برملا اظہار سے شگاف پڑنے لگے تھے۔ مرشد کی ہدایت کے بغیر خود میں اترنے کا لازمی نتیجہ۔۔۔انجذاب! گمراہی! ٹوٹ پھوٹ!۔۔۔اس نے کسی کی ماہرانہ رہنمائی کے بغیر آنکھیں اندر کو پھیر لیں۔ اور اپنی ذات کے مشاہدے میں مصروف ہو گئی۔۔۔وہ آگ سے کھیل رہی تھی۔ اسے راکھ ہونا ہی تھا۔۔۔۔۲۰۷

سلویا پلاتھ کے لئے صغیر ملال نے جو کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے چند نکات اس لیے قابل ذکر ہیں۔ کہ وہ خود صغیر کی مخصوص فطرت اور زندگی پر صادق آتے ہیں۔ مثلاً صغیر ملال نے یہاں جن خوابوں کی بات کی ہے۔ یہ وہی خواب ہیں۔ اسی طرح کے خواب ہیں۔ جو انہوں نے خود سے بھی نہیں دہرائے۔ لیکن وہ ان میں پوری طرح سے رہ رہے تھے۔ ان خوابوں کو بتا کر، دہرا کر وہ شاید دوسرے درجے کا ادیب بننا اور کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے۔ لہذا وہ جس خواہشِ مرگ میں مبتلا تھے۔ وہ اس کے اندر خواب در خواب خود کو بنتے چلے گئے۔ گو وہ خارجی فضا کے دباؤ کے باجود خود کو منہدم تو نہ کر سکے۔ لیکن اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کوئی کہانی، کوئی منظر اپنے مخصوص تاثر اور تسلسل کے ساتھ چلتا ہے۔ اور اسکا انجام اس سے مختلف اور اچانک سامنے آئے۔ اس صورت میں بھی ہم اس انجام کو ان کے گذشتہ تمام حالات و واقعات کی کڑیوں سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ اور نہ اس طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔ یہی بات صغیر ملال کی حیات سے موت تک کے سفر میں

دکھائی دیتی ہے۔ صغیر ملال کی فطری موت میں بھی ان کی زندگی کے مخصوص بہاؤ اور اس کے طرزِ عمل کو بخوبی دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ سلویا پلاتھ کے بارے میں صغیر ملال کے مخصوص طرزِ فکر سے یہ بات بخوبی عیاں ہوجاتی ہے۔ کہ ادیبوں کے ہاں خودکشی ان عالمی اور علمی ذہانتوں کے حوالے سے اپنی ذات اور اپنے داخلی مشاہدے کا عملی اقدام ہے۔ یہ وہ اقدام ہے۔ جسکا آغاز اور انجام سراسر آگ کا ایک کھیل ہے۔ اور اس کھیل کا ایک سرا روحانیت کے ان اسرار و رموز کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ جہاں مرشد کی راہنمائی سالک کو حیات بعد موت کی ابدیت اور سچائی سے ہمکنار کرتی ہے۔ لیکن جہاں ''سالکوں'' کو مرشد کی راہنمائی میسر نہیں آتی۔ وہاں اکثر نے خودکشی کے ''شارٹ کٹ'' کو اختیار کیا۔

صغیر ملال کی فطرت کا ایک اور نمایاں پہلو جوان کے مخصوص طرزِ زندگی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ یہ کہ صغیر کو نشہ کرنے کی عادت تھی۔ پینے پلانے کا شغل ادیبوں کے ہاں اکثر فیشن کے طور پر بھی رہا۔ عادت بھی بنا۔ اور اکثر تخلیقی عمل میں معاون سمجھ کر روا رکھا جاتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیسا نشہ؟۔ اور کتنا نشہ؟۔ یہ ایک فطری امر ہے۔ کہ ہر شئے ایک اعتدال اور توازن کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن ادب کی بدقسمتی یہ ہے۔ کہ اکثر ادیب مختلف اقسام کے نشوں کا نہ صرف عادی بنے۔ بلکہ عین شباب میں، جبکہ ادب کو وہ بہت کچھ دے سکتے تھے۔ نشے کی زیادتی کا شکار ہوکر چل بسے۔ یا خود کو اس کی وقتی سرمستی کا قطرہ قطرہ عادی بنالیا۔ اور ادب کو جتنا فائدہ وہ دے سکتے تھے۔ وہ اسکے لئے اتنے فعال نہ رہے۔ صغیر کے نشہ کرنے کا جہاں تک تعلق ہے۔ ان کے اہل خانہ سے اس ضمن میں بات ہوئی۔ جمیل ملال نے کہا۔ ''ہاں! صغیر چونکہ رات گئے تک جاگتا اور پڑھتا تھا۔ لہذا سونے کے لئے وہ نیند کی کوئی ایک آدھ گولی کھاتا تھا۔ شاید ڈائی۔ زی۔ پام وغیرہ تھی۔ جو وہ معمول کے مطابق لیتا تھا''۔ ۲۰۸

یہ خیالات ان کے عزیزوں کے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس موضوع پر کھل کر بات نہیں کی۔ جبکہ صغیر سے متعلق جن ادیبوں اور قریبی ساتھیوں سے اس بات کا تذکرہ ہوا۔ تو انہوں نے واضح طور پر کہا۔ کہ وہ نشہ ہی نہیں بلکہ حد درجہ نشہ کرتا تھا۔ پروفیسر احمد جاوید کا کہنا ہے۔ '' نشے کا وہ عادی تھا۔ سبھی لکھنے والے ایسا کرتے ہیں۔ لیکن صغیر ضرورت سے زیادہ لیتا تھا''۔ ۲۰۹

بقول کشور ناہید ''صغیر نشہ کرتا تھا۔ چھپاتا نہیں تھا۔ خود بتاتا تھا۔ لیکن میں نے اسے اکثر پان کھاتے ہی دیکھا تھا''۔ ۲۱۰ افتخار عارف سے دو مرتبہ اس ضمن میں گفتگو ہوئی۔ انہوں نے واضح طور پر کہا۔

> صغیر اپنا برخوردار تھا۔ چھوٹا تھا۔ لیکن بات یہ ہے۔ کہ اس نے اپنی زندگی کو کافی حد تک بے راہ روی کے ساتھ بسر کیا۔ بعد میں کچھ بہتر ہوگیا تھا۔ لیکن نشہ وہ کرتا تھا۔ اور خوب کرتا تھا۔ بھنگ، چرس، شراب وغیرہ وہ سب کا عادی تھا۔ اور اکثر تمام نشے یکجا کر کے لیتا تھا۔ شاید اس کاک ٹیل میں، اس شیشے میں انہیں کوئی پری نظر آتی ہو۔ جیسا کہ اس حوالے سے عموماً یہ لوگ کہتے ہیں۔ یا ہم سنتے ہیں۔ ایسا کر کے شاید یہ کسی اور ہی دنیا میں مست رہتے ہیں۔ ۲۱۱

صغیر کی زندگی میں انکا پینا پلانا کسی سے ڈھکا چھپا نہ تھا۔ اور نہ ہی وہ خود اپنی اس عادت کو چھپاتے تھے۔ مشتاق احمد یوسفی نے اس حوالے سے کہا۔ ''صغیر نشہ کرتا تھا۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی''۔ ۲۱۲ افتخار عارف نے اس حوالے سے ایک واقعہ سنایا۔

ایک مرتبہ ہم یوسفی صاحب کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔صغیر اپنی بیوی کے ساتھ وہاں آیا ہوا تھا۔ ہلکے پھلکے انداز میں بیوی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔کہ ان سب کو بتاؤ۔کہ میں نے شراب چھوڑ دی ہے۔۔۔۔۲۱۳

اس ضمن میں افتخار عارف نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔کہ صغیر نے اگر چہ شادی سے پہلے کچھ عرصہ بے راہ روی میں زندگی بسر کی۔نشے کا عادی تھا۔لیکن شادی کے بعد اس نے خود کو کافی تبدیل کیا۔صغیر کے نشہ کرنے کی عادت کے باعث ہی ایک رائے یہ ہے۔کہ صغیر ملال نے ضرورت سے زیادہ نشہ لیا۔اور اسوجہ سے ان کی موت واقعی ہوگئی۔اس کے برعکس دوسری رائے یہ ہے۔کہ صغیر کی موت شعوری طور پر کسی نشے کے باعث نہیں ہوئی۔ بلکہ صغیر کو بخار تھا۔اور ڈاکٹر کی دوا جو انجکشن کی صورت میں انہیں دی گئی۔اس کا ری ایکشن ہوا۔اور نتیجتاً ان کی فوری موت واقع ہوگئی۔اب ڈاکٹر کی دی جانے والی دوا کے بارے میں دو آراء پائی جاتی ہیں۔ایک رائے کے مطابق جس ڈاکٹر نے دوا دی۔وہ صغیر کا دوست تھا۔اور اس نے بخار اور فلو کے لیے ایک مرتبہ نہیں۔ بلکہ دن میں تین مرتبہ دوا تبدیل کی۔اور اس کے ری ایکشن کی وجہ سے صغیر نے وفات پائی۔اس ضمن میں دوسری رائے یہ ہے۔کہ دوا کسی کیمسٹ نے دی تھی۔صغیر ملال کے بھائی جمیل ملال کا کہنا ہے۔

ہمیں صغیر کی وفات کی خبر یہاں اسلام آباد میں انتہائی اچانک ملی۔ پہلے ہم نے سمجھا۔ کہ کوئی غلط کال ہے۔لیکن بعد میں مکمل خبر ملی۔وہاں کراچی جا کر ہی پتہ چلا۔کہ صغیر ڈاکٹر کی کسی غلط دوا کے ری ایکشن سے وفات پا گیا ہے۔جس ڈاکٹر کا ذکر تھا۔وہ صغیر کا دوست تھا۔صغیر اکثر اس سے دوا لیتا تھا۔اس روز چونکہ اسے فلو تھا۔ڈاکٹر نے اسے جو دوا دی۔اسکا اثر نہ ہوا۔اس نے دوا تبدیل کی۔تو صغیر کو گھبراہٹ شروع ہوگئی۔اس گھبراہٹ کو دور کرنے کے لیے ڈاکٹر نے کوئی انجکشن دیا۔تو اسکا ری ایکشن ہوگیا۔ اور صغیر کا فوراً انتقال ہوگیا۔۲۱۴

جبکہ کشور ناہید کا کہنا ہے کہ ''صغیر ملال کی اچانک موت کسی کیمسٹ کی غلط دوا کے ری ایکشن سے ہوئی۔اس نے خودکشی نہیں کی۔''۔۲۱۵ افتخار عارف نے بھی اسی قسم کی بات کہی۔کہ ''صغیر کا انتقال کوئی غلط دوا لینے کے باعث ہوا۔اس کی موت خودکشی کے باعث نہیں ہوئی۔''۔۲۱۶ پروفیسر احمد جاوید کا اس سلسلے میں کہنا ہے۔''صغیر ملال نے سنا ہے کہ خودکشی نہیں کی۔ بیمار تھا۔شاید اس نے کوئی غلط دوا لے لی تھی۔''۔۲۱۷ ان تمام آراء کا ماخذ صغیر ملال کے اہل خانہ کے تاثرات ہیں۔ایسے حالات میں کوئی خبر اور اطلاع عموماً انہی حوالوں سے زبان زدِ عام ہوا کرتی ہے۔یہی رائے صغیر ملال کی اہلیہ کی بھی ہے۔جن کے پاس کشور ناہید تعزیت کے لئے گئی تھیں۔

بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں سے جس بھی صورتِ حال سے دو چار ہو کر صغیر ملال نے وفات پائی ہو۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔کیونکہ صغیر ملال جس طرح کی زندگی گزار رہے تھے۔جس طرح کا انکا مخصوص ضابطۂ حیات تھا۔ان تمام شواہد کے پیشِ نظر میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر کوئی غلط دوا لینے سے ان کی موت واقعی نہ بھی ہوتی۔تو بھی اپنے مخصوص مزاج اور سوچ کے مطابق خواہش مرگ کے ہاتھوں مجبور ہو کر صغیر نے موت کا تجربہ ضرور کرنا تھا۔جس طرح کے تجربات وہ زندگی کے دیگر معاملات میں کر رہے تھے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی۔کہ منشیات کے استعمال میں ان کی حد درجہ

رغبت اسی خواہش مرگ کی تسکین ہی کی ایک صورت تھی۔ایک تجرباتی کیفیت تھی۔جس سے وہ لحہ بہ لحہ گزر رہے تھے۔

جس کو احساس ہوا افلاک کی تنہائی کا
دیر تک اسکو اکیلا نہیں رہنے دیتے

اور اپنی زندگی میں اپنی موت کے لئے اتنے یقین سے کچھ کہنا اسی سلسلہ ہی کی کڑی معلوم ہوتی ہے۔جو کسی بھی لحہ اقدام خودکشی میں بدل سکتی تھی۔بقول جمیل ملال۔

تحقیق اگر یہ کہے۔کہ صغیر ملال نے خودکشی کی ہے۔تو مجھے اس میں تعجب نہ ہوگا۔کیونکہ تجسس اس میں ایب نارمل حدتک تھا۔ایڈونچر کرنے کی اسے عادت تھی۔پیدائشی ذہین تھا۔انتہائی محنتی اور کثیر المطالعہ تھا۔اور اکثر وہ یہ کہتا تھا۔کہ میں بہت جلد مر جاؤں گا۔اس لیے جلد از جلد زیادہ لکھنا چاہتا ہوں۔-۲۱۸

صغیر کی فطرت کے نمایاں پہلو،جس میں انکا زندگی سے متعلق جارحانہ رویہ اور تجسس کا پہلو بہت نمایاں ہے۔بہت ممکن ہے۔کہ ان کی فطری ذہانت کے ساتھ ملکر انہیں اس راستے پر لے آتا۔جو راستہ ان مخصوص حالات میں خودکشی کرنے والے ادیبوں کے ہاں عموماً کھل جاتا ہے۔یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔کہ صغیر ایک پڑھے لکھے،معاشی حالات میں آسودہ اور پرسکون گھریلو زندگی بسر کررہے تھے۔بظاہر ایسے حالات میں صغیر ملال کا جانتے بوجھتے خودکشی کرنا کوئی جواز فراہم نہیں کرتا۔لیکن ادیب کی زندگی اور موت سے متعلق فکر آمیز لٹریری سوچ بظاہر ایسے خارجی تاثرات نہیں رکھتی۔جس سے کوئی آہٹ سنائی دے۔کہ اس کے یہاں خواہش مرگ کی آبیاری ہورہی ہے۔ایسے حالات میں ادیب کا خارج پرسکون دکھائی دیتا ہے۔یہ سارا طوفان اور متصادم سوچوں کا نشیب و فراز تو اس کے اندر ہوتا ہے۔

گھر کے اندر ہے دوسرا عالم
گھر کے باہر عجیب دنیا ہے

گھر کے اندر کا عالم ہی ادیب کے اندر کی دنیا ہوتی ہے۔جس میں وہ خود اپنے لیے ہی اہم اور ضروری ہوتا ہے۔اس لیے کہ اس عالم کا وہ خود ہی خالق اور خود ہی اسے بسر کر رہا ہوتا ہے۔وہ بقول صغیر ملال اپنے خوابوں کو خود سے بھی نہیں دہراتا۔اور صغیر کے حوالے سے تو ایسی صورتِ حال کی اس کی خارجی زندگی میں نشاندہی ملتی ہے۔جن کے باعث یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔کہ صغیر ملال نے اگر شعوری طور پر کوئی دوا حصول مرگ کے لئے نہیں لی۔تو جن مخصوص حالات میں ان کی مخصوص فطرت اور کردار کے نمایاں پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے۔وصالِ مرگ کا تجربہ کرنا ان کے ہاتھوں سے کچھ دور نہ تھا۔

صغیر ملال نے خوابوں کے حوالے سے جو بات کہی ہے۔اسی سے کسی قدر ملتی جلتی رائے بانو قدسیہ کی ہے۔جس میں انہوں نے انسانی شخصیت کی داخلی کیفیات و محسوسات کے اس کی خارجی زندگی پر وہ اثرات دکھائے ہیں۔جنہیں انسان نہ تو خود کوئی نام دے سکتا ہے۔اور نہ اسکا اظہار کرسکتا ہے۔اور نہ ہی دوسرا شخص بظاہر ان کیفیات کو محسوس کرسکتا ہے۔لیکن ان محسوسات کا اس کے اندر ہی اندر دنیاءِ گم گشتہ میں سفر جاری و ساری رہتا ہے۔بانو قدسیہ لکھتی ہیں۔

مجھے لگتا ہے۔کہ تمام بیماریاں سب کی سب خواہش سے تعلق رکھتی ہیں۔آدمی پہلے بیمار ہونا چاہتا ہے۔اسے اندر ہی اندر کہیں اپنے آپکو تکلیف دینے کی آرزو ہوتی ہے۔

پہلے اس کی صحت مندر ہنے کی Will کمزور ہوتی ہے۔ پھر وہ سائیکوسومیٹک بیماری
میں مبتلا ہوتا ہے۔ جسم مدافعت سے انکار کرتا ہے۔ اور جراثیم وغیرہ اثر کر جاتے ہیں۔
۲۱۹۔

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ انسانی خواہشات کی نہ تو کوئی متعین حدود ہیں۔ اور نہ انسانی فطرت کے ساتھ ان کی مطابقت اور انجذاب کی کوئی مخصوص صورت ہے۔ خواہشوں کی فصل تو انسان کے داخلی اور خارجی جہانوں کے مابین لا متناہی راستوں پر بوئی اور کاٹی جاتی ہے۔ بونے کا موسم تو شاید انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ لیکن کاٹنے کا موسم جب آتا ہے۔ تو اس میں پھر موسموں کی شدت بھی آڑے نہیں آتی۔ سب کچھ کر گزرنے کے انداز میں ہو جاتا ہے۔ خواہش مرگ بھی ایک ایسی آرزو ہے۔ ایک ایسی فصل ہے۔ جو انہی موسموں میں خود بخود کٹ جاتی ہے۔

صغیر ملال نے خودکشی نہیں کی۔ جیسا کہ شواہد بتاتے ہیں۔ لیکن خواہش مرگ ایک day dreaming کی صورت ان میں ضرور موجود تھی۔ جو صغیر کے نزدیک خوابوں کے جہان میں ان کی انتہائی ذاتی اور نجی تھی۔ جو انہوں نے شاید اپنے آپ سے بھی نہیں دہرائی۔ لیکن بانو قدسیہ کی مندرجہ بالا رائے کی روشنی میں یہ خواہش مرگ صغیر ملال کے حوالے سے ان کے اندر پروسیس ضرور ہوتی رہی۔ جو بعد میں صغیر ملال کی حادثاتی جوانمرگی کے ساتھ وابستہ ہوتی نظر آتی ہے۔

جمیلہ شاہین(۱۹۳۰ء-۱۹۹۷ء):

جمیلہ شاہین رائے بریلی میں پیدا ہوئیں۔ اپنے والد ڈاکٹر یونس کی دوسری شادی سے پہلی اولاد تھیں۔ ڈاکٹر یونس کی پہلی شادی سے دو بیٹے ہیں جبکہ ان کی دوسری شادی سے دو بیٹیاں ہیں۔ جمیلہ شاہین اور شکیلہ حمید۔

جمیلہ شاہین نے طالب علمی کا کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج باغ سرداراں میں گزرا اردو میں ایم اے اور بعد میں بی ایڈ کیا۔ وہ گارڈن کالج سے فارغ التحصیل تھیں۔ اور درس تدریس کے شعبے سے وابستہ تھیں لکھنے لکھانے کا شوق تھا۔ اگرچہ اس ضمن میں انہوں نے کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی۔ لیکن ان کے تنقیدی نوعیت کے مضامین اکثر مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ وہ مطالعہ کا بہت شغف رکھتی تھیں۔ اردو، انگریزی، روسی لٹریچر سبھی کچھ پڑھتی تھیں۔ مختلف مذاہب کے بارے میں مطالعہ رکھتی تھیں۔ اس بارے میں ان کی بہن پروفیسر شکیلہ حمید کا کہنا ہے کہ ''شاید زیادہ مطالعہ نے ہی جمیلہ شاہین کو کسی ایک راستے پر ثابت قدمی سے چلنے نہ دیا۔'' جمیلہ شعر و ادب کے ساتھ وابستگی رکھتی تھیں۔ وہ اپنے کالج کے زمانے میں بہترین شاعرہ کے حوالے سے جانی جاتی تھیں۔ ریڈیو پر وہ بزمِ خواتین کی انچارج تھیں۔ ٹی وی کے لیے بھی انہوں نے چند ڈرامے لکھے۔ اتنی بہت سی اور مختلف نوعیت کی تخلیقی سرگرمیوں سے وابستگی نے ان کے حلقہ احباب میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ دوران تحقیق یہ بات اکثر ناقدین نے کہی کہ جمیلہ شاہین کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ بقول پروفیسر شکیلہ حمید:

> جمیلہ شاہین ادب، ٹی وی اور ریڈیو کے حوالے سے جن اہم شخصیات سے وقتاً فوقتاً ملتی رہتی تھیں۔ ان میں احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، کشور ناہید، فتح محمد ملک، بیگم اختر ریاض الدین، بدر خلیل، منیزہ ہاشمی بانو قدسیہ، شجاعت ہاشمی، زہرہ نگار، بجیا، صبیحہ اور سنتوش وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ -۲۲۰

ان تمام افراد جن کے ساتھ ان کے مراسم تھے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ ہر شعبہ کا اپنا مزاج، اپنا طریقہ کار اور ایک مخصوص طرزِ فکر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں جہاں زیادہ ممکنات کسی شخصیت کو بہتر بنانے اور نکھارنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ وہاں اس بات کا بھی امکان موجود ہے۔ کہ وہ غیر شعوری طور پر اس مخصوص ماحول کے ایسے منفی طریقہ کار اختیار کرے۔ جو اس کی شخصیت کو ضرر پہنچانے کا باعث بنتے ہوں۔ ایسے عوامل کو اختیار کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے۔ کہ جب کوئی شخص اور خاص طور پر کوئی ادیب، کوئی تخلیق کار سوشل زندگی اختیار کرتا ہے۔ تو وہ ہر دلعزیز

ہونے کے لئے ان کا مخصوص ماحول اور مزاج اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے نتائج نکلتے ہیں۔ جمیلہ شاہین کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہوئیں۔ لہٰذا ان کی شخصیت جہاں ادبی اور تخلیقی حوالے سے فعال ہوئی۔ وہاں ان کے غیر اخلاقی رویوں نے انہیں نہ صرف تکلیف دہ صورتِ حال سے دوچار کیا بلکہ ان کی وجہ سے ایک اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی حامل ادیبہ خود اپنے ہاتھوں ضائع ہوگئی۔ اور ضائع ہونیکے اس عمل میں ان کے مخصوص حلقہ احباب نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

جمیلہ شاہین ٹی وی کے ساتھ بھی وابستہ تھیں۔ ٹی وی سے وابستگی کے زمانے میں انہوں نے چند معروف ڈرامے لکھے۔ جن میں بی جمالو، سفید سایہ، بس پانچ منٹ، رضیہ انور سریز وغیرہ اہم ہیں، بقول شکیلہ حمید ''جمیلہ شاہین امراؤ جان ادا پر کام کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ لیکن کچھ پیشہ ورانہ رقابت اور کچھ دیگر مسائل کے باعث وہ اس کام کو تکمیل تک نہ پہنچا سکیں۔''۔[۲۲۱]

پیشہ وارانہ رقابت نے جمیلہ شاہین کیلئے بے پناہ مشکلات پیدا کیں۔ ان مشکلات کی نوعیت دو طرح کی تھی ایک تو ایک تخلیق کار کے تخلیقی عمل کو پنپنے کے مواقع فراہم نہ کرنا۔ اور دوسرا نفسیاتی اور ذہنی طور پر صدمے کا باعث بننا۔ جمیلہ شاہین کیلئے یہ صورتِ حال یقیناً انتہائی تکلیف دہ تھی۔ ایک ادیب عموماً ایسے ہی موقعوں پر دل گرفتہ اور دل شکستہ ہوتا ہے۔ جبکہ بنیادی طور پر جمیلہ شاہین انتہائی زندہ دل شخصیت تھیں۔ ہنسی مذاق، لطیفہ گوئی، جملہ بازی، برجستگی ان کی طبیعت کا خاصا تھا۔ ملنا ملانا، پکنک، تاش کھیلنا، کیرم، پکچر دیکھنا اور اسی طرح کے دیگر مشاغل ظاہر کرتے ہیں کہ وہ زندگی کی گہما گہمی میں پوری طرح مصروف و مشغول تھی۔ لیکن ان کے مخصوص حلقہ احباب کے بعض تلخ رویوں اور ان کے اپنے مخصوص نفسیاتی و ذہنی طرزِ عمل نے ان کی زندگی میں بے پناہ مشکلات پیدا کر دیں۔ جس کے باعث جمیلہ شاہین کبھی نہ ختم ہونے والی خود اذیتی سے دوچار ہوگئیں۔ اور اسی کیفیت میں بالآخر انتہائی کسم پرسی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

جمیلہ شاہین کی خود اذیتی پر مبنی موت کے محرکات پر نظر ڈالی جائے تو اس میں مختلف عوامل کارفرما نظر آتے ہیں ابتداء ان کے معاشی مسائل سے ہوتی ہے۔ جمیلہ شاہین اپنے والد صاحب کی دوسری شادی سے پہلی اولاد تھیں۔ گھر میں کتنی ہی خوشحالی ہو۔ سوتیلے رشتوں میں کتنے ہی اچھے مراسم ہوں۔ غیر محسوساتی طور پر اختلافات ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ ان اختلافات کی نوعیت ایک تو باپ کی طرف سے اولاد کو عدم تحفظ کی صورت میں ملتی ہے۔ اور دوسرا معاشی نوعیت کے مسائل ہوتے ہیں۔ اگرچہ جمیلہ شاہین کے والد ڈاکٹر تھے۔ لیکن دو خاندانوں کی نگہداشت کرتے ہوئے اب نہ صرف ان کی اولاد کیلئے توجہ اور پیار بٹ گیا تھا۔ بلکہ معاشی حوالے سے بھی اخراجات کی مد بچوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی پہلی بیوی سے اولاد دو بیٹوں کی صورت میں تھیں۔ لہٰذا ایسی صورت حال میں گھر کا ماحول برا نہ سہی۔ لیکن کس قدر معاشی مسائل کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ جمیلہ شاہین کے اندر Self independence نظر آتی ہے۔

اگر ان کے معاشی حالات میں آسودگی ہوتی۔ تو جمیلہ شاہین تعلیم مکمل کر کے ملازمت کی طرف رجوع کرتیں۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ بلکہ وہ ملازمت کے ساتھ وقفے وقفے سے تعلیم حاصل کرتی رہیں۔ اس حوالے سے ان کے اندر ایک طرف خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ تو دوسری طرف خود انحصاری کی ایسی کیفیت نے جنم لیا۔ جس نے جمیلہ شاہین کو خاندان کی کفالت کیلئے ایک مردانہ صفت کردار میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ انہی عوامل نے جمیلہ کی نسوانیت میں مردانہ اوصاف کو ابھرنے میں مدد دی۔ ان کی بات چیت، نشست و برخاست اور سوشل زندگی میں ان کے مردانہ صفت رویے نمایاں حد تک فعال دکھائی

دیتے ہیں۔ یہ ہماری سوسائٹی کا ایک تکلیف دہ پہلو ہے۔ کہ عورت خاندان کی معاشی ضروریات کو پورا کرتے کرتے اپنی نسوانیت کو دبا دے۔ یا ان مخصوص حالات میں یہ نسوانیت خود بخود دبتی چلی جائے۔ اور پھر جمیلہ شاہین کے حوالے سے اگر اس صورتِ حال پر غور کیا جائے۔ تو یہ تمام مسائل ایک ایسی عورت کے ساتھ منسلک نظر آتے ہیں۔ جو ان مشکلات کے ساتھ ساتھ اپنی فطری تخلیقی صلاحیتوں کی پرداخت بھی چاہتی ہے۔ اور مرد کے سماج میں اپنا ایک مقام بنانے میں کوشاں ہے۔

یہ تمام پس منظر ان کی مخصوص فطرت کا وہ پہلا مرحلہ اور ابتدائی اینٹ ہے۔ جس نے جمیلہ شاہین کی بعد کی زندگی میں ان کی خود اذیتی پر مبنی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔ انہیں ان مخصوص حالات نے جس راستے پر ڈال دیا تھا۔ یا انہوں نے ان حالات میں خود جو طرزِ زندگی اپنے لیے انتخاب کیا تھا۔ اور جس کو اپنائے بغیر ان کے سامنے کوئی چارا بھی نہ تھا۔ اس کے لئے بالآخر ان کی حساس فطرت نے خود کو ہی تختہ ٔ مشق بنا دیا۔

مندرجہ بالا حالات و واقعات کی روشنی میں جمیلہ شاہین کے مخصوص رویے کا ایک اور نتیجہ جو برآمد ہوا۔ اور جس نے ان کی زندگی میں بحیثیت عورت ایک غیر فطری پن پیدا کیا۔ وہ جمیلہ شاہین کی بروقت شادی کا نہ ہونا ہے۔ گھریلو مسائل اور خاندان کی کفالت کے باعث وہ زندگی کو حقیقتاً مردانہ وار برتنے لگیں۔ لیکن ان کے اندر کی عورت جو وقتی طور پر دب تو گئی تھی۔ لیکن مر نہ سکی۔ اس سے ان کے اندر داخلی اور خارجی حوالے سے تصادم پیدا ہوا۔ جس نے ذہنی اور نفسیاتی سطح پر ایک لکھاری کو مفلوج اور عملی زندگی سے پسپا کرنا شروع کر دیا۔ انکے اندر ایک نا آسودگی اور ناخوشی پروان چڑھنے لگی۔ جس نے رفتہ رفتہ انہیں تنہا پسند بنایا۔ اور دوسروں کے حوالے سے رقابت اور حسد کے جذبات بھی ان کے اندر پنپنے لگے۔

جمیلہ شاہین کی خود اذیتی پر مبنی زندگی اور اس حوالے سے ان کی موت کا واقعی ہونا۔ ان محرکات میں ایک اور اہم محرک یہ ہے۔ کہ وہ حد درجہ حساس طبیعت کی مالک تھیں۔ بحیثیت ادیب حساس فطرت کے باعث ان کے اندر انسانی ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ سماج کے منفی رویے انہیں کسی طور قابلِ قبول نہ تھے۔ وہ جن انسانی قدروں کی حامل تھیں۔ گرد و نواح کا ماحول ان قدروں سے عاری تھا۔ ادیب کی زندگی کا یہ المیہ اس کی شخصیت میں ٹوٹ پھوٹ اور ایک تصادم کی کیفیت کو جنم دیتا ہے۔ ایسا تصادم جو بظاہر دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن اندر ہی اندر اس کے بہت شدید اور گھمبیر اثرات اس کی داخلی شخصیت پر مرتسم ہوتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ یا ایسا کیوں نہیں ہے؟ وہ انہی متضاد سوالیہ سمتوں کے درمیان معلق ہو کر رہ جاتا ہے۔ جمیلہ شاہین کی زندگی میں کچھ ایسا ہی کرب موجود تھا۔ جمیلہ شاہین کی بہن شکیلہ حمید نے اس ضمن میں ایک واقعہ سنایا۔

> جب ملک میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیئے جانے کا مسئلہ اٹھا۔ تو ہمارے محلے میں رہنے والے قادیانی خاندان کے ساتھ لوگوں نے ایک قسم کا سوشل بائیکاٹ کر دیا۔ اس حوالے سے انتہا پسندی اس حد تک بڑھی۔ کہ ان کے پینے کے پانی کا نل کاٹ دیا گیا۔ ایسے میں جمیلہ شاہین کے دکھ اور غصے کی انتہا نہ تھی۔ یہ کہتے ہوئے وہ خود بالٹیوں میں پانی بھر بھر کر ان کے گھر پہنچاتی تھیں۔ کہ میں دیکھتی ہوں کون مجھے روکے گا۔ یہ ستم تو میں غیر مسلموں کے ساتھ بھی نہیں دیکھ سکتی۔ کجا یہ کہ یہ لوگ اور ان کے معصوم بچے پیاس سے بلک بلک کر مر جائیں۔ ۲۲۲۔

حساس فطرت رکھنے کے باعث جمیلہ شاہین کے اندر خود اپنی ہی ذات سے الجھاؤ اور تصادم کی صورت دکھائی

راگ رُت، ایسی کیفیت کا اظہار اسوقت زیادہ ہوتا ہے۔ جب ماحول کو وہ اپنے حوالے سے بدل نہ سکیں۔ اور خلاف منشا دیتا ہے۔ ماحول کے سامنے ہتھیار پھینکنا انہیں گوارا نہ تھا۔ ان خارجی نا مساعد حالات کے علاوہ ان کی گھریلو اور ذاتی زندگی کے حوالے سے ایک یہ رائے بھی ہے۔ کہ جن عزیز و اقارب کیلئے انہوں نے معاشی مسائل کا سامنا کیا۔ جن کی مالی امداد کی۔ ان سے بھی انہیں وہ محبت، خلوص اور توجہ نہ مل سکی۔ جس کی وہ مستحق تھیں۔ اس ضمن میں ایک رو یہ یہ بھی ہے۔ کہ انہیں اپنے اہل خانہ کے ساتھ جائیداد کے حوالے سے کچھ اختلافات تھے۔ صورتِ حال کچھ بھی ہو۔ لیکن حساس دل لکھاری کی انا ایسی صورتِ حال میں بری طرح مجروح ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس نا آسودگی کا سارا غم و غصہ اور ناراضگی، جسے انتقام ہی کی ایک صورت کہا جاسکتا ہے۔ اپنی ذات پر نکالتا ہے۔ تو نتیجہ یہی نکلا کہ وہ ان دونوں کے نکتۂ اتصال پر خود کو اذیت دینے کے سوا کچھ اور نہ کر سکیں۔ اور اذیت بھی اس انتہا درجے کی، کہ جس میں دنیاوی زندگی کے تمام معمولات و مشاغل کو ترک کر دینے کے ساتھ ساتھ اپنی صحت اور بالآخر زندگی سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔

جمیلہ شاہین کی حساس فطرت میں اضافے کا سبب جمیلہ شاہین کی Sef made شخصیت بھی بنتی ہے۔ Self made لوگ زندگی میں ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل اور خاص معیار کے ساتھ زندگی کو برتتے اور برتے جانے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ زندگی کو آئیڈیلائزڈ کرتے ہیں۔ اور عدم تکمیل کی صورت بری طرح ٹوٹ پھوٹ سے ہمکنار ہوجاتے ہیں۔ اور اس ٹوٹ پھوٹ کا سارا عمل خود ان کی اپنی ہی ذات پر ہوتا ہے۔ چنانچہ جمیلہ شاہین کی زندگی اور ان کی شخصیت کا یہ پہلو ان کی خود ساختہ اور خود پسند موت کے محرکات سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں جمیلہ شاہین کی مخصوص شخصیت کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ وہ زندگی میں تمام طرح کے حالات سے گزرتے ہوئے کسی سے کوئی شکوہ نہیں کرتی تھیں۔ انتہائی نا مساعد حالات میں بھی خاموشی کے ساتھ وہ سب کچھ سہہ لیتی تھیں۔ دکھ اٹھاتی تھیں۔ اور یہ بات ان کے انتہائی قریب رہنے والے دوست احباب بخوبی جانتے تھے۔ کہ ان کے خاموش احتجاج میں کتنی تکلیف اور کرب پنہاں تھا۔ جمیلہ شاہین کی بھابھی مسز رخسانہ احسان اس ضمن میں کہتی ہیں۔

> کہیں بھی تکلیف دہ صورتِ حال کو سامنا کرتیں۔ گلہ کسی سے نہیں کرتی تھیں۔ کسی سے کچھ کہتیں۔ نہ سنتیں۔ لیکن اندر ہی اندر کڑھنے کی کیفیت کو دوسرا با آسانی محسوس کرسکتا تھا۔ یہ صورتِ حال آخری سالوں میں زیادہ ہوگئی تھی۔ ۲۲۳

درحقیقت یہی وہ مقام ہے۔ جب لکھاری اور حساس فطرت کی حامل شخصیات اندر ہی اندر ٹوٹنے کے عمل سے دوچار ہوکر خود اپنی ہی ذات میں سمٹنے لگتی ہیں۔ یہ وہ تنہائی ہے۔ جہاں خارجی ماحول سے گفت و شنید کا عمل نہ صرف رک جاتا ہے۔ بلکہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہوجاتا ہے۔ اور اس کی انتہائی کیفیت آخرکار خودکشی یا اقدام خودکشی کے راستے ہموار کردیتی ہے۔

جمیلہ شاہین کے ایک مخصوص اور تنہا پسند طرزِ زندگی کو اپنانے میں ان کی زندگی کے حوالے سے جو منفی نتائج سامنے آئے۔ ان میں جمیلہ کے غیر محتاط شخصی رویے کا بھی اہم کردار ہے۔ یہ درست ہے کہ جمیلہ شاہین ایک پختہ فکر اور سنجیدہ نظری کی حامل لکھاری تھیں۔ بہت ذہین اور مطالعہ کی شوقین تھیں۔ ادبی حلقوں میں نہ صرف جانی پہچانی جاتی تھیں۔ بلکہ ان حلقوں کی مخصوص ادبی نشستوں میں باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کا کہنا ہے۔

> جمیلہ شاہین ایک ذہین لکھاری تھیں۔ ادبی حلقوں میں اپنی پہچان رکھتی تھیں۔ اکثر حلقے

کی ادبی نشستوں میں بھی شامل ہوتیں۔ اپنا کوئی نہ کوئی مضمون یا شاعری پڑھ کر سناتی تھیں۔ انہوں نے کم لکھا۔ لیکن اچھا لکھا۔ ۲۲۴

لیکن ایک تخلیقی ذہن کو جس بہتر منصوبہ بندی اور مثبت و مخصوص راستے کا تعین کرنا چاہیے۔ جمیلہ شاہین اس منصوبہ بندی اور احتیاط کو نہ برت سکیں۔ وہ مرد کے سماج میں اپنی فطری صلاحیتوں کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی تھیں۔ وہ تخلیقی سطح پر شہرت بھی چاہتی تھیں۔ اور کامیابی بھی۔ لیکن یہ دونوں باتیں مرد کے سماج میں آسانی سے اور جلد ملنے والی چیزیں نہ تھیں۔ اسکے لیے جو مشکلات درپیش تھیں۔ انہیں جمیلہ کے اندر کی عورت نے پہلے سامنا کیا۔ اور بحیثیت ادیبہ وہ بعد میں جانی گئیں۔ اکثر ادیب ادب کے بہانے ان کے عورت پن کے متلاشی رہتے۔ اس میں جمیلہ شاہین کا اپنا بھی آزادانہ اور غیر محتاط رویہ شامل ہے۔ ان کے جلد بے تکلف ہونے کی عادت اور آزادانہ روش کا دائرہ کار رفتہ رفتہ ادب کی دنیا سے باہر تک پھیلتا چلا گیا۔ پھر ہر طرح کے لوگ اس میل جول میں در آئے۔ جمیلہ شاہین کی اس آزادانہ روش نے ان کیلئے بے پناہ مسائل کھڑے کر دیئے۔ اس سے بحیثیت لکھاری ایک طرف ان کی ادبی ساکھ کو دھچکا لگا۔ تو دوسری طرف ان کا کردار ایسے غیر اخلاقی حوالوں کی زد میں آ گیا۔ جو بعد میں خود جمیلہ شاہین کے لئے نفسیاتی اور ذہنی مسائل بنکر ابھرے اسی حوالے سے جمیلہ شاہین کی ایک قریبی دوست مسز سلمیٰ جبین جو لاہور کالج برائے خواتین سے فائن آرٹس کے شعبے میں بحیثیت ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ریٹائر ہوئیں۔ اور آج کل علامہ اقبال ٹاؤن نشتر پارک لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔ راقمہ کی جب گفتگو ہوئی۔ تو انہوں نے اس حوالے سے کہا کہ

> میں لیڈی میکگلن کالج لاہور میں تھی۔ جمیلہ شاہین وہاں آئی تھیں۔ ہماری دوستی ہوئی۔ جو کافی عرصہ رہی۔ وہ بہت ذہین اور خوشگوار مزاج رکھتی تھی۔ بات ہمیشہ موزوں الفاظ میں کرتی۔ لہجے میں شستگی تھی۔ پڑھی لکھی خاتون تھی۔ ادب اور مطالعہ سے بہت شغف تھا۔ لیکن کمزوری یہ تھی۔ کہ بہت جلد دوسروں سے بے تکلف ہو جاتی۔ ہماری سوسائٹی کے اخلاقی ضابطے مردوں کیساتھ یقیناً ایسی بے تکلفی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ میرے بار ہا منع کرنے کے باوجود بھی اُس کی اس عادت میں کمی نہ آئی۔ چونکہ الٹرا ذہین اور آؤٹ سپوکن تھی۔ لہذا ان تمام عوامل نے ملکر نہ صرف اس کی ادبی ساکھ کو نقصان پہنچایا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی اس بے تکلف عادت نے بعد میں اس کے لیے اخلاقی نوعیت کے بہت سے مسائل کھڑے کر دیئے۔ ۲۲۵

مشہور مصنف اور نقاد پروفیسر فتح محمد ملک اس ضمن میں کہتے ہیں ''ادیبوں کے ساتھ جمیلہ شاہین کے مراسم تھے۔ ان مراسم میں بے تکلفی کا عنصر غالب تھا۔ بعد میں بے تکلفی کا یہ رویہ غیر ادبی لوگوں کیساتھ بھی بڑھ گیا تھا۔'' ۲۲۶

ان تمام عوامل نے یکجا ہو کر جمیلہ شاہین کو ایک فعال، مثبت تخلیقی اور اخلاقی سطح سے بے نیاز کر دیا۔ یہاں سے ان کی زندگی کے ایک ایسے سفر کا آغاز ہوا۔ جس نے آہستہ آہستہ انہیں نہ صرف عملی زندگی کی سرگرمیوں سے محروم کر دیا۔ بلکہ یہ تنہا پسندی سماج کے منفی رویوں کے خلاف ایک احتجاج تھا۔ متضاد انسانی رویوں کو سامنا کرنے سے فرار کا ایک راستہ تھا۔ جو وقت، جو انا خود اپنے ہاتھوں ضائع ہو گئی۔ اسکا خود سے انتقام تھا۔ اپنی ناآسودہ زندگی کے کٹے پھٹے اوراق کو دنیا کی نگاہوں سے بچانے کا ایک گوشہ تھا۔ اور زندگی کے گذشتہ سفر میں جو جہاں چھوٹ گیا۔ خود اذیتی کے ساتھ اس کے پانے کی ایک سعی

لا حاصل تھی۔ جمیلہ شاہین خود اپنی ہی ذات میں گم ہو گئی تھیں۔

جہاں تک ادیبوں کی اپنی ذات میں گمشدگی اور خودکشی کے محرکات کا تعلق ہے۔ تو اس ضمن میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ کہ اکثر ان کے خودکشی کے انتہائی اقدام تک پہنچنے کا مرحلہ بہت بعد میں منظرِ عام پر آتا ہے۔ جس میں یہ بھی ممکن ہے۔ کہ اس انتہائی مرحلے پر کوئی اور فوری اور نمایاں محرک ان کی خودکشی کا سبب بن جائے۔ جس سے وہ خاص طور پر اس وقت گزر رہے ہوں۔ اور جو بظاہر سب کے پیشِ نظر ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس انتہائی مرحلے تک پہنچنے میں صورتِ حال چاہے خودکشی پر منتج ہو۔ یا خودکشی کر لینے جیسے عوامل کی اذیت میں مسلسل مبتلا رہا جائے۔ ادیب ایک مسلسل، بے نام مگر انتہائی تکلیف دہ نفسیاتی و ذہنی کیفیت سے دوچار ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اسے اس کیفیت سے دوچار کرنے میں عموماً اس کی زندگی کی داخلی اور خارجی دونوں قوتیں سرگرمِ عمل ہوتی ہیں۔

جمیلہ شاہین کے ساتھ بھی ایسی ہی صورتِ حال درپیش تھی۔ پروفیسر فتح محمد ملک کا اس حوالے سے کہنا ہے۔

> جمیلہ شاہین کے ساتھ ہمارے گھریلو سطح پر بھی مراسم تھے۔ جمیلہ میری کلاس فیلو تھیں۔ اور ان کے بڑے بھائی احسان صاحب تعمیر اخبار میں میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ ذاتی زندگی میں جمیلہ جن مخصوص حالات سے گزر رہی تھیں۔ اور جس طرح انہیں اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کے لئے سوچنا تھا۔ ان کے لئے کمانا تھا۔ غیر محسوساتی سطح پر ان نامساعد حالات سے ان کی فطرت میں ایک تناؤ خفگی اور ماحول سے ناراضگی کا عنصر بھی جڑ پکڑ رہا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا۔ کہ جمیلہ گھر کے کسی فرد کی بات نہیں مانتی تھیں۔ اور گھریلو زندگی کی ناآسودگیوں کے ساتھ ساتھ میں سمجھتا ہوں۔ کہ بہت سے معاملات میں ادیبوں نے بھی جمیلہ کیساتھ دھوکہ کیا۔ ان تمام عوامل سے اسکی فطرت میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ وہی بعد میں اس کے ذہنی و نفسیاتی مسائل کا باعث بنی۔ ۲۲۷

زندگی کے نامساعد حالات اور ذاتی زندگی کی محرومیوں نے باہم ملکر نہ صرف ایک لکھاری کی روح مسخ کی۔ بلکہ اسکا انسانی اور اخلاقی وقار بھی بری طرح مجروح کیا۔ یہاں پھر ایک ادیب کے حساس دل کی مضطرب دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ سماج سے انتقام میں ناکامی بالآخر خود اپنی ہی ذات سے انتقام کا موجب بن گئی۔ جمیلہ شاہین مکمل طور پر نفسیاتی اور ذہنی مسائل کا شکار ہو گئی تھی۔ اور انہی نفسیاتی مسائل و امراض نے آخرکار جمیلہ شاہین کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔

جمیلہ شاہین کے نفسیاتی و ذہنی امراض کا جہاں تک تعلق ہے۔ اَن مسائل و امراض کے کچھ اسباب و محرکات جمیلہ شاہین کی گھریلو اور سماجی زندگی کے حوالے سے بیان ہو چکے ہیں۔ اور جب ہم کسی شخص کے نفسیاتی امراض کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو بنیادی حوالہ اس فرد کی اپنی ذات اور ذات سے متعلقہ عوامل ہوتے ہیں۔ جمیلہ شاہین کا جہاں تک اس حوالے سے تعلق ہے۔ تو اس میں ایک بڑی وجہ اگر ایک طرف جمیلہ کا اپنے اہلِ خانہ کے لئے حصولِ روزگار کے مسائل و معاملات کو نبٹنا ہے۔ تو دوسری طرف جمیلہ شاہین کا بروقت شادی کا نہ ہونا بھی ایک ایسا مسئلہ تھا۔ جو بعد میں ان کا نفسیاتی مرض بنتا چلا گیا۔

جمیلہ شاہین کی زندگی کے اس پہلو کے حوالے سے جو نتائج اور صورتِ حال جمیلہ کے نفسیاتی مسائل کی صورت

میں سامنے آئی۔ اس کے بارے میں شاعرہ کشور ناہید کا کہنا ہے۔

میں اگرچہ جمیلہ شاہین کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی۔ میری ان سے دو یا تین ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ جن میں سے ایک ملاقات وہ ہے جب میں نے جمیلہ کو قدرے بہتر طور پر قریب سے دیکھا۔ میں لاہور سے دیگر ادیبوں کے ہمراہ راولپنڈی آئی ہوئی تھی۔ اور ایک رات جمیلہ کے گھر (گوالمنڈی) میں رہی۔ مجھے محسوس ہوا۔ کہ جمیلہ ذہنی و نفسیاتی حوالے سے کچھ نارمل نہیں تھی۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں۔ کہ اسکے کچھ جنسی نوعیت کے مسائل بھی تھے۔ تو بے جا نہ ہوگا۔ ۔۲۲۸

شادی کے بروقت نہ ہونے کی ایک وجہ تو ان کا ایک مرد کی حیثیت سے کمانا اور خاندان کی کفالت جیسی ذمہ داری تھی۔ اور دوسری طرف ادیبوں کے حلقے میں ان کی ادبی ناموری اور سوشل زندگی کا حوالہ ہے۔ جس میں وقتی طور پر ان کے کئی ہمدرد اور مخلص احباب موجود تھے۔ لیکن شادی کے معاملے میں احباب کا یہ اخلاص اور ہمدردی جمیلہ کے کسی کام نہ آئی۔ تمام احباب راہ و رسم شناسائی نبھانے کے بعد جمیلہ کو خیر باد کہہ گئے۔ اس مخصوص حلقے کے قول و فعل کے تضاد اور ان کے منافقانہ رویے سے جمیلہ کے اندر شدید ٹوٹ پھوٹ نے جنم لیا۔ لیکن اس ٹوٹ پھوٹ کے عمل کو اپنی انتہا تک پہنچنے کیلئے جمیلہ کے مخصوص رویے میں ایک ارتقائی دور بھی آتا ہے۔ اس ارتقائی دور سے پتہ چلتا ہے۔ کہ جمیلہ نفسیاتی اور ذہنی اعتبار سے اپنی ہی ذات میں متضاد رویوں کا شکار ہو رہی ہیں۔ اسے خود فریبی ساتھ ساتھ خود اذیتی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی۔ کہ جس کو اپنے معاملاتِ زندگی کو دوسروں کے سامنے اس طور سے دکھاتی اور بیان کرتی ہیں۔ جیسا کہ وہ اصلاً نہ تھے۔ وہ ذاتی زندگی کی محرومیوں اور ناآسودگیوں کو چھپانے کے لئے اکثر غلط بیانی سے کام لیتیں۔ مثلاً گھر میں ملازم نہ تھے۔ لیکن مہمانوں کے سامنے اکثر تصوراتی ملازموں کے وجود اور انکے خیالی نام گھڑ لیا کرتی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رشید امجد کا کہنا ہے۔

میں اور سرور کامران ایک مرتبہ جمیلہ شاہین کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جمیلہ کا ان دنوں ملنا ملانا کچھ کم کم ہو گیا تھا۔ دورانِ گفتگو وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چائے کے لیے ملازم کا نام لیکر آواز دیتی تھی۔ بعد میں خود ہی اٹھ کر چائے لائی۔ اور چائے بناتے ہوئے کچھ ایسی گفتگو کرتی رہی۔ جیسے ظاہر کرنا چاہتی ہو۔ کہ آجکل کے ملازم کام چور ہیں۔ لیکن تمام صورتِ حال سے پتہ چلتا تھا۔ کہ گھر میں کوئی ملازم نہ تھا۔ اس کی باتیں مجھے انتہائی کھوکھلی محسوس ہوئیں۔ محض دنیاداری کا ایک بھرم۔ ۔۲۲۹

روپے پیسے کی تنگی دور کرنے کے لئے وہ اکثر و بیشتر دوسروں سے پیسے ادھار مانگا کرتیں۔ جمیلہ شاہین کے اکثر احباب اور ان کے شاگردوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے۔ کہ وہ باتوں ہی باتوں میں اعلیٰ سماجی اور ادبی شخصیات کے ساتھ اپنی نشست و برخاست کا ذکر کرتیں۔ جو عملاً اب ان کے ساتھ وابستہ نہ تھے۔ ان حالات میں جمیلہ کی جو ذہنی حالت تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ شعوری طور پر نہیں کر رہی تھیں۔ بلکہ غیر شعوری طور پر وہ دراصل خود کو ایک بھرم کے ساتھ زندہ رکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ انکا داخل انکے ظاہر کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ جمیلہ شاہین کے اکثر احباب نے جمیلہ کے پیسے ادھار مانگنے کی عادت کا ذکر کیا ہے۔ بقول رشید امجد "ایک روز کشمیر روڈ پر میں نے جمیلہ کو عجب

مدہوشی کی حالت میں دیکھا۔ میرا گریبان پکڑ کر کہا۔ ایک روپیہ دے دو''۔ ۲۳۰

جمیلہ شاہین کے کردار کا یہ پہلو قاری کے اندر ایک شدید نوعیت کی ہمدردی کا عنصر پیدا کرتا ہے۔ بحثیت لکھاری جمیلہ کے اندر اب ٹوٹ پھوٹ، خود فریبی اور خود اذیتی کا پہلو جڑ پکڑنے لگتا ہے۔ یہ طریقہ کار اس کے لڑکھڑاتے قدموں کو وقتی سہارا دینے کی ایک عارضی اور بے بنیاد کوشش بھی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ صورت حال بھی زیادہ دیر برقرار نہ رہی۔ چنانچہ جمیلہ کی اس ناکام اور ناآسودہ حال زندگی نے نشے کی عارضی سکون بخش دنیا میں پناہ لے لی۔ وہ نشہ جو ابتداء میں کھانسی کے شربت اور نیند کی معمولی گولی کے طور پر ان کے ساتھ تھا۔ رفتہ رفتہ ایک بدترین نشے کی لت اختیار کر گیا۔

جہاں تک جمیلہ شاہین کے نشہ کرنے کی عادت اور اس کی ابتداء کا تعلق ہے۔ ابتداء میں انہوں نے نیند اور سکون کے لئے شربت کوریکس، فینسی ڈول، ویلم اور رے پروجیسک جیسی ادویات کا استعمال شروع کیا۔ پان کھانے کی حد درجہ شوقین تھیں۔ لیکن جوں جوں ذہنی ڈیپریشن بڑھنے لگا۔ نشہ اور دیگر ادویات کی ماہیت اور تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ اس ضمن میں جمیلہ شاہین کی بہن شکیلہ حمید کا کہنا ہے۔

> وہ وقت بھی آیا۔ کہ آپی چالیس پچاس نیند آور گولیاں تمام طرح کے نیند آور شربتوں میں ڈال کر پی جاتی تھیں۔ ہفتوں نہیں بلکہ مہینوں نیم مدہوشی کی حالت میں رہتی تھیں ۔سوتے چلے جانا۔ نہ کھانے کا ہوش، نہ پہننے کی خبر۔ گویا زندگی سے پوری طرح کٹ چکی تھیں ۔ ۲۳۱

اس ضمن میں ایک رائے یہ بھی ہے۔ کہ جمیلہ نے آخری زندگی میں نشہ کے استعمال میں کوئی تخصیص نہ رہنے دی تھی۔ ہر طرح کا نشہ جس بھی صورت میں ملتا۔ لیتی تھیں۔ جمیلہ شاہین کے نشہ کرنے کی عادت اور اسکی وجوہات کے ضمن میں ان کی بہن شکیلہ حمید نے انتہائی دکھ کے ساتھ ایک وجہ یہ بتائی۔ کہ

> جمیلہ شاہین کا ٹی وی کے احباب کے ساتھ جو رابطہ اور راہ و رسم تھی۔ اس نے ان پر شدید منفی اثرات مرتب کیے۔ جمیلہ کے نشہ کرنے کی باقاعدگی میں ٹی۔ وی کے ماحول کا اہم کردار ہے۔ خصوصاً جب جمیلہ نے ٹی وی کیلئے ڈرامہ ''سفید سایہ'' لکھا۔ تو اس کی شوٹنگ کے ضمن میں وہ رات گئے مصروف و مشغول رہتیں۔ مختلف جگہوں پر جاتی تھیں۔ اور اس ڈرامے کی شوٹنگ میں راتوں کو قبرستانوں میں بہت سا وقت گزارا۔ ٹی وی کے مخصوص ماحول کے اثرات ان پر شدت کے ساتھ مرتسم ہوئے۔ اور ایک خاص بات مختلف لوگوں کے حوالے سے میں کہنا چاہوں گی۔ کہ ڈرامہ ''سفید سایہ'' کی قبرستانوں میں شوٹنگ کرواتے ہوئے جمیلہ پر کوئی سایہ بھی ہو گیا تھا۔ جس نے رفتہ رفتہ انہیں ذی ہوش نہ رہنے دیا۔ ۲۳۲

ٹی وی کے مخصوص ماحول کے حوالے سے جمیلہ کے نشے کرنے کی عادت میں اضافہ کوئی بعید از قیاس بات معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ جمیلہ فطرتاً آزاد منش تھیں۔ چنانچہ ان کی حد درجہ سوشل زندگی کے ان مخصوص عوامل میں نشہ کا در آنا یا نشہ میں باقاعدگی یا اس میں اضافہ ہو جانا خارج از امکان نہیں۔

جمیلہ شاہین کے لیے نشے کی انتہا اب سکون و سرور کا ذریعہ ہی نہیں تھی۔ بلکہ اپنی گم شدگی کو بدترین حالات کے

سپرد کرنے کی سعی کامل تھی۔ جمیلہ اس نشے میں قطرہ قطرہ موت کا ذائقہ چکھ رہی تھیں۔ اب وہ تمام نشوں کو یکجا کر لیتی تھیں۔ ہفتوں مدہوشی کی کیفیت میں رہتیں۔ یہ ایک ایک لمحے پر مبنی خودکشی تھی۔ جس کی جانب وہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھیں۔ عملی زندگی سے کٹ کر وہ کب کی اپنی شناخت کھو چکی تھیں۔ گھر والوں کے لئے یہ یقیناً عزتِ نفس کا مسئلہ تھا۔ کیوں کہ بے خیالی میں بغیر بتائے گھر سے نکل جانا، ہر ایک سے روپیہ، دو روپے مانگنا، جہاں چاہا، وہیں بیٹھ جانا۔ اس صورتِ حال سے اب جمیلہ شاہین کو بچانے کے لئے ان کے اہل خانہ نے ان کے خارجی میل جول اور آمدورفت پر پابندی لگائی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رشید امجد کا کہنا ہے۔

> ایک مرتبہ میں اور سرور کامران جمیلہ شاہین سے ملنے ان کے گھر گوالمنڈی گئے۔ کیونکہ وہ ادیبوں کے حلقے میں اب دیکھی نہیں جا رہی تھیں۔ اور یہ بھی سننے میں آ رہا تھا۔ کہ وہ ذہنی اعتبار سے نارمل نہیں ہیں۔ اور شدید ڈیپریشن کی کیفیت میں ہیں۔ ہم اسی حوالے سے خیریت معلوم کرنے گئے۔ لیکن ہمیں جمیلہ شاہین سے ملاقات نہیں کرنے دی گئی۔ ۲۳۳

اس ضمن میں جمیلہ شاہین کی بہن شکیلہ حمید نے وضاحت کی۔

> ایسی صورتِ حال اسوقت درپیش ہوئی۔ جب جمیلہ شاہین مکمل طور پر اپنی درست ذہنی حالت میں نہیں تھیں۔ ایسے میں اگر انہیں اس احتیاط اور نگہداشت کے ساتھ نہ رکھا جاتا۔ تو بہت ممکن تھا۔ کہ اپنی دماغی غیر حاضری کے باعث وہ اپنا کوئی شدید نوعیت کا نقصان کر بیٹھتیں۔ ۲۳۴

جمیلہ شاہین کو ایک نارمل زندگی کے معمولات سے کاٹنے، شدید ڈیپریشن اور تنہائی کی زندگی کی طرف دھکیلنے میں ان کے نامساعد داخلی اور خانگی حالات کے ساتھ ساتھ ان کی ملازمت کے مسائل اور پیچیدگیوں کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ جمیلہ شاہین ایک بے باک اور جرأت مندانہ رویے کی حامل خاتون تھیں۔ ملازمت کے دوران افسران بالا کے ساتھ ان کے تعلقات کبھی سازگار نہ رہے۔ ان کیلئے دورانِ ملازمت ایک ایسی ناسازگار فضا تیار کی جاتی رہی۔ جس نے جمیلہ کے لئے شکایات کے دفتر رقم کیے۔ جمیلہ شاہین کے اندر جو اخلاقی کمزوریاں تھیں۔ انہیں بھرپور طریقے سے نمایاں کیا جاتا رہا۔ ظاہر ہے کہ ملازمت پیشہ انسان جس محتاط رویے کا حامل ہوتا ہے۔ اسکا طریقہ کار جتنا ذمہ دارانہ ہوتا ہے۔ جمیلہ میں یہ اوصاف کم کم تھے۔ اس ضمن میں جمیلہ کے مخصوص طرزِ عمل اور ان کی غیر محتاط فطرت نے اہم کردار ادا کیا۔ جس نے افسرانِ بالا کے ساتھ اپنے تعلقات کو متوازن بنانے کی بجائے انہیں مزید بگاڑا۔ چنانچہ دورانِ ملازمت نہ صرف روزمرہ سرکاری امور کی انجام دہی میں ہی وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہوئیں۔ بلکہ ان کی سالانہ کارکردگی کی رپورٹیں بھی ان کے خلاف لکھی جاتی رہیں۔ اسی کے باعث آئے دن مختلف جگہوں پر ان کے تبادلے ہوتے رہے۔ اور کہیں پر بھی جم کر سکون کے ساتھ نوکری کو بحال نہ رکھ سکیں۔

رفتہ رفتہ سرکاری ملازمت سے ان کی غیر حاضری، آفس کے ساتھ ان کی عدم تعاون کی فضا اور پیشہ وارانہ رقابت نے جمیلہ کو شدید ڈیپریشن سے ہمکنار کر دیا۔ اس صورتِ حال کا جمیلہ نے اتنا شدید اثر لیا۔ کہ موقع بہ موقع وہ سرکاری اجازت نامے کے بغیر بھی ڈیوٹی سے غیر حاضر ہوتی چلی گئیں۔ تنخواہ نہ ملنے کے ساتھ ساتھ ان کی دیگر سرکاری

مراعات میں بھی حق تلفی ہوئی۔ جمیلہ جس نفسیاتی دباؤ اور ذہنی گھٹن کا شکار ہو رہی تھیں۔ ان کے لئے یہ سب باتیں اب لائق توجہ نہ تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی پنشن کی وصولی کیلئے بھی کچھ نہ کیا۔ یہ ایک حساس دل ادیب کی انا کی شکست تھی۔ ان کے اندر اب اتنا ہی دم خم تھا۔ کہ خود اذیتی میں مبتلا ہو کر خود کو نشانہ عبرت بناتیں۔ وہ ایسی حالتِ زار سے گزر رہی تھیں۔ کہ دوسروں کے لئے وہ قابل رحم لیکن اپنی ذات میں وہ دوسروں سے انتقام لے رہی تھیں۔

بقول پروفیسر شکیلہ حمید

> سرکاری ملازمت نے جمیلہ کو انتہائی پریشان رکھا۔ شدید ذہنی کوفت دی۔ جمیلہ کے اندر جو شدید نوعیت کا ڈیپریشن پیدا ہوا۔ اس کی ابتداء میں ان کی ملازمت کے پریشان کن حالات نے اہم کردار ادا کیا۔[۲۳۵]

اس تمام صورت حال سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ انسان اور خاص طور پر ادب کا حساس طبقہ جب داخلی اور سماجی سطح پر نفسیاتی دباؤ کا شکار ہوتا ہے۔ تو اس کے نتائج بہت سنگین اور گھمبیر ہوتے ہیں۔ وہ ان حالات سے سمجھوتہ نہ کر سکنے کے باعث تمام تر تکلیف اور اذیت اپنی جان پر جھیلتا ہے۔ یہی حالات بعض اوقات اس کی خودکشی کا موجب بنتے ہیں۔ اور بصورت دیگر وہ جمیلہ شاہین کی طرح خودکشی کے عمل کو قطرہ قطرہ اپنے اندر اتارتا چلا جاتا ہے۔

جمیلہ شاہین کے روزمرہ معمولات کی خبر گیری کرنا اہل خانہ کی ایک اضافی اور تکلیف دہ ذمہ داری بن چکی تھی۔ کیونکہ جمیلہ سے اب جو کچھ سرزد ہو رہا تھا۔ اس میں ان کے شعور سے زیادہ لاشعور کا عمل دخل تھا۔ وہ اب کسی حوالے سے بھی ایک نارمل انسان نہیں تھیں۔ زندگی کی محرومیوں اور ناآسودگیوں کا دھچکا لگنا، انہیں سہنا، اور انکی تکلیف محسوس کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ لہٰذا جمیلہ شاہین کے نفسیاتی و ذہنی امراض نہ صرف بڑھتے گئے۔ بلکہ ان میں شدت آتی چلی گئی۔ بیرونی سرگرمیاں اور ملازمت تو کب کی ترک ہو چکی تھی۔ لیکن پاگل پن کی حالت میں کچھ کر گزرنے کا خدشہ اپنی جگہ موجود تھا۔ چنانچہ ان حالات میں ان کے اہل خانہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ جمیلہ شاہین کو بغرض علاج اور نگہداشت ہسپتالوں اور دیگر ذہنی امراض کے اداروں میں داخل کروایا جاتا۔ ان حالات میں جمیلہ مسلسل زیر علاج رہیں۔ چنانچہ مختلف ہسپتالوں میں انہیں زیر علاج رکھا گیا۔ نفسیاتی امراض کے ماہرین کی نگہداشت میں رہیں۔ جمیلہ شاہین کی بیرون خانہ سرگرمیوں پر ان کے اہل خانہ اگرچہ بہت حد تک احتیاطی تدابیر اختیار کیے ہوئے تھے۔ اور خود جمیلہ شاہین کے حد سے بڑھتے ہوئے نشے اور تیزی سے بگڑتی ہوئی صحت بھی انہیں تیزی کے ساتھ اپنی ذات سے بے رغبتی، خود فراموشی اور موت کی طرف دھکیل رہی تھی۔ جمیلہ کو اس خود فراموشی پر مبنی ناگفتہ بہ حالت میں ان کی اکثر ساتھیوں نے بھی دیکھا۔ جو کبھی ان کے ساتھ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ رہی تھیں۔ یہ ایک تکلیف دہ اور اذیت ناک صورتِ حال تھی۔ جس سے جمیلہ شاہین گزر رہی تھیں۔ ان کی ایک ساتھی نے اس حوالے سے بتایا کہ

> جمیلہ کو میں نے ان کے انتقال سے تقریباً دس بارہ سال پہلے آگے پیچھے دو مرتبہ دیکھا۔ ایک مرتبہ وہ انصار برنی ٹرسٹ کے زیر نگہداشت تھیں۔ سفید گاؤن پہنے جمیلہ فرش پر بیٹھی ہوئی خلاؤں کو گھور رہی تھیں۔ اور دوسرا موقع وہ تھا۔ جب ابھی اس کے کچھ ہوش و حواس بھی قائم تھے۔ بلکہ پرانی شناسائی ابھی کچھ کچھ باقی تھی۔ میں اس سے ملنے اس کے گھر گئی۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے باہر کھڑکی کے شیشے میں

سے وہ ایک سائے کی طرح کمرے میں گھومتی ہوئی روح محسوس ہوئی۔ جونہی میں کمرے میں داخل ہوئی۔ جمیلہ نے ایک قہقہہ لگایا۔ ''دیکھا تم نے میرا مرقد۔ اس کی آواز میں کھوکھلا پن نمایاں تھا۔ میں کانپ گئی۔ یہ جمیلہ وہ جمیلہ نہیں تھی۔ کمرے میں ایک بوسیدہ چارپائی۔ جمیلہ کے میلے کچیلے بکھرے ہوئے بال، سیاہ رنگت، کمزور، لاغر، بے تحاشا بڑھے ہوئے ناخن، جوؤں کی یلغار، بلکہ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار جوؤں کو اڑتے ہوئے دیکھا۔ اور سر کو بار بار کھجانے سے مری ہوئی جوئیں بری طرح اسکے بڑھے ہوئے ناخنوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ جن کے باعث ان کے ناخنوں کا رنگ سیاہی مائل جامنی ہو رہا تھا۔ اسوقت مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ اس جمیلہ کو کہاں تلاش کروں۔ جو اپنی ذہانت، مطالعہ اور متوازن گفتگو سے محفل پر چھا جایا کرتی تھیں۔ ۲۳۶

ایسا وقفہ وقفہ سے ہوتا رہا۔ لیکن کوئی مثبت نتیجہ نہ نکل سکا۔ بقول شکیلہ حمید

آپی کی بگڑتی ہوئی ذہنی اور نفسیاتی حالت کے باعث راولپنڈی کے تقریباً تمام ہسپتالوں میں ان کے علاج کے ساتھ ساتھ انصار برنی ٹرسٹ اور ایدھی ویلفیئر سنٹر میں بھی انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رکھا گیا۔ لیکن بہتری کی کوئی صورت سامنے نہ آسکی۔ ۲۳۷

اس حوالے سے جمیلہ شاہین کی بھابھی مسز رخسانہ احسان نے کہا۔

دراصل انہوں نے خود ہی جیسے زندگی سے منہ موڑ لیا تھا۔ ہر احساس اور جذبے سے عاری ہو گئی تھیں۔ شاید ایک جینئس جب حالات کو اپنے مطابق نہیں ڈھال سکتا تو اسی طرح خود کو ان حالات کی بے رحمی کے سپرد کر دیتا ہے۔ ۲۳۸

گویا ان کے اہل خانہ نے اس ضمن میں بے پناہ کوششیں کیں لیکن تمام احتیاطی تدابیر رائیگاں چلی گئیں۔ کیونکہ جمیلہ شاہین اب خود لذتی اور خود فراموشی کی انتہائی اور آخری منزل پر تھیں۔ بظاہر وہ خارجی طور پر سماج کی پابندی میں تھیں۔ لیکن ذہنی طور پر وہ اپنی دنیا میں بدمست اور مدہوش تھیں۔ انہیں علاج کی بہتری اور صحت یابی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جمیلہ ہر وقت وہ کام کرتیں جو ان کی زندگی کے لئے مضر تھا۔ علاج سے گریز کرنا، دواؤں کو ضائع کرنا اور ڈاکٹروں سے تعاون نہ کرنا صاف ظاہر کرتا ہے۔ کہ وہ خود کو اذیت دیکر اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتی تھیں۔ اس ضمن میں ان کی بہن شکیلہ حمید نے کہا۔

جمیلہ کو نشہ سے دور رکھنے کے لئے ہم سب نے سرتوڑ کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ حتیٰ کہ ہسپتالوں میں زیر علاج رہنے کے زمانوں میں ڈاکٹروں کی سخت احتیاط کے باوجود وہ ہسپتال کے کسی نہ کسی ملازم سے نشہ منگوا لیتی تھیں۔ ۲۳۹

ان حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمیلہ شعوری طور پر جلد از جلد اپنی زندگی کا چراغ گل کر دینے کے درپہ تھیں۔ نفسیاتی اور لاشعوری طور پر ان کے ذہن میں اس طرزِ عمل سے سماج کو نقصان پہنچانا تھا۔ جبکہ حقیقتاً وہ ایک ایک لمحہ خود کو موت کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ یہ وہ صورتِ حال ہے۔ جب ادیب اپنے ماحول اور سماج سے عدم مفاہمت کے باعث شدید

طور پر رنجیدہ ہوتے ہوئے اس سے کٹ جاتا ہے۔اور اکثر ایسے حالات میں وہ خودکشی کی طرف راغب ہوجاتا ہے۔

جمیلہ کے نفسیاتی امراض کا اب ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا۔کہ وہ نہ صرف خود کو اذیت دیکر خوش ہوتی تھیں۔بلکہ دوسروں کو اذیت دینے میں بھی خوشی محسوس کرتی تھیں۔لیکن دوسروں کو اذیت دینے کا عمل ان کی اپنی ذات سے ہی شروع ہوتا تھا۔اور اس خود اذیتی کے نمایاں عوامل میں بقول شکیلہ حمید

> کھانا نہ کھانا، دوا نہ پینا، موقع بہ موقع ہر ایک سے پیسے مانگنا، سب کے منع کرنے کے باوجود نشہ کا بے دریغ استعمال، حتیٰ کہ ایک مرتبہ جمیلہ شاہین کے منہ سے تیزی کے ساتھ خون کا فوارہ چھوٹا۔وہ اس کی وجہ کسی صورت بھی بتانے سے گریزاں رہیں۔ بعد میں خود ہی ان کی زبان کا کٹا ہوا ٹکڑا نظر آیا۔جو انہوں نے تیز دھار بلیڈ سے کاٹ کر انگیٹھی پر رکھ دیا تھا۔[۲۴۰]

خود اذیتی پر مبنی جمیلہ شاہین کا ایک رویہ یہ بھی ہے۔کہ ''۱۹۷۹ء میں جمیلہ شاہین نے اپنی تمام تر ڈگریوں اور اسناد کو صحن میں رکھ کر آگ لگا دی تھی۔''۔[۲۴۱] جمیلہ کی نظر میں یہ ڈگریاں اور اسناد درحقیقت ایک حساس دل لکھاری کو معاشرے میں وہ مقام اور عزت دینے میں ناکام رہیں جس کی وہ متقاضی تھی۔ادیب عموماً ایسے ہی رویوں سے بالآخر بد دل ہو کر خودکشی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔جمیلہ شاہین کا خود اذیتی پر مبنی یہ طریقہ کار ایک طرف ان کا اپنی زندگی کو ختم کرنے شعوری ارادہ ظاہر کرتا ہے۔جس کی نوعیت بالواسطہ ہے۔جبکہ دوسروں کو براہ راست اذیت دینے میں بھی جمیلہ کو ایک روحانی تسکین ملتی تھی۔خود کو چوٹیں لگانا، بہتے ہوئے خون سے لطف اندوز ہونا بھی ان کی اسی خاص ذہنی حالت کا عکاس ہے۔

اور دوسروں کو تکلیف دیکر خوش ہونا جمیلہ کی کچھ ایسی ذہنی کیفیت تھی۔جس میں درحقیقت ان کی اپنی زندگی کی محرومیاں اور نا آسودگیاں دفن تھیں۔اس ضمن میں جمیلہ شاہین کی بہن شکیلہ حمید نے ایک واقعہ سنایا کہ

> جب میری شادی ہوئی۔تو آپی سخت خفا تھیں۔مجھے کہنے لگیں۔حمید (شوہر) سے طلاق لے لو۔میں نے یوں ہی یوں کہا۔اگر آپ وعدہ کریں کہ نشہ نہیں کریں گی۔تو میں بھی آپ کی بات مان لوں گی۔کہنے لگیں، تمہاری بات کے جواب میں میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔اسی طرح جب میں کچھ پہنتی اوڑھتی یا تیار ہوتی۔تو مجھے واضح طور پر محسوس ہوتا کہ آپی انتہائی ناخوش ہیں۔لہذا اکثر میری کوشش ہوتی۔کہ ان کے دیکھنے سے پہلے ہی میں وہ لباس اتار دوں۔[۲۴۲]

مجموعی طور پر جمیلہ شاہین کی اذیت ناک اور کرب انگیز زندگی کا اگر جائزہ لیا جائے۔تو ان کی زندگی بنیادی طور پر ایسی نا آسودگیوں سے عبارت تھی۔جس میں کئی تشنہ آرزوئیں دم توڑ رہی تھیں۔بظاہر وہ مردانہ صفات و خیالات کی مالک نظر آتی تھیں۔لیکن ان کے اندر کی نسوانیت اور عورت پن نے شدت کے ساتھ انہیں ان محرومیوں کا احساس دلایا جو خارجی زندگی کے نا مساعد حالات کے ہاتھوں انہیں درپیش تھیں، بظاہر وہ اس صورتِ حال سے جنگ لڑ رہی تھیں۔لیکن ان کے اندر کی عورت اور حساس ادیبہ ان مخصوص حالات میں شکست کھا رہی تھی۔اور پھر اس شکست کے آثار مختلف نفسیاتی و ذہنی بیماریوں کی صورت میں ظاہری سطح پر بھی دکھائی دینے لگے۔جن کی شدت میں رفتہ رفتہ اضافہ ہونے لگا۔اور جمیلہ شاہین

نے زندگی کی طرف قدم بڑھانے کی بجائے خود کو موت کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ ایک طویل عرصہ تک شدید ترین تنہائی اور نشے کی حالت میں گمنامی کی زندگی بسر کرنا، مختلف ہسپتالوں اور ذہنی و نفسیاتی امراض کے اداروں میں علاج معالجہ ہوتا۔ لیکن صورتِ حال درست ہونے کی بجائے بگڑتی چلی گئی۔ کیونکہ جمیلہ خود صحت اور زندگی سے بے نیاز خود اذیتی کے درپے تھیں۔ ادبی سرگرمیاں زمانوں سے مفقود ہو چکی تھیں۔ سوشل زندگی کا دائرہ کار ان حالات میں ختم ہو چکا تھا۔ وہ تنہائی کی ایسی زندگی گزار رہی تھیں۔ جس میں تنہائی کا احساس تک نہ تھا۔ شدید نشہ اور شدید خود فراموشی کا عالم۔ ہفتوں غنودگی کی حالت میں رہنا، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، ملنا ملانا، سوچ بچار، خوشی غمی حتیٰ کہ زندگی اور موت کے فرق تک ان کے لئے بے معنی ہو چکے تھے۔ جمیلہ شاہین ہر وہ کام کرتیں۔ جس سے اذیت در اذیت کی کیفیت انہیں سرور عطا کرتی۔ اذیت کے نت نئے طریقوں کو تجربہ کرنا، یہی انکی زندگی کا مقصد رہ گیا تھا۔ وہ جیتے جی مردہ تھیں۔ وہ ان تمام مصائب اور تکالیف کو شعوری طور پر اختیار کر کے لحہ لحہ موت کو نہ صرف اپنے اندر اتار رہی تھیں۔ بلکہ اس کے نشے سے بھرپور لطف اٹھا رہی تھیں۔ اور اسی کیفیت میں برس ہا برس مبتلا رہنے کے بعد جمیلہ شاہین نے آخر کار انتہائی تکلیف دہ کیفیت میں ۱۷ جنوری بروز جمعہ ۱۹۹۷ء کو انتقال کیا۔ بظاہر انہوں نے خودکشی نہیں کی۔ لیکن ان کی زندگی مسلسل جن اذیت ناک حالات سے ارادتاً دوچار رہی۔ وہ کسی ایک لمحے کی خودکشی نہیں تھی۔ بلکہ ہر ہر لحہ وہ اقدامِ خودکشی میں مبتلا رہیں۔ اور انہی اقدامات نے انہیں بالآخر اس موت کے حصول میں سرخرو کیا۔ جس کی طرف وہ دانستہ بڑھ رہی تھیں۔

جون ایلیاء(۱۹۳۵ـ۲۰۰۲) :

جون ایلیا کی پیدائش امروہہ میں ہوئی۔ شعروادب کی روائیت جون ایلیا کی خاندانی وراثت میں شامل تھی۔ جو نسل درنسل چلتی ہوئی جون ایلیا کو منتقل ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید شفیق حسن ایلیا تھا۔ اور دادا کا نام سید نصیر حسن نصیر تھا۔ دادا کے والد سید امیر حسن امیر بھی فارسی اور اردو کے شاعر تھے۔ اس لحاظ سے جون ایلیا کو ادبی اور شعری وراثت بھرپور طریقے سے حاصل ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ سرزمین امروہہ جو اردو کے کئی قدیم شعراء کا مسکن رہی۔ جون ایلیا کی علمی و راثت میں ایک اضافی فخر کا باعث بنی۔ ''میں دوآبہ گنگ وجمن کی حالت خیز، رمزیت آمیز اور دل انگیز شہر امروہہ میں پیدا ہوا''۔[۲۴۳] جون ایلیا کے تین بھائی تھے۔ بڑے بھائی رئیس امروہوی تھے۔ جو انقلابی اور رومانی نظمیں لکھتے تھے۔ سید محمد تقی، جو رئیس امروہوی سے چھوٹے تھے۔ شاعر تھے۔ اگر چہ ان کا اصل میدان فلسفہ تھا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ جون ایلیا کے مطابق سید محمد تقی اور ان سے چھوٹے بھائی سید محمد عباس اپنے زمانے میں وطن پرست کیمونسٹ تھے۔ اور کھدر کے کپڑے پہنتے تھے۔ جون ایلیا اس تمام پس منظر میں اپنے گھر میں علمی وادبی فضاء کے لئے لکھتے ہیں۔

> جب میں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں۔ تو اپنے گھر میں صبح سے شام تک شاعری، تاریخ، مذاہب عالم، علم ہیئت (Astronomy) اور فلسفے کا دفتر کھلا دیکھا۔ اور بحث مباحثے کا ہنگامہ گرم پایا۔ اس تمام سرگرمی کا مرکز ہمارے بابا علامہ سید شفیق حسن ایلیا تھے۔۔۔ کئی علوم کے جامع تھے۔ اور کئی زبانیں جانتے تھے۔ یعنی عربی، انگریزی، فارسی، عبرانی اور سنسکرت۔ صبح سے شام تک وہ لکھتے رہتے تھے۔[۲۴۴]

جون ایلیا کے گھر کا یہ علمی پس منظر ایک توانا علمی وراثت کے طور پر انہیں منتقل ہوا۔ یہ شعور وآگہی کا وہ سرچشمہ تھا۔ جو انسان کے اندر عام انسانوں کی نسبت خودشناسی خود پسندی اور شناخت کا وہ پہلو ودیعت کرتا ہے۔ کہ انسان اپنے وجود اور کائنات کے ازلی وابدی حقائق کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ انسان کے لئے خودشناسی قدرت کا انمول تحفہ ہے۔ لیکن جب خودشناسی علم وآگہی کا عرفان پا کر انسان کو اپنی ذات کی تسخیر پہ آمادہ کرے۔ تو بہت ممکن ہے کہ مثبت اور منفی دونوں طرح کی سوچیں متحرک ہو جائیں۔ اور ایسے میں جب انسان تجرباتی سطح پر خود کو آزمانے پر آجائے۔ تو یہ آزمائش کبھی کبھار اس کی اپنی ذات کے لئے بھی ایک امتحان بن جاتی ہے۔ بحیثیت ادیب جون ایلیا کے اندر اس علمی وادبی وراثت نے کچھ اسی طرح کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ جون ایلیا کی یہاں خواہش مرگ اس حوالے سے ان کے شعور ذات کا شاخسانہ بھی

نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں جون ایلیا کے گھر کی فضا میں انقلاب، بغاوت اور ترقی پسندانہ نظریات کا بھی عمل دخل ہے۔ وہ اپنے والد کے لئے لکھتے ہیں۔

> ان کے ہاں ذاتی ملکیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا تھا۔ وہ اپنے استعمال کی بنیادی اور ناگزیر اشیاء کو بھی ذاتی ملکیت میں شمار نہیں کرتے تھے۔ میرا بستر، میری چادر، میرا تکیہ، میری الماری، اس نوع کے مفاہیم ذہن میں رکھنا، انہیں زبان پر لانا، سخت غیر مہذب اور غیر شریف ہونے کی علامت سمجھتے تھے۔۔۔ وہ سیاسی آدمی نہیں تھے۔ ایک عالم اور شاعر تھے۔ اگر وہ سیاسی آدمی ہوتے تو کمیونسٹ ہوتے۔ ۲۴۵

اس طرح جون ایلیا کی خواہش مرگ اس دور کے انقلابی محرکات سے بھی وابستہ ہے۔ انقلاب کے ساتھ ہیرو ازم اور ہیرو شپ کا جو تصور پایا جاتا ہے۔ جون ایلیا کے ہاں اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ جون ایلیا کی اس دور کی انقلابی تحریکات سے وابستگی محض جذباتی اور ذاتی حوالے سے ہی نہیں تھی۔ بلکہ علمی و ادبی وراثت کی طرح یہ بھی ان کے گھر کی زندگی میں موجود تھی۔ جون کے والد اگر چہ کوئی سیاسی حوالہ نہیں رکھتے تھے۔ اور نہ ہی وہ کمیونسٹ ہونے کے دعویدار تھے۔ لیکن ان کے نظریات، خیالات حتیٰ کہ عملی زندگی اسی قسم کے ترقی پسندانہ نظریات اور انقلابی طرز کی حامل تھی۔

جون ایلیا کا عہد انفرادی اور اجتماعی دونوں حوالوں سے ہنگامہ خیزی پر مبنی تھا۔ زندگی نت نئے تجربوں کی زد میں تھی۔ انسان کی تخلیقی سرگرمیوں کے لئے ماحول سازگار تھا۔ ترقی پسندانہ نظریات نے ادیبوں کے اندر نئے نئے آئیڈیلز کی تلاش کے جو بیج بوئے تھے۔ ان کے باعث زندگی میں نہ صرف ہل چل پیدا ہوگئی تھی۔ بلکہ زندگی رنگارنگی کی حامل بھی بن گئی تھی۔ ماحول کا یہ عنصر جہاں انسان کو زیادہ سے زیادہ عملی بناتا ہے۔ وہاں تصوریت پسندی کے باعث ایک تخیلاتی فضابندی موجود تھی۔ ادیب ایسی ہی کیفیت میں خود کو کسی عالمِ مثالیت میں دیکھتے اور محسوس کرتے تھے۔ جس سے انکے اندر یہ احساس پیدا ہوتا تھا۔ کہ وہ جس ماحول میں زندہ ہیں۔ یہ ان کے رہنے کے لائق نہیں۔ چنانچہ ایسی صورتِ حال میں ایک ذہنی اور داخلی کش کش کا پہلو سامنے آتا ہے۔ جو اندر ہی اندر اہل قلم میں شکوہ اور احتجاج کا رنگ بھرتا چلا جاتا ہے۔ اس احساس کی انتہائی شکل پھر خواہش مرگ کو نمو دیتی ہے۔ جون ایلیا کے یہاں یہ صورتِ حال موجود تھی۔

> میرے بچپن اور لڑکپن کا درمیانی دور سیاسی اعتبار سے بے حد ہنگامہ خیز دور تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس کی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔۔۔ بہت سے کمیونسٹ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ ہمارے دونوں بڑے بھائیوں نے بھی مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ ۲۴۶

سیاسی ماحول کی بیداری اذہان کو یقینی طور پر بیدار کرتی ہے۔ یہ بیداری مثبت ہے یا منفی۔ یہ ایک الگ بحث ہے۔ لیکن بیدار ذہن میں ماحول سے ہم آہنگ ہونے کا یا نہ ہونے کا جو جواز پیدا ہوتا ہے۔ اصل اہمیت اسی کی ہوتی ہے۔ اور چونکہ ادیب طبقہ معاشرے کا حساس اور بیدار نظر طبقہ ہوتا ہے۔ وہ حالات کے ان تغیرات سے بہت اثر لیتا ہے۔ یہ بیدار نظری و روشن خیالی جب ہمارے ادیبوں میں آئی۔ تو اس خارجی اور سیاسی ماحول میں مغرب کے گھلے ملے اثرات سے بھی انہوں نے اثر قبول کیا۔ اس حوالے سے جون ایلیا کی ذہنی نشوونما میں یہ بات ایک اضافی محرک اسوجہ سے بھی بنی۔ کہ جون ایلیا کے گھر کا ماحول خالصتاً علمی و ادبی نوعیت کا تھا۔ اسی علمی وراثت اور ماحول کے باہمی ٹکراؤ کے متعلق جون

ایلیا کا کہنا ہے۔

> جس بیٹے کو اس کے انتہائی خیال پسند اور مثالیہ پرست باپ نے عملی زندگی گزارنے کا کوئی طریقہ نہ سکھایا ہو۔ بلکہ یہ تلقین کی ہو۔ کہ علم سب سے بڑی فضیلت ہے۔ اور کتابیں سب سے بڑی دولت۔ تو وہ رائیگاں نہ جاتا۔ تو اور کیا ہوتا۔ ۲۴۷

سماج سے ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث ادیبوں کے اندر وہ شدت احساس پیدا ہوئی۔ جس کے باعث وہ نیم دیوانگی کی حالت میں اپنے ماحول سے، لوگوں سے، حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی کٹ گئے۔ جون ایلیا کی خواہش مرگ میں سماج کے ساتھ ان کی ذہنی مطابقت نہ ہونے نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا۔ یہ صورتِ حال خالصتاً ایک انٹی لیکچول کی ہے۔ جو نہ خود ماحول میں جذب ہو سکا۔ اور نہ ماحول کو اپنے مطابق ڈھال سکا۔ ایسی ہی صورتِ حال میں ادیب اس داخلی ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ ان کے اندر خواہش مرگ کی صورتِ حال کو تیز تر کرتے ہوئے اکثر اوقات ان کے سامنے خودکشی کا راستہ کھول دیتی ہے۔

> میری حالت گذشتہ دس برس سے سخت ابتر تھی۔ میں ایک نیم تاریک کمرے کے اندر ایک گوشے میں سہا بیٹھا تھا۔ مجھے روشنی سے، آواز سے اور لوگوں سے ڈر لگتا تھا۔۔۔ ایک دن میرا عزیز بھائی سلیم جعفری مجھے ملنے آیا۔ اور مجھ سے کہا۔ کہ جون بھائی، میں آپکو فرار اور گریز کی زندگی نہیں گزارنے دوں گا۔ آپ نے میرے لڑکپن سے انقلاب کے، عوام کی فتح مندی اور لاطبقاتی سماج کے خواب دکھائے ہیں۔ میں نے کہا تجھے معلوم ہے۔ کہ میں سال ہا سال سے کس عذاب میں مبتلا ہوں۔ میرا دماغ نہیں۔ بھوبل ہے۔ آنکھیں ہیں کہ زخموں کی طرح ٹپکتی ہیں۔۔۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ میں اپنے خوابوں کو نہیں ہارا ہوں۔ ۲۴۸

خواہش مرگ کے حوالے سے ادیبوں کے عام آدمی کی نسبت اپنے خواب اور اپنے آئیڈیلز ہوتے ہیں۔ جس میں ان کی نا آسودہ خواہشات اپنی تکمیل کے لئے بے قرار ہوتی ہیں۔ اور کبھی یہ آئیڈیلز اجتماعی زندگی کے حوالے سے نمو پذیر ہوتے ہیں۔ ان آئیڈیلز کے لئے انقلاب آفرین سوچیں، ایک نئی دنیا کی تعمیر کا جذبہ اور وسیع پیمانے پر اپنی شناخت، اپنی صلاحیتوں کو منوانے اور شہرت حاصل کرنے کے خوابوں نے ادیبوں کو پریشان رکھا ہے۔ جون ایلیا کے یہاں یہی صورتِ حال موجود تھی۔ جون ایلیا کی خواہش مرگ ایک انٹی لیکچول کی خواہش مرگ کو نظر آتی ہے۔ چونکہ مغرب کا ادیب سائنس، فلسفے اور فکر کی بالغ النظری کی پیداوار رہا ہے۔ حیات بعد موت سے متعلق مباحث نے انسانی فکر و نظر کو بہت تحریک دی۔ انٹلیکچول کی خواہش مرگ کے ساتھ جو سوالات وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ عام شخص کی خواہش مرگ کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتے۔ جون ایلیاء لکھتے ہیں۔

> میں نے اب تک دو قسم کی انفعالیتوں میں زندگی گزاری تھی۔ ایک مابعد الطبیعات انفعالیت اور دوسری تاریخیاتی انفعالیت۔ مابعد الطبیعاتی انفعالیت کی آرام دہ کیفیت سے اب میرا ذہن محروم ہوتا جا رہا تھا۔ مغربی اور یونانی فلسفے کے منطقی نتائج نے مجھے ارسطو کی محرک اول (Prime Mover) اور عربی فلسفے کی اصطلاح کے مطابق

واجب الوجود کی عقلی اور جذباتی دادرسی سے مستفید ہونے کا کسی درجے میں بھی اہل نہیں رکھا تھا۔ ذہنی صورتِ حال بہت سازگار ہوگئی تھی۔ اور مجھے اپنے شہر کے جنگل اور باغ اب اچھے نہیں لگتے تھے۔ موسم گرما کی تاریک راتوں کا گھنا آسمان اب میرے لیے خیال آفریں نہیں رہا تھا۔ پروٹاگورس سے کسی نے سوال کیا تھا۔ کہ خدا کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا تھا۔ کہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ اور عمر بہت کم۔۔۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ یقین سے محروم ہو جانے کی اذیت سے متعلق رکھتا تھا۔۔ کانٹ نے صحیح کہا تھا۔ کہ مابعدالطبیعی امور کو منطقی استدلال کے ذریعے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ کہ مذہب اور خدا عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔۔۔ میں فلسفے کا مطالعہ کرنے کے نتیجے میں اپنی تمام تریقینیات سے محروم ہو گیا۔ ۔۲۴۹

اے خدا جو کہیں نہیں موجود
کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں

میں آہستہ آہستہ فلسفے کے مطالعہ میں غرق ہوتا جا رہا تھا۔ میری بدنصیبی کہ میں سب سے پہلے ایک برطانوی فلسفی سے دوچار ہوا۔ وہ تھا تصوریت پسند بارکلے۔ اسکا کہنا تھا۔ کہ ہم شئے کا اوراک اس لیے نہیں کرتے۔ کہ وہ پائی جاتی ہے۔ بلکہ وہ پائی ہی اس لیے جاتی ہے۔ کہ ہم اسکا ادراک کرتے ہیں۔ یعنی اگر ہم کسی کتاب کو پڑھنے کے بعد الماری میں بند کردیں۔ تو وہ ہمارا معروض ادراک نہ رہے۔ تو وہ یک سر معدوم ہو جائے گی۔ اور اسکا کائنات میں کہیں کوئی وجود باقی نہیں رہے گا۔ ۔۲۵۰

جون ایلیا نے یہاں واضح طور پر تسلیم کیا۔ کہ مغربی فلسفے کے اثرات نے ان کے اندر مذہب اور روحانیت کو شدید طور پر گزند پہنچائی۔ مذہب انسان کے اندر یقین کی جو آسودگی اور اطمینان قلب پیدا کرتا ہے۔ مغربی فلسفے نے وہ داخلی اطمینان کی دولت ان ادیبوں سے چھین لی۔

ان کتابوں نے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر
ان میں اک رمز ہے، جس رمز کا مارا ہوا ذہن
مژدہ عشرتِ انجام نہیں پا سکتا
زندگی میں کبھی آرام نہیں پا سکتا

مغرب کے انٹیلیکچول کے ہاں مذہب واخلاق سے جو دوری تھی۔ وہ دُوری ان کی خواہش مرگ کے حوالے سے اردو ادب کے بعض ادیبوں کے ہاں بھی در آئی۔

ہستی کا مشہود ہی فنا ہے
جو ہے وہ تمام ہو چکا ہے
جو لمحہ ہے وہ گزر رہا ہے
فریاد کہ وقت مر رہا ہے

انٹیلیکچول کے احساس مرگ میں شدت نظری اور فوری عمل ورد عمل کی جو کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ خودکشی کے عمل کی سنسنی خیزی کے ساتھ ملکر مزید سنسنی خیزی کا باعث بنتی ہے۔ جون ایلیا کی خواہش مرگ کا ایک اور اہم محرک ان کا رومانوی طرزِ احساس ہے۔ اس طرزِ احساس نے انہیں زندگی میں ایک مخصوص رویے کا حامل بنایا۔

> میری عمر کا آٹھواں سال میری زندگی کا سب سے اہم اور ماجرا پرور سال تھا۔ اس سال میری زندگی کے دو سب سے اہم حادثے پیش آئے۔ پہلا حادثہ یہ تھا۔ کہ میں اپنی نرگسی انا کی پہلی شکست سے دوچار ہوا۔ یعنی ایک قتالہ لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا۔ اور دوسرا حادثہ یہ تھا۔ کہ میں نے پہلا شعر کہا۔۔۔ ۔۲۵۱

رومانوی طرزِ احساس کے باعث آزاد خیالی، آئیڈیل کی تلاش، شدید جذبوں کا جہاں، باغیانہ اور انقلابی سوچ کے حامل ادیب جب زندگی میں عشق ومحبت کے معاملات کا شکار ہوئے۔ تو عشق کی یہ دنیا گویا ان کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی۔ مثالیت کا شکار تو وہ پہلے ہی تھے۔ تخیل کے جہاں نے انہیں مزید کسی خوش رنگ دنیا کی تلاش پر مامور کر دیا۔ رومانوی طرزِ احساس کے باعث ادیبوں کی انتہائی جذباتی داخلی کیفیت بھی ان کی خواہش مرگ کے لئے باعثِ تقویت بنی ہے۔ جون ایلیا اپنی اس جذباتی کیفیت کا اظہار اس طور سے کرتے ہیں۔

> میں نے اظہار محبت کا جو طریقہ اختیار کیا۔ وہ انتہائی عجیب وغریب تھا۔ وہ طریقہ یہ تھا۔ کہ اگر وہ سامنے سے آ رہی ہوتی۔ تو میں اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا۔ اسکا مطلب یہ تھا۔ کہ اے لڑکی میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ میں اظہار محبت کو انتہائی ذلیل کام سمجھتا تھا۔ اور اپنے اچھے دنوں میں میں نے یہ ذلیل کام کبھی نہیں کیا۔ ۔۲۵۲

خواہش مرگ کے حوالے سے ادیبوں کی انا قدم قدم پر ان کے لئے عزتِ نفس کا مسئلہ بنی ہے۔ ادیبوں میں موت کی خواہش کے ساتھ خود کو اذیت دینے کی ایسی کیفیت موجود رہی ہے۔ جو اپنے پہلے مرحلے پر موت کے ساتھ رومانس اور اس رومانس سے لطف اندوز ہونے کی کیفیت رکھتی تھی۔ جبکہ خود اذیتی کے حوالے سے دوسرا اور آخری مرحلہ خود کو ختم کرنے کا جوش وجذبہ تھا۔ خود اذیتی کی بھی دو صورتیں تھیں۔ ایک صورت جو بعض ادیبوں میں موجود رہی۔ وہ کسی تیز دھار آلے سے خود کو ضربیں لگانا تھا۔ جبکہ خود کو اذیت دینے کی دوسری صورت کسی جان لیوا بیماری کی خواہش رکھنا، اسکا انتظار کرنا، اور پھر اسے حاصل کرنے کے بعد اس سے لطف اٹھانا تھا۔ اس لحاظ سے تپ دق ایک ایسی بیماری تھی۔ جو گئے وقتوں میں نا قابل علاج ہونے کی صورت میں خاص طور پر ادیبوں میں اس لیے مقبول تھی۔ کہ اس مرض کی بدولت موت کا نہ صرف انتظار رہتا تھا۔ بلکہ موت یقینی نظر آتی تھی۔ اس حوالے سے جون ایلیا کو تپ دق کی بیماری کا شدت سے انتظار تھا۔

> میں نے اس زمانے میں اپنے گھر میں نجانے کس سے یہ اشعار سنے تھے۔ ان اشعار نے میری پوری جوانی میں ایک مؤثر مگر سخت منفی کردار ادا کیا۔۔۔ وہ شعر یہ تھے۔

میرا مرنا ان کے گھر شادی ہوئی
خون کے چھاپے لگے دیوار پر ---
تھوکتا ہوں جو لہو خوشبوئے حنا آتی ہے

جس پہ مہندی تیری پستی تھی وہی سل ہے مجھے

ان اشعار میں عاشق ایک ایسا نوجوان نظر آتا ہے۔ جس نے تپ دق میں خون تھوک تھوک کر جان دی ہو۔۔۔۔ ۲۵۳

تپ دق کی بیماری کا جان لیوا ہونا، خون کی الٹیوں سے مسلسل اذیت سہنا۔ یہ طرزِ احساس جون ایلیا کی شاعری میں بھی کثرت سے ملتا ہے۔ مثلاً

یہ زندگی خون کا سفر ہے اور ابتدا اس کی رہگذر ہے
جو خون اس سیلِ خون کی موجوں کو تیز کر دے وہ نامور ہے

اپنے حجرے کا کیا بیان کروں کہ یہاں
خون تھوکا گیا شرارت میں
سوچاہے کہ اب کارِ مسیحانہ کریں گے
وہ خون بھی تھوکے گا تو پروا نہ کریں گے
خود اپنے عشوہ و انداز کا شہید ہوں میں
خود اپنی ذات سے برتی ہے بے رخی میں نے
ہاں اس کے نام میں نے کوئی خط نہیں لکھا
کیا اس کو یہ لکھوں کہ لہو تھوکتا ہوں میں

جون ایلیا نے تپِ دق کو انقلابی نوجوانوں کی خون تھوکنے والی بیماری کہا ہے۔ خون تھوکنا، خون کی الٹیاں کرنا، گویا ان ادیبوں کی موت کی جانب پیش قدمی کو تیز تر کرتا تھا۔ رومانوی طرزِ احساس مہم جوئی سے عبارت ہے۔ گویا اس حوالے سے موت بھی ان کے سامنے ایک خطرناک مہم تھی۔ جسے سر کرنے کے لئے یہ ادیب خود کو جان لیوا بیماری سے مسلح کرتے تھے۔ جون ایلیا کو بھی بڑے انتظار کے بعد جب تپِ دق کا مرض لاحق ہوا۔ تو جیسے انہوں نے فتح و بہادری کی آدھی منزل طے کرلی تھی۔ خون کے دھبے، خون کے چھینٹے، لہو کے چھاپے اور دیگر اسی طرح کے الفاظ جون ایلیا کے یہاں کثرت سے ہیں۔ اسی حوالے سے جون ایلیا کے یہاں ایک خیالی محبوبہ کا تصور بھی تراشا ہوا ملتا ہے۔ ''۱۹۴۳ء میں مری عمر بارہ برس تھی۔ میں اس زمانے میں بھی شعر کہتا تھا۔ کبھی جبران خلیل کے نابالغ طرزِ احساس میں اپنی ایک خیالی محبوبہ صوفیہ کے نام خط لکھا کرتا تھا''۔ ۲۵۴

خیالی محبوبہ کا پیکر تراشنا، اس کے تصور میں گم رہنا، اس کے لئے شعر کہنا اور اس کے فراق کی اذیت سہنا۔ یہ عوامل ایک طرف رومانوی ذہن کے عکاس ہیں۔ تو دوسری طرف اردو ادب پر عالمی ادب کے اثرات کا بھی اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ خود جون ایلیا نے اسکا اظہار کیا ہے۔ جون ایلیا کی خواہش مرگ ان کے اندر کی شدید تنہائی سے بھی وابستہ ہے۔

مستقل بولتا ہی رہتا ہوں
کتنا خاموش ہوں میں اندر سے

اس اندر کے شدید احساسِ تنہائی نے ادیبوں کو بہت سرعت لیکن خاموشی کے ساتھ موت کی طرف پیش قدمی پر آمادہ کیا۔ یہ اندر کی تنہائی درحقیقت ان کے اندر کی وہ دنیا ہے۔ جس میں صرف اپنے آپ سے ہی مکالمہ کرتے ہیں۔ ایسا ہی مکالمہ زندگی کے حوالے سے جون ایلیا کا بھی رہا۔

ارجمند ارجمنداں کیا کہوں
زندگی ہے کس قدر زار و زبوں

ادیب کے اندر کا احساسِ تنہائی جب شدید تر ہو جائے۔ تو ناامیدی اور مایوسی کا پودا خود بخود پھوٹ پڑتا ہے۔ داخلی کرب کی کیفیت ناقابلِ برداشت ہو کر زندگی کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتی ہے۔ جون ایلیا کی خواہشِ مرگ اسی راستے سے زندگی اور داخلی اذیت کی دونوں کیفیات سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔

حیات ناامیدی کے سہارے
یہ کربِ جانکنی لوٹا رہا ہوں میں

یہ بات یقینی ہے۔ کہ احساسِ تنہائی کی شدت نے بالآخر ادیبوں کو اذیت دے دے کر مارا۔ اور جو بچ گئے۔ وہ اذیت ناک زندگی کے ہاتھوں تمام عمر قدم قدم پر مرتے رہے۔

جون ہم زندگی کی راہوں میں
اپنی تنہا روی کے مارے ہیں

جون ایلیا کی شاعری میں قدم قدم پر نہ صرف خواہشِ مرگ موجود تھی۔ بلکہ ایک ایسی اذیت ناک زندگی کا تصور سامنے آتا ہے۔ جو جون ایلیا کو بسر کرنا کسی طور پر گوارا نہ تھی۔ یہاں ہر ہر لمحہ زندگی کا دامن چھوڑنے کا ایک عہد دکھائی دیتا ہے۔ ایک ایسا عہد جسے ایفا کرنے کے لئے خود شاعر تندہی کے ساتھ کوشاں ہے۔ وہ زندگی کو اور زندگی قائم رکھنے کے تمام امکانات کو خود توڑنے پھوڑنے پر شدت کے ساتھ آمادہ نظر آتا ہے۔

تیرے عدم کو گوارا نہ تھا وجود میرا
سو اپنی بیخ کنی میں کمی نہ کی میں نے
سانس کیا ہیں کہ میرے سینے میں
ہر نفس چل رہا ہے اک آرا
ہو گئی ہے مرے سفر کی سحر
کوچ کا بج رہا ہے نقارہ
زندگی کس طرح بسر ہو گی
دل نہیں لگ رہا محبت میں
کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے
تو بھی اے شخص کیا کرے آخر
مجھ کو تو سر پھوڑنے کی عادت ہے

خواہشیں دل کا ساتھ چھوڑ گئیں
یہ اذیت بڑی اذیت ہے
ان خرابوں میں جان کنی نے مری
خون تھوکا ہے زخم چاٹے ہیں
پلایا تھا ہمیں امرت کسی نے
مگر منہ سے لہو کے جھاگ نکلے ہیں

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر میراجی ایک مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰، ص، ۲۲

۲۔ ایضاً، ص، ۲۸

۳۔ الطاف گوہر، میراجی، ایک تصویر، بحوالہ میراجی ایک مطالعہ، (مرتب) جمیل جالبی ڈاکٹر، ص، ۱۲۸

۴۔ ایضاً

۵۔ کمال مصطفیٰ، مضمون میراجی ۱۹۴۲ء تک کی شاعری، مشمولہ، فنون، مئی، جون، ۱۹۷۰ء، ۴۷، انارکلی، لاہور، ص، ۴۳

۶۔ خان فضل الرحمٰن، میراجی، ناول، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۲، ناشر، بشیر احمد چودھری، شاد سنز پریس، لاہور، بار اول، ۱۹۸۹ء، ص، ۱۶

۷۔ ایضاً، ص، ۲۳

۸۔ ایضاً، ص، ۳۴

۹۔ ایضاً، ص، ۳۸

۱۰۔ اخلاق احمد دہلوی، میراجی کا اخلاق، مشمولہ، میراجی ایک مطالعہ، (مرتب) ڈاکٹر جمیل جالبی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۰، ص، ۹۳

۱۱۔ خان فضل الرحمٰن، میراجی، ناول، ص، ۱۰۲

۱۲۔ ایضاً، ص، ۳۴

۱۳۔ شاہد احمد دہلوی، میراجی ایک مطالعہ، (مرتب) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص، ۵۲

۱۴۔ خان فضل الرحمٰن، میراجی، ناول، ص، ۵۵

۱۵۔ شاہد احمد دہلوی، بحوالہ میراجی، ایک مطالعہ، (مرتب) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص، ۵۶

۱۶۔ خان فضل الرحمٰن، میراجی، ناول، ص، ۸۱

۱۷۔ سعادت حسن منٹو، تین گولے، بحوالہ میراجی، ایک مطالعہ، (مرتب) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص، ۷۶

۱۸۔ محمود نظامی، بحوالہ میراجی، ایک مطالعہ، (مرتب) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص، ۱۱۷

۱۹۔ مختار صدیقی، اکیلا، ایضاً، ص، ۱۸۶

۲۰۔ میراجی بنام الطاف گوہر، بحوالہ، میراجی، ایک مطالعہ، مرتبہ جمیل جالبی، ص،۴۵۲

۲۱۔ احمد بشیر، بحوالہ، میراجی، ایک مطالعہ، ص،۱۴۲

۲۲۔ کمال مصطفیٰ، میراجی ۱۹۴۲ء تک کی شاعری، مشمولہ، فنون، مئی، جون، ۱۹۷۰ء، ۴۷، انارکلی، لاہور ص،۴۸

۲۳۔ حسن عسکری، بحوالہ میراجی، ایک مطالعہ، ص،۸۵

۲۴۔ سعادت حسن منٹو، تین گولے، بحوالہ میراجی، ایک مطالعہ، ص،۶۹

۲۵۔ شاہد احمد دہلوی، بحوالہ میراجی، ایک مطالعہ، ص،۵۱

۲۶۔ حمید نسیم، پانچ جدید شاعر، فضلی سنز، (پرائیویٹ) لمیٹڈ، نومبر ۱۹۹۴ء، ص،۱۶۰

۲۷۔ خان فضل الرحمٰن، میراجی، ناول، ص،۱۴۳

۲۸۔ احمد بشیر، اکیلا، بحوالہ میراجی، ایک مطالعہ، ص،۱۲۹، ۱۳۰

۲۹۔ خط بنام الطاف گوہر، بحوالہ، میراجی، ایک مطالعہ، (مرتب) جمیل جالبی، ص،۴۴۸

۳۰۔ خان فضل الرحمٰن، میراجی، ناول، ص،۲۳

۳۱۔ ایضاً، ص،۱۴۱

۳۲۔ شاہد احمد دہلوی، بحوالہ میراجی، ایک مطالعہ، ص،۵۷

۳۳۔ کمال مصطفےٰ، میراجی، بحوالہ مضمون میراجی، ۱۹۴۲ء تک کی شاعری، مطبوعہ، فنون، مئی، جون، ۱۹۷۰ء، جلد ۱۱، شمارہ ۱، ۲، ۴۷، انارکلی، لاہور ص،۴۳

۳۴۔ ایضاً، ص،۵۰

۳۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر میراجی، ایک مطالعہ، ص،۳۰

۳۶۔ میراجی، خط بنام عبداللطیف، مشمولہ، میراجی، ایک مطالعہ (مرتب) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص،۳۰

۳۷۔ جمیل جالبی ڈاکٹر، میراجی، ایک مطالعہ، ص،۲۷

۳۸۔ میراجی، مشرق و مغرب کے نغمے، اکادمی پنجاب (ٹرسٹ) لاہور، شمارہ ۱۴، باراوّل، ۱۹۵۸ء، ص،۴۶

۳۹۔ ایضاً، ص،۵۸

۴۰۔ ایضاً، ص،۵۰۳

۴۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر میراجی، ایک مطالعہ، ص،۲۶

۴۲۔ میراجی، مشرق و مغرب کے نغمے، ص،۲۵۵

۴۳۔ ایضاً، ص،۱۶۶

۴۴۔ ایضاً، ص،۱۶۹

۴۵۔ ایضاً، ص،۱۷۴

۴۶۔ ایضاً، ص،۳۲۷

۴۷۔ ایضاً، ص،۳۵۰

۴۸۔ ایضاً، ص،۶۳۸، ۶۴۰

۴۹۔ ایضاً، ص،۶۵۸

۵۰۔ اخلاق احمد دہلوی، میراجی کا اخلاق، مشمولہ، میراجی، ایک مطالعہ، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ص،۹۰

۵۱۔ احمد بشیر اکیلا، بحوالہ میراجی، ایک مطالعہ، ص،۱۳۷

۵۲۔ اخلاق احمد دہلوی، میراجی کا اخلاق، بحوالہ میراجی، ایک مطالعہ، ص،۹۱

۵۳۔ احمد بشیر، اکیلا، بحوالہ میراجی، ایک مطالعہ، ص،۱۴۲

۵۴۔ اخلاق احمد دہلوی، میراجی کا اخلاق، ص،۹۷

۵۵۔ الطاف گوہر، بحوالہ میراجی ایک مطالعہ، ص، ۴۵۶
۵۶۔ اختر الایمان، میراجی کے آخری لمحے، مشمولہ، میراجی، ایک مطالعہ، ص، ۴۷۱
۵۷۔ سعادت حسن منٹو، تین گولے، ایضاً ص، ۵۷
۵۸۔ ابوسعید قریشی، مضمون، باقیات منٹو، مشمولہ دائیں بائیں، اوپر نیچے، (منٹو فن وشخصیت) مرتبہ فرید احمد، پنجاب بک ہاؤس، اردو بازار کراچی، اشاعت اول، ۱۹۹۵، ص، ۲۷۲
۵۹۔ منٹو فیملی سے راقمہ کی ملاقات، ۱۵ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۶۰۔ احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، (پچاس برس بعد)، (مرتب) شمشیر حیدر شجر، نوید الحسن، شعبہ اردو جی سی، یونیورسٹی، سویرا آرٹ پریس، لاہور، باراول، ۲۰۰۵، ص، ۲۰۷
۶۱۔ منٹو بنام احمد ندیم قاسمی، ایڈلفی چیمبرز، کلیئر روڈ، بمبئی، نمبر ۸، ۱۲ فروری، ۳۹ء، بحوالہ نقوش، ص، ۳۶۸
۶۲۔ منٹو کے خطوط بنام احمد ندیم قاسمی، ۱۷ ایڈلفی چیمبرز، کلڑ روڈ، بمبئی نمبر ۸، جنوری، فروری ۳۹ء، منٹو کی نیند یادیں اور چند خطوط، احمد ندیم قاسمی، نقوش، ص، ۳۶۶، ۳۶۸
۶۳۔ عصمت چغتائی، میرا دوست، میرا دشمن، مشمولہ، نقوش، ص، ۲۰۰
۶۴۔ ایضاً
۶۵۔ مسز ثریا نصیر الدین، راقمہ سے ملاقات، ۱۵ جون ۲۰۰۵، لاہور
۶۶۔ عارف عبدالمتین، بحوالہ سعادت حسن منٹو (پچاس برس بعد)، ص، ۲۰۸
۶۷۔ منٹو بنام احمد ندیم قاسمی، ۱۷، ایڈلفی چیمبرز، کلیسر روڈ، بمبئی نمبر ۸، ۳۰ جنوری، ۱۹۳۹ء، بحوالہ نقوش، ص، ۳۶۶
۶۸۔ ابوسعید قریشی، رحمدل دہشت پسند، مشمولہ، نقوش، ص، ۳۴۲
۶۹۔ نصرت جلال (منٹو کی بیٹی)، راقمہ سے ملاقات، ۱۵ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۷۰۔ ابوسعید قریشی، رحمدل دہشت پسند، مشمولہ، نقوش، ص، ۲۴۲
۷۱۔ جی ایم اثر، دائیں بائیں، اوپر نیچے، (منٹو فن وشخصیت) مرتبہ فرید احمد، پنجاب بک ہاؤس، اردو بازار، کراچی، اشاعت اول، ۱۹۹۵، ص، ۲۸۲
۷۲۔ سید عابد علی عابد، گنجا فرشتہ، مشمولہ، نقوش، ص، ۲۵۷
۷۳۔ ابوسعید قریشی، رحمدل دہشت پسند، مشمولہ، نقوش، ص، ۳۳۹
۷۴۔ ہاجرہ مسرور، جو بک نہ سکا، مشمولہ، نقوش، ص، ۳۳۵
۷۵۔ عصمت چغتائی، میرا دوست، میرا دشمن، مشمولہ نقوش، ص، ۳۱۰
۷۶۔ ابوسعید قریشی، رحمدل دہشت پسند، مشمولہ، نقوش، ص، ۳۴۲
۷۷۔ احمد ندیم قاسمی، منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط، مشمولہ نقوش، ص، ۳۶۲
۷۸۔ احمد ندیم قاسمی، راقمہ سے ملاقات، ۱۷ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۷۹۔ ہاجرہ مسرور، جو بک نہ سکا، مشمولہ، نقوش، ص، ۳۳۵
۸۰۔ جی ایم اثر، دائیں بائیں، اوپر نیچے، (منٹو فن وشخصیت) مرتبہ فرید احمد، پنجاب بک ہاؤس، اردو بازار، کراچی، اشاعت اول، ۱۹۹۵، ص، ۲۹۵
۸۱۔ ایضاً ص، ۲۷۹
۸۲۔ ایضاً ص، ۲۹۲
۸۳۔ ڈاکٹر وحید قریشی، راقمہ سے ملاقات، لاہور، ۲۰، جولائی ۲۰۰۶
۸۴۔ مسز نصرت جلال، (منٹو کی بیٹی)، راقمہ سے ملاقات، ۱۵ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۸۵۔ مسز ثریا نصیر الدین، منٹو کی فیملی سے راقمہ کی ملاقات، ۱۵ جون، ۲۰۰۵، لاہور

۱۵۱۔ توصیف تبسم، پروفیسر راقمہ سے گفتگو، ۳ فروری، اسلام آباد
۱۵۲۔ لطیف کاشمیری زیدی ایک کھلی کتاب، مشمولہ، افکار، ص ۲۰۰
۱۵۳۔ شاہد رضا، مصطفیٰ زیدی کے بھتیجے، راقمہ سے ملاقات، ۲۸ دسمبر، ۲۰۰۶، کراچی
۱۵۴۔ مسز فرحت ارتضیٰ زیدی، راقمہ سے ملاقات، ۳ ستمبر، ۲۰۰۵، اسلام آباد
۱۵۵۔ علامہ نصیر ترابی، علامہ راقمہ سے گفتگو، ۱۵ اکتوبر، ۲۰۰۵، اسلام آباد
۱۵۶۔ مسز فرحت ارتضیٰ زیدی (مصطفیٰ زیدی کی بھابھی) راقمہ سے ملاقات، اسلام آباد
۱۵۷۔ شاہد رضا، مصطفیٰ زیدی کے بھتیجے، راقمہ سے ملاقات، کراچی
۱۵۸۔ ایضاً
۱۵۹۔ مسز فرحت ارتضیٰ زیدی، راقمہ سے ملاقات، اسلام آباد
۱۶۰۔ شاہد عشقی، بحوالہ الرحوم، مرتب، اشرف قدسی، ص ۳۳۰
۱۶۱۔ احسن فاروقی ڈاکٹر، بحوالہ الرحوم، ص ۱۴
۱۶۲۔ نصیر ترابی، علامہ راقمہ سے گفتگو، ۱۵ اکتوبر، ۲۰۰۵، اسلام آباد
۱۶۳۔ شاہد رضا، راقمہ سے گفتگو، ۲۸ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۱۶۴۔ مصطفیٰ زیدی، کوہِ ندا، حرف آخر، ص ۱۵
۱۶۵۔ مسز فرحت ارتضیٰ زیدی، راقمہ سے گفتگو
۱۶۶۔ شاہد رضا، راقمہ سے ملاقات
۱۶۷۔ جمیل ملال، (صغیر ملال کے بھائی) راقمہ سے ملاقات، ۴ مارچ، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۶۸۔ مرزا ادیب، نوائے وقت، لاہور، ۲۱ مئی، ۱۹۹۲
۱۶۹۔ جمیل ملال، راقمہ سے ملاقات
۱۷۰۔ ثریا ملال (جمیل ملال کی بھابھی)، راقمہ سے ملاقات، ۴ مارچ، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۷۱۔ مشتاق احمد یوسفی، راقمہ سے ملاقات، ۲۹ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۱۷۲۔ جمیل ملال، راقمہ سے ملاقات، ۴ مارچ، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۷۳۔ ایضاً
۱۷۴۔ مشتاق احمد یوسفی، راقمہ سے ملاقات، ۲۹ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۱۷۵۔ جمیل ملال، راقمہ سے گفتگو
۱۷۶۔ ایضاً
۱۷۷۔ صغیر ملال، بیسویں صدی کے شاہکار افسانے، ترجمہ و تبصرہ، ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ، فضل سنز، کراچی، ۱۹۹۱، ص ۲۲۴
۱۷۸۔ جمیل ملال، راقمہ سے گفتگو
۱۷۹۔ ثریا ملال، راقمہ سے ملاقات
۱۸۰۔ جمیل ملال، راقمہ سے ملاقات
۱۸۱۔ کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۸۲۔ صغیر ملال، بیسویں صدی کے شاہکار افسانے، (ترجمہ و تبصرہ)، ویلکم بک پورٹ، (پرائیویٹ) لمیٹڈ، فضل سنز کراچی، ۱۹۹۱، ص ۱۷۸
۱۸۳۔ جمیل ملال، راقمہ سے ملاقات، ۴ مارچ، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۸۴۔ ایضاً
۱۸۵۔ ایضاً

۱۸۶۔ ثریا ملال، راقمہ سے ملاقات، ۴ مارچ، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۸۷۔ صغیر ملال، بیسویں صدی کے شاہکار افسانے، ص، ۲۰، ۲۱
۱۸۸۔ ایضاً، ص، ۲۲۲
۱۸۹۔ ایضاً، ص، ۳۲۰
۱۹۰۔ ایضاً، ص، ۹۸
۱۹۱۔ ایضاً، ص، ۸۴
۱۹۲۔ ایضاً، ص، ۹۷
۱۹۳۔ ایضاً، ص، ۱۱۸
۱۹۴۔ ایضاً، ص، ۱۲۲
۱۹۵۔ ایضاً، ص، ۲۲۱
۱۹۶۔ ایضاً، ص، ۱۶۷
۱۹۷۔ ایضاً، ص، ۱۷۸، ۱۷۹
۱۹۸۔ ایضاً، ص، ۲۲۱
۱۹۹۔ ایضاً، ص، ۲۲۲
۲۰۰۔ ایضاً، ص، ۲۲۳
۲۰۱۔ ایضاً، ص، ۲۲۴
۲۰۲۔ ایضاً، ص، ۲۲۵
۲۰۳۔ ایضاً، ص، ۴۰
۲۰۴۔ ایضاً، ص، ۲۷۰
۲۰۵۔ ایضاً، ص، ۲۷۷
۲۰۶۔ ایضاً، ص، ۴۱، ۴۲
۲۰۷۔ ایضاً، ص، ۳۰۳، ۳۰۴
۲۰۸۔ جمیل ملال، راقمہ سے ملاقات، ۴ مارچ، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۰۹۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۶ جولائی، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۱۰۔ کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۱۱۔ افتخار عارف، راقمہ سے ملاقات، ۱۱ دسمبر، ۲۰۰۵، اسلام آباد
۲۱۲۔ مشتاق احمد یوسفی، راقمہ سے ملاقات، ۲۹ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۲۱۳۔ افتخار عارف، راقمہ سے ملاقات، ۱۱ دسمبر، ۲۰۰۵، اسلام آباد
۲۱۴۔ جمیل ملال، راقمہ سے ملاقات، ۴ مارچ، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۱۵۔ کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۱۶۔ افتخار عارف، راقمہ سے ملاقات، دسمبر، ۲۰۰۵، اسلام آباد
۲۱۷۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۴ مارچ، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۱۸۔ جمیل ملال، راقمہ سے ملاقات، ۴ مارچ، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۱۹۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۲واں ایڈیشن، ۲۰۰۵، ص، ۱۷۷
۲۲۰۔ شکیلہ حمید (جمیلہ شاہین کی بہن)، راقمہ سے گفتگو، بمقام، رہائش گاہ، ایم۔اے حق، P۔۲۴۴، انڈس روڈ، لالکڑتی، بتاریخ، ۱۷ جولائی، ۲۰۰۵، راولپنڈی
۲۲۱۔ ایضاً

۲۲۲۔ ایضاً
۲۲۳۔ مسز رخسانہ احسان (جمیلہ شاہین کی بھابھی)، راقمہ سے ملاقات، ۱۷جولائی، ۲۰۰۵، راولپنڈی
۲۲۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۴نومبر، ۲۰۰۵، اسلام آباد
۲۲۵۔ سلمیٰ جبین، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۴اگست، ۲۰۰۵، لاہور
۲۲۶۔ فتح محمد ملک، پروفیسر راقمہ سے گفتگو، ۳۰جولائی، ۲۰۰۵، اسلام آباد
۲۲۷۔ ایضاً
۲۲۸۔ کشور ناہید، راقمہ سے گفتگو، ۱۴جنوری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۲۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲فروری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۳۰۔ رشید امجد، ڈاکٹر راقمہ سے گفتگو، ۲فروری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۳۱۔ شکیلہ حمید، پروفیسر راقمہ سے گفتگو، ۱۷جولائی، ۲۰۰۵، راولپنڈی
۲۳۲۔ ایضاً
۲۳۳۔ رشید امجد، ڈاکٹر راقمہ سے گفتگو، ۲فروری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۳۴۔ شکیلہ حمید، پروفیسر راقمہ سے گفتگو، ۱۷جولائی، ۲۰۰۵، راولپنڈی
۲۳۵۔ ایضاً
۲۳۶۔ ناصرہ راٹھور، پروفیسر راقمہ سے گفتگو، ۵جنوری، ۲۰۰۵، راولپنڈی
۲۳۷۔ شکیلہ حمید، پروفیسر راقمہ سے گفتگو
۲۳۸۔ رخسانہ احسان، راقمہ سے ملاقات
۲۳۹۔ شکیلہ حمید، پروفیسر راقمہ سے گفتگو
۲۴۰۔ ایضاً
۲۴۱۔ ایضاً
۲۴۲۔ ایضاً
۲۴۳۔ جون ایلیا، ''شاید''، الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، انارکلی، لاہور، اشاعت ہفتم ۱۹۹۸، ص، ۱۴
۲۴۴۔ ایضاً، ص، ۱۵
۲۴۵۔ ایضاً، ص، ۱۶
۲۴۶۔ ایضاً، ص، ۱۹
۲۴۷۔ ایضاً، ص، ۱۱
۲۴۸۔ ایضاً، ص، ۱۲، ۱۳
۲۴۹۔ ایضاً، ص، ۲۹، ۳۰
۲۵۰۔ ایضاً، ص، ۲۶
۲۵۱۔ ایضاً، ص، ۱۷
۲۵۲۔ ایضاً، ص، ۱۸
۲۵۳۔ ایضاً، ص، ۱۹
۲۵۴۔ ایضاً، ص، ۲۱

باب پنجم

ادیبوں میں خودکشی کے محرکات (تجزیہ ونتائج)

مجموعی طور پر ادیبوں میں خودکشی کے محرکات کا تفصیلی جائزہ:

اس ضمن میں ادیبوں میں خودکشی کے مندرجہ ذیل محرکات سامنے آتے ہیں

ا۔ مغرب میں مذہب کا زوال جو کلیسا کے منفی طرزِ عمل کے باعث ہوا۔ اس سے مغربی معاشرے میں بے راہ روی اور فرد کو حد سے بڑھی ہوئی خود مختاری ملی۔ فکری طور پر اس خود مختاری نے فرد کو زندگی کے ہر شعبے میں آزاد کر دیا۔ مذہب و اخلاق کا خانہ جو فرد اور سماج کی زندگی میں ایک مرکز ومحور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جس کی نمو پذیری سے دنیاوی زندگی مخصوص قاعدوں اور ضابطوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ اور اسی کے باعث مادی اور روحانی زندگی کا توازن قائم ہوتا ہے۔ اب اس فکری آزادی اور اخلاقی بے راہ روی نے فرد اور سماج کو مذہبی قواعد وضوابط کی پابندی سے آزاد کر دیا۔

بقول جون ایلیا

۔۔۔ مجھے ڈیوڈ ہیوم کی ''مبادی علمِ انسانی'' پڑھنے کا موقع ملا۔ ہیوم پڑھنے کا مشورہ مجھے دہلی میں مشہور کمیونسٹ مفکر اور ترقی پسند ادیب ڈاکٹر عبدالعلیم نے دیا تھا۔ میں دنیا کا تو پہلے بھی نہیں تھا۔ یہ کتاب پڑھ کر دین سے بھی گیا۔ جس حکمت عملی کے ساتھ بار کلے نے مادے کا خانہ خراب کیا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ منصوبہ بندی کے ساتھ ہیوم نے ذہن، نفس، روح اور انکی کمین گاہیں برباد کیں۔ [1]

نتیجہ یہ نکلا کہ فرد اور سماج کی زندگی ایک خودرو پودے کی مانند برگ وبار تو لائی۔ لیکن بے ثمر ہوگئی۔ فرد مذہب و اخلاق سے کٹ کر حیات ومما ت سے متعلق ایک خود ساختہ آزاد خیالی اور خود مختاری سے وابستہ ہو گیا۔ ان عوامل میں جو صورتِ حال پیدا ہوئی۔ وہ یہ تھی۔ کہ زندگی کے مسائل ومصائب کے پیش نظر فرد نے جب اور جیسے چاہا۔ ناامیدی اور نام نہاد خود مختاری کے باعث اپنی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ اس سے معاشرتی سطح پر خودکشی کا رجحان پنپنے لگا۔

بانو قدسیہ اس ضمن میں کہتی ہیں۔

مغرب کے لوگ مادیت سے قریب ہونے کے باعث مذہب سے دور ہوتے چلے گئے۔ مذہب سے دوری کی وجہ سے ان کے یہاں مذہبی، اخلاقی اور روحانی اقدار کو شدید نقصان پہنچا۔ روحانیت درحقیقت انسان کو اللہ اور فلاح سے ملاتی ہے۔ جب معاشرہ اس روحانی زوال سے دوچار ہوا۔ تو یقیناً وہاں کا ادب اور ادیب بھی اس زوال سے محفوظ نہ رہ سکا۔ [2]

جب زندگی مادے کی غلام بنکر ایک بے جان جسم کی مانند بے کیف اور بے روح ہو گئی۔ تو اس کے اثرات ادب اور ادیب نے بھی قبول کیے۔ چنانچہ انیسویں اور بیسویں صدی میں ایسی فکری اور ادبی تحریکیں منظرِ عام پر آئیں۔ جن کے فلسفہ نے ادب کی دنیا میں مادے کو اہمیت اور مذہب و اخلاق کو انسانی زندگی سے خارج کر دیا۔ اگر چہ یہ تینوں تحریکیں براہ راست ادب سے متعلق نہیں تھیں۔ لیکن چونکہ ادب پورے سماج اور انسانی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ لہذا ان تحریکات کے اثرات ادب کی دنیا پر شدت کے ساتھ اثر انداز ہوئے۔ انہی کے تحت ادیبوں نے جو اثرات قبول کیے۔ ان میں سے ایک حوالہ ادیبوں میں خودکشی کا محرک بنا۔ ادب چونکہ سماجی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لہذا سماجی زندگی کا یہی مخصوص مزاج اور

رویے ادیبوں میں خودکشی کے رجحانات کو فروغ دینے کا باعث بنے۔

بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

> مذہب کا وجود انسانی زندگی کے اس یقین کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ جس کے باعث زندگی اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے مسلسل تقویت پاتی رہتی ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی یا دورِ حاضر کے ادیب نے اسوجہ سے خودکشی کا راستہ اختیار کیا۔ کہ مذہب سے انکا رشتہ کمزور پڑ گیا تھا۔ ورنہ کیا وجہ ہے۔ کہ ہماری کلاسیکی ادبی تاریخ میں شاید ہی کسی ادیب نے خودکشی کی ہو۔ کیا ان ادیبوں کے کوئی ذاتی، نفسیاتی یا ذہنی مسائل نہیں تھے؟ کیا زندگی میں ان کے لئے کوئی مشکلات نہیں تھیں۔ ضرور تھیں۔ بلکہ بے پناہ تھیں۔ میر تقی میر نے ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ میں نے بعض اوقات کتے بلیوں کی طرح زندگی گزاری ہے۔ لیکن میر یا کسی اور شاعر نے بدترین حالات کے باوجود خودکشی نہیں کی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اسوقت کا انسان مذہب اور اپنی تہذیبی اقدار سے زیادہ قریب تھا۔ اور معاشرے میں قناعت پسندی بھی تھی۔ -۳

۲۔ ادیبوں کی خودکشی کا ایک محرک ان کی زندگی کی ایسی مشکلات بھی رہی ہیں۔ جو سماج کے منفی رویوں کے باعث پیدا ہوئیں۔ ان میں بعض عزیز و اقارب کا ناروا سلوک، دوست احباب کی بدعہدی، جھوٹ، خودغرضی، فریب اور نفسانفسی کے عناصر شامل ہیں۔ ان عوامل کے پیشِ نظر ادیبوں میں ان کی انا، حساس طبیعت اور نرگسیت پسندی کا جو پہلو تھا۔ ان کے باعث ان کی سماج سے مفاہمت نہ ہو سکی۔ اور وہ سماج میں رہتے ہوئے بھی سماج سے کٹنے لگے۔

بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ''ادیب حساس ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے۔ کہ دنیا اس کے خلاف ہے۔ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ حساس ہونے کا یہ تناسب ادیبوں کے اندر عام شخص کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔''-۴

Alvarez Says,

> It is also true that the suicide creates his own society: to shut yourself off from other people... day in and day out at the dead wall outside your window is in itself a rejection of the world which is said to be rejecting you...-۵

ادیبوں کی حساس فطرت در حقیقت ان کی تخلیقی صلاحیتوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ وہ جسمانی طور پر تو معاشرے کے ساتھ شریکِ زندگی رہتے ہیں۔ لیکن ذہنی و فکری طور پر ان کی اپنی دنیا اور اپنی زندگی ان کے اندر ہی اندر وجود پا جاتی ہے۔ ان کی حساس فطرت ان تکلیف دہ عوامل کو داخلی کرب کی صورت اپنا لیتی ہے۔ جسکا ان کی خارجی زندگی پر بظاہر کوئی خاص اثر دکھائی نہیں دیتا۔ یہی صورتِ حال انہیں ایک عام شخص سے مختلف بناتی ہے۔

بقول فتح محمد ملک ''ادیب حساس ہوتا ہے۔ اس لیے وہ عام و عامی سے مختلف ہوتا ہے۔''-۶ حساس فطرت کی شدت انہیں رفتہ رفتہ ایک نارمل زندگی سے کاٹنے لگتی ہے۔ جس سے ان کے اندر فکری پردیس اور انسانی زندگی کے متوازن

رویے منتشر ہو جاتے ہیں۔سماج اور ادیب کے حوالے سے ذہنی دوری اور عدم مفاہمت بعض اوقات ایسی مایوسی، ناامیدی اور پریشان حالی کی فضا پیدا کر دیتی ہے۔ کہ بعض ادیب خودکشی یا اقدام خودکشی کی طرف مائل ہو گئے۔ادیبوں کا اس قسم کا رویہ اور طرزِ احساس سماج کے منفی رویوں کے سامنے شدید احتجاج کی ایک صورت تھا۔سماج سے اس قسم کا غم وغصہ اور ناراضگی جن ادیبوں کی خودکشی کے محرکات میں ایک محرک ثابت ہوئی۔ان میں امریکی سیاہ فام شاعرہ ایلس واکر، سارہ ٹیسیڈیل ایرانی شاعر رضا کمال شہزاد، صادق ہدایت، امریکی شاعر پال سیلان، اور اردو کے شاعر شکیب جلالی، ثروت حسین اور آنس معین قابل ذکر ہیں۔

۳۔ ادیبوں میں خودکشی کا ایک اہم محرک یہ بھی رہا ہے۔ کہ خودکشی یا اقدام خودکشی کرنے والے اکثر ادیبوں کی ازدواجی زندگی غیر مطمئن تھی۔اس حوالے سے ان کی زندگی میں امن سکون کی فضا عنقا رہی۔انہیں گھر کا وہ ماحول نہ مل سکا۔جو انسان کو تحفظ اور سلامتی عطا کرتا ہے۔اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ان ادیبوں کو دو طرح کی اذیت سے گزرنا پڑا۔ ایک اذیت یہ کہ انسان کو زندگی کا بنیادی سکون جو گھر کے حوالے سے ممکن ہوتا ہے۔میسر نہ آیا۔اور دوسرا یہ کہ ادیب کی حساس طبیعت اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو ازدواجی زندگی کے مسائل نے کچل ڈالا۔اسکا نتیجہ یہ نکلا۔کہ ان ادیبوں نے یا تو براہ راست خودکشی کا راستہ اختیار کیا۔یا خود کو مسلسل اذیت میں مبتلا رکھتے رکھتے وہ جان سے گزر گئے۔اسکا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کی مشکلات کے پیشِ نظر بعض ادیبوں نے ناکام شادیوں کے کئی کئی تجربے کیے۔جس سے ان کی عزتِ نفس مسلسل کچلی جاتی رہی۔اس حوالے سے ایک خاص بات یہ ہے کہ ادیبات اور شاعرات کو ازدواجی مسائل کے پیشِ نظر اضافی پریشانیاں اس طور اٹھانا پڑیں۔کہ انہیں ایک ادبی شخصیت کی بجائے صرف عورت سمجھ کر اکثر ان کے فن کا گلا گھونٹا گیا۔انہیں ذہنی، جسمانی اور اخلاقی سطح پر ایذا پہنچائی گئی۔خودکشی کرنیوالی زیادہ تر ادیبات ازدواجی زندگی کا یہی پس منظر رکھتی ہیں۔سلویا پلاتھ، این سیکسٹن اور سارا شگفتہ کی ناکام ازدواجی زندگی اسی المیے سے عبارت ہے۔اس حوالے سے خودکشی کرنے والے ایسے ادیب بھی ہیں۔جن کی ازدواجی زندگی ناکام تو نہیں ہوئی۔لیکن ان کی زندگی میں اپنی شریکِ حیات سے مکالمہ کم کم رہا۔اس ضمن میں وہ ایک عجیب وغریب تنہائی کا شکار ہو کر اپنی ذات سے بھی کٹتے چلے گئے۔
اس حوالے سے ثروت حسین کے لیئے ڈاکٹر عبدالکریم خالد کا کہنا ہے۔

> اس کی ازدواجی زندگی اگرچہ ناکام زندگی نہیں تھی۔البتہ ایک انٹی لیکچول کا اپنی شریک حیات سے جس طرح مکالمہ ہونا چاہیے تھا۔وہ کمی ثروت کی زندگی میں ضرور تھی۔ممکن ہے کہ وہ اسی وجہ سے اکثر گھر سے دور رہتا تھا۔[۷]

۴۔ بعض ادیبوں کے ہاں خواہش مرگ یا خودکشی کا حوالہ ابتداء ہی سے ان کی کسی انتہائی قریبی عزیز کی موت کے رد عمل کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے۔اس صورت میں حد درجہ حساس فطرت کے باعث یہ ادیب زندگی کے قدرتی حادثاتی سانحات کے ساتھ عملی زندگی میں توازن برقرار نہ رکھ سکے۔اس کے نتیجے میں یا تو خود ان کے اندر موت کی خواہش نے جنم لیا۔یا ناامیدی اور مایوسی کی حالت میں وہ زندگی سے کٹ کر موت کی تمنا کرنے لگے۔اس طرح ان کے یہاں ابتداء ہی سے خواہش مرگ کا ایک پروسیس شروع ہو گیا۔موت کی حقیقت کو جاننے اور اس تک رسائی پانے کی کیفیت لاشعوری طور پر ان کے اندر جڑ پکڑتی گئی۔اس ابتدائی مرحلے پر ان ادیبوں کی سوچ میں غور وفکر کے حوالے سے کوئی فکری پہلو موجود نہیں تھا۔بلکہ جذباتی نوعیت کی صورتِ حال تھی۔یعنی جس طرح بال یا پتھر لگنے سے کوئی بچہ غیر ارادی طور پر بال یا پتھر مارنے

والے کی طرف دیکھتا ہے۔ اور وہ نظر نہ آنے پر اس کو ڈھونڈنے کے لئے اسی سمت چل پڑتا ہے۔ اور پھر چوٹ کا درد کم ہونے پر بھی بچے کے اندر تلاش کا پروسس جاری رہتا ہے۔ ان ادیبوں نے بھی کمسنی میں اپنے والدین یا قریبی عزیزوں کی موت کے جو حادثے دیکھے۔ وہ رفتہ رفتہ جذباتی نوعیت سے نکل کر ان کی فکری پرداخت سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے انہیں موت سے قریب کرتے چلے گئے۔ اور اس کیفیت میں بالآخر انہوں نے زندگی کے دیگر کئی مسائل کے پیش نظر خودکشی کی۔ ایسے ادیبوں میں سلویا پلاتھ، این سیکسٹن، رضا کمال شہزاد اور شکیب جلالی کے نام قابل ذکر ہیں۔

سلویا پلاتھ تقریباً آٹھ سال کی تھیں۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا۔ اپنے باپ کے ساتھ سلویا کو بے انتہا محبت تھی۔ اور اس جذباتی عمر میں باپ کی موت کے عظیم سانحے پر انہوں نے ابتدا میں بہت سی نظمیں لکھیں۔ جنکا موضوع باپ کی موت پر نہ صرف شدید رنج و غم کا اظہار تھا۔ بلکہ موت کو دیکھنے اور اس کی حقیقت جاننے کی شدید خواہش بھی ان نظموں میں موجود ہے۔ وہ موت، جو اتنی طاقتور تھی۔ کہ ان کے باپ کو ان سے چھین لے گئی۔ اس طرح شکیب جلالی نے نو برس کی عمر میں اپنی والدہ کی ٹرین کے آگے جو ہلاکت دیکھی۔ تو وہ اس منظر کی دہشت، خوف، اور ماں کی مامتا کی جستجو کے عمل سے زندگی بھر نہ نکل سکے۔ حتیٰ کہ شکیب کی شاعری کا حوالہ ہی خون، لہو اور لہو کے چھینٹے بن گئے۔ جو انہوں نے اپنی کمسنی میں ریل کی پٹڑی پر بکھرے ہوئے دیکھے تھے۔ ابتدائی زندگی کے یہی حادثے انہیں رفتہ رفتہ موت سے قریب لے گئے۔ اسی طرح این سیکسٹن نے اپنے والدین کی موت دیکھی۔ بچے کیلئے زندگی کی دو بڑی پناہ گاہیں جو یکے بعد دیگرے این سیکسٹن کو محرومی اور عدم تحفظ کا احساس دے گئیں۔ این کے لئے زندگی کا عظیم دکھ بن گیا۔ جو بالآخر انہیں زندگی سے دور کرتا گیا۔ اور آخر کار ان کی خودکشی کا باعث بنا۔

انہی حالات میں ایرانی شاعر رضا کمال شہزاد نے بھی خواہش مرگ کو تقویت دی۔ ان کے والدین کا انتقال اس وقت ہوا۔ جب شہزاد کی نوجوانی کی عمر تھی۔ عمر کا یہ جذباتی مرحلہ ہمیشہ کیلئے ان کا والدین کی جدائی پر مبنی سانحہ بن گیا۔ اس کے علاوہ شہزاد کی بہن کا بھی اس دوران انتقال ہوا۔ جو انہیں عزیز از جان تھی۔ چنانچہ اپنے قریبی عزیزوں کی اس انمٹ جدائی کا صدمہ انہیں ہمیشہ کے لئے زندگی سے دور اور موت سے قریب کرتا چلا گیا۔ جو آخر کار ان کی خودکشی پر منتج ہوا۔

اسی طرح اردو کے کہانی نویس مظہر الاسلام کے ہاں بھی موت کیلئے کشش کا حوالہ ابتدائی زندگی میں ان کے والد کی موت کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ نوعمری میں موت کو اپنی آنکھوں دیکھنے اور برتنے کا وہ عملی تجربہ ہے۔ جو رفتہ رفتہ ان ادیبوں کی سوچ اور فکر پر حاوی ہوتا چلا گیا۔ مظہر الاسلام موت سے اسوقت Fascinate ہوئے۔ جب بقول ان کے (مظہر الاسلام)

> جب میں نے موت کو اپنے باپ کے سرہانے بیٹھے دیکھا۔ باپ کی موت کے بعد کئی مہینوں تک میں ہر روز صبح قبرستان جاتا رہا۔ تو موت نے مجھے بے حد Fascinate کیا۔ اور پھر گزشتہ تجربوں میں موت کا ذائقہ بھی شامل ہوگیا۔ ۔[۸]

یہ صورتِ حال انفرادی سطح پر موت کو محسوس کرنے اور برتنے کی ہے۔ یہ نہ تو کس فلسفے کے مطالعے سے انسان میں پیدا ہوتی ہے۔ اور نہ مذہب کے راستے انسان کو اپنی حقیقت کا ادراک کرواتی ہے۔ یہ وہ ذائقہ ہے۔ جو انسان خود چکھتا ہے۔ اور پھر عمر بھر اسکا اسیر ہو کر اسے بھول نہیں پاتا۔

۵۔ ادیبوں میں خودکشی کا ایک محرک جینز کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ کسی انسان کی

سوانح اور اس کے پشت در پشت اسی بات کا کھوج لگانا اور تحقیق کرنا، کہ اس کے خاندانوں میں کس کس نے خودکشی کی، ایک امر حال ہے۔ کیونکہ عموماً اس قسم کی موت پر اقرباء کی پردہ پوشی یا خاموشی اختیار کرنا مصلحتوں کے تابع ہوتا ہے۔ البتہ از خود اس ضمن میں کوئی موت جو خودکشی کے حوالے سے ہوئی۔ منظرِ عام پر آ جائے یا زبان زدِ عام ہو جائے۔ تو وہ الگ بات ہے۔ اسی طرح ادیبوں کے حوالے سے بھی یہ صورتِ حال کافی دقت طلب ہے۔ کہ ان کے اقرباء میں "کس نے" اور "کب" خودکشی کی۔ لیکن ابتک کی تحقیق سے یہ بات بہت حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔ کہ خودکشی کا ایک محرک انسانی جینز بھی ہیں۔ جو بعض اوقات وراثت کی صورت ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بعض ادیبوں کے ہاں اسکا ثبوت موجود ہے۔ مثلاً مغرب کے حوالے سے امریکی ادیب ہیمنگ وے کے لئے یہ بات سامنے آتی ہے۔ کہ ہیمنگ وے نے بھی خودکشی کی۔ اور اس طرح سے کی۔ جس طرح ان کے والد نے ان سے پہلے کی تھی۔ "Hemingway's father, in fact, shot himself as his son did later."-۹ اسی طرح جان بیری مین کے لئے کہا جاتا ہے۔ کہ

> ...So did the father of the John Berryman, whose major theme...in his poetic maturity was mourning and also killed himself in 1972.-۱۰

اردو ادب میں جینز کے ضمن میں خودکشی کا ایک حوالہ شکیب جلالی کے ساتھ وابستہ ہے۔ شکیب کی والدہ کی موت ریلوے ٹرین کے سامنے ہلاکت کے باعث ہوئی۔ بعد میں شکیب جلالی نے اسی طرح ٹرین کے سامنے خودکشی کی۔ اس طرح مصطفیٰ زیدی کی حادثاتی موت جو قتل اور خودکشی دونوں کا ایک مخصوص حوالہ رکھتی ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں مصطفیٰ زیدی کی موت کے محرکات کم و بیش یکساں ہیں۔ اس ضمن میں مصطفیٰ زیدی کے بھتیجے شاہد رضا کے مطابق ان کے ایک چچا جنکا نام ناصر تھا۔ تقریباً بیس برس کی عمر میں خودکشی کر گئے تھے۔ یہ تمام عوامل اس بات کے شاہد ہیں۔ کہ خودکشی کے دیگر محرکات کی طرح بعض ادیبوں میں جینز بھی خودکشی کا محرک بنے۔

۶۔ ادیبوں میں خودکشی کا ایک محرک انکا وجودی نقطہ نظر کا حامل ہونا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی ادبی اور فکری تحریکیں جو انسان کے اندر بیک وقت آزادی، خودمختاری اور بعض مخصوص حالات میں زندگی کی بے معنویت پیدا کرنے کا موجب بنی تھیں۔ انہی کے اثرات کے تحت بعض ادیبوں کی ذہنی نشو و نما انہی سطور پر ہوتی چلی گئی۔ آزادی، خودمختاری اور اپنے وجود کی اہمیت ان کے نزدیک اتنی بڑھی۔ کہ وہ اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں، ارادوں، قول و فعل، حتیٰ کہ مستقبل کے حوالے سے تمام تر منصوبہ بندی اور لائحہ عمل اختیار کرنے پر مختارِ کل بن گئے۔ ان کے نزدیک صرف وجود کی اہمیت تھی۔ یہ آزادی اس حد تک بڑھی۔ کہ انہوں نے جب چاہا۔ اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیئے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ جب تک وہ زندگی میں مثبت افعال اور سرگرم عمل رہے۔ زندگی کی وہی صورت انہیں قبول تھی۔ لیکن بیماری لاچاری اور بڑھاپے کے باعث جہاں انہوں نے سمجھا۔ کہ اب وہ زندگی میں پہلے کی طرح فعال نہیں رہے۔ اور ان کے اندر اس حوالے سے کوئی کمزوری اور معذوری پیدا ہو رہی ہے۔ تو وہ خود انحصاری کی کیفیت میں زندگی سے منکر ہو گئے۔ اور یہ سوچتے ہوئے، کہ وہ ایسے حالات میں زندہ کیوں رہیں۔ یا موت کا انتظار کیوں کریں۔ (جبکہ بقول ان کے، موت تو ان کی پابند تھی)۔ لہذا ایسے حالات میں انہوں نے خودکشی کو ہی اس اذیت ناک کیفیت سے نکلنے کا ذریعہ سمجھا۔ یہ ایک طرح سے قوانینِ فطرت سے فرار اور انحراف کا طریقہ بھی تھا۔ اس ضمن میں ہیمنگ وے کا نام قابل ذکر ہے۔ انہوں نے انہی حالات اور ایسی ہی کیفیت

میں پستول سے خودکشی کر لی تھی۔ وہ خودکشی کے وقت جسمانی اور ذہنی طور پر خود کو جس طرح بیمار محسوس کر کے عجب لاچاری اور تنہائی محسوس کر رہے تھے۔ وہ صورتِ حال بڑھاپے کے وقت سے پہلے نہ تھی۔ اسوقت وہ بڑھاپے کے ساتھ ساتھ مختلف جنگوں میں شرکت کر کے زخموں کی اذیت بھی سہہ رہے تھے۔ یہ ذہنی کیفیت مجموعی طور پر ان کی زندگی سے وابستہ نہ تھی۔ بلکہ وہ بنیادی طور پر مہم جو انسان تھے۔ بے پناہ مشاغل نے انہیں تمام زندگی سرگرمِ عمل رکھا۔ ان کا ناول "The Old Man and The Sea" میں بوڑھے شخص کا کردار درحقیقت ہیمنگ وے کا ہی کردار ہے۔ جو سمندر کی مچھلیوں سے جو بمعنی زندگی کی مشکلات تھیں۔ تن تنہا نبرد آزما رہا۔ حتیٰ کہ ان کا جسم و جان ایک ڈھانچے کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ لیکن اس بوڑھے کردار کے پایۂ استقلال میں لغزش نہ آئی۔ اس تمام حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے۔ کہ وجودی نقطہ نظر کے حامل موت کی طلب اس وقت کرتے ہیں۔ جب وہ موت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ گویا بوقتِ ضرورت موت پر قادر ہوتے ہوئے جب چاہیں۔ زندگی کی اذیت سے نجات پالیں۔

اسی ضمن میں سلویا پلاتھ اور این سیکسٹن کی خودکشی میں بھی یہی حوالہ ایک محرک بن جاتا ہے۔ دونوں نے جب چاہا۔ کہ اب زندگی کی اذیت سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ تو خودکشی کا راستہ اختیار کیا۔ جاپانی شاعر اور مصنف یوکیومشی ما کی خودکشی میں بھی موت سے متعلق خود انحصاری کا پہلو موجود ہے۔ بلکہ ان کے ہاں تو موت ایک تجربے کی صورت بھی رکھتی ہے۔ وہ تمام زندگی نہایت بہادری کے ساتھ مختلف پرخطر کاموں میں مصروفِ عمل رہے۔ نہایت مستعد اور چاک و چوبند۔ اور پھر موت جو انسانی زندگی کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہو سکتی ہے۔ وہ اس پرخطر طاقت سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار ہوئے۔ اور اپنے اندر خنجر اتار کر گویا انہوں نے موت کو شکست دی تھی۔

مغرب کے وجودی فلسفے کے اثرات اردو ادب کے بعض ادیبوں کے ہاں ایک پسندیدہ نظری کی صورت پائے جاتے ہیں۔ جس سے اس نقطۂ نظر کو تقویت ملی۔ کہ جس طرح انسان خود اعتمادی اور یقین کے ساتھ اپنے تمام امورِ زندگی کو نبٹاتا ہے۔ اس کی درستی اور اصلاح پر قادر ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ موت کے معاملے میں بھی کسی دوسرے کے اختیار کا پابند نہیں ہوتا۔ بقول مظہر الاسلام ''اپنے ہاتھوں مرنا اچھا لگتا ہے۔''۔۱۱

جہاں تک اردو ادب میں مغرب کے وجودی اثرات کا تعلق ہے۔ یہ درست ہے کہ مغرب کی نسبت ہمارے ہاں وجودیت کا اثر کم رہا۔ بقول ڈاکٹر عبدالکریم خالد ''وجودیت ہمارے ہاں اس طرح سے نہیں آئی۔ جس طرح سے مغرب میں تھی''۔۱۲ لیکن مغرب کے وجودی فلسفے کے جتنے اثرات آئے۔ وہ ہمارے ادیبوں پر اثر انداز ہوئے۔ تناسب کم یا زیادہ تھا۔ یہ الگ سے ایک بحث ہے۔ لیکن جب بھی کسی معاشرے سے ہم سماجی یا ادبی اثرات لیتے ہیں۔ تو ابتدائی مرحلے پر ہم بہت کچھ ضروری اور غیر ضروری عوامل کی پیروی کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور ایسی صورت میں بالواسطہ یا بلاواسطہ کی تفریق بھی باقی نہیں رہتی۔ بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ''ہمارے ہاں وجودیت کا امکان موجود ہے۔''۔۱۳

یہاں موت کے حوالے سے فرد کی خود انحصاری کی وہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ جسے ہم مغرب کے وجودی فلسفے کا اثر کہہ سکتے ہیں۔ مغرب کے وجودی فلسفے کا اثر ہی ہے۔ کہ بالخصوص اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مغربی معاشرے اور اس کے حوالے سے ادیبوں میں خودکشی کا رجحان ایک خاص رویے کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

اٹھارویں صدی کا ایک فرانسیسی مضمون نگار انگریز قوم اور اس حوالے سے انگریز ادیبوں کے لیے لکھتا ہے۔

"They die with their own hands with as much indifference as by

another's..."-۱۴

۷۔ ادیبوں کی خودکشی کا ایک اور بنیادی اور اہم محرک کثرت شراب نوشی اور دیگر منشیات کا بے تحاشا استعمال ہے۔ تخلیقی پروسیس کے دوران اکثر ادیبوں کے یہاں شراب نوشی ان کے معمولات زندگی میں شامل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تقریباً سبھی ادیبوں کے یہاں شراب یا کسی نہ کسی نشہ آور شئے کے استعمال کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن اس کی کثرت اور اس کے حد سے بڑھتے ہوئے استعمال نے اکثر لکھاریوں کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ کچھ ادیب ایسے بھی ہیں۔ جنھوں نے جانتے بوجھتے شراب یا کسی نشہ آور شئے کا استعمال حد سے بڑھایا۔ جو ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔ اور اسی نقصان میں ان کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ شراب کا استعمال اور اس میں زیادتی کی کیفیت دو طرح سے دکھائی دیتی ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ بعض ادیبوں نے جنسی و اخلاقی بے راہ روی کے ہاتھوں شراب اور دیگر نشہ آور ادویات کا استعمال اسقدر بڑھایا۔ کہ ہر لحہ مدہوشی یا نیم بے ہوشی کی حالت میں پائے گئے۔ ایسی صورت میں شراب نے نہ صرف ان کی صحت کو گھن کی طرح چاٹ کھایا۔ بلکہ آخر کار انہیں زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ایسے ادیبوں میں سارا شگفتہ اور میرا جی کا نام قابل ذکر ہے۔ سارا شگفتہ نے تو ذاتی غموں کے باعث شراب اور دیگر نشوں کو رسم آوارگی کے لحاظ سے اپنایا۔ اور پھر انہی میں پناہ ڈھونڈتی ڈھونڈتی وہ انجام کار خودکشی کر گئیں۔ سارا کے دکھ بحثیت ادیبہ کے نہ تھے۔ ان کی شاعری محض ذاتی غموں کی کہانی ہے۔ جو غمِ جاناں سے غمِ دوراں کی دہلیز پار نہ کر سکی۔ جبکہ میرا جی کے ہاں شراب ایک لکھاری کی تخلیقی سطح سے ابھری۔ اس میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کے دھارے شامل ہوتے گئے۔ ایک ادیب اپنے ماحول کے ہم مزاج نہ ہو سکا۔ احتجاج یا انتقام؟ میرا جی نے دونوں حوالوں سے خود کو اذیت دینے کے لئے شراب اور نشہ آور اشیاء کے گویا اپنی زندگی کو گروی رکھ دیا۔ میرا جی نے خودکشی نہیں کی۔ لیکن خودکشی کے راستے کا انتخاب کرتے ہوئے شراب کا زہر انہوں نے قطرہ قطرہ اپنے اندر اتارا۔ یہاں تک کہ زندگی مزید اس آتشِ مدہوشی کی متحمل نہ ہو سکی۔

اسی حوالے سے امریکی شاعر اور ادیب ایڈگر الن پو کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ شراب ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ بلکہ ان کے نزدیک زندگی کا دوسرا نام شراب اور نشہ تھا۔ میرا جی کی طرح انہوں نے زندگی کی آخری سانس تک خود کو شراب کا غلام رکھا۔ لیکن شراب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ سکا۔ جوں جوں مرض، بیماری اور ہسپتال کی احتیاطی تدابیر بڑھتی گئیں۔ شراب کی مقدار بھی ان کے ہاتھوں بڑھتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ شراب نوشی کی انتہا نے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

اسی ضمن میں امریکی شاعرہ ساراہ ٹیسڈیل کا ذکر آتا ہے۔ جنھوں نے اپنی پریشان کن زندگی کے ہاتھوں اینٹی ڈیریشن ادویات کا سہارا لیا۔ لیکن جب سکون میسر نہ آیا۔ تو انہی ادویات کی مقدار بڑھا کر خودکشی کر گئیں۔ ادیبوں میں شراب نوشی کی دوسری صورت وہ ہے۔ جو سعادت حسن منٹو نے، جو کہ اپنے وقت کے نامور ادیب تھے۔ اپنے ساتھ وابستہ کی۔ وہ جس اعلیٰ درجے کے تخلیق کار تھے۔ سماج سے سمجھوتہ نہ کر سکے۔ منٹو کے اندر کا ادیب تن تنہا سماج کے منفی رویوں کے سامنے ڈٹ گیا۔ وہ انتہا درجے کی اذیت سے دوچار ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ ماحول کو تو اپنے مطابق بدل نہ سکے۔ لیکن جو ٹوٹ پھوٹ ان کے اندر شروع ہوئی۔ اور اس تکلیف سے بچاؤ کے لئے انہوں نے جو پناہ گاہ تلاش کی۔ وہ شراب کی پناہ گاہ تھی۔ اس پناہ گاہ میں وقتی سکون کا متلاشی یہ فنکار ازلی و ابدی سکون تلاش کرنے لگا۔ یہ سکون ان کے لئے اور بھی درد کا دارو بن گیا۔ جب دوست احباب کی بے وفائیوں، معاشی زندگی کی مشکلات انہیں دامن گیر ہوئیں۔ وہ رفتہ رفتہ اپنی ذات سے بھی کٹتے چلے گئے۔ شراب نے آخر کار انکا جگر پارہ پارہ کر دیا۔ وہ سماج سے ناراض تھے۔ شراب ان کے ہاتھ میں دھمکی

تھی۔احتجاج کا ایک ذریعہ تھا۔ آخر کار خون کی الٹیوں اور شراب کے قطرے کو زبان پر لیے یہ عظیم لکھاری داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔

سماج سے ناراض ادیبوں میں ساغر صدیقی کا نام بھی سرفہرست ہے۔ ساغر نے بھی بطور احتجاج اور انتقام نشے میں پناہ لی۔ خود فراموشی اور عالم رفتگی میں انہوں نے خود کو نشے کی گم شدگی کے سپرد کر دیا۔ شہر لاہور کی رونق بھری زندگی کے اندر بھی ساغر نے تنہائی اور اداسی پر مبنی وہ شامیں تلاش کر لیں۔ جو ایک تخلیق کار کی دسترس میں ہی آ سکتی ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں۔"جب شام ہوتی ہے۔تو میں ویران سا ہو جاتا ہوں"۔[۱۵] اسے ایک ادیب کی فطری اداسی کا نام ہی دیا جا سکتا ہے۔ جو اس کی حساس فطرت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ اور ان اداسی بھرے لمحوں میں صرف نشہ ہی ان کا واحد سہارا اور ساتھی تھا۔ اسی سے محوِ گفتگو ہونا یا خود کلامی سے غرقاب ساغر اپنی زندگی سے گزرتے چلے گئے۔

بقول یونس ادیب

> اصل میں چرس اور مارفیا کو ساغر صدیقی کا نشہ ہو گیا تھا۔ پہلے پہل کپڑے اتارنے والے اس سنگدل شہر کے لوگوں سے بھاگ کر اس نے نشے میں پناہ تلاش کی۔ اور جب وہ اس شہر کے سنگدل لوگوں سے بے نیاز ہو گیا۔ تو نشہ اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔[۱۶]

گویا ادیبوں نے نامساعد سماجی حالات کے باعث بعض اوقات نشہ کی زیادتی اسقدر بڑھا دی۔ کہ نشہ ان کی موت کا ایک اہم ترین محرک ثابت ہوا۔ اس طرح ادیبوں میں یہ رجحان رہا۔ کہ نشے کے سہارے خود کو ایک ہی مرتبہ مکمل طور پر ختم نہ کرنا، لیکن ختم ہونے کی خواہش کے ساتھ اس طور سے زندہ رہنا، کہ تھوڑا تھوڑا نشہ موت کی آسودگی انہیں عطا کرتا رہے۔

> Coleridge's symbolic Suicide-creative death by opium was to become one of the Romantic alternatives for those fated not to die prematurely; Baudelaire also had the opium habit ... who called himself "Litteraturicide".[۱۷]

گویا بودلیر نے اپنے اور خودکشی کے حوالے سے جو اصطلاح استعمال کی۔ وہ درحقیقت ادیب اور خودکشی کے مابین ایک مخصوص اور منفرد تعلق کا اظہار ہے۔

۸۔ بعض ادیبوں کی خودکشی کا محرک مسلسل کوئی جسمانی، ذہنی یا نفسیاتی عارضہ تھا۔ جس کے شدید ڈیپریشن سے وہ خود کو باہر نہ لا سکے۔ یہ ڈیپریشن ان کے یہاں خودکشی کا ایک اہم محرک رہا ہے۔ ڈیپریشن کے باعث ان ادیبوں نے خودکشی سے پہلے کئی مرتبہ اقدام خودکشی بھی کیا۔

سی۔جی ینگ کا کہنا ہے۔

> Psychology and study of art will always have to turn to one another for help, and the one will not invalidate the other.[۱۸]

ذہنی یا نفسیاتی حوالے سے ڈیپریشن کی کئی صورتیں ہیں، مثلاً ابتدائی زندگی کا کوئی حادثہ جو رفتہ رفتہ نفسیاتی بیماری بن گیا۔ اور جس نے بالآخران ادیبوں کی زندگی کو خودکشی پر منتج کیا۔ مثلاً سلویا پلاتھ اور شکیب جلالی وغیرہ۔ بعض ادیبوں میں ڈیپریشن کی ایک صورت یہ بھی رہی ہے۔ کہ سماج سے حتیٰ کہ اپنی ذات سے کٹ کر یہ ادیب شدید مایوسی، بیزاری اور زندگی سے فرار پانے کیلئے خود کو انتہا درجے کی اذیت سے دوچار کرتے رہے۔ اس حوالے سے انہوں نے ڈیپریشن کی حالت میں کسی تیز دھار آلے کی مدد سے خود کو وقتاً فوقتاً ضربیں لگانے کا عمل جاری رکھا۔ خون، زخم اور درد کی اذیت سے ان کے اندر موجود خواہشِ مرگ کو تقویت ملتی رہی۔ جو بعض اوقات خودکشی پر منتج ہوئی۔ اور بعض اوقات اذیت پسندی کا یہ عمل تمام عمر جاری رکھا اور لمحہ لمحہ کی اذیت سے وہ قدم قدم پر گویا موت کا سامنا کرتے رہے۔ اس ضمن میں جمیلہ شاہین اور این سیکسٹن کے نام قابل ذکر ہیں۔ جمیلہ شاہین نے تمام عمر خود کو اذیت دینے کا یہ کربناک کھیل جاری رکھا۔ اور اسی حوالے سے وہ آخرکار موت سے ہمکنار ہوئیں۔ جبکہ این سیکسٹن ڈیپریشن کی حالت میں خود کو تیز دھار آلے سے ضربیں لگا کر نہ صرف اپنی مختصر زندگی میں لطف اندوز ہوتی رہیں۔ بلکہ اس کیفیت میں ایک روز خودکشی کر گئیں۔

بقول ڈاکٹر سہیل احمد خان

> خود کو اذیت دینے والوں کے نزدیک خود اذیتی میں Pleasure of pain کی کیفیت ہوتی ہے۔ جس سے وہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وسیع معنوں میں یہی کیفیت بعد میں اکثر خودکشی کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے۔ ۱۹

Alvarez Says, " Injured self esteem, is one of the prime motive for suicide."-۲۰

بعض ادیبوں نے شدید جسمانی بیماری کے باعث رفتہ رفتہ نہ صرف ذہنی اور نفسیاتی دباؤ میں زندگی بسر کی۔ بلکہ اینٹی ڈیپریشن ادویات اور ہسپتال میں زیر علاج رہنے کے باوجود وہ نہ تو صحت یاب ہو سکے۔ اور نہ ہی ان کے اندر زندگی کی طرف لوٹنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ بلکہ جسقدر علاج ہوتا گیا۔ وہ اسی تیزی کے ساتھ زندگی سے دور ہوتے چلے گئے۔ اور آخرکار خودکشی کر لی۔ بقول ڈاکٹر وحید قریشی ''ادیب حساس ہوتے ہیں۔ نا مساعد حالات سے سمجھوتہ نہیں کر پاتے۔ ادیبوں میں خودکشی کا ایک محرک ان کی کوئی ذہنی یا جسمانی نوعیت کی بیماری ہو سکتی ہے۔''-۲۱ ان میں امریکی ادیبہ ورجینیا وولف اور سلویا پلاتھ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ ورجینیا اور سلویا دونوں نے خودکشی سے پہلے دو سے تین مرتبہ اقدام خودکشی کیا۔ لیکن بچا لی گئیں۔ ورجینیا نے خودکشی کی تیسری کوشش میں خود کو دریا کی تند و تیز لہروں کے سپرد کر دیا۔ جبکہ سلویا نے کاربن مونو آکسائیڈ سے خود کو ختم کر لیا۔

امریکی شاعر رینڈال جیرل بھی اینٹی ڈیپریشن دواؤں کا استعمال کرتے تھے۔ گھریلو زندگی کے مسائل اور سماجی زندگی کی پریشانیوں نے ان کے اندر ایک عجب طرح کی ذہنی اور نفسیاتی الجھن پیدا کر دی تھی۔ اسی کے دباؤ اور ڈیپریشن میں وہ ایک روز خودکشی کر گئے۔ ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کا جہاں تک خودکشی کے حوالے سے تعلق ہے۔ یہ از خود ایک مہلک ترین محرک کے طور پر ادیبوں کی خودکشی کے عمل میں معاون رہا ہے۔

۹۔ انسان کی زندگی کی پریشان حالی میں معاشی تنگدستی اور مسائل روزگار کا اہم کردار رہا ہے۔ اس کے ہاتھوں ایک عام شخص بھی خودکشی کا مرتکب ہوتا اور ہو سکتا ہے۔ ادیب معاشرے کا فرد ہے۔ چنانچہ بعض ادیبوں نے معاشی تنگدستی کے ہاتھوں بھی خودکشی کی ہے۔ اور اگر معاشی مسائل کے حوالے سے ادیبوں نے براہ راست خودکشی نہیں کی۔ تو اس کی ایک

صورت یہ رہی ہے۔ کہ معاشی مسائل سے دلبرداشتہ ہو کر وہ زندگی سے حد درجہ بیزار ہوتے چلے گئے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتیں بری طرح مجروع ہوئیں۔ اور سماج سے ایک عجب طرح کی ناراضگی ان کی ناآسودہ زندگی کا حصہ بنتی چلی گئی۔ اور اسی تلخ کیفیت کا ''تند و تیز ریلا انہیں بالآخر اپنے ساتھ بہالے گیا۔ اردو ادب میں ساغر صدیقی کا نام اسی زمرے میں آتا ہے۔ بقول یونس ادیب ''تنگدستی تو ساغر کا مقدر تھی۔۔۔ اس کی ہڈیوں پر گوشت چمڑے کی طرح کسا جا رہا تھا۔ کبھی اس کے جسم پر کوئی پھوڑا نکل آتا۔ اور کبھی اس کے زخمی پیر سے پیپ بہنے لگتی۔''۔۲۲

گو اس حوالے سے ادیبوں کا تناسب کم کم ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے۔ کہ معاشی مسائل کے ہاتھوں اپنی زندگی کا چراغ گل کرنے والے ادیبوں کے اس کے علاوہ بھی زندگی کے کچھ مسائل رہے ہوں گے۔ لیکن ان کی خودکشی کا بنیادی حوالہ زندگی کی یہی ضرورت بنی۔ چنانچہ ادیبوں کے اس طبقے میں امریکی شاعر ہارٹ کرین کا نام اس ضمن میں اہم ہے۔ ان ادیبوں کا بھی ایک مسئلہ تھا۔ جو رفتہ رفتہ ڈیپریشن کی صورت اختیار کرتا گیا۔ وہ یہ تھا۔ کہ یہ ادیب معاشرے میں بہتر سماجی مقام کے لئے زندگی کی ان تھک تگ و دو کرتے رہے۔ لیکن اس میں وہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ اور دوست احباب نے بھی اس ضمن میں مدد نہ کی۔ لہذا یہ مسئلہ بھی ان کے نزدیک زندگی کی ایک محرومی تھی۔ جو رفتہ رفتہ ان کیلئے سوہان روح بن گئی۔ اور اس صورتِ حال سے دلبرداشتہ ہو کر آخر کار انہوں نے خودکشی کی۔

اس ضمن میں بات درحقیقت یہ ہے۔ کہ انسان جب ذہنی و دماغی طور پر بے حد پریشان ہوتا ہے۔ تو اس صورتِ حال سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ جسمانی تکلیف سے گزرنے میں اس لیے آسانی محسوس کرتا ہے۔ کہ ذہنی تکلیف کی نسبت جسمانی تکلیف اسے اسوقت جز وقتی محسوس ہوتی ہے۔ یہی محسوسات خودکشی کے لئے اس کے سامنے راستہ ہموار کرتے ہیں۔

> ...great mental suffering make us in sensible to bodily pain; we despise it... it distract our thoughts and we welcome it as a pause in mental sufferings, it is this feelings that make suicide easy...۔۲۳

۱۰۔ سماجی زندگی کے بنیادی ستونوں میں سیاست، معاشرت، معیشت اور مذہب ایک اکائی کی صورت انسانی شخصیت و کردار کی تشکیل میں معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ سیاست کے حوالے سے جو تبدیلیاں معاشرے میں آتی ہیں۔ وہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اپنے اثرات ڈالتی ہیں۔ کیونکہ سیاست براہ راست سوسائٹی کو اور سوسائٹی انسانی زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ چنانچہ سیاسی ردوبدل یا کوئی سیاسی انقلاب ہو۔ انسان کے ساتھ اسکا بالواسطہ تعلق قائم ہوتا ہے۔ اس حوالے سے انسانی زندگی کی سیاسی تاریخ پر نگاہ ڈالیں۔ تو ادیبوں کا ایک ایسا طبقہ سامنے آتا ہے۔ جو سیاست میں براہ راست ملوث رہے۔ اور عملی طور پر اس کے انقلاب میں سرگرم عمل۔ لہذا بعض مخصوص حالات میں ان ادیبوں کی خودکشی کا محرک سیاسی دباؤ اور ان کے سیاسی آئیڈیلز کا ٹوٹ جانا تھا۔

اس ضمن میں ایک نمایاں حوالہ روسی انقلاب کا ہے۔ جو ادیب اس انقلاب کے خواہشمند تھے۔ اور عملی طور پر ان سیاسی راہنماؤں کے ساتھ ان کی وفاداریاں تھیں۔ اور وہ اس انقلاب کے لئے کوشاں تھے۔ جو ان بڑے بڑے سیاسی راہنماؤں کے ذریعے وجود میں آنے والا تھا۔ انہوں نے بعض سیاسی لیڈروں کو اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ چنانچہ اس انقلاب

کے حوالے سے جس کے ساتھ مستقبل کے حوالے سے ان کے کئی خوش آئیند خواب وابستہ تھے۔ ان کی خواہشات پوری نہ ہوئیں۔ تو اپنے ان ادھورے خوابوں کے باعث اور شدید بد دلی، ناامیدی اور مایوسی کی حالت میں ڈوب گئے۔ انہیں اپنی زندگی اور ساری جدو جہد رائیگاں نظر آنے لگی۔ ان کے پیشِ نظر جو تمام چھوٹے بڑے آئیڈیلز تھے۔ گویا ان کی موت واقع ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس مایوس کن صورتِ حال میں اکثر روسی ادیبوں نے خودکشیاں کیں۔ ان میں اہم نام مایا کوسکی کا ہے۔ فتح محمد ملک کا کہنا ہے۔

> یہ مغرب کے مادی نظریات بھی ہیں۔ ادیبوں نے انقلاب اور کمیونزم کے لئے زندگیاں وقف کیں۔ لیکن ناکامی کی صورت میں روسی لکھاریوں نے انقلاب کے بعد خودکشیاں کیں۔ ادیب چونکہ حساس تھے۔ انہوں نے دیکھا۔ کہ ان کے لیڈر اس طرح انقلاب نہ لا سکے۔ جس طرح ان کی ذہنی امیجز تھے۔ تو انہوں نے خود اپنے آپکو ختم کرنا شروع کر دیا۔ یعنی آئیڈیلز جب نہ ملے۔ تو مایوسی کی حالت میں یہ ادیب خودکشی کی طرف راغب ہوئے۔ ۲۴

ایسی صورتِ حال میں ہم ادیبوں کی خودکشی کے محرکات سے سیاسی محرک کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اردو ادب کے حوالے سے ادیبوں نے خواہشِ مرگ میں جہاں سکون کا پہلو تلاش کیا ہے۔ وہاں سیاسی دباؤ اور گھٹن کے ماحول میں موت کی علامت نہ صرف بدلی ہے۔ بلکہ اس میں شدت کا پہلو بھی شامل ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کا اس حوالے سے کہنا ہے کہ ''میرے افسانوں میں موت ایک اہم علامت ہے۔ بنیادی بات تو عافیت اور سکون کی ہے۔۔۔ مارشل لاء کے جبر و تشدد میں قبر، موت اور جنازہ سیاسی علامتیں بن جاتے ہیں۔۔۔'' ۲۵ رشید امجد کے یہاں سیاسی حوالے سے بھی خواہشِ مرگ کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ یہ عوامل ظاہر کرتے ہیں۔ کہ زندگی اور سماج کے دیگر تلخ معاملات جو ادیبوں کی خودکشی کا محرک بنتے ہیں۔ وہاں سیاسی زندگی کے انتشار اور اس سے پیدا شدہ گھٹن اور نفسیاتی دباؤ نے بھی ادیبوں کی خودکشی کے محرکات میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ کیونکہ جب ذہنی طور پر یہ گھٹن اور دباؤ ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ تو احتجاج، توڑ پھوڑ اور غم و غصہ پر مبنی کھلنے والے تمام راستوں میں سے ایک راستہ خودکشی کی طرف بھی جاتا ہے۔

بقول ڈاکٹر وحید قریشی

> ادیبوں میں خودکشی کی ایک وجہ سیاسی بھی رہی ہے۔ حکومت کے زیرِ عتاب ہوتے ہوئے ان کی تخلیقات کا نہ چھپ سکنا اور پھر عدم تحفظ کی فضا محسوس کرتے ہوئے بھی ادیبوں نے خودکشی کا راستہ اختیار کیا۔ ۲۶

اس ضمن میں مصطفیٰ زیدی کی حادثاتی موت بھی سیاسی حوالے کے ساتھ وابستہ ہے۔ مصطفیٰ زیدی کی موت خودکشی یا قتل۔ دونوں صورتوں میں یکساں محرکات کی حامل ہے۔ چنانچہ سیاسی دباؤ موت کی ان دونوں صورتوں کا اہم محرک بنتا ہے۔ مصطفیٰ زیدی نے خودکشی کی۔ جیسی کہ ایک اہم رائے ہے۔ تو اس خودکشی کا محرک سیاسی طور پر افسرانِ بالا کا مصطفیٰ زیدی کے ساتھ پیشہ وارانہ عناد اور اس کے لئے ذہنی اور نفسیاتی دباؤ پر مبنی گھٹن کی ایسی فضا تیار کرنا تھا۔ کہ سوائے خودکشی کے مصطفیٰ زیدی کے سامنے فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اور اگر مصطفیٰ زیدی کی موت قتل سے واقع ہوئی۔ جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ تو اس صورت میں بھی سیاسی حوالہ بہت قوی دکھائی دیتا ہے۔ کہ ایک ذہین، قابل اور پر اعتماد افسر کو جو اس وقت ایک اعلیٰ

سرکاری منصب پر فائز تھا، کو راستے سے ہٹانے کے لئے اس کے ہم منصب آڑے آئے۔ اور زیب داستان پر مبنی کہانی، جو اپنے اندر حقیقت بھی رکھتی تھی۔ مصطفےٰ زیدی کی حادثاتی موت کا محرک بتائی گئی۔

بقول مسعود اشعر ''مصطفیٰ زیدی بہت دبنگ آدمی تھا۔ یحییٰ خان کا دور تھا۔ زیدی نہ صرف اس کے خلاف نظمیں لکھتا، بلکہ ٹیلی فون پر دوستوں کو وہ نظمیں سناتا تھا''۔ ۲۷

بعض ادیبوں کی زندگی میں محبت کے ناکام تجربے ان کی خودکشی کا محرک ثابت ہوئے۔ محبت، عشق یا رومانس ایک تخلیق کار کی زندگی اور اس کی فطرت کا بنیادی جوہر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ادیب نازک اور حساس جذبوں کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے اندر جمال پرستی، خلوص دردمندی، لطافتِ خیال اور نزاکت احساس کے عناصر قدرتی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ انہی کے باعث وہ ماحول کے ردوبدل کا سب سے زیادہ اثر لیتا ہے۔ جس میں اسکا عمل اور ردعمل دونوں شدید تر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ادیبوں میں خودکشی کے محرکات کے حوالے سے یہ محرک بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کہ بعض ادیبوں نے محبت میں ناکامی کے باعث خودکشی کا راستہ اختیار کیا۔

یہ الگ بات ہے۔ کہ محبت میں ناکامی کے علاوہ ان کے دیگر مسائل زندگی بھی تھے۔ لیکن محبت میں ناکامی کا پہلو ان کے یہاں بہت نمایاں اور بنیادی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے باعث ان ادیبوں کے ہاں ناآسودہ حالی کی وہ کیفیت پیدا ہوئی۔ جس نے انہیں مزید حساس اور معاملاتِ زندگی سے بیزار کر دیا۔ نتیجتاً ان میں سے کچھ نے تو داغِ محبت کا غم غلط کرنے کے لئے شراب نوشی کی ایسی پناہ ڈھونڈی۔ کہ آخر کار ان کا بستر مرگ بھی شراب نوشی کی زد میں آ گیا۔ ان میں میرا جی ایک نمایاں نام ہے۔ جنہوں نے ناکام عشق کے ہاتھوں اپنی زندگی کو ناکام بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اور آخر کار اپنا نام، دھرم اور جسم و جان عشق کے طاق پر سجا کر میرا جی زندگی سے منہ موڑ گئے۔ یہ محبت کے غم میں تمام عمر سلگنے اور جان دینے کا عمل تھا۔

محبت میں ناکامی کی ایک اور صورت جو واضح طور پر بعض ادیبوں کے ہاں خودکشی کا محرک بنی۔ وہ تمام عمر اندر ہی اندر سلگنے کی کیفیت نہیں تھی۔ بلکہ محبت میں ناکام ہونا ان کے یہاں جان سے گزرنے کا بہانہ بن گیا۔ اس ضمن میں آنس معین کی خودکشی ایک نمایاں حوالہ ہے۔ جس نے اس غم کو رفتہ رفتہ سلگتی چنگاریوں کی مانند اپنے اندر جگہ دی۔ اور شدتِ احساس کے ہاتھوں یہ چنگاریاں چشم زدن میں بھڑک کر شعلہ بن گئیں۔ جس نے آخر کار ٹرین کے آگے خودکشی کر کے زندگی کو ہی خیر باد کہہ دیا۔

محبت میں ناکامی کا تجربہ شمس آغا کو بھی ہوا تھا۔ جو ان کی خودکشی اور گمشدگی کا حوالہ بنتا ہے۔ اسی طرح ایرانی شاعر رضا کمال شہزاد نے دو مرتبہ ناکام محبت کا تجربہ کیا۔ محبت میں ناکامی ان ادیبوں کے یہاں دراصل ان کے لطیف جذبوں کی ناآسودگی اور انا کی شکست کے مترادف رہی ہے۔ بہت ممکن ہے۔ کہ ایک عام شخص ان حالات و کیفیات میں حالات سے سمجھوتہ کر جائے۔ لیکن ادیبوں کے ہاں عشق کے ان جذباتی صدموں نے ان کی زندگی کا رنگ پھیکا کر دیا تھا۔ اور اس جذباتی وابستگی میں ان ادیبوں کے یہاں جو شدت تھی۔ ضروری نہیں۔ کہ وہ انتہا پسندی کا شکار ہو کر اس میں جل مرتے۔ بلکہ یہاں جذبات کے دھیمے رنگوں میں بھی بڑی تپش تھی۔

ایسی ہی ایک مثال ثروت حسین کے حوالے سے ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالکریم خالد

ثروت حسین کی خودکشی کے پیچھے جو ذہنی اور جذباتی صدمے موجود تھے۔ ان میں سے

ایک صدمہ ثروت حسین کا پروین شاکر کے ساتھ جذباتی تعلق بھی تھا۔ جس میں ثروت کو صرف نا آسودہ حالی ملی۔ ۲۸

اس حوالے سے اگر دیکھا جائے۔ تو بظاہر ثروت اور پروین شاکر میں ایسا کوئی معاملہ نہ تھا۔ جوان کی زندگی میں زبان زدِ عام ہوتا۔ لیکن کم و بیش تمام ادیبوں اور خود ثروت کے حقیقی بھائی شوکت عابد نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے۔ کہ ثروت کی خودکشی میں اس عشقیہ اور جذباتی نوعیت کے معاملے کی بہت اہمیت ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا کہنا ہے۔ ''ثروت حسین ایک ذہین انسان تھا۔ اسکا آفیئر تھا اور اس حوالے سے اسے کوئی جذباتی صدمہ پہنچا تھا''۔ ۲۹ اور بقول احمد ہمیش ''دو چیزیں اسکو خودکشی کی طرف لے گئیں ایک پروین شاکر کی بے وفائی اور فن کی ناقدری کا دکھ۔۔۔ لاڑکانہ میں وہ منشیات مثلاً افیم، چرس اور ہیروئن کے عادی ہو گئے تھے۔ اور بھی کئی طرح کی بے راہ رویوں کا شکار ہو گئے تھے۔ اس دوران ان میں خودکشی کا رجحان پیدا ہوا''۔ ۳۰

اس ضمن میں زاہد حسین بھٹی کا کہنا ہے۔ ''جب پروین شاکر نے ان سے بے اعتنائی کی۔ تو وہ بے راہ روی کا شکار ہو گئے۔'' ۳۱

۱۱۔ اسی ضمن میں بقول ڈاکٹر عبدالکریم خالد

پروین شاکر جب ایم اے انگریزی کی طالبہ تھی۔ ثروت حسین اردو میں ایم اے کر رہا تھا۔ چونکہ دونوں شاعر تھے۔ لہذا کالج کے مشاعروں میں دونوں شریک ہوتے تھے۔ اور اکثر اشعار کی درستی اور اصلاح میں ثروت حسین پروین کی مدد کرتا تھا۔ اکثر کہتا تھا۔ کہ پروین کو بنانے والا میں ہوں۔ اور آج پروین جس مقام پر ہے۔ وہ میرے بغیر ممکن نہیں تھا۔ ثروت کے لئے یہ بات انتہائی تکلیف دہ تھی۔ کہ پروین شاکر نے کبھی یہ نہیں کہا۔ کہ وہ ثروت حسین سے متاثر ہے۔ اور اس مخصوص پس منظر میں پروین کا شہرت پانا اور پھر بھول کر بھی ثروت حسین کی خبر نہ لینا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ثروت جیسے نازک اور حساس دل شاعر کے لئے یہ کوئی معمولی صدمہ نہ تھا۔ پروین شاکر کے ضمن میں یہ حوالہ ثروت حسین کی خودکشی کا ایک محرک ضرور بنتا ہے۔ ۳۲

کچھ اسی قسم کی رائے ثروت حسین اور پروین شاکر کے ضمن میں ڈاکٹر اجمل نیازی نے بھی دی۔ ڈاکٹر اجمل نیازی کا کہنا ہے۔

پروین کو اعتراف تو تھا۔ کہ وہ ثروت سے متاثر ہے۔ لیکن اس نے کسی جگہ اور کسی انٹرویو وغیرہ میں اس بات کا کوئی واضح اظہار نہیں کیا۔ یہ بات ثروت شدت کے ساتھ محسوس کرتا تھا۔ بلکہ ثروت پروین کو نظمیں لکھ کر بھی دیتا رہا تھا۔ اور جب پروین شاکر شہرت کے ایک خاص مقام تک پہنچ گئی۔ تو ثروت اس سے اس ضمن میں Jealous ہونے لگا تھا۔ کہ میں بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی کیوں کر اس درجے اور شہرت سے محروم کر دیا گیا۔ ۳۳

اس قسم کے جذباتی صدموں نے ادیبوں کو ہمیشہ ایک داخلی اضطراب میں رکھا۔ اسی قسم کا معاملہ شبیر شاہد کے

حوالے سے بھی آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ''محبت میں ناکامی بھی شبیر شاہد کی گمنام موت کا ایک محرک بنتی ہے۔'' ۳۴۔ عشق و محبت میں ٹوٹ پھوٹ کا یہ سلسلہ خارجی طور پر زیادہ نہ سہی۔ لیکن داخلی اور جذباتی دنیا کو اندر ہی اندر تہہ و بالا کر دیتا ہے۔ اسکا اندازہ خود تجربہ کرنے والوں کو ہی بہتر طور پر ہو سکتا ہے۔

عشق و محبت کے حوالے سے جب ہم خودکشی یا اقدام خودکشی کرنے والے ادیبوں کا ذکر کرتے ہیں۔ تو عشق و محبت کے الفاظ عموماً ایک ہی معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ یعنی وہ کیفیت جوان ادیبوں کو انتہائی جذباتی شدتِ نظری سے ہمکنار کرتی نظر آتی ہے۔ لیکن جہاں تک لفظ محبت کا تعلق ہے۔ اس میں ان کے اندر کسی حد تک اعتدال و توازن کی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ اور انسان محبت کی ناکامی میں پھر بھی کسی طرح حالات سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ لیکن جب کسی مقصد، منزل، محبوب یا کسی بھی آئیڈیل کی تلاش میں عشق کی صورتِ حال پیدا ہو جائے۔ تو اس میں جنون اور دیوانگی کے وہ آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو زندگی سے گزر جانے کا دوسرا نام پاتے ہیں۔ خودکشی کا عمل اسی عشق اور جنون کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کہانی نویس، ناول نگار اور دانشور بانو قدسیہ سے جب اس ضمن میں بات ہوئی۔ تو انہوں نے کہا۔

> عشق انسان کو کسی درمیانی حالت میں نہیں رہنے دیتا۔ یہ انسان کو موت سے ہمکنار کرتا ہے۔ جبکہ محبت ایک درمیانی حالت کا نام ہے۔ اس میں شدت نہیں ہوتی۔ انسان اپنی مرضی سے، اپنی پسند سے جتنا آگے بڑھے، بڑھ سکتا ہے۔ واپسی کے امکانات موجود رہتے ہیں۔ اللہ بھی صرف محبت چاہتا ہے۔ عشق نہیں۔ کیونکہ عشق زندگی اور وجود کے خاتمے کا نام ہے۔ یہ ترکِ دنیا سے عبارت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی محبت میں انسان کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اور اسے زندگی میں دنیا کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر خدا انسان کو اپنے عشق میں فنا کر دے۔ تو روزِ جزا انسان کے گناہ اور نیکی اور انسان کے اختیار و بے اختیاری کا جواز باقی نہیں رہتا۔ ہاں۔ عشق اللہ کے نبیوں اور اس کے پیاروں کی میراث ہے۔ لیکن انسان اگر اپنے مقصد اور محبوب سے عشق کرے۔ اور ناکام ہو جائے۔ تو اس عشقِ لا حاصل سے جینز پیدا ہوتے ہیں۔ فنا کے اور خودکشی کے۔۔۔۔ ۳۵۔

اس حوالے اور وضاحت کی رو سے اگر دیکھا جائے۔ تو خودکشی کرنے والے ادیبوں کے ہاں محبت کی ناکامی نہیں۔ بلکہ عشق کی ناکامی دکھائی دیتی ہے۔ اور جس عہد شباب میں انہوں نے خودکشیاں کیں۔ اس عمر میں انسانی جذبات ویسے بھی تند و تیز موجوں اور سرکشی کی زد میں ہوتے ہیں۔ اور حالات سے سمجھوتہ کرنے کی اجازت دینا عہد شباب کی فطرت نہیں۔ اس اعتبار سے ان ادیبوں کا عشقِ لا حاصل ان کی خودکشی کا جواز بن جاتا ہے۔ اور وہ ادیب جنہوں نے عشقِ لا حاصل کے باوجود خودکشی نہیں کی لیکن شدید اذیت پسندی کے ساتھ وہ ایک داخلی تڑپ اور کسک کے ساتھ خواہش کی جستجو میں رہے۔ اور کبھی نشے کی مدہوشی میں غرقاب۔

اس حوالے سے دیگر کئی ادیبوں کی طرح اختر شیرانی اور ساغر صدیقی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ جنہوں نے عشقِ لا حاصل کا کرب تمام زندگی اسطرح اپنے اندر سمیٹے رکھا۔ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ اگرچہ ان ادیبوں نے خودکشی نہیں کی۔ لیکن زندگی سے بیزار اور نشے کی خود فراموشی میں وہ کب کے اپنی جان سے گزر گئے تھے۔ بقول یونس ادیب

ساغر کا عشق بھی اختر شیرانی کے عشق کی طرح اسرار بن کر رہ گیا۔ شاید اسے بھی کوئی نہ جانتا ہو۔ جس نے ساغر کو توڑ دیا تھا۔ اور وہ ساری زندگی کانچ کی کرچیں چننے کی کوشش میں اپنے ہاتھ زخمی کرتا رہا۔ ۳۶

گویا ان کی زندگی، ان کی خواہش عشق لاحاصل کے فراق میں مدفون ہوگئیں۔

۱۲۔ ادیبوں میں خودکشی کا ایک محرک ان کی فطرت کا وہ تجسس ہے۔ جو ان کے سامنے موجود رنگا رنگ کائنات کے پس پردہ قدرت کے پوشیدہ رازوں کی تلاش میں انہیں سرگرداں رکھتا رہا۔ فطرت کے حسن اور اس کے پس پردہ حیات و ممات کی سچائیوں کے لئے انسان کے اندر تجسس کا مادہ جب غور وفکر کی بھٹی سے کندن بنکر نکلا۔ تو اسے اسرار و رموزِ ہستی نے بے کل کر دیا۔ چونکہ ادیب سماجی زندگی میں عام و عامی کی نسبت فکری مطالعہ اور غور وفکر کا پہلو زیادہ رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کے سامنے بکھرا ہوا حسنِ ازل، مناظرِ قدرت، اور مظاہرِ فطرت قلب ونظر کے لئے محض تماشا گاہ نہیں ٹھہرے۔ بلکہ مادی کھیل اور اس رنگا رنگی کے پیچھے قدرت کے راز، ازل و ابد کے اسرار ایک بن بوجھی پہیلی کی طرح لبوں پر انگلی رکھے خاموش کھڑے تھے۔ اور چونکہ انسان کی فطرت میں تجسس کا مادہ اس حوالے سے بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کہ جو سامنے ہے اسے دیکھو۔ اور جو موجود نہیں اس تک پہنچو۔ لہٰذا زندگی اور زندگی کی رنگا رنگی تو سامنے تھی۔ اس کے پیچھے۔ اس کے بعد اور پھر اس کے بعد کیا ہے؟ کیا کیا ہوگا۔ فکرِ انسانی اس میں غلطاں ہوگئی۔ ادیب اسی طبقے کا سرخیل ہے۔ یہاں پھر ایک بے بسی اسکے آڑے آئی۔ جو غیر محسوساتی سطح پر تھی۔ اور یہ بے بسی موت کے وقت کا انتظار تھا۔ چونکہ وہ لمحہ موت پر قادر نہ تھا۔ چنانچہ موت کے آنے سے پہلے موت کو پانے کی شدید خواہش اور اس سے وابستہ رازوں سے ہمکنار ہونے کے لئے بعض ادیبوں نے خودکشی کا راستہ اختیار کیا۔ اس ضمن میں مختلف زبانوں کے ادب سے تعلق رکھنے والے ادیبوں میں نمایاں نام سیفو، سلویا پلاتھ، این سیکسٹن، رضا کمال شہزاد، شمس آغا، آنس معین اور ثروت حسین کے ہیں۔ اگر چہ ان ادیبوں کی خودکشی کا یہی ایک محرک نہیں۔ بلکہ دیگر کئی محرکات اس ضمن میں ایک اضافی حوالہ بنتے ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا حوالہ ایک بنیادی اور اہم محرک کے طور پر ان محرکات میں شامل ہے۔ جن کے شواہد ان ادیبوں کی شاعری، ان کے خطوط، ڈائریوں اور ان کے مخصوص طرزِ حیات سے بخوبی ملتے ہیں۔ اس حوالے سے ثروت حسین کے ضمن میں ڈاکٹر اجمل نیازی کا کہنا ہے۔ ''ثروت حسین میں موت کے لئے کشش اور اسرار موجود تھا''۔ ۳۷

یہاں جس کشش اور اسرار کی بات ہوئی ہے۔ وہ موت کے حوالے سے اگلی دنیا اور اس زندگی سے متعلق ہے۔ جو ابھی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ اور جسکے لئے ادیب زیادہ متجسس رہتا ہے۔ ثروت حسین کیلئے ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی رائے بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ ''ثروت کے سامنے سوالات تھے۔ یہ سوالات اگلی دنیا سے متعلق تھے''۔ ۳۸

اگلی دنیا سے متعلق سوالات کا سلسلہ بھی فنکار کے لئے خود سے مکالمے کی صورت رکھتا ہے۔ کیونکہ ادیب کی ذہنی سطح عام شخص کی نسبت زیادہ نزاکت خیال کی حامل ہوتی ہے۔ لہٰذا اسکا مکالمہ زیادہ تر اپنی ہی ذات سے رہتا ہے۔ جو سوالات اسے درپیش ہوتے ہیں۔ وہ ان کے بارے میں خود ہی غور وفکر کرتا ہے۔ ان کا تجزیہ کرتا ہے۔ اور اکثر یہ سوالات اسے فکر کے حیرت کدوں میں بھٹکاتے پھرتے ہیں۔ اس کے سامنے مادی دنیا کے مسائل سے زیادہ داخلی دنیا سے متعلق سوالات و مسائل کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ بکھرا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی کا اس حوالے سے کہنا ہے۔ ''ادیبوں نے پریشانیوں سے زیادہ حیرانیوں کے باعث خودکشی کا راستہ اختیار کیا''۔ ۳۹

یہاں ادیب کی سوچ کے حوالے سے جن حیرت کدوں کی بات ہوئی ہے۔ اسکا زیادہ تر تعلق اس کی قوتِ تخیل کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہی قوتِ تخیل ایک ادیب کو عام شخص سے مختلف اور منفرد بناتی ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان اس حوالے سے کہتے ہیں۔

> جینئس genious کو دنیا کسی اور ہی زاویے سے نظر آتی ہے۔ جینئس اور ایک عام شخص میں Imagination قوتِ تخیل کا فرق ہے۔ کولرج نے جس طرح کہا۔ کہ قوت تخیل چیزوں کو آپس میں ملاتی ہے۔ ان کے باہمی تضادات کو دور کرتی ہے۔ اسی طرح ولیم بلیک جو vision کا شاعر ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ عام شخص کو درخت ہرا نظر آئیگا۔ لیکن مجھے اس کی شاخوں میں فرشتے نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادیبوں میں قوتِ تخیل کے حوالے سے چیزوں کے، اشیاء کے زندگی اور موت کے معنی، مفاہیم ، حقائق اور مناظر کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ ۔[۴۰]

اس حوالے سے ادیبوں کی خودکشی کا ان کی قوتِ تخیل کے ساتھ ایک واضح رابطہ اور تعلق دکھائی دیتا ہے۔ الوارض کی اس ضمن میں رائے ہے۔ "...so for as literature was concerned, suicide has ceased to be imaginatively possible..." ۔[۴۱] یہ بات بہت حد تک درست ہے۔ کہ شعور و آگہی کا بھی اپنا ایک کرب ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس غور و فکر کو وہ تحریک ملتی ہے۔ کہ پھر اسرارِ حیات کا سرا پوری طرح پکڑا بھی نہیں جاتا۔ اور ہاتھ سے چھوٹ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس سے سلسلہ در سلسلہ اور دائرہ دائرہ رموز کائنات کے نئے نئے روزن اور دریچے وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ زندگی کیا ہے؟۔ اور موت کیا؟۔ یہ بہت بڑا سوال فکرِ انسانی کے لئے صرف چیلنج ہی نہیں بنا۔ بلکہ شعور و آگہی کی تپش و حدّت نے اس سوال کی قوتِ پرواز کو تیز سے تیز تر اور خوب سے خوب تر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور جب یہ اہل قلم طبقہ تشکیک و تفلسف کی بحرِ ظلمات سے ایمان وایقان کے آبِ حیات تک پوری طرح نہ پہنچ سکا۔ (اور جو واقعی اس حوالے سے کلی طور پر ممکن نہیں ہے)۔ تو خود اپنی ہی ذات اس کے لئے ایک معمہ بن گئی۔ مایوسی، الجھن، داخلی بے چینی اور لامحدود کو پانے کی کسک نے انہیں تلاش مرگ کے راستے پر ڈال دیا۔ کیونکہ یہی ایک راستہ تھا۔ جو ابھی کارزارِ حیات میں ان ادیبوں کے تجربے کی رسائی سے ماوراء تھا۔ شوپن ہار کا اس حوالے سے کہنا ہے۔

> Suicide may also regarded as an experiment, a question which man puts to nature, trying to force her to an answer. The question is this what change will death produce in a man's existence and in his insight into the nature of things...۔[۴۲]

ادیبوں کی خودکشی میں ان کے حددرجہ تفکر اور کثیر المطالعہ ہونے نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس ضمن میں چند ادیبوں کے نام قابل ذکر ہیں۔ ملتان کا جوانمرگ شاعر آنس معین جو اپنی شاعری میں موت کی حقیقت اور اس کی جستجو کا ایک فکری حوالہ رکھتا ہے۔ یہی فکری پروسس بعد میں اس کی خودکشی پر منتج ہوا۔ اس کے علاوہ شبیر شاہد اور شمس آغا کے نام اہم ہیں۔ دونوں شاعر تھے۔ اور دونوں کی عمریں بائیس سے چوبیس سال کے درمیان تھیں۔ ان کے ساتھ خودکشی کا عمل ان کی گمشدگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس بات کو ان شواہد سے تقویت ملتی ہے۔ کہ نہ تو انہیں معاشی مسائل درپیش تھے۔ اور نہ

زندگی کے کٹھن حالات اور دیگر مسائل و مصائب ان کے سامنے اس درجے پیش نظر تھے۔ کہ وہ خودکشی کا راستہ اختیار کرتے ۔اس کے برعکس انکا غور وفکر، علم، مطالعہ، فکر اور مشاہدہ عمر کے جتنے ماہ وسال وہ اسوقت تک گزار چکے تھے، کے حوالے سے نسبتاً زیادہ تھا۔ مگر بدقسمتی سے وہ تکمیل کے مراحل طے نہ کرسکا۔ اور ناپختہ کار سالک کی طرح سلوک کی منازل ادھوری رہ گئیں۔ ریاضت کے لئے عمل، صبر اور علم کو تجربے اور روحانی بیداری کی چنگاری کے ساتھ جذب وہم آہنگ کرنے کے تمام مرحلے نامکمل رہے۔ وہ تکمیل تو کیا تشکیل کی صورت بھی اختیار نہ کرسکے۔

Alwarez کا کہنا ہے۔

> I believe, a whole class of suicide... who take their own lives not in order to die but to escape confusion, to clear their heads. They delibrately use Suicide to creat an un numbered reality for themselves or to break trough the patterns of obsession and necessity which they have unwittingly imposed on their lives.-۴۳

Antonin Artond کا کہنا ہے۔ "If I commit suicide, it will not be to destroy myself but to put myself back together again."-۴۴ شمس آغا اور شبیر شاہد یہ دونوں نوجوان شاعر گمنامی کی نذر ہوئے۔ ان کی گمنامی کو خودکشی کا نام اس لیے دیا گیا ہے۔ کہ ان دونوں کی مختصر زندگی میں موت کا وجود، اسکا ذکر اور اس کے لئے ان کا تجسس ایک مرکز ومحور کی صورت رہا۔ دوست احباب کے ساتھ ان کی گفتگو کا زاویۂ نظر موت کی تلاش سے عبارت تھا۔ پھر اپنے فن میں بھی موت کے ساتھ ان کا گہرا رابطہ دکھائی دیتا ہے۔ اسکے علاوہ شمس آغا نے دوتین مرتبہ خودکشی کی کوشش کی تھی۔ مگر بچا لئے گئے۔ یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ لوگوں کی نظروں سے دور گم ہوجانا یا خودکشی کرلینا، ایک ایسا عمل ہے۔ جس میں ان ادیبوں نے اپنی خواہش مرگ کو پورے اطمینان سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اور اس بات کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ کہ دوسرے لوگ ان کو خودکشی کرتے ہوئے دیکھیں۔ یا انہیں خودکشی کرنے سے بچا لیا جائے۔ اس حوالے سے یہاں خواہش مرگ پورے تیقن اور تکمیل کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔

۱۳۔ کچھ ادیبوں کی اموات اس طرح سے وقوع پذیر ہوئیں۔ کہ بظاہر نہ تو ان کا خودکشی کا کوئی ارادہ تھا۔ اور نہ اس حوالے سے ان کا کوئی مخصوص طرزِ عمل اور طرزِ فکر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ان کی اموات کچھ ایسی جلد بازی، تیز رفتاری اور حادثاتی انداز میں ہوئیں۔ کہ ان کی موت کو حادثہ کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن اس حادثے کو ان ادیبوں کے مخصوص طرزِ حیات سے مماثل کیا جائے۔ تو جس بے خطری اور بے خوفی کیساتھ وہ موت سے ہمکنار ہوئے۔ شاید ان کی خواہش مرگ اور ان کا طرزِ زندگی ایسی ہی موت کا منتظر تھا۔ ان حالات میں انسان کے شعور کے ساتھ اسکا لاشعور کس طرح کام کرتا ہے۔ اور ان کے تحت الشعور میں کس قسم کی مہم جوئی کارفرما ہوتی ہے۔ یہ مباحث ادیبوں کی اس طرح کی اموات کے محرکات سے خارج از بحث نہیں کیے جاسکتے۔ صغیر ملال، اور پروین شاکر کی حادثاتی اموات اسی زمرے میں آتی ہے۔

پروین شاکر جو خود تیز رفتاری کے ساتھ گاڑی چلاتی تھیں۔ ناسازگار موسم میں بھی انکے کار چلانے کا طریقہ کار یہی ہوتا تھا۔ لیکن جس دن کار کے حادثے میں پروین کا انتقال ہوا۔ تو ان کی گاڑی اگرچہ انکا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ لیکن

جو بے خطری اور مہم جوئی پروین شاکر کی فطرت میں تھی۔ وہ اپنی عملی صورت میں ان کے ڈرائیور کے ہاتھوں اپنی تکمیل سے ہمکنار ہوئی۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا

> پروین شاکر کی کار اسکا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ پروین نے ہی اسے کار تیز چلانے کو کہا ہو۔ کیونکہ پروین شاکر خود بھی تیز رفتاری سے گاڑی چلاتی تھی۔ گاڑی کی تیز رفتاری دراصل Thrill کا احساس دلاتی ہے۔ پروین اس احساس کے ساتھ وابستہ نظر آتی ہے۔ اس تمام حوالے سے میں یہ کہوں گا۔ کہ انسانی ذہن جو کمپیوٹر کی طرح کام کرتا ہے۔ اور اسکا استعمال ابھی کم کم ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے۔ کہ اس کے زیادہ استعمال سے کوئی معجزہ ہو جائے۔ چنانچہ پروین شاکر کے حوالے سے بھی ممکن ہے کہ اسوقت پروین شاکر کی ذہنی کیفیت ڈرائیور کے اندر حلول کر گئی ہو۔ یا ڈرائیور کا ریموٹ کنٹرول پروین شاکر کے ہاتھ میں آ گیا ہو۔ ۔۴۵

بقول بانو قدسیہ

> خیال بہت طاقتور ہوتا ہے۔ خیال انسان کو لاشعور میں اسی طرح زندہ رکھتا ہے۔ جسطرح شعور میں۔ لہذا کبھی خیال میں یہ آ جائے۔ اور آتا رہے کہ اس کی کار کہیں ٹکرا جائے۔ کوئی حادثہ ہو جائے۔ تو پھر اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ ۔۴۶

اس ضمن میں جینکس کا day dreaming اپنے اندر بہت معنویت رکھتا ہے۔ خصوصاً موت کے حوالے سے اس کے لاشعور میں موت سے محبت، اس کی خواہش، جو موت کے ساتھ اس کے رومانس کی صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ اسے رفتہ رفتہ پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ بعض رومانوی طرز احساس کے حامل ادیبوں میں خاص طور پر یہ رویہ بہت نمایاں رہا۔ اور اس رویے کی شدت بعد میں ان کی جوانمرگی کی صورت ظاہر ہوئی۔

> The traditional combination of genius and melancholy... genious and premature death... keats died in 1821 at the age of twenty five, Shelley the next year at twenty nine, and when Byron died at thirty six, his brain and heart according to the post mortem, already showed symptoms of old age... the intense atom glows a moment, then is quenched in a most cold repose. That is from Adonais... the fullest and the most emphatic statement of the romantic belief that, for the poet, life itself is the real corruption...۔۴۷

کچھ ایسا ہی حوالہ اردو کے شاعر اور نثر نگار صغیر ملال کی موت کا بھی ہے۔ ان کے اہل خانہ اور احباب کے مطابق صغیر ملال کی موت غلط انجکشن لگنے کے باعث واقع ہوئی۔ لیکن چند تحقیقی نکات اس حوالے سے چونکاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ صغیر ملال کے اندر خواہش مرگ بے پناہ تھی۔ انہوں نے اسکا تذکرہ اپنے عزیز و اقارب سے بارہا کیا۔ کہ وہ ۴۰ چالیس سال

سے زائد عمر نہیں جئیں گے۔ اور پھر واقعی ان کی موت چالیس سال کے لگ بھگ ہوئی۔ اس ضمن میں بانو قدسیہ کی رائے بہت اہمیت کی حامل دکھائی دیتی ہے۔

> چالیس سال کی عمر بہت خطرناک ہوتی ہے۔ یہ پختگی کی عمر ہے۔ نبیوں پر وحی، الہام اور بشارتیں اسی عمر میں نازل ہوئیں۔ صغیر ملال کے ذہن میں جو خیال تھا۔ وہ اس خیال میں رہنے لگا تھا۔ اور خیال کبھی معمولی نہیں ہوتا۔ اور خیال کی پختگی بالآخر لاشعور سے شعور کی دنیا میں آ کر حقیقت بن جاتی ہے۔ ۴۸

یہ طریقہ کار ظاہر کرتا ہے۔ کہ شخصی وجود کے ظاہر اور باطن میں اس بلند درجے کی مفاہمت، ہم آہنگی اور تیقن پیدا ہو جائے۔ کہ پھر جو چیز، جو خیال یا ارادہ اس کے لاشعور میں موجود ہو۔ وہ عملی طور پر وقوع پذیر ہو جائے۔ کچھ اسی قسم کی بات بانو قدسیہ نے اپنے ناول ''راجہ گدھ'' میں لکھی ہے۔

> یہ جو لوگ حادثے میں مرتے ہیں۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔ کہیں اندر بہت اندر ان کے دل میں حادثے سے مرنے کی آرزو ہوتی ہے۔ کبھی نہ کبھی انہوں نے day dream کیا ہوتا ہے۔ حادثاتی موت کے متعلق۔۔۔ ۴۹

یہ day dreaming درحقیقت ہمارے اندر موجود وہ خواہشیں ہوتی ہیں۔ جن کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔ لیکن ہمارے لاشعور کا حصہ بنکر وہ ہمیشہ شعور کے ساتھ متصادم رہتی ہیں۔ اور اپنی تکمیل کا راستہ تلاش کرتی رہتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

> حادثاتی موت کے پیچھے ہمارے اندر کوئی نہ کوئی شدید، بھرپور اور ناقابل برداشت خواہش کروٹ لے رہی ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض اوقات لاشعور کی دنیا شعور کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ اور وہ خیال یا خواب، جس میں ہم رہ رہے ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت بن جاتا ہے۔ ۵۰

۱۴۔ خودکشی کرنے والے یا اپنے آپکو اذیت دیکر ختم کرنے والے ادیبوں کی عمر کا جہاں تک تعلق ہے۔ تو کم وبیش تمام ادیبوں نے ۲۲ سے ۴۵ سال کی عمر کے دوران خودکشی کی۔ سوائے ہیمنگ وے اور سیفو کے جن کی عمر خودکشی کے وقت ۵۰ سال سے زائد تھی۔ ادیبوں نے جوانی کے جس دور میں خودکشی کی عمر کے اس حصے میں جذبات کی شدت زوروں پر ہوتی ہے۔ ذہن ایسی صورت میں کوئی دلیل اور توجیہہ جلد قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ انسان کسی کام کے لئے اس شدتِ احساس کے ہاتھوں نہ تو کوئی خاص حکمت عملی اختیار کر سکتا ہے۔ اور نہ کسی منصوبہ بندی کے لئے وہ خود کو ذہنی طور پر تیار کر پاتا ہے۔ عمر کے اس حصے اور شدتِ جذبات کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا کا کہنا ہے۔

> جذبات دھند تخلیق کرتے ہیں۔ اس سے منظر صاف دکھائی نہیں دیتا۔ جب جذبات مدہم ہوتے ہیں۔ تو vision صاف ہو جاتا ہے۔ اس لیے زیادہ تر ادیبوں نے خودکشی ۵۰ سال کی عمر سے پہلے کی۔ ۵۱

گویا شدتِ جذبات کے سامنے جب دھند تھی۔ تو کچھ نظر نہ آنے کے باعث زندگی کے اس پار اترنے کی جلدی میں ادیبوں نے خودکشی کا راستہ تلاش کیا۔ یہاں ایک اور صورت بھی سامنے آتی ہے۔ کہ پچاس سال سے بہت کم عمر

میں ادیبوں کے خودکشی کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ اگر وہ قدرے زیادہ عمر میں خودکشی کریں گے۔ تو بہت ممکن ہے۔ کہ خودکشی کے عمل میں انہیں خود اپنے ہی ہاتھوں تاخیر ہو جائے۔ کیونکہ اسوقت تک جذبات میں اتنی شدت باقی نہیں رہتی۔ یا یہ ممکن ہے۔ کہ کہیں دوسرے انہیں خودکشی سے بچانے کیلئے کوئی لائحہ عمل اختیار نہ کریں۔ اس ضمن میں شمس آغا کا حوالہ موجود ہے۔ جو خودکشی کے ارادے اور اقدام خودکشی سے دو تین مرتبہ بچا لیے گئے تھے۔ لیکن آخر کار انہوں نے جلد ہی اپنے ارادے کو تکمیل دینے کا راستہ اختیار کیا۔

بقول ڈاکٹر انوار احمد

> ادیبوں کی زیادہ تر عہد شباب میں خودکشی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ انسان اس عمر میں عقل اور دلیل سے زیادہ جذبات کے زیر اثر ہوتا ہے۔ حقیقت کی بجائے خوابوں میں رہتا ہے۔ لہذا کسی درمیانی صورتِ حال کی بجائے وہ انتہا پسندی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ ۵۲

۱۵۔ بعض اوقات بعض ادیبوں کا مخصوص طرزِ زندگی جب ان کی حادثاتی موت سے ہمکنار ہوا۔ تو ان کی موت کے اسباب و محرکات ایک دوسرے میں غلط ملط ہو گئے۔ (خودکشی یا قتل)۔ ایسے ادیب جس طرح کی غیر محتاط اور آزاد خیالی کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ ان میں موت ہمیشہ دبے قدموں ان کی زندگی کی گھات میں لگی رہتی ہے۔ چنانچہ ایسے ادیبوں کی زندگی کا موت سے ہمکنار ہو جانا قتل ٹھہرے یا خودکشی۔ محرکات کم و بیش ایک سے رہتے ہیں۔ یعنی زندگی کو بے قاعدگی اور بے ضابطگی میں بسر کرنا اور اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہو جانا۔ مصطفٰے زیدی کی حادثاتی موت کا محرک یہی عوامل ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا اس حوالے سے کہنا ہے۔ ''ادیبوں میں خواہش مرگ کا ایک حوالہ یہ ہے۔ کہ جب قطرہ سمندر میں اترنے کا منتظر ہوتا ہے۔''۔۵۳ چنانچہ تلاش مرگ میں جلد بازی، بے چینی اور جذباتی شدتِ احساس نے ان ادیبوں کو گویا چشم زدن میں اس راستے پر ڈال دیا۔ کہ وہ ابدیت کے بحر بیکراں میں اتر گئے۔

۱۶۔ ادیبوں کی خودکشی کے محرکات میں ان کے آئیڈیلزم اور گلیمر کے عنصر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس حوالے سے ذہانت، حسن، جوانی اور خودکشی۔ ان چار عناصر نے ملکر خودکشی کے عمل کو گلیمرائز ڈ کیا ہے۔ یہاں یہ بات اہم ہے۔ کہ خودکشی کرنے والے ادیب خواہ ان کا تعلق کسی بھی معاشرے اور ادب سے ہو۔ وہ اپنے وقت کے اعلیٰ ادبی ایوارڈز سے بھی نوازے گئے۔ ان میں زیادہ تر لکھاری ذہنی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ پرکشش شخصیت کے بھی حامل تھے۔ ان دونوں عوامل کے علاوہ تیسری چیز جوان کے درمیان قدرے مشترک تھی۔ وہ ان سبکا عہد جوانی تھا۔ عہد جوانی از خود انسان کے دل و دماغ کی جولانی اور رعنائی کا زمانہ ہوتا ہے۔ ان میں انسان کی تخلیقی صلاحیتوں اور دیگر خوبیوں کو گویا پر لگ جاتے ہیں۔ انسان کی شخصیت و کردار میں رنگ بھرنے لگتے ہیں۔ یہ وہ مرحلہ عمر ہے۔ جہاں انسان سرتاپا جذبات ہوتا ہے۔ اور جذبات بھی وہ، جو عام انسان کے حوالے سے نہیں۔ بلکہ ایک دردمندی، حساس اور مخلص فنکار کے جذبات جو اس کی فکری سطح میں گھل مل کر عام و عامی سے جدا بناتے ہیں۔ ان تمام حوالوں کے فنکار جب خودکشی کے مرتکب ہوئے۔ تو ان کا یہ عمل اپنے اندر نہ صرف گلیمر لیکر آیا بلکہ وہ لکھاری دوسرے لوگوں اور خاص کر ادیبوں کے آئیڈیل بن گئے۔ خودکشی کے عمل میں چونکہ Short term action، میں جذباتی نوعیت کا ردعمل، اور سنسنی خیزی پائی جاتی ہے۔ ایسی سنسنی خیزی، جس میں موت کی

پوشیدہ حقیقت اور اس کی ابدی سچائی مضمر ہوتی ہے۔ چنانچہ خودکشی کے ان تمام اجزائے ترکیبی میں الگ الگ پہلو سے بھی دیکھیں۔ تو ان میں فوری طور پر کشش کا پہلو نظر آتا ہے۔ چنانچہ ایسا بھی ہوا۔ کہ خودکشی کرنے والے ادیب جب ان تمام حوالوں سے دوسرے ادیبوں کے ہیرو بن گئے۔ تو ان کو ہیرو بنا کر انہیں اسطرح اپنے لیے مثالی سمجھنا، کہ ان کے کردار اور قول و فعل کا ہر پہلو قابل تقلید دکھائی دینے لگے۔ اسطرح خودکشی کا حوالہ بھی ان کے یہاں لائق تحسین ٹھہرا۔ یہ صورتِ حال مرد لکھاریوں کی طرف سے خواتین اور خواتین لکھاریوں کی طرف سے مرد لکھاریوں کے لئے زیادہ دیکھنے میں آئی۔ اس ضمن میں اردو ادب کے حوالے سے دورِ حاضر کے کہانی نویس مظہر الاسلام کے یہاں خودکشی کے رجحانات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان رجحانات کے تحت کہیں تو مظہر الاسلام کا ایسا نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔ جو خودکشی کے لئے ان کی پسندیدگی کا مظہر ہے۔ اور کہیں کہانی کے اندر ان کا کوئی نہ کوئی کردار خودکشی کرتا ہوا، اور خودکشی کے عمل سے لذت محسوس کرتا نظر آتا ہے۔ خود مظہر الاسلام کی تحریروں میں اس بات کا واضح اظہار ملتا ہے۔ کہ انہوں نے خودکشی کے حوالے سے مغرب کے خودکشی کرنے والے ادیبوں کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''آج بھی خودکشی کرنے والی امریکی شاعرہ سلویا پلاتھ، این سیکسٹن اور سکینڈے نیویا کا ڈرامہ نگار ڈیگرمین میرے آئیڈیل ہیں جنہوں نے زندگی کے عروج کے دنوں میں خودکشی کر لی تھی۔''۔۵۴

یہاں یہ بات واضح رہے۔ کہ مظہر الاسلام نے یہاں ہیمنگ وے کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہیمنگ وے نے ساٹھ سال کی عمر میں خودکشی کی تھی۔ اس عمر میں ہیمنگ وے اپنی جوانمرگی کی سنسنی خیزی سے نکل چکے تھے۔ جبکہ سلویا پلاتھ، این سیکسٹن اور ڈیگرمین کا عالمِ شباب تھا۔ جب انہوں نے خودکشی کی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سہیل احمد خان کی رائے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ''یہ بات درست ہے۔ کہ خودکشی میں گلیمر کا پہلو جوانمرگی کے ساتھ وابستہ ہے۔''۔۵۵

مظہر الاسلام کے یہاں خودکشی کے ضمن میں بے پناہ گلیمر پایا جاتا ہے۔ شاید ہی ان کی کوئی کہانی ایسی ہو۔ جس میں ان کا کوئی کردار خواہشِ مرگ کی تکمیل یا خودکشی کرتا ہوا نظر نہ آتا ہو۔ اور بات ان کے صرف کرداروں کی خودکشی کی نہیں۔ بلکہ خودکشی کے ضمن میں مظہر الاسلام کا ناول ''محبت مردہ پھولوں کی سمفنی'' بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں انسان، پرندے، نباتات، جمادات، ہوائیں بادل، موسم، رنگ خوشبوئیں سب کے سب خواہشِ مرگ میں ڈوبے ہوئے اور خودکشی کرتے نظر آتے ہیں۔ مظہر الاسلام کی تحریروں میں خودکشی کا عمل پرندوں، خوشبوؤں، گیتوں، اداس نغموں، جدائی کی شاموں اور ساز و سُر کی لے سے اتنا گلیمرائز ڈ ہوا ہے۔ کہ جیسے خودکشی کرنا کسی عبادت و ریاضت کا جزو خاص ہے۔ یہاں خودکشی کا بیج محبت اور موت کے خالص پن سے جنم لیتا ہے۔ اسے ہم خالصتاً ایک ادبی نوعیت کی خودکشی کا محرک کہہ سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر مظہر الاسلام کے یہاں خودکشی پر مبنی نقطۂ نظر کے دو پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ ایک حیات بعد موت کی تلاش۔ اور دوسرا یہ کہ ایک جنم کے بعد کسی دوسرے جنم کی خواہش اور جستجو۔ اس طرح کبھی انسان پرندے اور کبھی پرندے انسانوں، پھولوں، موسموں اور ہواؤں کے ساتھ بہتی زندگی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ مظہر الاسلام کے ناول ''محبت مردہ پھولوں کی سمفنی'' سے چند حوالہ جات درج ذیل ہیں۔ جن سے مظہر الاسلام کے یہاں خودکشی کے حوالے سے بے پناہ گلیمر دکھائی دیتا ہے۔

جب شہر میں پھولوں کا یہ پُراسرار طوفان آیا ہوا تھا۔ تو اسوقت موت کی تیاری میں مسحور سلطان آدم اپنے فلیٹ کے کمرے میں خودکشی کر رہا تھا۔۔۔ جب وہ خودکشی کر چکا۔ اور

مردہ پرندوں، پھولوں اور تتلیوں کا کفن اوڑھ کر کسی شکستہ وائلن کی طرح خاموش ہو گیا۔ تو پھولوں کا یہ طوفان بھی تھم گیا۔ ۵۶

مظہر الاسلام کے یہاں خودکشی کا عمل موت کی شدید محبت اور اس کے خالص روپ کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہاں خودکشی اور موت کے حوالے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مثلاً ''دوسری بار اسے موت کو اسوقت چھونا پڑا تھا۔ جب وہ ایک فاختہ کے پروں میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔'' ۵۷ مظہر الاسلام کے یہاں موت سے رومانس کا حوالہ درحقیقت خودکشی کی طرف پیش قدمی کی ایک صورت بنتا ہے۔ خواہش مرگ کی شدت اور موت کے تصور کی خوبصورتی سے ہی خودکشی کو گلیمر کی فضا فراہم ہوتی ہے۔ مظہر الاسلام کے ایک کردار کے لئے خودکشی کا حوالہ اسطور سے دیا گیا ہے۔ ''آئیندہ موسم بہار میں پھولوں کے ایک طوفان میں موت کی محبت میں مبتلا ہو کر خودکشی کرے گا۔'' ۵۸ یہاں موسموں کی شدت دراصل جمالیاتی پہلو کے اندر شدید جذباتیت کا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ اور یہ انداز ایک ادیب کے یہاں ہی اپنے اصل اور خالص رنگ میں ظاہر ہوتا ہے۔ ''یہ موسم شاید پھر کبھی نہ آ سکے۔ اسکے خیال میں یہ موسم محبت اور خودکشی کے لیے انتہائی موزوں ہے۔'' ۵۹ موسم، موت، خودکشی، سفر، آغازِ سفر، یہ سب ایک زندگی سے دوسری زندگی اور ایک جنم سے دوسرے جنم کی طرف کوچ کرنے کے بہانے ہیں۔ ''میں موت کی شراب کے نشے میں مست ہو کر بے وفا ہوا کر جھکڑ میں اپنی روح کے وفادار گھوڑے پر سوار ہو کر نئی دنیا کے سفر پر روانہ ہونا چاہتا ہوں۔'' ۶۰

مظہر الاسلام نے جس زاویہ نگاہ سے خودکشی کی وضاحت اور جواز فراہم کیا ہے۔ اسے ایک ادیبانہ نقطہ نظر کی نزاکت اور صداقت کے باعث ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ''خودکشی کا رنگ ہی نہیں، اپنی مہک بھی ہوتی ہے۔۔۔ خودکشی ایک نشہ ہے۔ مدہوشی ہے۔ اس کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ ترنگ اور گرمجوشی ہوتی ہے۔ اپنی پیاس ہوتی ہے۔'' ۶۱ مندرجہ بالا تمام عوامل نشاندہی کرتے ہیں۔ کہ ادیبوں کے ہاں خودکشی نہ صرف ایک عام شخص کے ذہنی معیار سے جدا اور مختلف شئے ہے۔ بلکہ ادیبوں نے خودکشی کے عمل کو بھی جذبات و احساسات کا رنگ دیکر اسے جمالیاتی پیرہن عطا کیا ہے۔ ان عوامل سے اس بات کو تقویت ملتی ہے۔ کہ خودکشی کو گلیمرائز کرنے میں انسان کے عالم شباب اور اس کی شخصیت کی ذہنی و جسمانی خوبصورتی کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ اس کے بغیر خودکشی کے عمل سے گلیمر بھی نکل جاتا ہے۔ اور سنسنی خیزی بھی۔

جوانمرگی اور خودکشی کے حوالے سے جہاں تک گلیمر اور آئیڈیلزم کی بات ہے۔ تو اس ضمن میں اردو کے شاعر جون ایلیا کا ذکر بھی بہت اہم ہے۔ اس سے ایک ایسے نوجوان کا ذہن ہمارے سامنے آتا ہے۔ جو حقیقت کی بجائے شدت کے ساتھ تصوریت پسند، تخیل پرست اور رومانوی مزاج کا حامل تھا۔ جوانمرگی اور خودکشی کے ساتھ ایسے ہی اذہان وابستہ ہوئے ہیں۔ جون ایلیا نے اس حوالے سے لکھا ہے۔

> ''پلوٹینس نے ایک جگہ لکھا ہے۔ مجھے اس بات پر بہت ندامت ہے۔ کہ میں جسم میں ہو کر پایا جاتا ہوں'' میں بھی اس زمانے میں اسی احمق انداز میں سوچا کرتا تھا۔۔۔ ایک دن کا ذکر ہے۔ کہ لڑکی ہمارے گھر آئی، میں اسوقت کھانا کھا رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی فوراً لقمہ نگل لیا۔ محبوبہ کے سامنے لقمہ چبانے کا عمل مجھے انتہائی ناشائستہ، غیر جمالیاتی اور بے ہودہ محسوس ہوا تھا۔ میں اکثر یہ سوچ کر شرمندہ ہو جایا کرتا تھا۔ کہ وہ مجھے دیکھکر یہ سوچتی ہوگی۔ کہ میرے جسم میں، مجھ جیسے لطیف لڑکے کے جسم میں بھی

معدے جیسی کثیف اور غیر رومانی چیز پائی جاتی ہے۔ اگر آپ تاریخ کے کسی ہیرو کا مجسمہ دیکھ کر یہ سوچیں۔ کہ زندگی میں اس شخصیت کے جسم میں معدہ ہوگا۔ اور انتڑیاں بھی۔ تو آپکے ذہن کو دھچکا لگے گا یا نہیں؟ ۔۶۲

یہاں شدید مثالیت پسندی کا حامل ذہن اسطرح دکھائی دے رہا ہے۔ جیسے وہ خود کو دوسروں کے لئے آئیڈیل بناتے ہوئے مادی جسم کا ساتھ چھوڑ کر کسی ماورائی دنیا میں پہنچ گیا ہو۔ یا کسی دیوی اور دیوتا کا تصور وجود میں آجائے۔ جو صرف قابل پرستش ہو۔ اور کچھ نہیں۔ جون ایلیا اور ان جیسے نوجوان انقلاب اور ہیروازم کے حوالے سے خود اس لحاظ سے بھی آئیڈیلزم کا شکار تھے۔ کہ کسی جان لیوا بیماری کو اس طرح سے خوش آمدید کہا جائے۔ کہ پھر اس کی جوانمرگی واقعی اسے دوسروں کا ہیرو بنا سکے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ ابتداء میں تپِ دق کی بیماری میں ادیبوں کو بہت کشش نظر آتی تھی۔ کیونکہ اسوقت یہ مرض نا قابل علاج تھا۔ اور یقینی موت کا بہانہ بن جاتا تھا۔ لہذا اکثر ادیبوں کو جب یہ مرض لاحق ہوا ۔ تو انہوں نے نہ صرف اس مرض کے حوالے سے موت کے ساتھ رومانس کیا۔ بلکہ اس مرض کی اذیت میں ان کی خواہش مرگ کو بہت تقویت ملی۔ جون ایلیا اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

عام طور پر ذہین اور مفکر قسم کے انقلابی نوجوان اپنی شدتِ احساس اور بے بند و بار زندگی کے پنجے میں اپنی صحت ہار جاتے تھے۔ اور تپِ دق میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ وہ زمانہ تصوریت پسندی کا زمانہ تھا۔ جس کے سحر میں نوجوان ہی نہیں، من چلی لڑکیاں بھی مبتلا رہتی تھیں۔ اس زمانے میں باغی اور انقلابی نوجوان کھدر کا پاجامہ، کھدر کا کرتا اور چپل پہنتے تھے۔ ان کے بال بڑے بڑے اور الجھے ہوئے ہوتے تھے۔ ۔۶۳

جون ایلیا نے یہاں ایک ہیرو کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ وہ دراصل خود جون ایلیا کا سراپا ہے۔ جو انہوں نے اس ہیرو اور انٹی لیکچول کے حوالے سے اختیار کیا ہوا تھا۔ چنانچہ اپنی خواہش مرگ کو جون ایلیا تپِ دق جیسے جان لیوا مرض اور احساسِ جوانمرگی کے حوالے سے اس طرح بیان کرتے ہیں۔

تپ دق کی انقلابی بیماری ''جوانمرگی'' کی ایک جان پرور ضمانت تھی۔ میرا خیال یہ تھا۔ کہ صرف دائیں بازو کے کانگریسی، مسلم لیگی، احراری اور خاکسار نوجوان ہی طبعی عمر کو پہنچ کر وفات پانے کی ذلت برداشت کر سکتے ہیں۔ کوئی انقلابی نوجوان یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے جوانمرگی میں ایک عجب مرموز اور محزوں حسن محسوس ہوتا تھا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں عرفی کے حسن، اس کی قادر الکلامی اور اس کی جوانمرگی کا بہت ذکر ہوا کرتا تھا۔ ان تینوں چیزوں نے ملکر میری نظر میں عرفی کو جمال و کمال کا بے مثال مظہر بنا دیا تھا۔ میں بھی اس زمانے میں جوانمرگی کی شدید آرزو رکھتا تھا۔ میری یہ آرزو تو پوری نہ ہو سکی۔ مگر حسنِ اتفاق سے پاکستان آنے کے بعد مجھے دق میں مبتلا ہونے کی لذت نصیب ہوگئی۔ ۔۶۴

جون ایلیا کی خواہش مرگ جو اپنی انتہائی شدت کے ساتھ ان کی خودکشی سے متعلق ایک مخصوص رویے کی بھی عکاس تھی۔ اسکا اندازہ نہ صرف ان کی شاعری سے ہوتا ہے۔ بلکہ عام زندگی کے معاملات سے بھی اس بات کی نشاندہی

ہوتی ہے۔ کہ وہ خودکشی کے لئے باقاعدہ ایک سوچ، ذہن اور طرزِ عمل رکھتے تھے۔ اس ضمن میں جون ایلیا کے عزیز ڈاکٹر ہلال نقوی کا کہنا ہے۔

> جون ایلیا اکثر کہتے تھے۔ کہ زندگی کیا ہے۔ بالکل بے معنی، بکواس، اسے ختم ہو جانا چاہیے۔ اسکی کوئی اہمیت نہیں۔ اور حال یہ تھا۔ کہ آخری سانس تھے۔ اور ہسپتال نہیں جاتے تھے۔ نشہ کرتے تھے۔ اور خوراک کیا تھی۔ بس یہی کہ پانچ چھ کپ چائے پی لی۔ دو چار سگریٹ پیئے اور بس۔ اور یہ بات درست ہے۔ کہ ان کی گفتگو میں، رویے میں خودکشی کے عناصر تھے۔۔ ۶۵

ان تمام شواہد کی روشنی میں ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے اپنی جگہ خاص اہمیت کی حامل ہے۔

> ہماری سوسائٹی کی نشوونما کا عمل پیچیدہ رہا ہے۔ اس حوالے سے اس سوسائٹی کو ایک منظم معاشرے کے حوالے سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ کیونکہ ایک منظم معاشرے میں Complexes نہیں ہوتے۔ اس حوالے سے یہ درست ہے کہ ہم سب نے بہت حد تک مغربی اثرات لیے ہیں۔ اور ادیبوں میں یہ مغربی اثرات خودکشی کے حوالے سے بھی ممکن ہو سکتے ہیں۔۔ ۶۶

یہاں ان عوامل کی بہت واضح انداز میں نشاندہی ہوتی ہے۔ کہ اردو کے بعض ادیبوں نے غیر ملکی ادیبوں سے نہ صرف اثرات قبول کیے۔ بلکہ انہیں اپنے اندر موجود خواہش مرگ کی تکمیل میں اپنا آئیڈیل بنایا۔ اور خود بھی اس حوالے سے ایسا طرزِ عمل اختیار کیا۔ کہ دوسرے انہیں اپنا آئیڈیل بنائیں۔ گویا اس طریقہ کار سے ادیبوں نے جوانمرگی اور خودکشی کے گلیمر کو Promote بھی کیا۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان اس حوالے سے کہتے ہیں۔

> خودکشی کے حوالے سے مغرب کے اثرات ہمارے ادیبوں میں آئے ہیں۔ شبیر شاہد کو ہی لیں۔ ''ہرمن ہیے'' کی کتاب ''سدھارتھ'' کے مطالعہ نے شبیر کی زندگی ہی بدل ڈالی۔ اور وہ خودکشی یا کسی تجرباتی نوعیت کی مہم جوئی میں معدوم ہو گیا۔۔ ۶۷

جوانمرگی اور خودکشی کے عمل میں جو گلیمر پایا جاتا ہے۔ ادیبوں نے عموماً اس گلیمر کے ہاتھوں یا تو زندگی بھر ایسا رویہ اور طرزِ عمل اختیار کیا۔ جس میں جوانمرگی اور خودکشی کے لئے ان کے اندر پسندیدگی کا پہلو کروٹیں لیتا رہا۔ اور بعض نے اسی گلیمر کے ہاتھوں اپنی زندگی کے چراغ گل کر دیئے۔ یہ مخصوص طرزِ احساس اور طرزِ عمل ایک مخصوص رومانوی ذہن کا عکاس ہے۔ ادیبوں نے اس طرزِ احساس کے ہاتھوں مہلک اور جان لیوا بیماریوں کو بھی دل سے چاہا۔ ان کی خواہش کی۔ اور پھر ان بیماریوں کو خوش آمدید کہا۔ تپ دق کی بیماری کے لئے جون ایلیا اسی حوالے سے لکھتے ہیں۔ ''مجھے تپ دق کی بیماری بہت جمالیاتی، شاعرانہ، ہیروانہ اور انقلابی محسوس ہوتی تھی۔۔۔ اس زمانے میں باغی اور انقلابی نوجوان لڑکیوں کے ہیرو ہوتے تھے۔''۔ ۶۸

اور جہاں تک تپِ دق کے مرض کا تعلق ہے۔ تپ دق اور جوانمرگی کے حوالے سے ملکی اور عالمی سطح کے لکھاریوں میں کافکا، ایڈگر ائلن پو، سٹیفا رمے ملارمے، جون کیٹس، ڈی۔ ایچ لارنس، انگلستان کی ناول نگار دو بہنیں این برونٹی اور ایملی برونٹی کے علاوہ اردو ادب میں ساغر صدیقی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ خودکشی کے حوالے سے ادیبوں میں

آئیڈیل بننے اور بنانے کی ایک صورت یہ بھی رہی ہے۔ کہ ملکی سطح پر بھی خودکشی کرنے والے ادیبوں نے ایک دوسرے پر اثرات ڈالے۔ اور اس حوالے سے اثرات قبول بھی کیے۔ مثلاً ثروت حسین کے لئے احمد جاوید کا کہنا ہے۔

خودکشی بھی ٹرین کی طرح ان کو بہت Fascinate کرتی تھی۔ اسکا سبب ان کے لڑکپن میں پوشیدہ ہے۔ وہ نوجوان تھے۔ جب شکیب جلالی نے خودکشی کی۔ شکیب جلالی ان کے اولین Ideal تھے۔ ان کی زندگی میں بھی، شاعری میں بھی اور خاص طور پر شکیب کی شخصیت اور انجام ان کو بہت Fascinate کرتا تھا۔ قصہ مختصر ثروت حسین شکیب جلالی کو اپنا Ideal بنا چکے تھے۔ ۔۶۹

خودکشی کرنے والے ادیبوں کا ایک دوسرے سے اثر لینے اور متاثر ہونے کے ایک صورت یہ بھی ہے۔ کہ اردو ادب میں خودکشی کرنے والے کم و بیش تمام نمایاں ادیبوں نے ٹرین کے ذریعے خودکشی کی۔ بقول زاہد حسین بھٹی

شکیب جلالی، آنس معین، سارا شگفتہ، ثروت حسین، ان لوگوں نے تو ٹرین تلے آ کر خودکشی کی۔ ٹرین گویا ان کے لئے کوئی خوبصورت شہزادی تھی۔ جس کے بے رحم پہیوں تلے ان لوگوں نے ٹکروں کی صورت اپنے جسم کا نذرانہ پیش کیا۔ ۔۷۰

خودکشی کرنے والے ادیبوں نے موت کو جس طرح اور جس سطح پر گلے لگایا۔ ایک عام شخص موت کو اس سطح اور اس روپ میں کم کم ہی دیکھتا ہے۔ اس حوالے سے Daniel Stern کا کہنا بہت بجا ہے۔ "Suicides were the aristocrates of death." ۔۷۱ اردو ادب میں ادیبوں کا مغرب سے متاثر ہونے یا ان پر مغرب کے اثرات کا جہاں تک تعلق ہے۔ تو ان اثرات کا ایک حوالہ اس طرح سے بھی پیدا ہوا۔ کہ بعض ادیبوں نے اپنی باتوں میں، تحریروں میں، شاعری میں مغرب کے نامور ادیبوں کا ذکر اس طرح سے کیا ہے۔ کہ ان کا ذکر کرنے سے ادب اور ادیبوں میں وہ اعلیٰ پائے کے لکھاری، فلاسفر اور دانشور کہلائے جا سکیں۔ یہ بھی مغربی ادیبوں سے متاثر ہونے کی ایک منفرد صورتِ حال ہے۔ کہ ادیبوں نے مغربی ادب کو ایک اعلیٰ معیار سمجھ کر حقیقت میں نہ سہی، تصور ہی میں ان کی پیروی کی۔ ایسا کرنے سے ان کی ذاتی تسکین اور خود تشفی کا سامان بھی موجود تھا۔ کہ نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی ادب اور ادیبوں کے بارے میں ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اس ضمن میں سارا شگفتہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ وہ اپنی شاعری میں غیر ملکی ادیبوں اور فلاسفروں کا ذکر کچھ اس انداز سے کرتی ہیں۔

کاغذوں کے بھونکنے پر سارتر کے پاس گئی
تم راں بو اور فرائڈ سے بھی مل آئے ہو کیا
سیفو ! میری سیفو، میرابائی کی طرح مت بولو
میں سمجھ گئی، اب اس کی آنکھیں
کیٹس کی آنکھیں ہوئی جاتی ہیں ---
مجھے تنہا دیکھ کر
سارتر فرائڈ کے کمرے میں چلا گیا

وہ اپنی تھیوری سے گر گر پڑتا

غیر ملکی ادیبوں سے متعلق یہ حوالے ایک طرف سارا کی مخصوص ذہنی حالت اور اسکی تصوراتی جنت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف اکثر ادیبوں کی خاص فکری جہت کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ کہ بظاہر شعوری طور پر نہ سہی۔ لاشعوری طور پر ہم مغرب زدگی کا شکار ہیں۔ سارا شگفتہ نے جن مغربی ادیبوں کا ذکر کیا۔ وہ سب کے سب اپنے اپنے عہد کے نامور ادیب تھے جن کی فکر نے نہ صرف اپنے عہد کو بلکہ صدیوں پر محیط عالمی ادب کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ سارا کے سامنے ادب میں ناموری اور گلیمر کی تلاش تھی۔ وہ حقیقت میں تو اس تک رسائی نہ پا سکیں۔ جن تصورات کی دنیا میں وہ اس حوالے سے ذاتی تسکین اور شہرت کے لئے متجسس رہیں۔ کیونکہ حقائق بتاتے ہیں۔ کہ وہ شاعر، جس کی شاعری، اس کی عمر کے پچیس ویں برس شروع ہوئی۔ اور تیس برس کی عمر میں انہوں نے خودکشی کر لی۔ پانچ برس پر محیط شاعری میں وسعت، گہرائی اور گیرائی کا فقدان کیونکر نہ ہوتا۔ وہ شاعرہ سے زیادہ معاشرے کی ایک دکھی، مظلوم اور اخلاقی بے راہ روی کا شکار تنہا عورت تھی۔ جو اپنی مختصر زندگی میں اپنے ہونے کا کرب جھیلتی رہیں۔ پیٹ کی بھوک مٹانے اور سر چھپانے کے لئے انہیں کوئی ٹھکانہ نہ ملا۔ مایوسی اور بے کسی انہیں ہر ہر لحہ دامنگیر رہی۔ خودکشی سے پہلے ان کی کئی ناکام خودکشیاں ظاہر کرتی ہیں۔ کہ وہ زندگی سے کتنی بیزار اور متنفر تھیں۔ اسکے ساتھ ساتھ کئی ناکام شادیوں کے حادثات اور اپنے بچوں سے دوری کا کرب سم قاتل بنکر ان کے اندر اترتا رہا۔ ان حالات میں کیسے اور کیونکر ممکن تھا۔ کہ وہ عالمی ادب اور ادیبوں کے حوالے سے کچھ پڑھتیں اور فلسفے بگھارتیں۔ یہ محض سنے سنائے نام، لفظ اور جملے تھے۔ جو ان کی زندگی میں لمحاتی طور پر ہی سہی۔ سارا کو اس کے ہونے کی تسلی اور سہارا دیتے تھے۔ اس صورتِ حال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اردو ادب میں بعض ادیبوں کی مخصوص ذہنی اور فکری حالت ایک بے بنیاد بات کو حقیقت کے طور پر گھڑ سکتی ہے۔ تو غیر ملکی ادیبوں میں جو خودکشی کا ایک نمایاں رجحان رہا۔ اس کے اثر سے یہ ادیب کیسے بچ سکتے تھے۔ ''آئیڈیل بننے'' اور ''آئیڈیل بنانے'' کے شوق میں خودکشی کرنا اس حوالے سے کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہو سکتی۔

اس ضمن میں ادیبوں کا ایک طریقہ کار یہ بھی رہا ہے۔ کہ خودکشی کے حوالے سے انسان کے ایک ایسے رویے کا تجزیہ کیا جائے۔ جس سے معلوم ہو سکے۔ کہ زندگی کو انسان ''کہاں تک'' ''کیسے'' اور ''کیونکر'' برداشت کر سکتا ہے۔ مثلاً

> Donne's attitude to suicide... it was an act of self-conscious nobility proceeding from a pholisophy of life which judge what was bearable and what was not ...-۷۲

خودکشی کے حوالے سے ادیبوں کی یہ سوچ دراصل زندگی کی فلاسفی کو سمجھنے اور برتنے کی ایک کوشش بھی کہی جا سکتی ہے۔ مندرجہ ذیل تمام عوامل اور تحقیقی شواہد سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ ''ادیبوں میں خودکشی کے محرکات'' کا جہاں تک تعلق ہے۔ تو ان محرکات کا جائزہ بہت حد تک ادب کی اپنی اقدار (values) اور مزاج کے باعث ممکن ہے۔ ادیب سماج کا حساس طبقہ ہونے کے ناطے اپنی زندگی اور زندگی سے متعلق اپنے تمام رویوں میں عام شخص سے مختلف ہوتا ہے۔ لہذا ایک ادیب کی خودکشی کے محرکات بھی عام شخص کی خودکشی سے بہت حد تک مختلف اور منفرد ہوتے ہیں۔ یہ محرکات اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنے ہی حساس ہوتے ہیں۔ جتنے ادیب کے اندر کی دنیا۔ جس طرح ادیب کی داخلی دنیا کے افق کا احاطہ ممکن

نہیں ہے۔ اسی طرح ادیب کی خودکشی کے محرکات کی سمتیں اور اس کے افق بھی ہمہ جہت ہیں۔ بقول ڈاکٹر وحید قریشی

> ادیب کی خودکشی کے محرکات کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں ادب کی حساس دنیا سے گزرنا اور اس کی حساس اقدار کو سامنے رکھنا ہوگا۔ کیونکہ ایک عام شخص کی سائیکی کی بنیاد پر ہم ادب اور ادیب کی سائیکی کو نہیں پرکھ سکتے۔ ۷۳

ڈاکٹر وحید قریشی کی اس رائے کو اگر ہم پیش نظر رکھیں۔ تو ادیب کی خودکشی کے محرکات میں عام شخص کی خودکشی کا ایک ہی نمایاں محرک قدرِ مشترک کے طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ ہے زندگی کے معاشی مسائل۔ لیکن معاشی مسائل سے ہٹ کر ادیبوں نے جن بنیادی عوامل کے باعث خودکشیاں کیں۔ ان میں ان کی تخلیقی اور فطری ذہانت نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ جس طرح ہر شئے کی زیادتی توازن اور اعتدال کو بگاڑ دیتی ہے۔ اس طرح حد سے بڑھا ہوا انٹی لیکٹ، علم، شعور و آگہی اور غور و فکر کا مادہ خودکشی کرنے والے ادیبوں کو ان دیکھے جہانوں کے اسرار کی جانب کھینچتا چلا گیا۔ مادے کی دنیا سے پرے ان کی تخیل کی اڑانوں نے نئی دنیاؤں کی دید اور جستجو میں اپنی زندگی کے عارضی اور مادی خول سے نکلنے کیلئے خودکشی کا راستہ اختیار کیا۔ اس کے باعث ان ادیبوں نے خود کو دوسروں سے مختلف سمجھا۔ اور ایک مختلف طرزِ حیات اختیار کرتے ہوئے۔ وہ ان سرمدی ذہانتوں اور صداقتوں کی تلاش میں سرگرداں ہوئے۔ جسکا متحمل انکا مادی وجود نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی رویے نے ان کے ساتھ نئے نئے آئیڈیلز تراشے۔ عشق، خواب، تخیل، جستجو اور بے یقینی کی بدگمانیوں سے نکلنے کی آرزو انہیں یقین کے آبِ حیات تک پہنچنے کے لئے بے قرار کرتی چلی گئی۔ جذبوں کی اس نزاکت نے انہیں عملی زندگی میں بھی اتنا نازک خیال بنا دیا۔ کہ وہ خود کو سماج میں اجنبی تصور کرنے لگے۔ اس پس منظر میں ''یہ دنیا'' ان کی دنیا نہیں تھی۔ سماج میں بکھرے ہوئے مکر، فریب، خود غرضی، نفسا نفسی اور مفاد پرستی کے سائے انہیں تمام رشتوں اور سماجی بندھنوں سے آزاد کرتے گئے۔ ان ادیبوں کی غیر مطمئن فطرت اپنے مادی وجود میں بے کل رہی۔ ایسی صورت میں ان کے سامنے موت اور صرف موت کی طلب پیدا ہوئی۔ یہ طلب زندگی کی تلخیوں سے محض فرار نہیں تھا۔ بلکہ خود کو حیاتِ دائمی کے بحرِ بیکراں میں گم کر دینے کی خواہش بھی انہیں ایک نئے تجربے سے ہم آہنگ کر رہی تھی۔ اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کی یہ ایک سعی پیہم تھی۔ اسی جذبے کی سرشاری انہیں ''اس دنیا'' سے ''اس دنیا'' کی طرف کھینچ لے گئی۔ یہ وہ عوامل ہیں۔ جو بلا تخصیص ملکی اور غیر ملکی ادیبوں کی خودکشی کا محرک بنے۔ کیونکہ ادب اور ادیب جغرافیائی حد بندیوں میں مقید نہیں ہوتے۔ ان کی فطرت، ان کا طرزِ احساس اور زندگی کے ساتھ ساتھ موت سے متعلق ان کا رویہ کم و بیش ایک سا ہوتا ہے۔ البتہ جہاں تک اردو ادب کے خودکشی کرنے والے ادیبوں کا خصوصی حوالہ ہے۔ تو ان میں سے بعض ادیبوں نے اپنی فطری ذہانت، علم اور فکر و تدبر کے ساتھ ساتھ عالمی سطح کے ادیبوں کے ایسے رویے اور اثرات قبول کیے۔ جو بالآخر ان کی خودکشی اور اقدامِ خودکشی پر منتج ہوئے۔

حوالہ جات

۱۔ جون ایلیا، شاید، الحمد پبلیکیشنز، رانا چیمبرز، انارکلی، لاہور، اشاعت ہفتم، ۱۹۹۸ء، ص ۲۶
۲۔ بانو قدسیہ، راقمہ سے ملاقات، ۲۲ جولائی، ۲۰۰۶ء، لاہور
۳۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۱ جولائی، ۲۰۰۶ء، لاہور
۴۔ ایضاً
۵۔ Alvarez Al, The Savage God, A Study of Suicide, P, 118.
۶۔ فتح محمد ملک، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۲۹ جولائی، ۲۰۰۵ء، اسلام آباد
۷۔ عبدالکریم خالد، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶ء، لاہور
۸۔ مظہر الاسلام، دیباچہ، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۲
۹۔ Alvarez Al, The Savage God, A Study of Suicide, P, 132.
۱۰۔ Ibid
۱۱۔ مظہر الاسلام، انٹرویو، اخبار خواتین، ۲۴ فروری تا یکم مارچ، ۱۹۸۸ء، ص ۲۶، ۲۷
۱۲۔ عبدالکریم خالد، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶ء، لاہور
۱۳۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶ء، لاہور
۱۴۔ Alvarez Al, The Savage God, P, 104.
۱۵۔ بحوالہ یونس ادیب، ساغر صدیقی، شخصیت، فن اور کلام، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ادبی مارکیٹ، لاہور، س ن، ص ۲۰
۱۶۔ ایضاً، ص ۹۸
۱۷۔ Alvarez Al, The Savage God, P, 108
۱۸۔ Young C.G., Modern Man in Search of a Soul, Translated by W.S. Dell and Cary F. Baynes, Routledge & Kegan Paul, London and Henley, Reprinted, 1981, P, 177.
۱۹۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۲ جولائی، ۲۰۰۶ء، لاہور

۲۰۔ Alvarez Al, The Savage God, A Study of Suicide, P, 119.

۲۱۔ وحید قریشی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۰ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۲۲۔ بحوالہ یونس ادیب، ساغر صدیقی، شخصیت، فن اور کلام، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلیشرز ادبی مارکیٹ، لاہور، س ن ص، ۳۲

۲۳۔ Alvarez Al, The Savage God, A Study of Suicide, P, 161.

۲۴۔ فتح محمد ملک، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۳۰ جولائی، ۲۰۰۵، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

۲۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر رشید امجد سے گفتگو، قرۃ العین طاہرہ، مشمولہ "ست رنگے پرندے کے تعاقب میں، ص، ۱۳۷، ۱۵۰

۲۶۔ وحید قریشی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۰ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۲۷۔ مسعود اشعر، راقمہ سے گفتگو، ۲۱ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۲۸۔ عبدالکریم خالد، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۲۹۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۳۰۔ احمد ہمیش، بحوالہ زاہد حسین بھٹی، کاندھے پہ دھرے ساز (ثروت حسین اور فن) غالب نما، الیف۔اے/10، وحدت کالونی، لاہور، الحسن پبلیکیشنز، ۲۵۳، الیف رحمان پورہ، لاہور، اکتوبر، ۱۹۹۸، ص، ۵۷

۳۱۔ زاہد حسین بھٹی، کاندے پہ دھرے ساز، (ثروت حسین شخصیت اور فن) غالب نما۔ الیف۔اے/10، وحدت کالونی، لاہور، الحسن پبلیکیشنز، ۲۵۳، الیف رحمان پورہ، لاہور، اکتوبر، ۱۹۹۸، ص، ۵۷، ۶۰

۳۲۔ عبدالکریم خالد، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۳۳۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۳۴۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۱ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۳۵۔ بانو قدسیہ، راقمہ سے گفتگو، ۲۲ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۳۶۔ یونس ادیب، ساغر صدیقی، شخصیت فن اور کلام، ص، ۲۵

۳۷۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۳۸۔ عبدالکریم خالد، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۳۹۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۴۰۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۲ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

۴۱۔ Alvarez Al, The Savage God, A Study of Suicide, P, 196.

۴۲۔ Schopenhauer, on Suicide,

Notes:

i) Hist Nat. Lib. XXVIII ch. 1

ii) Loc.cit.Lib.ch.7.

iii) Valerius maximum; hist. Lib. 11.ch.6,secs. 7et.8.
Heraclides pointicus, fragmenta de rebus publicis, ix.
Aellami variae historia, 111, 37. starabo; Lib; x, ch. 5,6.

iv) Eth. Nichom; V,15.

v) Stobaeus, Ecl. Eth. 11, Ch. 7, PP. 286, 312.

vi) Tradhuit par st. Julien, 1834.

vii) See my treatise on the foundation of morals, Sec. 5.
viii) Essays on suicide and the immorality of the soul, by the Late David Hume, Basle, 1799, Sold by James Decker. Return to Suicide & Philosophy # 5, 484.

۴۳۔ Alvarez Al, The Savage God, A Study of Suicide, P, 154.
۴۴۔ Ibid, P, 153.
۴۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۶ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۴۶۔ بانو قدسیہ، راقمہ سے گفتگو، ۲۲ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۴۷۔ Alvarez Al, The Savage God, A Study of Suicide, P, 225.
۴۸۔ بانو قدسیہ، راقمہ سے گفتگو، ۲۲ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۴۹۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۲واں ایڈیشن ۲۰۰۵، ص، ۱۷۷
۵۰۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۱ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۵۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۶ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۵۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۲ دسمبر، ۲۰۰۵، ملتان
۵۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۶ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۵۴۔ مظہر الاسلام، دیباچہ، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۲
۵۵۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۲ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۵۶۔ مظہر الاسلام، ناول، محبت، مردہ پھولوں کی سمفنی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، باردوم، ۱۹۹۹، ص، ۳۴، ۳۵
۵۷۔ ایضاً، ص، ۳۷
۵۸۔ ایضاً، ص، ۵۴
۵۹۔ ایضاً، ص، ۵۸
۶۰۔ ایضاً
۶۱۔ ایضاً، ص، ۷۵
۶۲۔ جون ایلیاء، شاید، الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، اشاعت ہفتم، انارکلی، لاہور، ۱۹۹۸، ص، ۱۸
۶۳۔ ایضاً، ص، ۱۹
۶۴۔ جون ایلیا، ایضاً، ص، ۱۹
۶۵۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر راقمہ سے گفتگو، ۱۴ اگست، ۲۰۰۶، کراچی
۶۶۔ وحید قریشی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۰ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۶۷۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۲ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۶۸۔ جون ایلیا، الحمد پبلی کیشنز، اشاعت ہفتم، انارکلی، لاہور، ۱۹۹۸، ص، ۱۹
۶۹۔ بحوالہ ”کاندھے پہ دھرے ساز، از زاہد حسین بھٹی، ص، ۶۱
۷۰۔ ایضاً، ص، ۶۲
۷۱۔ Alvarez Al, The Savage God, A Study of Suicide, P, 163.
۷۲۔ Ibid, P, 179.
۷۳۔ وحید قریشی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۰ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور

کتابیات

(ا)۔ کتب

۱۔ اقبال، علامہ محمد کلیاتِ اقبال، اُردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ادبی مارکیٹ، انارکلی، لاہور، اشاعت چہارم، ۱۹۹۹ء

۲۔ ابن حنیف، دنیا کا قدیم ترین ادب، دوسرا ایڈیشن، بیکن پبلی کیشنز، ملتان، ۱۹۸۷ء

۳۔ احمد سلیم (مرتب) مردہ آنکھیں زندہ ہاتھ، نگارشات لاہور، میاں چیمبرز، ۳ ٹیمپل روڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء

۴۔ ابوسعید نورالدین، اسلامی تصوف اور اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۷۷ء

۵۔ اشفاق حسین (مرتب) فیض کے مغربی حوالے، جنگ پبلشرز پریس، ۱۹۹۲ء

۶۔ اشرف قدسی (مرتب)، المرحوم، پنج پبلی کیشنز، لاہور، باراول، ۱۹۷۲ء

۷۔ انعام الرحمٰن سحری، خودکشی (ایک مکمل مطالعہ) سنگ میل، پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء

۹۔ امریتا پریتم (مرتب) سارا شگفتہ، ایک تھی سارا، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ، لاہور، ۱۹۹۴ء

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، طبع چہارم، ۱۹۹۹ء

۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر ادیبانِ رفتہ، ۴۲، دی مال، لاہور، س ن

۱۲۔ انور سدید، ڈاکٹر اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ پریس، لاہور، ۱۹۹۱ء

۱۳۔ انیس ناگی، ڈاکٹر میراجی ایک بھٹکا ہوا شاعر، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، اقبال پرنٹرز، ۱۹۹۱ء

۱۴۔ انیس ناگی، ڈاکٹر سعادت حسن منٹو، جمالیات، لاہور، ۱۹۸۴ء

۱۵۔ انیس ناگی، ڈاکٹر نیا شعری افق، عالمی پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۶۔ اوپندر ناتھ اشک، منٹو میرا دشمن، مکتبہ اردو، لاہور، س ن

۱۷۔ اطہر پرویز، ڈاکٹر (مرتب) منٹو کے بہترین افسانے، چودھری اکیڈیمی، لاہور، س ن

۱۸۔ ایس ایم اختر، ڈاکٹر مولانا غلام رسول مہر، (مترجم)، عظماء کے معاشی نظریات، از جارج سول، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۰ء

۱۹۔ باقر نقوی، خلیے کی دنیا، جینیات، کلوننگ اور انسانی جینوم، اردو سائنس بورڈ، کوہستان انٹرپرائزز، ۲۹۹، اپر مال، لاہور، ۲۰۰۲ء

۲۰۔ بانو قدسیہ، راجہ گِدھ، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۲واں ایڈیشن، لاہور، ۲۰۰۵ء

۲۱۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر تنقیدی مطالعے، نذیر سنز، پبلشرز، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۶ء

۲۲۔ بلیغ الدین جاوید، ڈاکٹر کلیاتِ ساغر صدیقی، مقبول اکیڈیمی، انارکلی لاہور، ۱۹۹۸ء

۲۳۔ ثروت حسین، آدھے سیارے پر، قوسین، لاہور، ۱۹۸۷ء

۲۴۔ جون ایلیاء، شاید، الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، انار کلی لاہور، اشاعت ہفتم، ۱۹۹۸ء

۲۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر میراجی ایک مطالعہ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء

۲۶۔ حسن رضوی، ڈاکٹر وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر، ناصر کاظمی (شخصیت و فن) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء

۲۷۔ حمید نسیم، پانچ جدید شاعر، فضل سنز، پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۹۹۴ء

۲۸۔ خان فضل الرحمٰن، میراجی، (ناول) مکتبہ میری لائبریری، شاد سنٹر پریس، لاہور، باراول، ۱۹۸۹ء

۲۹۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر (مترجم) تاریخ فلسفہ، از الفرڈ ویبر، جامعہ عثمانیہ، دکن، ۱۹۲۸ء

۳۰۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر (مترجم) نفسیات و وارداتِ روحانی، از ولیم جیمز، مجلس ترقیِ ادب، طبع دوم، لاہور، ۱۹۶۵ء

۳۱۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر (مترجم) تاریخ فلسفہ جدید، از ڈاکٹر ہیرلڈ ہونڈنگ، نفیس اکیڈیمی، اُردو بازار، کراچی، طبع اول، ۱۹۸۷ء

۳۲۔ رشید امجد، ڈاکٹر بیزار آدم کے بیٹے، دستاویز پبلشرز، راولپنڈی، ۱۹۷۴ء

۳۳۔ رشید امجد، ڈاکٹر سہ پہر کی خزاں، دستاویز پبلشرز، راولپنڈی، ۱۹۸۰ء

۳۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر پت جھڑ میں خود کلامی، اثبات پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۸۴ء

۳۵۔ رشید امجد، ڈاکٹر دشتِ خواب، مقبول اکیڈیمی، لاہور، ۱۹۹۳ء

۳۶۔ رائے شیو موہن لال ماتھر (مترجم)، تاریخ ہندی فلسفہ، جلد اول، از گپتا ایس۔این ڈاکٹر، جامعہ عثمانیہ دکن، ۱۹۴۴ء

۳۷۔ رئیس امروہوی، نفسیات و مابعد النفسیات، فرید پبلشرز، اُردو بازار، کراچی، س ن

۳۸۔ زاہد حسین بھٹی، کاندھے پہ دھرے ساز، الحسن پبلی کیشنز، ۳۵۳ ایف، رحمان پورہ، لاہور، ۱۹۹۸ء

۳۹۔ سارا شگفتہ، آنکھیں، فکشن ہاؤس، ۱۸ مزنگ روڈ، لاہور، ۱۹۹۷ء

۴۰۔ سلطان علی رشید، ڈاکٹر (مترجم) ابتدائی فلسفہ، از جان ہاسپرس، المطبۃ العربیہ، ۱۹۹۸ء

۴۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر ادب اور لاشعور، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۶ء

۴۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر (مرتب) منٹو کے نمائندہ افسانے، مکتبہ جدید علم و فن، لاہور، طبع اول، ۱۹۸۴ء

۴۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر نفسیاتی تنقید، مجلس ترقیِ ادب، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۸۶ء

۴۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر افسانہ اور افسانہ نگار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء

۴۵۔ شہزاد احمد، فرائڈ کی نفسیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء

۴۶۔ شہزاد احمد، وجودی نفسیات پر ایک نظر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء

۴۷۔ شبلی نعمانی، علامہ شعر العجم، جلد دوم، اعظم گڑھ، ۱۹۴۷ء

۴۸۔ شیما مجید (مرتب) ادبی مذاکرے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

۴۹۔ شیما مجید (مرتب) مقالات، ن۔م۔راشد، الحمرا پبلشنگ ہاؤس، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء

۵۰۔ شگفتہ افتخار، ایک انتخاب، عالمی ادب، اکادمی بازیافت، کراچی، اشاعت اول، ۲۰۰۱ء
۵۱۔ شمشیر حیدر، نوید الحسن (مرتب) (سعادت حسن منٹو، پچاس برس بعد) شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، سویرا آرٹ پریس، لاہور، باراول، ۲۰۰۵ء
۵۲۔ صلاح الدین درویش، اُردو افسانے کے جنسی رجحانات، نگارشات، لاہور، طبع اول، ۱۹۹۹ء
۵۳۔ صفی حیدر دانش، سید، تصوف اور اُردو شاعری، سندھ ساگر اکیڈیمی، لاہور، ۱۹۴۸ء
۵۴۔ صغیر ملال، اختلاف، نروان پبلشرز، نفیس اکیڈیمی، ۱۹۸۱ء
۵۵۔ صغیر ملال، انگلیوں پر گنتی کا زمانہ، فیروز سنز، کراچی، ۱۹۸۳ء
۵۶۔ صغیر ملال، بیسویں صدی کے شاہکار افسانے (ترجمہ وتبصرہ) ویلکم بک پورٹ، (پرائیویٹ) لمیٹڈ، فضل سنز، کراچی، ۱۹۹۱ء
۵۷۔ ضیاء الحسن (مرتب) گمشدہ ستارہ، شبیر شاہد، اظہار سنز، اُردو بازار، لاہور، ۲۰۰۲ء
۵۸۔ ضیاء الدین احمد برنی، اقبال از عطیہ بیگم، اقبال اکادمی، پاکستان، میکلوڈ روڈ، لاہور، بارسوم، ۱۹۸۱ء
۵۹۔ طاہر تونسوی، اقبال اور مشاہیر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء
۶۰۔ ظہور الدین احمد، ڈاکٹر نیا ایرانی ادب، ناشر، ضیائی ادب، لاہور، ۱۹۹۰ء
۶۱۔ ظہیر کاشمیری، ادب کے مادی نظریات، کمال پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۵ء
۶۲۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر تنقیدی زاویے، مکتبہ اُردو، لاہور، ۱۹۵۱ء
۶۳۔ عابد علی عابد، سید (مترجم) داستانِ فلسفہ، جلیل القدر فلسفیوں کے سوانح وافکار، تالیف، ازوِل ڈیورنٹ، فکشن ہاؤس ۱۸ مزنگ روڈ، لاہور، ۱۹۹۵ء
۶۴۔ عبدالرؤف ملک، مغرب کے عظیم فلسفی، پاکستان ٹائمز پریس، لاہور، باراول، ۱۹۶۴ء
۶۵۔ عبدالسلام ندوی، مولانا (مرتب) امام رازی، منزہ پرنٹنگ کارپوریشن، اسلام آباد، طبع اول، ۱۹۹۳ء
۶۶۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر پاکستانی ادب، بک ٹاک، لاہور، طبع اول، ۱۹۹۵ء
۶۷۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر پاکستانی ادب، ۱۹۴۷ء سے تا حال، بک ٹاک میاں چیمبرز، ۳ ٹیمپل روڈ، لاہور، ۱۹۹۵ء
۶۸۔ غلام رسول چودھری، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، علمی کتب خانہ، اُردو بازار، لاہور، س ن
۶۹۔ غلام رسول مہر، مولانا (مترجم) ذہن انسانی کا ارتقاء، از جے۔ ایچ۔ جونیئر، مؤسسہ مطبوعات، فرینکلن، پوسٹ بکس، ۳۶۹، لاہور، س ن
۷۰۔ فرید احمد (مرتب) (منٹو فن وشخصیت) پنجاب بک ہاؤس، اُردو بازار، کراچی، اشاعت اول، ۱۹۹۵ء
۷۱۔ لطیف اللہ پروفیسر، تصوف اور سریت، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، مکتبہ جدید پریس، ۲ کلب روڈ، لاہور، طبع اول، ۱۹۹۰ء
۷۲۔ مرزا ادیب (مرتب)، اندھیرے کے جگنو، از شمس آغا، جنگ پبلشرز، اشاعت اول، ۱۹۹۲ء
۷۳۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر مصطفےٰ زیدی کی کہانی، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ، ۲۵ لوئر مال، لاہور، اشاعت اول،

۱۹۹۳ء
۷۴۔ ممتاز حسین، ادب اور شعور، اُردو اکیڈیمی، سندھ، کراچی، ۱۹۶۱ء
۷۵۔ ممتاز شیریں، منٹو نوری نہ ناری، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۵ء
۷۶۔ ممتاز شیریں، معیار، نیا ادارہ، سویرا آرٹ، ۱۹۶۳ء
۷۷۔ ممتاز مفتی، اور اوکھے لوگ، مکان نمبر ۲۲، گلی نمبر ۳۲، سیکٹر ایف، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء
۷۸۔ محمد تقی، سیّد رُوح اور فلسفہ، مطبع ندارد، ۱۹۶۴ء
۷۹۔ محمد حسن، ڈاکٹر جدید اُردو ادب، مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی، ۱۹۷۵ء
۸۰۔ محمد حسن، ڈاکٹر اُردو ادب میں رومانوی تحریک، کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۸۶ء
۸۱۔ محمد زکریا خواجہ، ڈاکٹر (مرتب)، روشنی کی جستجو، علاؤالدین کلیم، عمر پبلشرز، میاں مارکیٹ، لاہور، بار اول، ۱۹۹۶ء
۸۲۔ محمود علی سڈنی، فلسفہ، سائنس اور کائنات، المطبۃ العربیہ، لاہور، ۱۹۹۵ء
۸۳۔ مصطفٰے زیدی، زنجیریں، سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہٰ آباد (بھارت) طبع اول، ۱۹۴۷ء
۸۴۔ مصطفٰے زیدی، روشنی، مکتبہٗ جدید، لاہور، (پاکستان) طبع دوم، ۱۹۶۰ء
۸۵۔ مصطفٰے زیدی، گریبان، مکتبہ جدید، لاہور، (پاکستان) طبع اول، ۱۹۶۴ء
۸۶۔ مصطفٰے زیدی، کوہ ندا، الحمد پبلیکیشنز، پرانی انارکلی، مکتبہ شرکت پریس، لاہور، ۱۹۹۸ء
۸۷۔ مصطفٰے زیدی، موج میری صدف صدف، پرانی انارکلی، مکتبہ شرکت پریس، لاہور، ۱۹۹۸ء
۸۸۔ مصطفٰے زیدی، قبائے ساز، ناشر، بہرام خان، مطبع منظور پریس، ماوراء پبلشرز، کالج روڈ، راولپنڈی، س ن
۸۹۔ مصطفٰے زیدی، شہر آذر، ناشر، بہرام خان، مطبع جنگ پریس، ماوراء پبلشرز، راولپنڈی، س ن
۹۰۔ موریس بوکائلے، بائبل، قرآن اور سائنس، المطبۃ العربیہ، لاہور، ۱۹۹۵ء
۹۱۔ مظہر الاسلام، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، طبع اول، ۱۹۸۳ء
۹۲۔ مظہر الاسلام، گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء
۹۳۔ مظہر الاسلام، خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء
۹۴۔ مظہر الاسلام، اے خدا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء
۹۵۔ مظہر الاسلام، محبت مردہ پھولوں کی سمفنی، ناول، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، بار دوم، ۱۹۹۹ء
۹۶۔ مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء
۹۷۔ میراجی، مشرق و مغرب کے نغمے، اکادمی، پنجاب (ٹرسٹ)، مکتبہ جدید چوک، انارکلی، اُردو پریس، لاہور، ۱۹۸۵ء
۹۸۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر (مرتب) بیسویں صدی میں اُردو ادب، ساہتیہ اکادمی، دہلی، طبع اول، ۲۰۰۲ء
۹۹۔ ناصر بشیر، گم شدہ افسانہ نگار شمس آغا کی کہانی، القمر انٹر پرائزز، رحمان مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور، جولائی، ۱۹۹۵ء

۱۰۰۔ نذیر نیازی (مترجم)، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، از علامہ محمد اقبال، لاہور، ۱۹۵۸ء

۱۰۱۔ وارث علوی، ہندوستانی ادب کے معمار، سعادت حسن منٹو، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۹۵ء

۱۰۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر شام کی منڈیر سے، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۰۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر نئے تناظر، مکتبہ جدید پریس، لاہور، س ن

۱۰۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر آدھی صدی کے بعد، مکتبہ اُردو زبان، ریلوے روڈ، سرگودھا، نقوش پریس، لاہور، ۱۹۸۱ء

۱۰۵۔ ہادی حسین احمد، شاعری اور تخیل، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۶ء

۱۰۶۔ ہادی حسین احمد (مترجم)، مغربی شعریات، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء

۱۰۷۔ یوسف حسن خان، ڈاکٹر روح اقبال، بار دوم، لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۰۸۔ یونس حسنی، ڈاکٹر اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب، انجمن ترقی اُردو، پاکستان، بابائے اُردو روڈ، کراچی، اشاعت اول، ۱۹۷۶ء

۱۰۹۔ یونس حسنی، ڈاکٹر (مرتب) کلیات اختر شیرانی، ندیم بک ہاؤس، میاں چیمبرز، ۳ ٹیمپل روڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء

(ب) کتب

۱۔ اصطلاحاتِ نفسیات (مرتب) ادارۂ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء

۲۔ دیوانِ غالب، اُردو، نسخۂ عرشی، انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ، ہندوستان پرنٹنگ ورکس، رامپور، ۱۹۵۸ء

۳۔ فلسفۂ اقبال (مرتب)، بزمِ اقبال، مکتبہ جدید پریس، لاہور، طبع دوم، ۱۹۸۴ء

۴۔ نفسیات، اعتصام پبلشرز، چوک اُردو بازار، لاہور، ۱۹۹۷ء

۵۔ نفسیات پنجاب ایجوکیشنل پریس، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور، جون، ۱۹۹۱ء

(ا) رسائل و جرائد

۱۔ ادب لطیف، (ماہنامہ)، لاہور، فروری، مارچ، ۱۹۶۳ء

۲۔ ادبی دنیا (ماہنامہ)، لاہور، شمارہ ۹، ۱۹۶۳ء

۳۔ اُردو ادب (سہ ماہی)، انجمن ترقی اُردو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء

۴۔ ادبیات، اسلام آباد، جنوری تا مارچ، ۱۹۸۸ء

۵۔ افکار (ماہنامہ)، کراچی، جنوری، ۱۹۷۰ء

۶۔ افکار (ماہنامہ)، کراچی، اکتوبر، ۱۹۷۷ء

۷۔ افکار (ماہنامہ)، کراچی، ستمبر، ۱۹۷۸ء

۸۔ افکار (ماہنامہ)، کراچی، دسمبر، ۱۹۷۹ء

۹۔ افکار (ماہنامہ)، کراچی، منتخب مضامین، شمارہ ۱، ۲، اپریل مئی، ۱۹۹۵ء

۱۰۔ افکار، مصطفےٰ زیدی نمبر، دوسری بار، اضافہ، مکتبہ افکار، روبنن روڈ، کراچی، س ن
۱۱۔ انشاء، حیدرآباد، جولائی تا دسمبر، ۱۹۹۶ء
۱۲۔ اوراق (ماہنامہ)، لاہور، سالنامہ، جنوری، فروری، ۱۹۶۷ء
۱۳۔ اوراق (ماہنامہ)، لاہور، شمارہ خاص، لاہور، جولائی، ۱۹۶۸ء
۱۴۔ اوراق (ماہنامہ)، لاہور، افسانہ نمبر، نومبر، دسمبر، ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۰ء
۱۵۔ اوراق (ماہنامہ)، لاہور، خاص نمبر، جلد ۸، شمارہ ۳، ۴، مارچ، اپریل، ۱۹۷۳ء
۱۶۔ اوراق (ماہنامہ)، لاہور، سالنامہ جنوری، فروری، ۱۹۷۶ء
۱۷۔ اوراق (ماہنامہ)، لاہور، جنوری، فروری، ۱۹۷۷ء
۱۸۔ اوراق (ماہنامہ)، لاہور، شمارہ ۸، ۹، ستمبر، اکتوبر، ۱۹۸۱ء
۱۹۔ اوراق (ماہنامہ)، لاہور، مارچ، اپریل، ۱۹۸۴ء
۲۰۔ اوراق (ماہنامہ)، لاہور، اکتوبر، نومبر، ۱۹۸۶ء
۲۱۔ اوراق (ماہنامہ)، لاہور، جنوری، ۱۹۸۹ء
۲۲۔ اوراق (ماہنامہ)، لاہور، ستمبر، ۱۹۹۰ء
۲۳۔ اوراق (ماہنامہ)، لاہور، نومبر، دسمبر، ۱۹۹۷ء
۲۴۔ پاکستانی ادب، اسلام آباد، شمارہ ۵، جنوری، ۱۹۸۲ء
۲۵۔ پاکستانی ادب (تنقید، جلد پنجم)، مرتبین، رشید امجد، فاروق علی، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، راولپنڈی، طبع اول، جنوری، ۱۹۸۶ء
۲۶۔ تحریر، میرپورخاص، اکتوبر تا دسمبر، ۱۹۹۵ء
۲۷۔ تحریر، میرپورخاص، جنوری، ۱۹۹۷ء
۲۸۔ تشکیل، کراچی، اکتوبر، ۱۹۹۲ تا ستمبر ۱۹۹۳ء
۲۹۔ جائزہ، مجلّہ، پشاور، ۱۹۸۳ء
۳۰۔ چہارسُو، راولپنڈی، ۱۹۸۸ء
۳۱۔ چہارسُو، راولپنڈی، ۱۹۹۸ء
۳۲۔ دریافت (ششماہی)، شمارہ ۳، ستمبر، ۲۰۰۶، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد
۳۳۔ سویرا (سہ ماہی) لاہور، ۱۹۶۵ء
۳۴۔ سویرا (سہ ماہی) لاہور، شمارہ ۴۶، اپریل، ۱۹۷۳ء
۳۵۔ سویرا (سہ ماہی)، لاہور، نمبر ۴۹، اپریل، ۱۹۷۵ء
۳۶۔ سویرا (سہ ماہی)، لاہور، شمارہ ۵۰، ۵۱، ۵۲، مئی، ۱۹۷۶ء
۳۷۔ سیپ (سہ ماہی)، کراچی، شمارہ ۲۹، ۱۹۶۳ء
۳۸۔ سیپ، کراچی، ستمبر، ۱۹۹۰ء

۳۹۔ فنون (سہ ماہی)، اشاعت خاص، لاہور، اپریل، مئی، ۱۹۶۴ء
۴۰۔ فنون (سہ ماہی)، لاہور، جولائی، اگست، ۱۹۶۶ء
۴۱۔ فنون، لاہور، (جدید غزل نمبر)، جنوری، ۱۹۶۹ء
۴۲۔ فنون، لاہور، مئی، جون، ۱۹۷۰ء
۴۳۔ فنون، لاہور، شمارہ ۱۰، نومبر، ۱۹۷۰ء
۴۴۔ فنون، لاہور، شمارہ ۳۵، ۱۹۷۷ء
۴۵۔ فنون، لاہور، جنوری تا مئی، ۱۹۹۷ء
۴۶۔ ماہِ نو، (ماہنامہ)، کراچی، شمارہ ۱۱، نومبر، ۱۹۷۰ء
۴۷۔ ماہِ نو، (ماہنامہ)، لاہور، اپریل، ۱۹۸۶ء
۴۸۔ ماہِ نو، لاہور، اپریل، ۱۹۹۲ء
۴۹۔ مکالمہ، کراچی، جولائی تا ستمبر، ۱۹۹۷ء
۵۰۔ مکالمہ، کراچی، کتابی سلسلہ ۸، ترتیب مبین مرزا، اکادمی ادبیات، فیڈرل بی ایریا، کراچی، جون، ۲۰۰۲ء
۵۱۔ نگار (ماہنامہ)، کراچی، شمارہ ۱۱، ۱۹۸۴ء
۵۲۔ نقوش، منٹو نمبر، ادارہ فروغ اُردو، لاہور
۵۳۔ نقوش (ماہنامہ)، کراچی، شمارہ ۱۹، ۲۰، اپریل، ۱۹۵۲ء
۵۴۔ نقوش (ماہنامہ)، لاہور، شخصیات نمبر، ۱۹۵۵ء
۵۵۔ نقوش (ماہنامہ)، لاہور شمارہ ۱۰۷، مئی، ۱۹۶۷ء
۵۶۔ نئی تحریریں، رسالہ، مطبع استقلال پریس، لاہور، ۱۹۵۶ء
۵۷۔ نیرنگ خیال، راولپنڈی، شمارہ ۱۰، جلد ۸۳، سالنامہ، ۲۰۰۶

(ب) اخبارات

۱۔ پاکستان، روزنامہ، لاہور، ادبی ایڈیشن
۲۔ پبلک، روزنامہ، کراچی، ۱۲ ستمبر، ۱۹۹۷
۳۔ جنگ، اخبار خواتین، راولپنڈی، فروری، مارچ، ۱۹۸۸ء
۴۔ جنگ، روزنامہ، کراچی، ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء
۵۔ جنگ، روزنامہ، کراچی، ۲۰ ستمبر، ۱۹۹۶ء
۶۔ جنگ، روزنامہ، راولپنڈی، اسلام آباد، ۱۹ اگست، ۱۹۹۶ء
۷۔ جنگ، روزنامہ، کراچی، ۱۱ اکتوبر، ۱۹۹۶ء
۸۔ جنگ، روزنامہ، راولپنڈی، سنڈے میگزین، ۱۶ اپریل، ۲۰۰۶ء

۹۔ سفیر، روزنامہ، حیدرآباد، ۲۵ستمبر، ۱۹۷۱ء

۱۰۔ نوائے وقت، روزنامہ، لاہور، ۵دسمبر، ۱۹۷۶ء

۱۱۔ نوائے وقت، روزنامہ، لاہور، ملتان، ۳۰مارچ، ۱۹۸۶ء

۱۲۔ نوائے وقت، روزنامہ، لاہور، ۲۱مئی، ۱۹۹۲ء

۱۳۔ نوائے وقت، روزنامہ، کراچی، ۱۴اکتوبر، ۱۹۹۶ء

۱۴۔ نوائے وقت، روزنامہ، کراچی، ۲۱اکتوبر، ۱۹۹۶ء

۱۵۔ نوائے وقت، روزنامہ، کراچی، ۲دسمبر، ۱۹۹۶ء

۱۶۔ نوائے وقت، روزنامہ، کراچی، ۲۴دسمبر، ۱۹۹۶ء

۱۷۔ نوائے وقت، سنڈے میگزین، راولپنڈی، ۲۵فروری، ۲۰۰۷

۱۸۔ The Times of Karachi, Thursday, October, 14, 1993

(ا) لُغات/فرہنگ

۱۔ انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع اوّل، ۱۹۹۳ء

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر فرہنگ اصطلاحات، جامعہ عثمانیہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول، ۱۹۹۱ء

۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر قومی انگریزی، اُردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول، ۱۹۹۲ء

۴۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد اوّل، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء

۵۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد دوم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء

۶۔ سید مرتضیٰ حسین فاضل، قائم رضا امروہوی، جامعہ نسیم اللغات، اُردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، نمبر ۲، س ن،
ISBN-969-31-072776

۷۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول، ۲۰۰۲ء

۸۔ فیروز الدین، مولوی فیروز اللغات، (چھٹا ایڈیشن) فیروز سنز، لاہور، ۱۹۷۵ء

۹۔ فیروز الدین، مولوی فیروز اللغات، اُردو جامع، (نیا ایڈیشن)، جدید ترتیب اور اضافوں کے ساتھ، لاہور، (س ن)

۱۰۔ فیروز اللغات، فارسی، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۵۲ء

(ب) دائرہ ہائے معارف/انسائیکلوپیڈیا

۱۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا، جلد ۲۱، لندن، ۱۹۵۵ء

۲۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز، لاہور، باراوّل، ۱۹۶۲ء

۳۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا، تیسرا ایڈیشن، فیروز سنز، لاہور، جنوری، ۱۹۸۲ء

۴۔ جدید اُردو شاعری کا انسائیکلوپیڈیا، الف سے ی تک، (مرتب) شہزاد محمود، المطبعۃ العربیہ، لاہور، ۱۹۹۷ء

۵۔ شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا، مرتب، مقصود ایاز، محمد ناصر، شعاع ادب، انارکلی، لاہور، ۸، باراول، ۱۹۸۷ء
۶۔ مصارف الحدیث، مولانا محمد منظور عثمانی، جلد سوم، ادارہ اشاعتِ حدیث، لاہور

موضوع سے متعلق چند ادیبوں کے اہل خانہ سے ملاقات و گفتگو

ادیب/شاعر	اہل خانہ
۱۔ آنس معین	عارف بلے (بھائی) ۲۳ دسمبر، ۲۰۰۵، ملتان
۲۔ ثروت حسین	شوکت عابد (بھائی) ۲۷ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۳۔ جمیلہ شاہین	شکیلہ یونس (بہن) رخسانہ احسان (بھابھی) ۱۷ جولائی، ۲۰۰۵، راولپنڈی
۴۔ سارا شگفتہ	افضال احمد سید (سابقہ شوہر) ۲۷ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۵۔ شکیب جلالی	محدثہ خاتون (اہلیہ) اقدس رضوی (بیٹا) ۲۸ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۶۔ صغیر ملال	جمیل ملال (بھائی) ثریا ملال (بھابھی) ۴ مارچ، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۷۔ مصطفےٰ زیدی	سید ارتضیٰ حسین زیدی (بھائی) فرحت زیدی (بھابھی) ۳ ستمبر، ۲۰۰۵، اسلام آباد شاہد رضا (بھتیجا) ۲۸ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۸۔ منٹو	نصرت جلال (بیٹی) شاہد جلال (داماد) ۱۵ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۹۔ ناصر کاظمی	حسن کاظمی (بیٹا) ۱۴ جون، ۲۰۰۵، لاہور

انٹرویوز (ملاقات و گفتگو)

۱۔ احمد جاوید، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۵ جولائی، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۔ احمد ندیم قاسمی، راقمہ سے ملاقات، ۱۶ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۳۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۴۔ افتخار عارف، راقمہ سے ملاقات، ۲۶ فروری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۵۔ انوار احمد، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۳ دسمبر، ۲۰۰۵، ملتان
۶۔ انور سدید، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۶ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۷۔ انور نسیم، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۵ جولائی، ۲۰۰۵، اسلام آباد
۸۔ بانو قدسیہ، راقمہ سے گفتگو، ۲۲ جولائی، ۲۰۰۶ء، لاہور
۹۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۱۰۔ توصیف تبسم، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۲۰ جنوری، ۲۰۰۵، راولپنڈی
۱۱۔ جلیل انور، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۸ فروری، ۲۰۰۷، راولپنڈی

۱۲۔ جلیل عالی، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۷ جنوری، ۲۰۰۶ء، راولپنڈی
۱۳۔ روبینہ ترین، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۳ دسمبر، ۲۰۰۵، ملتان
۱۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۱۵۔ سلمیٰ جبین، پروفیسر راقمہ سے گفتگو، ۱۴ اگست، ۲۰۰۵، لاہور
۱۶۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۲ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۱۷۔ شکیلہ یونس، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۱۷ جولائی، ۲۰۰۵، راولپنڈی
۱۸۔ ظفر اقبال راجہ، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۴ جنوری، ۲۰۰۶، راولپنڈی
۱۹۔ عبدالکریم خالد، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۲۰۔ عذرا عباس، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری، ۲۰۰۶، کراچی
۲۱۔ علی کرار نقوی، علامہ راقمہ سے گفتگو، ۱۶ جون، ۲۰۰۵، کراچی
۲۲۔ فتح محمد ملک، پروفیسر راقمہ سے ملاقات، ۳۰ جولائی، ۲۰۰۵، اسلام آباد
۲۳۔ کشور ناہید، راقمہ سے ملاقات، ۱۶ فروری، ۲۰۰۶، اسلام آباد
۲۴۔ محسن عباس، متعلم پی ایچ ڈی (اُردو) نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، راقمہ سے ملاقات، ۱۵ جولائی، ۲۰۰۵، اسلام آباد
۲۵۔ محمد زکریا خواجہ، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۱ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۲۶۔ مسعود اشعر، راقمہ سے ملاقات، ۲۱ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۲۷۔ مشتاق احمد یوسفی، راقمہ سے ملاقات، ۲۹ دسمبر، ۲۰۰۵، کراچی
۲۸۔ مظہر الاسلام، راقمہ سے ملاقات، ۱۷ جنوری، ۲۰۰۵، لوک ورثہ، اسلام آباد
۲۹۔ منصورہ احمد، راقمہ سے ملاقات، ۱۶ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۳۰۔ ناہید قاسمی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۷ جولائی، ۲۰۰۵، لاہور
۳۱۔ نصیر ترابی، علامہ راقمہ سے گفتگو، ۱۵ اکتوبر، ۲۰۰۵، راولپنڈی
۳۲۔ نوازش علی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۷ جولائی، ۲۰۰۵، راولپنڈی
۳۳۔ وحید قریشی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۲۰ جولائی، ۲۰۰۶، لاہور
۳۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۶ جون، ۲۰۰۵، لاہور
۳۵۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر راقمہ سے ملاقات، ۱۴ اگست، ۲۰۰۶، کراچی

غیر مطبوعہ مقالہ جات

۱۔ امتیاز کلثوم، شکیب جلالی، مقالہ برائے ایم اے اُردو، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۷۷ء
۲۔ سیّدہ پروین، ''شکیب جلالی'' (شخصیت وفن) مقالہ برائے ایم اے اُردو، بہاؤالدین زکریا، یونیورسٹی،

ملتان، ۱۹۸۰ء

۳۔ صلاح الدین درویش، "ملتان کے تین جوانمرگ شاعر" بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۸۶، ۱۹۸۷ء

English Books

1. Alvarez.A. The Savage God London, The Study of Suicide Great Britain, Clays Ltd, St Ives Ple, ISBN 747559058, Copyrights, Alvarez, 1971.
2. Bashir Ahmad, Prof. Ernest Hemingway, "The Old Man and the Sea", Lahore Polymer Publishers, 1996.
3. Barrett William, "Death of the Soul", Oxford University Press, 1987.
4. Brigham.C.C. A Study of American Intelligence, Princeton University Press, 1923.
5. Brink Andrew. Loss and Symbolic Repair, Psychological Study of Some English Poets, Hamilton, Cremlech Press, 1977.
6. Brown.E.G, Modern Persian & Poetry, Pakistan Review Iranian Press, 1954.
7. Butscher Edward, Sylvia Plath, Method and Madness New York, The Seabury Press.
8. Bundtzen Linda K. Plath's Incarnations, Women and the Creative Process. Ann Arbor, University of Michigan Press, 1983.
9. Bowker John. The Meaning of Death, Cambridge University Press, 1991.
10. Carmichael Leonard. Basic Psychology, New York, Random House, 1957.
11. Carlsen G. Robert, Ludwig M. Richard and Others American Literature, Theme and Writers series U.S.A, Webster Division, Mc. Graw, Hill Book Company, 1967.
12. Cole Michael, Cole Sheilar, The Development of Children, Second Edition, University of California, 1938.
13. Collin Mey Nell Laurence, Edited, Poe Edgar Allen, "Tales, Poems, Essays", London, 1966.
14. David Lamb. Death, Brain, Death and Ethics, State University of New York press, 1985.
15. Davison Jane, The Fall of a Doll's House, New York; Holt, Rinehart and Winston, 1980.
16. Davison Peter, Half Remembered, A Personal History, New York, Harper & Row, 1973.
17. Ervin Laszlo and Wilber. B. James Edited, "Human Values and the Mind of man", NewYork, London, Cordon and Breach science Publishers, 1971.

18. Feldman. S. Robert, Understanding Psychology, Fourth Edition, U.S.A, 1996.

19. Frank Waldo, Edited, The Collected Poems of Hart crane, New York, Liveright Publishing Corporation, 1946.

20. Friedrich. P. Warner, "German Literature", New York, 1998.

21. Harry Thomas. Adgar Allen Poe, Living Biography of Great Poets, London, 1959.

22. Haim Andrew. Adolescent Suicide, Translation of A. M. Sheridan Smith, Tavistock Publication.

23. Hartle Anne. Death and the Disinterested Spectator, state University of New York Press, 1986.

24. Hal Brook David. Sylvia Plath, Poetry and Existence British Council Library, London and Atlantic High Lands, Atlantic Press, 1991.

25. Hegal, "The Philosophy of History" Dover Publication, New York, 1950.

26. Hotchner. A. E. Papa Hemmingway, London, Toronto, Sydney, New York, Panther Granda Publishing, 1979.

27. Hamburger Michael, Selected, Translated and Introduced Paul Cellan Poems, A Bilingual Edition, Manchester, New Press Limited, 1976.

28. Kamshad. H. Modern Persian Prose Literature, Cambridge, 1966.

29. Kendall. C. Philip, Abnormal Psychology California, Los Angelos, 1995.

30. Lauren. B. Alloy, Abnormal Psychology, U.S.A. Seventh Edition, M.C.Graw Hill, 1972.

31. Lee Robert and Derek Morgan, Edited "Death Rites, Law and Ethics at the End of Life, London & New York, First Published by Routledge, 1994.

32. Louis Levine, Biology of the Gene, Third Edition, Toronto, London, The C.V. Mosly Company, 1980.

33. Lewontin. R.C , Rose.S and Kamim. L. J, Not in our Genes,New York, Pantheon, 1984.

34. Lewontin. R. C. The Doctrine of D.N.A., Biology as Ideology, England, Penguin, 1992.

35. Margaret. S. Stroebe, Hand Book of Bereaverrent, Cambridge University Press, 1993.

36. Marcuse .F. L. Edited, Areas of Psychology, New York, The State College of Washington, 1954.

37. Macleod John. Davidson's Principle Practice of Medicine, Fourth Edition, 1984.

38. Mencil Barbora, Edited, Twentieth Century Author Biographies.

39. Master Index, First Edition, U.S.A., Gale Research Company, 1984.

40. Moeen Akhtar, What is Death, Dar-ul-Tazkeer, Lahore, 1998.

41. Nicolson Nigal, Editor, "Leave the Letters, Till we're Dead" The Letters of Virginia Woolf, 1936-1941, London Hogarth Press, 1980.

42. Qiunn Robinson, Compiled, Edger Allen Poe, "Selection from the Critical Writings, New York, 1958.

43. Ram Babu Saksena, European Poets of Urdu & Persian, Lahore, Book Traders, P.O. Box, 1854.

44. Raven. H. Peter. Biolog, Fifth Edition, U.S.A. McGraw Hill Companies, 1999.

45. Redgrove, Peter, The black Goddess and the Sixth Sense, London, Bloomsbury, 1987.

46. Singer Irving, Meaning in Life, the Creative Value, New York, 1992.

47. Smith A.M. Sheridon. Adolescent Suicide Translated by Andore Haim, Tavistock Publications, Paris, 1969.

48. Smith .R.M. Suicide and intervention in Perspective Paper Presented at Annual Meeting of the National Council of Family Relation, Boston, 1979.

49. Salk Jonas, "The Survival of the Wisest", New York, London, Harper & Row, 1973.

50. Shakepear Arden. Death, Book of Quotations, Compiled by Jane Armstrong, Printed in Singapore, Seng Lee Press, 2001.

51. Stevenson Anne. Bitter Fame, A Life of Sylvia Plath, London Penguins Books, 1989.

52. Swinber Ricahard, "The Evolution of the Soul" Clarendon Press-Oxford, 1986.

53. Ted Hughes, Edited with an Introduction "Sylvia Plath, Collected Poems, Faber and Faber, London, 1981.

54. Wagner Martin, Linda, Sylvia Plath, A Biography, New York, Simon and Schuster, 1987, London, Chatto & Windows, 1988.

55. Walter. J. B. General Pathology M.S. Israel, Sixth Edition, London and New York, Hill Living Strong, 1987.

56. Wilson. E. O. Sociobiology, the New Synthesis, Cambridge, M.A. Harvard University Press, 1975.

57. Winter. G. David Personality Analysis and Interpretation of Lives, University of Michigon, Hill Companies, 1996.

58. Yong. C. G. "Modern Man in Search of Soul", Routledge & Kegan Paul, London, Reprinted 1981.

59. Yukio Mishima, The Temple of Dawn, Translated from the Japanese by E. Dale Saunders and Cecilia Segaura Seigle, Penguin Books, 1977.

Essays

1. Alexander, Paul, Ed, Aried Ascending: Writing about Sylvia Plath, New York: Harper & Row, 1985.
2. Butcher, Edward, Ed. Sylvia Plath: The Woman and the Work,New York, Dodd, Mead, 1977.
3. Gabrial Garcia Marqees, Essay on Hemingway, The New York Times, Book Review, July 1981.
4. Suicide and Attempted Suicide in Young People", Report on a Conferecne, Geneva, Switzerland, W.H.O. 1974.

English Dictionaries

1. A Critical Dictionary of Psychoanalysis Penguin Books, 1972.
2. A Dictionary of Psychology, Penguin Books, Revised by HarveyWallerstein, 1952.
3. A Comprehensive Persian English Dictionary, F.Steingass, Oriental Book Reprinted Corporation, First Indian Edition, 1972.
4. A Dictionary of Literary Terms, Mortin Gray, Longman Group, U.K limited, 1994.
5. Chambers Twentieth Century Dictionary, Edited A.M. Macdonald(Oxon) 1975.
6. Dictionary of Behavioural Science, Compliled & Edited by Benjamin.B. Walma Litton Educational Publishing 1973.
7. English to English and Urdu Dictionary, Feroz Sons (P.V.T) Limited New Edition.
8. Longman Dictionary of Psychology & Psychiatry, Longman, New York & London, 1991.
9. "Oxford Advanced Learner's Dictionary of current English" Oxford University Press, 4th Edition, 1991.
10. Practical Dictionary, English into English and Urdu, Kitabistan Publishing Co-Urdu Bazar, Lahore.
11. The Concise Oxford Dictionary of Current English, 190,000 Definitions, 120,000 Entries, The New Edition for the 1990's Eighth Edition, Edited by R.E. Allen, Clarendon Press, Oxford, 1990.
12. Urdu English Dictionary, Feroz Sons, A Comprehensive Dictionary of Current Vocabulary, Revised Edition.
13. Webster's New World College Dictionary, Fourth Edition, he Official Dictionary

of the Associate Press, 2001.

English Encylopaedia

1. An Encyclopaedia of Philosophy Edited by G.H.R, Parkinson, Routledge, U.K. 1988.
2. Encyclopaedia of Britanica University of Chicago, U.S.A Vol: 17, 15th Edition 1976.
3. The New Encyclopaedia of Britanica, University of Chicago, U.S.A. Vol: 10, 15th Edition, 1997.
4. The Cambridge Encyclopaedia, Cambridge University Press,Sydney, 1991.
5. The Hutchinson Encyclopaedia, Helicon, Second Edition,1994.
6. The world of learning 2000, 50th Edition, Europa Publishers,London, 1999.

(a) Internet

1. Biographical Notes of Suicidal Poets and Authors at http:/www.poets/poets.cfm? 45542 B7C00CO50 70C, Copyrights 1997-2004, by the Academy of American Poets.
2. Existentialism, Introduction, Microsoft Corporation 1993-2003.
3. Research Studies, "Is Suicide Hereditary?" Tendency to kill Oneself have a Genetic Basis, Daily University Science, New Search, a Web Page, "Good Morning America, April, 2002.
4. htt://em/wikipaedia.org (Suicide from Wikipedia the freeEncyclopaedia).
5. Suicide, Introduction, 1993, 2002, Microsoft Corporation, All Rights reserved.
   Programme: National Geography, 28th April, 2005.

(b) Internet Refernces about Suicide and Genes

1. Gould MS, Fisher P, Parides M et al. (1996), Psychosocial Risk Factors of Child and Adolescent Completed Suicide. Arch Gen Psychiatry 53(12): 1155-1162.
2. Kendler KS, Davis CG, Kessler RC (1997), The Familial Aggregation of Common Psychiatric and Substance use Disorders in the National Comorbidity Survey: a Family History Study. Br J Psychiatry 17:541-548.
3. Glowinski AL, Bucholz KK, Nelson EC et al. (2001), Suicide Attempts in an Adolescent Female Twin Sample. J Am Acad Child Adolesc Psychiatry 40(11): 1300-1307.
4. Roy A, Segal NL, Centerwall BS, Robiette CD (1991), Suicide in Twins. Arch

Gen Psychiatry 48(1): 29-32.

5. Wender, P., Kety, S., Rosenthal, D., et al (1986) PsychiatricDisorders in the Biological and Adoptive Families of Adopted Individuals with Affective Disorders. Archives of General Psychiatry, 43, 923-929.
6. Roy, A., Nielsen, D., Rylander, G., et al(1999) Genetics of Suicide in Depression. Jouranal of Clinical Psychiatry, 60 (suppl.2), 12-17.
7. Statham, D. J., Heath, A. C., Madden, P.A., et al (1998) Suicidal Behaviour: An Epidemiological and Genetic Study. Psychological Medicine, 28, 839-855.

(C) Schopenhauer on Suicide

Notes:

1. Hist Nat. Lib. xxviii. Ch. 1
2. Loc. CiT. Lib. Ch. 7.
3. Valerius Maximum; hist. Lib. 11. ch. 6, Secs. 7et.8. Heraclides pointcus, fragmenta de rebus publicis, ix Aellemi variae historia,111, 37. Starabo; Lib; x, ch.5,6.
4. Eth. Nichom; v, 15.
5. Stobaeus, Eci: Eth. 11, ch.7, PP. 286, 312.
6. Tradhuit par st. Julien, 1834.
7. See my Treatise on the Foundation of Morals, Sec.5.
8. Essays on Suicide and the Immorality of the Soul, by the Late David Hume, Basle, 1799, Sold by James Decker. Return to Suicide & Philosophy # 5, 489.

ضمیمہ

(خودکشی کرنے والے عالمی ادیب)

(1752-1770) Thomas Chatterton

یہ پندرھویں صدی عیسوی میں انگریزی کا اہم ترین شاعر تھا۔ کیٹس، شیلے اور ورڈز ورتھ اسے ہیرو مانتے تھے۔ وہ سوسائٹی کے رویوں کا شاکی تھا۔ 18 سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اُس نے زہر کھا کر خودکشی کی۔

> "Chatterton was, in fact the first romantic poet of the English language."

He often remained upset due to his disturbed professional life and the difficulties of publishing his poetry and writings.

> "On the evening of the 24th august 1970, Chatterton locked himself in his room and drank a dose of arsenic mixed in water. His body was discovered the following day, the floor of his room littered with the torn-up pieces of his manuscripts. The coroner's ruling: a suicidal death as the result of insanity. He was 17 years and 9 months old."

(Katinka Matson, short lives, First British Publication, Picador, printed in Great Britain by Richard Clay, 1980, P. 33)

Arthur Rimband (1854-1891)

یہ فرانسیسی شاعر تھا۔ اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ تمام زندگی سخت محنت اور جدوجہد میں بسر کی۔ حد درجہ محنت سے وہ اکثر بیمار رہنے لگ گیا تھا۔ لیکن معاشی تنگدستی اُسے سخت مشقت کے راستے پر چلاتی چلی گئی۔ اُس کے اندر کا لکھاری، فنکار، اُس کا حساس دِل ودماغ گویا زندگی سے بُری طرح لڑ رہا تھا۔ جس کا اظہار اکثر وبیشتر اُس کی شاعری میں بھی دکھائی دیتا تھا۔

"I went off, my fists in my torn pockets, my coat too was becoming ideal."

(Katinka Matson, short lives, First British Publication, Picador, printed in Great Britain by Richard Clay, 1980, P. 292)

(1876-1916) Jack London

یہ امریکی ناول نگار تھا۔ افسانے بھی لکھے۔ سوشلسٹ لیبر پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ زندگی میں جو مقام پایا، وہ سب اُس کی ذاتی محنت اور جدوجہد پر مبنی تھا۔ اعلیٰ درجے کی ذہانت اور فراست کا حامل تھا۔ معاشی حالات کی تنگدستی اُس کے اعلیٰ عزائم کی راہ میں مانع رہی۔ نشہ کی عادت نے اُس میں مزید تنہائی اور سوسائٹی سے متعلق غم وغصہ پیدا کر دیا۔

> "He poured his soul in to stories, articles and poems and entrusted them to the machine... my home-one of my dreams- is destroyed."

(Katinka Matson, short lives, First British Publication, Picador, printed in Great Britain by Richard Clay, 1980. P. 173)

(1895-1925) Sergei Esenin

I greet everything, I accept everything,
I am glad and happy to abandon my soul.
I have come on this earth
To leave it soon.

یہ روسی شاعر تھا۔ روسی انقلاب کے حوالے سے یہ مایا کوسکی کے بالمقابل سمجھا جاتا ہے۔ یہ والدین کی اکلوتی اولاد تھا، جواُن کی علیحدگی کے بعد ننھیال میں اچھے حالات میں پلا بڑھا۔ ساتھ ہی ساتھ محبت کے معاملات کا شکست خوردہ بھی رہا۔ اعلیٰ پائے کا لکھاری اور حساس انسان تھا۔ اچھے ملبوسات اور خوشبوؤں کا شوقین تھا۔ ایک سے زیادہ شادیوں کے مسائل میں بھی الجھتا رہا۔ زندگی بھر شراب کا ساتھ رہا۔

My friend, my friend,
I am very, very sick
I don't know myself where
This sickness has come
Or is it alcohol scattering
My brain
Like leaves inSeptember

یہ خون سے لکھی ہوئی اُس کی آخری نظم تھی۔ اور 27 دسمبر کا دن تھا۔

Now good-bye my friend, no hand clasped
No word spoken, in this life there is nothing new in dying
And, in truth, to live is nothing new.

اور اسی دن علی الصبح

"Sergei Esenin, 30 years old, hanged himself from a heating pipe in his hotel room."

(Katinka Matson, short lives, First British Publication, Picador, printed in Great Britain by Richard Clay, 1980, P. 90)

Ibid, 99

Ibib, 99

Ibib, 99

(1896-1948) Antonin Artaud

He was French actor, director, dramatist, assayist and a poet,

اُس کی بہترین تصنیف "Theatre of Cruelty" ہے۔ اپنے بہن بھائیوں میں یہ سب سے زیادہ قابلِ توجہ جانا جاتا ہے۔ تھیٹر میں اونچا بولنا اُس کے اندر کے تمام تر غصے اور تاثرات کا واضح اظہار تھا۔ یہ بے پناہ ایوارڈ یافتہ اور انتہائی ذہین تھا۔

> "I myself spent nine years in an insane asylum and a never had the obsession of suicide, but I know that each conversation with a psychiatric, every morning at the time of his visit, made me want to hang myself, realizing that I would not be able to cut his throat."

With all this mental health and situation, at last he died of cancer.

(Katinka Matson, short lives, First British Publication, Picador, printed in Great Britain by Richard Clay, 1980, P. 12)

(1909-1957) Malcolm Lowry

یہ انگریزی کا ناول نگار، افسانہ نگار اور شاعر تھا۔ نشے کی عادت نے اُس کے اندر بڑی ٹوٹ پھوٹ پیدا کر دی۔ حساس اور افسردہ طبیعت رکھتا تھا۔ زندگی کے تلخ تجربات نشے کی صورت اُسے اندر ہی اندر توڑتے اور کھوکھلا کرتے گئے۔ نشہ گویا اُس کے نزدیک زندگی کی تلخیوں سے راہِ فرار تھا۔

"On the evening of 27th June 1957, Lowry became violently drunk."

اُس کی بیوی نے اُسے مردہ حالت فرش پر پڑا ہوا پایا۔ اُس نے نشے کی دوائیاں استعمال کی تھیں۔

(Katinka Matson, short lives, First British Publication, Picador, printed in Great Britain by Richard Clay, 1980, P. 188)

(1914-1953) Dylan Thomas

یہ شیلے اور کیٹس کے سلسلے کا آخری رومانوی شاعر جانا جاتا ہے۔ اپنے لیے خود لکھتا ہے "The drunkest man in the World" اگرچہ اس نے معاشی تنگدستی کا سامنا نہیں کیا۔ کیونکہ مالدار آدمی تھا۔ لیکن نشہ کہ عادت، اس کی شدت اور انتہا نے ایک اعلیٰ پائے کے شاعر کا خاتمہ کر دیا۔

مندرجہ بالا غیر ملکی ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ مندرجہ ذیل نام بھی اسی فہرست میں شامل ہوتے ہیں۔ جنہوں نے یا تو موت کے متلاشی ہو کر یا تنگی دوراں کے ہاتھوں خودکشی کا انتخاب کیا۔ اور بعض نے نشہ آور زندگی کا کچھ اس طرح سہارا لیا۔ کہ جوانمرگی اس کا عنوان بن گئی۔

(1922-1969) Jack Kerouac

یہ امریکی ناول نگار اور شاعر تھا۔ پڑھے لکھے والدین کی اولاد تھا۔ طبیعت میں حساس پن حد درجہ پایا جاتا تھا۔ خواب، خواہشات، نا آسودگی اور بے چینی ہمیشہ اُسے دامن گیر رہی۔ تنہائی، موت اور تفکر کے عناصر اُس کی سوچ کا حصہ تھے۔

"Was it possible that all the beauty, life and loyality, the brave dreams and the young hopes had to die..."

(Katinka Matson, short lives, First British Publication, Picador, printed in Great Britain by Richard Clay, 1980, P. 154)

(1925-1966) Lenny Bruce

یہ امریکن مزاح نگار اور طنز نگار تھا۔ والدین کی علیحدگی کے پس منظر میں اس کی پرورش ہوئی۔ 35 سال کی عمر تک یہ مشہور ہو چکا تھا۔ اپنی محنت اور صلاحیتوں کی بنا پر اس نے خوب دولت کمائی۔ پہاڑوں پر خوبصورت گھر بنایا۔ اس پر منشیات کے الزامات وقتاً فوقتاً لگتے رہے۔ کئی مرتبہ گرفتار ہو کر پولیس کی نگرانی میں رہا۔ مقدمات چلے اور جیل گیا۔ جیل پھلانگنے کے جرم میں پکڑا گیا۔ پھر سزا اور جرمانہ ہوا۔ گویا وہ تمام زندگی تلخ تجربات میں الجھتا رہا۔ نشہ آور زندگی اور حیات کی تلخیوں نے بالآخر خودکشی کے راستے کا انتخاب کیا۔

"Lenny Bruce died on 3rd august 1966. He was discovered on the floor in the bathroom of his house, a needle in his arm and his pants around his knees. He was forty years old."

خودکشی کرنے والے یا خودکشی کے راستے پر چلنے والے مزید ادیبوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

Montgomery Clift, Harry Crosby, James Dean, F. Scott Fitzgerald, Judy Garland, Billie Holiday, Janis Joplin, Ross Lockridge, Amedeo Modigliani, Marilyn Monroe, Vaslav Najinsky, Elvis Presley, Vincent Vangogh, Simone Weil.

(Katinka Matson, short lives, First British Publication, Picador, printed in Great Britain by Richard Clay, 1980, P. 26)

ارنیسٹ ہیمنگ وے ۱۸۹۹ء میں شکا گو میں پیدا ہوئے جو امریکی ادب کا ایک اہم نام ہیں۔ وہ زندگی بھر پُر خطر مہمات کے شائق رہے۔ بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی رنگا رنگ مشاغل سے عبارت تھی۔ بیک وقت کئی صفات کے حامل شکاری، لکھاری، پرکشش شخصیت، مطالعے کے شوقین، محفل پسند اور زندگی سے پر امید نکتہ نظر نے ان کی شخصیت کو منفرد بنا دیا۔
سفر کو ہیمنگ وے کی زندگی میں بہت عمل دخل ہے چنانچہ سفر کا حوالہ ان کے یہاں ایک استعارہ بن جاتا ہے۔ زندگی میں حرکت و عمل، گہما گہمی، رنگا رنگی اور خوشگوار یا ناخوشگوار حالات سے لطف اندوز اور نبرد آزما ہونا ان کا وصف خاص نظر آتا ہے اور یہ ان کی ہنگامہ خیز شخصیت اور فطرت کا عکاس بھی ہے۔ ایسی شخصیت اور مزاج جس میں ٹھہراؤ نہیں بلکہ مہم جوئی ہے اور وہ ان تجربات میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو موت بھی اک تجربہ اور سفر کی علامت ہے ایسا سفر جو زندگی کے خاتمے پر آغاز پاتا ہے۔ ہیمنگ وے کی زندگی میں سفر کی کیفیت اور مختلف تجربات سے گزرنے کی لذت اور ان کی خواہش مرگ کے ساتھ ساتھ خودکشی کے محرکات کو تقویت دیتی محسوس ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صفیہ عباد درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے نمایاں پوزیشن کے ساتھ ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی اور وہ گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ انھوں نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز سے ڈاکٹریٹ کیا۔ ملک کے معروف اخبارات اور ادبی جرائد میں ان کی مختلف موضوعات پر تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے کئی تحقیقی اور تنقیدی مقالے قومی و عالمی سطح پر شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''کہانی مظہر الاسلام ہے'' سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور نے شائع کی ہے جب کہ مشہور افسانہ نگار اور تنقید نگار ڈاکٹر رشید امجد کے فکر و فن پر مبنی ان کی ایک اہم کتاب ''رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ'' پورب اکیڈمی سے شائع ہو چکی ہے۔ اُن کی مختصر کہانیوں پر مبنی نئی کتاب ''سرما کی پہلی برف باری'' حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ آج کل وہ بطور پروفیسر فاطمہ جناح وویمن یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالے ''ادیبوں میں خودکشی کے محرکات'' پر مبنی ہے جس کا یہ دوسرا ایڈیشن اضافے کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

ISBN: 978-969-37-0335-1